غزل

از شہزادہ عالیجاہ جناب نواب معظم جاہ بہادر دام اقبالہٗ

رخ نہ بدلا مرے فسانے کا — دل بدلتا رہا زمانے کا

ہو گئی ہے قفس سے دلچسپی — ہوں گنہگار آشیانے کا

نزع میں پوچھتے ہیں دل کا مزاج — وقت اچھا ہے دل دکھانے کا

ہر نفس دُور ہے محبّت میں — راستہ دیکھتا ہوں آنے کا

دن گئے جب وہ تھے نگاہوں میں — حوصلہ تھا نظر اٹھانے کا

کچھ اس انداز سے ستاتے ہیں — جیسے احسان ہے ستانے کا

پہلے تھا صرف دردِ عشق شجیعؔ
درد ہے دل میں اب زمانے کا

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہے

جلد ۲۶ | نمبر ۲

فہرست مضامین ماہ جنوری ۱۹۳۷ء

ملاحظات

سنہ ۱۹۳۶ء اور سنہ ۱۹۳۷ء

گذشتہ سال (سنہ ۱۹۳۶ء) کا پہلا مہینہ (جنوری) اور جنوری کی ۲۹ تاریخ میرے لئے مسرتوں اور شادمانیوں کی جو سرافرازیاں اور دلنوازیاں اپنے ساتھ لائی — **کچھ کچھ وہ اب بھی یاد ہیں جو سب نہیں** لیکن اب یہاں ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے اور پھر اسی سال (سنہ ۱۹۳۶ء کا تیسرا مہینہ مارچ) اور مارچ کی ۲ تاریخ بھی اپنی جن نہایت سامانیوں کے ساتھ آئی اور میرے لئے غم و اندوہ کا جو پیام لائی اس کی روح فرسا اور جانگسل یاد اب تک دل میں باقی ہے۔ اس درد آفریں اور اندوہگیں قصے کو طول دینا مناسب نہیں اور نہ مجھ میں اتنی ہمت ہے۔ جب تک زندگی ہے دنیوی علائق سے انقطاع ناممکن ہے۔ جیسے جا رہا ہوں اور دنیا کے ان امور کی انجام دہی میں مشغول ہوں جو میرے فرائض میں شامل ہیں۔ ہر حال میں راضی برضا اور خدائے ارحم الراحمین کی رحمتوں کا امیدوار ہوں۔

اسی سنہ ۱۹۳۶ء میں اردو کے بعض ایسے ادیب بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے جن کے دائمی فراق کا احساس بزم اردو میں نہایت شدت کے ساتھ ہوتا رہیگا۔ اللہ تعالیٰ منزل عدم کے ان مسافروں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

سنہ ۱۹۳۶ء ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا اب سنہ ۱۹۳۷ء کی آمد آمد ہے۔ خدا کرے کہ نیا سال عالمگیر اور ناظرین عالمگیر کیلئے من کل الوجوہ مبارک ثابت ہو۔

عالمگیر کا خاص نمبر سنہ ۱۹۳۷ء عالمگیر کے تمام ناظرین کرام کی خدمت میں حاضر ہو چکا ہے۔ اس نمبر کی تعریف میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین اس کے حسن و قبح پر مجھ سے زیادہ بہتر الفاظ میں اظہار رائے کر چکے ہونگے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ دفتر عالمگیر میں کثرت کے ساتھ ایسے گرامی نامے موصول ہوئے جن میں خاص نمبر کی خصوصیات اور مدیر عالمگیر کی ناچیز مساعی کی نہایت شاندار الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔ چونکہ ایسے حضرات کی خدمت میں خطوط کے ذریعہ اظہار تشکر نہ کر سکا اس لئے اب ان سطور میں ان تمام کرم فرمایان عالمگیر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے حوصلہ افزا الفاظ میں میری محنتوں کی داد دی۔ در اصل عالمگیر کی یہ قابل رشک کامیابی محبان عالمگیر کی نوازشات پیہم کی رہین منت ہے۔

میں عالمگیر کے ان کرم فرماؤں کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے میری تحریک یا میری تحریک کے بغیر اپنے حلقۂ اثر میں عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرمائی اور باوجود اپنی کثیر مصروفیات کے اپنے عالمگیر کو یاد رکھا۔ میں ان تمام حضرات کی خدمت میں جو اب تک اس جاریہ امداد کا موقع نہیں پا سکے ہیں بطور یاد دہانی یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ بھی اپنے حلقۂ اثر میں عالمگیر کی توسیع اشاعت کیلئے کوشش فرمائیں۔

(حافظ) **محمد عالم عفی عنہ** (مدیر عالمگیر)

سالومی

محفل نشاط کا ایک ہلاکت آفریں رقص

ہیرود نے آدمی بھیجکر یوحنا کو پکڑوایا اور اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیس کے سبب سے اسے قید خانے میں باندھ رکھا ہیرود نے اپنی بھائی کی بیوی سے بیاہ کیا تھا اور یوحنا نے اس سے کہا تھا کہ تجھے اپنی بھائی کی بیوی رکھنا روا نہیں پس ہیرودیس یوحنا سے دشمنی رکھتی اور چاہتی تھی کہ اسے قتل کرائے لیکن ایسا نہ ہو سکا اس واسطے کہ ہیرود یوحنا کو راست باز اور مقدس آدمی جان کر اس سے ڈرتا اور اسے بچائے رکھتا تھا اور اس کی باتیں سن کر حیران ہو جاتا تھا مگر سنتا خوشی سے تھا ایک دن جب ہیرود نے اپنی سالگرہ میں اپنے امیروں اور فوجی سرداروں اور گلیل کے رئیسوں کی ضیافت کی اور ہیرودیس کی بیٹی سالومی نے ناچ کر مہمانوں کا دل خوش کیا تو بادشاہ نے خوش ہو کر سالومی سے کہا "تو جو چاہے مانگ میں تجھے دونگا" اور اس نے باہر جا کر اپنی ماں سے کہا "میں کیا مانگوں؟" وہ بولی "یوحنا کا سر" چنانچہ اس نے اندر آکر بادشاہ سے کہا میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے یوحنا کا سر تھال میں منگوا دیں۔ بادشاہ غمگین ہوا لیکن اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب انکار نہ کر سکا پس اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا وہ جا کر قید خانہ سے یوحنا کا سر کاٹ لایا اور سالومی کو دیا۔ سالومی نے وہ سر اپنی ماں کو دیا۔ (انجیل)

فلسطین کی سرزمین جہاں ابھی چند دن قبل تک قتل اور غارتگری کا بازار گرم تھا دنیا کے قدیم ترین ملکوں میں سے ہے اور اس کے کھنڈروں، ریت کے تودوں۔ دریاؤں کی خشک اور گہری وادیوں اور پہاڑ کی چوٹیوں میں صدہا سال کی رومانی زندگی کے کتنی کہانیاں دفن ہیں، کتنے ذخیرے نظروں سے پوشیدہ ہیں، سالومی کی عبرتناک اور پُر از انتقام کہانی کھلیان کے ایک دانہ کی حیثیت رکھتی ہے آج کی صحبت میں ہم اس واقعہ پر تاریخی نقطہ نظر کی روشنی ڈالینگے۔

ہیرودیس کے شوہر ہیرود کا باپ فلسطین کی تاریخ میں اپنے بے پناہ مظالم کے لئے اتنا ہی مشہور ہے جتنا کہ چنگیز اور ہلاکو وسطی ایشیا کی تاریخ میں۔ اگر وہ زمانہ قبل از تاریخ میں پیدا ہوا ہوتا تو لوگ اسے قتل اور دہشت انگیزی کا دیوتا یا ستارہ تخریب کا ایک دنیاوی پرتو جان کر پوجنے لگتے۔ وہ ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہے اپنی قوت برقرار رکھنے اور اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے وہ ہر اس شخص کو بلا تخصیص و استثناء کے قتل اور برباد کر دیتا جس کے متعلق اسے یہ شبہ بھی ہوتا کہ وہ اس کی ترقی میں رکاوٹ ڈالے گا۔ خون کی محبت اور خاندانی تعلقات کو وہ خود ساختہ ڈھکوسلے سمجھا کرتا اور اس کی کتنی بیویاں، لڑکے اور بھائی اس کی اس قاتلانہ دیوانگی کے نذر ہوئے اور اس کی تیوری پر بل نہ آیا۔ اپنے بیٹوں کے کٹے ہوئے سروں کو دیکھ کر وہ اس طرح خوش ہوتا گویا وہ شیر کے سر ہیں۔ تاسف کے بجائے اس کا چہرہ فاتحانہ جذبے سے چمکنے لگتا تھا۔

ایک بار کسی نے پیشین گوئی کردی کہ بیت لحم کی سرزمین سے ایک لڑکا اٹھے گا جو اس کی جگہ بادشاہت کریگا۔ ہیرود اعظم نے اس اندیشے سے بیت لحم کے تمام لڑکوں کو قتل کرا دیا بستر مرگ پر پڑے پڑے اسے یہ خبر ملی کہ ولی عہد سلطنت نے ابھی سے شاہانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی موت سے ایک دن قبل حکم دیا کہ ولیعہد کو قتل کر دیا جائے۔

وہ کثیر الاولاد تھا لیکن جس وقت وہ مرا تو اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے صرف تین لڑکے زندہ بچے تھے۔ خون کی فضا میں رہتے رہتے ان کی

فطرتیں بھی باپ جیسی ہوگئی تھیں۔ ہیرود انٹی پس نے جسے گلیلی اور شرق پیرون کا علاقہ ورثہ میں ملا جنوب کی ہمسایہ ریاست پٹرا کے فرمانروا کی لڑکی سے شادی کی اس کے سوتیلے بھائی فلپ نے جو زیادہ تر روم میں رہتا تھا ہیرودیس سے جو اس کے سوتیلے بھائی کی بیٹی تھی شادی کی۔

یوحنا شورش پسند ایک بار ہیرود کو گلیلی سے روم جانے کا اتفاق ہوا وہاں وہ اپنے بھائی کی بیوی ہیرودیس کا گرویدہ ہوگیا۔ اس حقیقت کہ دونوں ـــــ ہیرود اور ہیرودیس شادی شدہ ہیں نظرانداز کردیا گیا۔ ہیرودیس نے اپنے شوہر کو چھوڑ کر ہیرود سے ناتا جوڑا اور اپنی سالومی کو لیکر ہیرود کے پاس چلی آئی۔

لیکن ان لوگوں کو زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ان کے دو دشمن انہیں ستانے لگے ـــ ایک تو پٹرا کا بادشاہ تھا جس کی بیٹی کو ہیرود نے طلاق دیدی تھی اور دوسرا یوحنا بپتسمہ دینے والا تھا۔

یوحنا بپتسمہ دینے والا فلسطین میں بہت مقبول تھا۔ کسانوں کی جماعتیں دیوانہ وار اس کے ساتھ چلتیں۔ وہ ان لوگوں سے کہا کرتا گھبراؤ نہیں ان ظلموں اور سفاکیوں کا عنقریب خاتمہ ہوجائیگا۔ ایک نیا عہد آنے والا ہے۔ ایک نئی حکومت قائم ہونے والی ہے اس وقت نہ ہیرود ہوگا نہ اس کے سپاہی ہونگے نہ اس کے محصولات ہونگے۔ آزادی اور مساوات کی سادہ زندگی ہوگی اور امن کا راج ہوگا۔ یوحنا کی تقریریں ہیرود کی حکومت کی بنیاد کھوکھلی کررہی تھیں اسے اندیشہ تھا۔ نہ جانے کب ایوان شاہی کے درودیوار کی اینٹ بج جائے۔

کوئی حکومت اپنے مخالف کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ یوحنا کی تقریروں کے مہلک نتائج پر غور کرتا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا۔ اگر یوحنا کے بقول کوئی نئی حکومت قائم ہوئی تو کیا ہیرود اس کا بادشاہ ہوگا؟ وہ اپنے دل سے سوال کرتا اور پھر خود ہی مایوس ہوکر اس کا جواب نفی میں دے لیتا۔ پھر جب شورش زیادہ بڑھنے لگی اور عوام حکومت سے زیادہ یوحنا کے معتقد ہونے لگے تو ہیرود نے "امن عامہ" اور "پبلک مفاد" کے پیش نظر یوحنا کو قید کردیا۔ قیدخانہ حکومت کی کمزوریوں اور ناکامیوں کا ایک افسوسناک ثبوت ہے۔

اصولوں کا تصادم ۔ ہیرود کو یوحنا سے ذاتی عناد نہ تھا اس نے اپنے سیاسی مفاد کی غرض سے یوحنا کو قید کیا تھا لیکن ہیرودیس یوحنا سے ذاتی طور پر نفرت کرتی تھی۔ یوحنا نے اس کی دکھتی ہوئی رگ پکڑی تھی۔

"تجھے اپنے بھائی کی بیوی رکھنا روا نہیں" وہ سوچتی اس فقرے میں کتنی نفرت، حقارت اور عداوت کی بو آتی ہے جب تک یہ شخص زندہ رہے گا میں اپنا ماضی نہیں بھول سکتی۔ میرا ضمیر مجھے ستانے سے باز نہیں آسکتا۔ پھر آخر یہ کیوں دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالتا ہے۔ جب وہ یوحنا کو بازاروں میں تقریر کرتے دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ دیکھو یہ عورت اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس شخص کے ساتھ چلی آئی جس سے اسے محبت تھی۔

یوحنا محبت کی زندگی سے بالکل ناآشنا تھا وہ اس آگ کی جلن اور آنچ کو محسوس نہ کرتا تھا، اس نے راہبوں کی سی زندگی گذاری تھی یہی وجہ تھی کہ اس میں دوسرے کے جذبات کا احساس یا احترام بالکل مفقود تھا ـــــ وہ زندگی کو چند اصولوں کا پابند سمجھتا تھا۔ وہ اس کی حقیقی نزاکتوں، پیچیدگیوں اور گہرائیوں سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کے مذہب میں عورت کا فرض اپنے شوہر کی اطاعت گزاری تھا چاہے وہ اس سے محبت کرے یا نہ کرے ـــ دنیا دو ہزار برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک محبت پر اطاعت کو ترجیح دیتی ہے، ہیرودیس کی اخلاقی جرأت یقیناً قابل احترام ہے۔

یوحنا اور ہیرودیس کا اختلاف دو اصولوں اور زاویوں کا اختلاف تھا۔ یوحنا شادی کو مقدس فرض اور عورت کو محکوم تصور کرتا تھا۔ یہی اس کی تمام تلقین کا سنگ بنیاد تھا۔ ہیرودیس شادی کو دوستی اور محبت کا ایک نازک رشتہ سمجھتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہیرود کے ساتھ چلی آئی تھی۔

سالومی ۔ مختصر یوں سمجھنا چاہئے کہ ہیرود اور ہیرودیس دونوں یوحنا سے تنگ آگئے تھے اور ایک دن یہ ہونا تھا کہ یا تو یوحنا کا قصہ پاک کردیا جاتا یا پھر یوحنا ان لوگوں کو ختم کردیتا۔

چنانچہ ۲۹ء کی ایک رات کو جبکہ ہیرودیس کا یوم سالگرہ منایا جارہا تھا وہ وقت آپہونچا جس کا عرصے سے انتظار تھا۔

ہیرود کا خسر پٹرا کا بادشاہ ہیرود سے انتقام لینے کا عہد کرچکا تھا اور وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ہیرود بھی دشمن کی ان تیاریوں سے بے خبر نہ تھا۔ چنانچہ یہ محسوس کرکے کہ بیرونی حملہ کے وقت اندرون ملک میں کسی قسم کی مخالف شورش کا بڑھنا روا نہیں اس نے یوحنا کو گرفتار کرا لیا تھا شورش کا انسداد کرچکنے کے بعد اس نے تمام جاگیرداروں، رئیسوں، سرداروں اور افسروں کو مشورہ اور امداد کی غرض سے مدعو کیا تھا۔ چنانچہ سالگرہ کے موقع

پر تقریباً دو سو آدمی شریک بزم تھے۔ لیکن اس جلسہ میں کوئی عورت موجود نہ تھی رومیوں کے رواج کے مطابق کھانے کی میزیں بچھی ہوئی ہیں اور انہوں نے نصف دائرہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے ہیں۔ لیکن شراب کا دور ابھی تک جاری ہے۔ بلانوشوں کی بن آئی ہے شاہی محفل خیام کا گھر بن گئی ہے ——— دفعتہً موسیقی کے تاروں کی رفتار زیادہ تیز ہوجاتی ہے ——— نغمے زیادہ بلند ہونے لگتے ہیں ——— ایک پردہ کو حرکت ہوتی ہے۔ اور ہیرود اعظم کی پوتی ہیرود فرمانروائے فلسطین کی سوتیلی لڑکی ——— سالومی ——— رقص کا لباس پہنے ہوئے محفل میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے نیم عریاں جسم کی تابانیاں شمع کو بھی شرما رہی ہیں۔

ارباب محفل نقش حیرت بنے ہوئے ہیں ——— ایک نیم عریاں شہزادی اور عام محفل میں ارادہ رقص ——— ؟ یہ کام تو مصری کنیزوں کے کرنے کے قابل تھا۔

تاریخ کے صفحات اس سوال کے جواب میں خاموش ہیں کہ سالومی نے آخر یہ طریقہ کیوں اختیار کیا ——— ؟ اسے اس غیر معمولی حرکت کی جرأت کیونکر ہوئی۔ کچھ لوگ قیاس کرتے ہیں وہ ہیرود کی سالگرہ کی دلفریبیوں میں اضافہ کرنا چاہتی تھی۔ شاید ہیرودیس نے سالومی کو مجبور کیا کہ وہ اس سفلہ پن کے ذریعہ ہیرود کی خوشنودی حاصل کرے اور ——— اس کے صلہ میں یوحنا سے سر مانگے۔ لیکن اگر یہ سارا انتظام کسی سازش کے تحت تھا ——— اور گمان غالب یہی ہے ——— تو پھر سازش کے مکمل ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا تھا۔

لیکن یہ خیال کرنا کہ سالومی اس سے قبل کہیں ناچی نہ تھی یا وہاں کی تہذیب میں یہ طریقہ معیوب سمجھا جاتا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا تھا جس بیدھڑک اور بے پناہ طریقہ سے اس نے رقص کے کرتب دکھائے اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے رقص کی عادی تھی اور یہ پہلا موقع نہ تھا کہ وہ جھجکتی اور وہ کمالات نہ دکھا سکتی جو اس نے وہاں دکھائے۔

رقاصہ کی حیثیت سے!

رقاصہ کی حیثیت سے سالومی ایک بلند درجہ رکھتی ہے ——— مے آلود فضا میں سالومی کا جذبات کو حرکت دینے والا رقص جس کی ہر ادا میں رباب کی آوازوں کی بھی آویزش تھی ہیرود کے دل و دماغ کو مسحور کرنے کے لئے کافی تھا مشرقی کہانیوں کا یہ خاص انداز ہے۔

ہیرود ہاتھ کے اشارے سے سالومی کو پاس بلاتا ہے اور کہتا ہے ——— مانگ لے جو کچھ تجھے مانگنا ہو ——— چاہے یہ میری آدھی سلطنت ہی کیوں نہ ہو وہ قسم کھالیتا ہے۔

ہیرودیس بخوبی جانتی تھی کہ اس رقص کا اثر یہی ہوگا۔ ہیرود جذبات سے مغلوب ہوکر یہی وعدہ کریگا۔ چنانچہ اس نے سالومی کو ہدایت کردی تھی کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو تو آن کر مجھ سے مشورہ کرے۔

سالومی محفل رقص سے ماں کے پاس آتی ہے اب ہیرودیس کو انتقام کا موقع ملا ہے وہ اس راہب کو جو اسے بدنام کرتا رہتا ہے اسکی زبان درازیوں کا مزہ چکھائیگی۔ وہ سوچتی ہے اس شخص نے میری زندگی کتنی تلخ کر رکھی تھی۔ آج ان تمام روحانی تکلیفوں کا خاتمہ ہوجائیگا۔ اس نے سالومی سے کہا۔ "جا ہیرود سے یوحنا کا سر مانگ لا"۔

سالومی بے نیازی کے ساتھ محفل میں داخل ہوتی ہے اور کہتی ہے "جہاں پناہ مجھے یوحنا کا سر ایک تھال میں منگا دیجئے"۔ بادشاہ بہت رنجیدہ ہوا لیکن اپنے وعدہ اور مہمانوں کے سبب انکار نہ کرسکا۔

اس حادثہ پر تنقید کرنے والے سیاست داں یہ نہیں تسلیم کرتے کہ ہیرود در اصل بہت رنجیدہ ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ بدی بات ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہیرود سالومی کے اس سوال پر بیحد خوش ہوا۔ یوحنا ہیرود کی حکومت کے لئے سب سے زیادہ خطرناک انسان تھا۔ تخت کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ صرف مہمانوں کے سبب اس نے افسوس اور رنج کا اظہار کیا۔

تاروں بھری رات میں جلاد رنگ محل سے روانہ ہوا اور اس تنگ و تاریک حجرہ میں داخل ہوا جہاں یوحنا قید تھا اس نے قیدی کو شاہی پیغام سنایا اور یوحنا کا سر جدا کیا اور اسے لیکر محل میں واپس آیا پھاٹک پر ایک سپاہی ایک طشت لئے کھڑا تھا جلاد نے طشت لاکر شاہی تخت کے روبرو رکھدیا۔ ساری محفل سونی پڑی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ لوگ اس سفاکانہ حادثہ کی تاب نہ لاکر محفل سے روانہ ہوچکے تھے فضا پر مردنی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

سالومی کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگتا ہے لیکن ماں کی اطاعت کا خیال اسے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں خونی طشت اٹھالینے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ یوحنا کا سر ماں کے قدموں پر لاکر ڈال دیتی ہے اب یوحنا اس کی توہین کبھی نہ کریگا۔ سالومی کی تاریخ کا باب اس دردناک حادثہ کی تکمیل کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتا ہے اور دنیا کا کوئی ادیب نہ بتاسکا کہ سالومی پر اس کے بعد کیا گذری؟ کیا یہ قتل آفریں رقص اس کی زندگی کا پہلا اور آخری یادگار

اُردو زبان کے شہرۂ آفاق رسالہ "عالمگیر" لاہور کا بے نظیر

خاص نمبر ۱۹۳۷ء

گرانقدر علمی و ادبی مضامین، بادہ نواز تصاویر، دلگداز افسانوں اور کیف بار نظموں کا قابل دید مجموعہ

ہندوستان کے بہترین ادبا و شعرا کی نگارشات کا حسین ترین مرقع

۱۹۳۷ء کے تمام سالناموں سے ہر لحاظ سے بہتر ہے

اگر آپ اسے بالکل **مفت** حاصل کرنا چاہتے ہیں تو

فوراً ایک سال کے لئے فرمائش خریداری بھیجکر اسی خاص نمبر سے خریداری قبول فرما لیجئے اس صورت میں اس خاص نمبر کے علاوہ جون ۱۹۳۷ء میں شائع ہونے والا قابل دید سالانہ نمبر بھی مفت ملیگا۔ خاص نمبر ۱۹۳۷ء جہازی سائز کے دو سو صفحات سے زیادہ ضخامت پر شائع ہو چکا ہے۔ سال بھر کی قیمت صرف چار روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک ہے۔ فرمائش خریداری آج ہی روانہ فرمائیے

نیازمند: مینیجر عالمگیر، لاہور

ضروری اطلاع

عالمگیر بارہ تیرہ سال سے نہایت آب و تاب اور پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے آج تک اسکی ایک اشاعت بھی کبھی ناغہ نہیں ہوئی ہر سال اس کے سالانہ خریداروں کی خدمت میں دو ایسے بلند پایہ خاص نمبر (ایک دسمبر اور دوسرا جون میں) پیش کئے جاتے ہیں جو صحیح معنوں میں خاص نمبر ہوتے ہیں۔ مینیجر

جذباتِ عالیہ

حضرت دلؔ شاہجہانپوری

اگر کچھ نالۂ شبگیر کا ظاہر اثر ہوتا — مری اُمید کی دنیا میں آغازِ سحر ہوتا

کوئی گھائل اِدھر ہوتا کوئی بسمل اُدھر ہوتا — نگہ جب دل کو تڑپاتی تو پہلو میں جگر ہوتا

مرا مٹنا نمودِ عشق تھا اے خاک کے ذرو — اگر رودادِ بربادی سے کوئی باخبر ہوتا

حقیقت میں وہی ساعت سکونِ دل کی ساعت تھی — مری بالیں پہ جب مایوس کوششِ چارہ گر ہوتا

دلِ ناکام مٹ کر بھی رہا محرومِ پامالی — اسے برباد ہونا تھا تو خاکِ رہ گزر ہوتا

مرے چاکِ گریباں نے تو اک دنیا بدل ڈالی — قیامت در قیامت تھی جو نالہ با اثر ہوتا

حجابِ ناز میں کب تک رہینگے حسن کے جلوے — تقاضائے تمنا ہے کوئی اب پردہ در ہوتا

فضائے دہر میں بے نور ذرے جگمگا اُٹھتے — کوئی خلوت نشیں آج اس ادا سے جلوہ گر ہوتا

مری اک آہ رودادِ دلِ ناکام باقی ہے — بیانِ عشق ہوتا اور اتنا مختصر ہوتا

وہاں اب ہوں جہاں اس آرزو سے دل ہی بیگانہ — مری دنیا میں کیا اندازۂ شام و سحر ہوتا

تمنا ہے ادا ہوں یوں نیازِ عشق کے سجدے — جبیں اپنی اُدھر جھکتی کسی کا رخ جدھر ہوتا

تری اس ذہنیت سے میکدہ بے نور ہے زاہد — سمجھتا مشربِ ساقی تو فردوسِ نظر ہوتا

مقدر کاش لے جاتا مجھے اس بزمِ دلکش تک

کبھی نذرِ ادا اے دلؔ کبھی صرفِ نظر ہوتا

ماہی گیر کی بیوی

مشہور فرانسیسی افسانہ نگار وکٹر ہیوگو کا ایک بہترین افسانہ کا ترجمہ

از جناب عبدالشکور صاحب پیلی بھیتی

(۱)

رات سرد، تاریک اور طوفانی تھی۔ جھونپڑا اگرچہ باہر سے خراب و شکستہ معلوم ہوتا تھا مگر اندر سے آرام دہ اور گرم تھا۔ آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں کی مدھم روشنی میں ہر شے سیاہی مائل سرخ نظر آ رہی تھی۔ ماہی گیر کے جال دیوار میں لٹک رہے تھے۔ چند برتن ایک کونے میں رکھی ہوئی ٹوٹی پھوٹی الماری میں پڑے تھے۔ قریب ہی ایک لمبا پلنگ جو دو تپائیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا پڑا تھا جس پر پیال بستر کے بجائے بچھا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف موٹے موٹے پردے لٹک رہے تھے۔ پیال کے بستر پر پانچ بچے ایک دوسرے کو لپٹے اس طرح پڑے تھے جس طرح چڑیا کے گھونسلے میں اس کے بچے اور اس پلنگ کے نزدیک اپنی پیشانی کو پٹی سے لگائے بچوں کی ماں بیٹھی تھی۔ وہ اکیلی تھی جھونپڑے کے باہر ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے پانی برس رہا تھا اور سمندر میں زبردست طوفان آیا ہوا تھا۔ ساحل کی پتھریلی چٹانوں پر سمندر کی لہروں کے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس طوفانی رات میں ماہی گیر مچھلیوں کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔

ماہی گیری بچپن ہی سے اس کا پیشہ تھا اب تک اس کی زندگی سمندر سے جنگ میں ہی گذری تھی اس کو ہر روز اپنی بیوی بچوں کو زندہ رکھنے کیلئے شکار کو جانا پڑتا تھا اور شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جو موسم خوشگوار رہتا ہو ورنہ اس کو ہر روز سمندر کی ظالم لہروں اور تھپیڑوں سے آمادہ پیکار رہنا پڑتا تھا۔ جب ماہی گیر اپنی چار بادبانوں والی کشتی میں سمندر کے درمیان مچھلیوں کی تلاش میں ہوتا تو اس کی بیوی پرانے بادبانوں میں پیوند لگاتی جال درست کرتی یا چولھے کے قریب بیٹھی مچھلی کے شوربے کا قوام دیکھتی رہتی جب پانچوں بچے سو جاتے تو وہ جاگتی رہتی اور اپنے خاوند کیلئے جو اس وقت تاریکی اور ظالم لہروں کے درمیان ہوتا خدا سے سلامتی کی دعا کرتی اور یقیناً ماہی گیر کو اس وقت ان دعاؤں کی سخت ضرورت ہوتی تھی کیونکہ شکار کی حالت میں وہ سخت خطرے میں ہوتا تھا۔ وہ خاص جگہ جہاں مچھلیوں کی افراط تھی اس کے جھونپڑے سے طول و عرض میں دوگنی تھی اور چاروں طرف سے نکیلی اور خطرناک چٹانوں میں گھری ہوئی تھی۔

اس جگہ کو تاریکی اور کہر۔ سرد رات میں جبکہ ہوا کے تھپیڑے اور سمندر کی کوہ پیکر لہریں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوں تلاش کرنا آسان کام نہ تھا وہ تو یہ شکر تھا کہ اس کو ہوا اور لہروں سے خوب واقفیت تھی ورنہ نہ معلوم کب کا وہ سمندر کی تہ میں پہنچ گیا ہوتا اور جب جبکہ جھونپڑے میں تنہا رہ کر خدا سے اس کی سلامتی کیلئے دعائیں مانگ رہی ہوتی تو ماہی گیر بھی سمندر کے اس خونی اور خطرناک قطعہ میں جہاں موت ہر وقت اپنے خوفناک جبڑے کھولے کھڑی ہوتی جہاں سمندر کی خونخوار اور ظالم لہریں اس کی مخالفت میں اپنی پوری قوت صرف کرتی نظر آتیں۔ جہاں تاریکی اتنی مہیب ہوتی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا اور جب سمندر کی لہروں میں بادبان کا مستول اور کشتی کی لکڑیاں اس طرح چرچراتیں گویا وہ ٹوٹ رہی ہوں۔ اس وقت شکار کی حالت میں وہ اپنی بیوی ہی کو یاد کرتا ہوتا۔

وہ اس وقت بھی اپنے خاوند کے لئے دعا مانگ رہی تھی۔ سمندر کی لہروں اور تھپیڑوں کی آواز سے وہ کانپ رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کو اپنی

غربت۔ عسرت۔ تنگدستی اور بیچارگی کا خیال آتا۔ اگر ان کے پاس جاڑوں کو اطمینان سے گذارنے کے لئے سرمایہ ہوتا تو اس کا خاوند اپنی بیوی اور بچوں [illegible] طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر کیوں موت کے منہ میں جاتا [illegible] بچوں کے پاس جوتے تک نہ ہوتے۔ گیہوں کا آٹا ان کو کبھی نصیب نہ ہوتا صرف جو کی روٹیاں ہی ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھیں اور یہ جو کی روٹیاں بھی آسانی سے حاصل نہ ہوتی تھیں اے خدا!

اور اس رات تو طوفان اور بھی زیادہ سخت تھا۔ بعض وقت ایسا معلوم ہوتا کہ طوفان باد اس جھونپڑی کو جس میں ایک ماں اور پانچ بچے بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے گرا کر رہے گا۔ ماہی گیر کی بیوی پڑی رو رہی تھی [illegible] باپ۔ بھائی۔ عزیز و اقارب ایسے طوفانی [illegible] ہوں کہ جینی کی حالت تو اور بھی قابل رحم تھی [illegible] کوئی بھائی نہ اس کا کوئی عزیز ہی تھا۔ اس دنیا میں اگر [illegible] کوئی تھا تو وہ اس کا خاوند اور وہ اس وقت نہ معلوم سمندر میں کس طرف اور کس حالت میں بے یار و مددگار اکیلا تھا اس کے بچے بھی اس قابل نہ تھے کہ اس کی مدد کر سکیں۔ غریب ماں! اس وقت وہ کہتی ہے۔ کاش میرے بچے [illegible] بڑے ہوتے کہ وہ اپنے باپ کی مدد کر سکتے" مگر جس وقت وہ اس قابل ہو جائینگے تو یہی ماں یہ کہیگی "کاش میرے بچے بچے ہی رہتے۔"

جینی نے ایک ہاتھ سے لبادہ لیا اور دوسرے میں لالٹین اٹھائی "اس کے آنے کا یہی وقت ہے دیکھوں شاید وہ آ رہا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ خطرہ کے مینار پر روشنی نہ ہو رہی ہو" کہہ کر وہ باہر نکلی۔ تاریکی کے باعث کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ ہاں افق پر سفیدی کی ایک لکیر سی کھینچی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ موسلا دھار پانی برس رہا تھا اور سردی اپنے شباب پر تھی۔ ہوا کے جھونکے سینے کو چیرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایک مہیب سکوت چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ کسی جھونپڑی سے روشنی نہ نکل رہی تھی۔ جب وہ اپنے چاروں طرف جھونپڑیوں پر ایک نگاہ ڈال رہی تھی اس کی نظر ایک شکستہ جھونپڑے پر پڑی جو غالباً اب تک۔ اس لئے کھڑا رہ گیا تھا کہ یہ طے نہ کر سکا تھا کہ کس طرف [illegible] مشکل سے زیادہ دیر تک چھت کے بوجھ کو برداشت [illegible]

"یہ تو اس بیمار بیوہ کا جھونپڑا ہے جسے میں [illegible] دیکھنے گیا تھا اُف دیکھتی چلوں کہ وہ اب کیسی ہے؟"

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ جینی دروازہ پر کھڑی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ "وہ بیمار ہے۔ اس کے دو بچے ہیں وہ بہت غریب ہے۔ خدا نے اس کے خاوند کو بھی اس سے چھین لیا۔ اب سوائے خدا کے اس کا مددگار کون ہے؟"

اس نے دوبارہ دستک دی اور چلائی "پڑوسن! پڑوسن! مگر پھر بھی اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔" مجھے اپنی پڑوسن کے سکون پر رشک آتا ہے باوجود اتنی پریشانیوں کے وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ ٹھیک اسی لمحہ دروازہ ہوا کے جھونکے سے خودبخود کھل گیا۔ جینی جھونپڑے میں داخل ہو گئی اس کی لالٹین نے کمرہ کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ جھونپڑی کی چھت سے پرنالہ چل رہا ہے۔ کمرہ کے ایک طرف ایک عورت بستر پر ہنر پڑی تھی جل کی آنکھیں بے نور او جسم غیر متحرک تھا۔ اس کے جسم پر چادر تک نہ تھی ایک ہاتھ اس کا زمین پر پھیلا ہوا تھا اور دوسرا پیال کے ایک ڈھیر پر۔ وہ مر چکی تھی۔ کسی زمانہ میں وہ ایک تندرست اور زندہ دل عورت تھی مگر اس وقت جبکہ غریبی اور عسرت نے اس کے جسم سے ایک ایک بوٹی نوچ لی تھی وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا معلوم ہو رہی تھی۔

قریب ہی پیال کے بستر پر دو بچے ——— ایک لڑکا اور ایک لڑکی ——— میٹھی نیند سو رہے تھے۔ ان کے چہرہ پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ان کی ماں نے مرتے وقت ان کو اپنے لبادہ میں لپیٹ دیا تھا جبکہ وہ سردی میں اکڑی ہوئی دم توڑ رہی تھی ——— اس کو اطمینان تھا کہ اس کے بچے سردی سے محفوظ ہیں۔

آہ! وہ دونوں بچے دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف۔ دنیا کے سرد و گرم سے بیخبر۔ دنیا کی تکالیف سے ناآشنا۔ اپنی ماں کی بیچارگی سے لاعلم کتنی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ جھونپڑی کے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی اور سمندر سے نکلی ہوئی ہوائیں اور ان کی آوازیں اتنی مہیب تھیں جتنی خطرہ کی گھنٹیوں کی صدائیں۔ پھوس کی خستہ چھت سے ایک قطرہ ٹپک کر بکیس ماں کے چہرہ پر گرا اور ایک آنسو کی طرح چہرہ سے ڈھلک کر زمین پر گر پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بچوں کی ماں مرنے کے بعد بھی اپنی مجبوری اور اپنے بچوں کی تنہائی اور بیچارگی پر آنسو بہا رہی ہے۔

(۲)

ہائیں! یہ جینی غریب بیوہ کے جھونپڑے میں اتنی دیر تک کیا کر رہی تھی وہ اپنے لبادہ میں کیا چیز چھپائے لئے جا رہی تھی۔ اس کا دل اتنے زور زور سے کیوں دھڑک رہا ہے؟ وہ اتنی تیزی سے کیوں جا رہی تھی کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا؟ ہائیں! یہ اس نے پردوں کے پیچھے بستر میں کیا چیز چھپا دی؟ وہ غریب بیوہ کے جھونپڑے سے کیا چیز چرا کر لائی؟

جس وقت جینی اپنے جھونپڑے میں داخل ہوئی چٹانوں پر سفید سی دھند چھا رہی تھی۔ رات ختم ہو چکی تھی اور صبح نمودار ہو رہی تھی۔ اگرچہ بارش ہلکی ہو گئی تھی مگر ہوا کے زور میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی تھی بلکہ اور زیادہ سرد ہو گئی تھی۔ جینی بستر کے قریب ایک کرسی پر اوندھی گر پڑی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بات پر پچھتا رہی ہے اس نے اپنا سر دو تکیوں کے درمیان چھپا لیا اور اس کے منہ سے رک رک کر غیر مسلسل اور بے ربط جملے نکل رہے تھے۔

"آہ! میرا غریب خاوند! وہ کیا کہے گا؟ وہ کیا پہلے ہی کچھ کم پریشان ہے جینی یہ تو نے کیا کیا۔ پانچ بچے پہلے ہی سے ہمارے پاس ہیں۔ ان کا باپ بچوں کے لئے کماتا کماتا مرا جاتا ہے۔ ان بچوں ہی کی پرورش اس کے لئے کیا کچھ کم تکلیف دہ تھی جو تو نے ان میں دو کا اور اضافہ کر دیا۔ کیا وہ آ گیا؟ نہیں۔ خدا کرے وہ ابھی نہ آئے۔ میں ذرا سوچ لوں کیا میں ان بچوں کو وہیں رکھ آؤں؟ بیچارے [illegible] مر جائیں گے بھوکوں مر جائیں گے کسی کو خبر تک نہ ہو گی۔ یہ دروازہ کیسا کھلا؟ کیا وہ آ گیا؟ —— اے خدا! —— آخر مجھے آج اتنا ڈر کیوں معلوم ہو رہا ہے؟"

اس کے بعد وہ اپنے خیالات میں گم ہو گئی۔ اتنی گم کہ اس کو آبی چڑیوں کی مہیب آوازیں بھی جو صبح ہونے کا اعلان کر رہی تھیں نہ سنائی دے رہی تھیں وہ کرسی پر اوندھی پڑی کانپ رہی تھی۔

ایکدم دروازہ کھلا۔ صبح کی سپیدی ایک لکیر کی صورت میں کمرہ میں داخل ہوئی اور ماہی گیر بھیگے ہوئے جال کو جس میں سے پانی ٹپک رہا تھا، گھسیٹتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ایک تمسخر آمیز ہنسی سے بولا۔

"جینی لو! تمہارے جہاز کا کپتان موجود ہے!"

"تم آ گئے!" جینی چونک کر اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔

"ہاں میں آ گیا" اس نے آتشدان کی طرف اپنا تند اور صابر چہرہ جو جینی کو بہت پیارا معلوم ہوتا تھا پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیوں! آج کا موسم کیسا تھا؟"

"بہت وحشتناک اور مہیب"

"اور شکار؟"

"بالکل نہیں! مگر اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے میرے لئے کیا یہ کم ہے کہ میں واپس آ گیا اور تمہارے پاس ہوں"

"اور بس"

"آج شکار میں ایک مچھلی بھی نہ ملی۔ ایسا معلوم ہوتا [illegible] کا قبضہ ہے ایک مرتبہ تو میں اپنی زندگی ہی سے مایوس ہو گیا تھا۔ کیا بتاؤں ایسا معلوم ہوا کہ گویا کشتی کے تختے ٹوٹ رہے ہیں اور کشتی ڈوبی جا رہی ہے۔ مگر تم اس اثنا میں کیا کرتی رہیں؟"

"میں حسب معمول سیتی پروتی رہی" اسکی آواز میں لغزش تھی۔ "مگر نہ معلوم کیوں مجھ پر آج خوف کا غلبہ زیادہ تھا —— آج سمندر بھی تو بہت طوفانی تھا"

"جاڑوں کا موسم تو ہمارے لئے ہمیشہ ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

"ہماری پڑوسن کا آج رات انتقال ہو گیا" جینی نے اس طرح کانپتے ہوئے کہا جس طرح مجرم اقبال جرم کے وقت کانپتا ہے "اس [illegible] چھوڑے ہیں۔ لڑکا گھٹنوں چل سکتا ہے اور لڑکی مشکل سے بول سکتی ہے غریب نے بڑی بیکسی میں جان دی۔ مرنے کے بعد بھی اس کا [illegible] دونوں [illegible] پناہ میں لئے ہوئے تھا۔"

ماہی گیر کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا بھیگی ہوئی ٹوپی [illegible] اتار کر ایک کونے میں پھینک دی اور سر کھجلاتے ہوئے بولا [illegible] ہیں۔ ہمارے پاس پہلے ہی سے پانچ بچے ہیں جن کی پرورش و پرداخت ہمارے لئے آسان نہیں۔ اب ان کی تعداد سات ہو جائی [illegible] ہم کو ویسے ہی فاقے کرنے پڑتے ہیں۔ اے خدا! اب ہم کیا کرینگے۔ مگر یہ میرا قصور نہیں! یہ خدا کا کرنا ہے۔ مجھے یقیناً سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن آخر خدا نے اس برے وقت میں ان بچوں سے ان کی ماں کو کیوں چھین لیا؟ ان باتوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل بیکار ہوتی ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فرموداتِ ناطق

حضرت ناطق لکھنوی

یہ دل نہیں نور کا ہے شعلہ، کسی کو اِس سے ضرر نہیں ہے
مثالِ برق و شرر ہے لیکن، مزاجِ برق و شرر نہیں ہے

حجاب ہے اک مشاہدہ بھی، وہ رُوبرو ہے مگر نہیں ہے
نقاب ہے ایک اس کے رُخ کی، نظر ہماری نظر نہیں ہے

ہے رُوکشِ آفتاب ذرّہ، بغیر پردہ بلا وسیلہ
وہاں لگائی ہے آنکھ دل نے، جہاں مجالِ نظر نہیں ہے

اذاں ہو، ناقوس یا جرس ہو، مؤثر اپنی جگہ پہ سب ہیں
مگر جہاں میں پہونچ گیا ہوں، وہاں کسی کا اثر نہیں ہے

جو دیکھنے والے دیکھتے ہیں، وہ سننے والوں کو کیا بتائیں
نظر کو ذوقِ زباں نہیں ہے، زباں کو ذوقِ نظر نہیں ہے

جو ضبط کر لی تھیں خاص باتیں، ہوئیں وہ تحلیل جذبِ دل میں
غرض کہ جو راز کی تھیں باتیں، ہمیں اب اُن کی خبر نہیں ہے

وہ نیچی نظریں تھیں دل کی طالب، وفا نے گو جان نذر کر دی
مگر اثر جو سوال میں تھا، جواب میں وہ اثر نہیں ہے

حرم سے نکلے تلاشِ بُت میں، بتوں سے یادِ خدا پہ بگڑی
غرض ہم آوارۂ وفا ہیں، کہیں ہمارا گذر نہیں ہے

سخن مرا کیفِ دل ہے ناطق، وہی کرے قدر جو ہو عاشق
نہیں ہے یہ فلسفہ کتابی، یہ اکتسابی ہنر نہیں ہے

عربی شاعری

عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں

از مسٹر مستجاب احمد انصاری فاضل ادب

اسلام سے قبل عرب جہالت کدہ بنا ہوا تھا۔ ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی برائیوں کے علاوہ علمی حالت بھی اس قدر ابتر تھی کہ خاص حجاز میں تو پڑھے لکھوں کی تعداد دہائیوں سے گذر کر سیکڑوں تک بھی نہیں پہونچتی تھی۔ مگر یہی وہ زمانہ تھا جب عربی شاعری اپنے پورے شباب پر تھی۔ اسی دور میں وہ سات مشہور قصائد لکھے گئے تھے جن کی نظیر آج تک پیش نہیں کی جاسکی۔ اسلام آیا تو اس نے اور خرابیوں کی اصلاح کے ساتھ تعلیمی حالت سدھارنے کی بھی پوری کوشش کی یہاں تک کہ ایک قلیل عرصہ میں پڑھے لکھے آدمیوں کی تعداد میں معقول اضافہ ہوگیا۔ نئے نئے علوم و فنون کی بنیاد رکھی گئی اور وہی جاہل عرب جو جہالت وضلالت کے عمیق ترین غاروں میں گرے ہوئے تھے علم و فضل اور رشد وہدایت کے آسمان پر چاند اور سورج ہوکر چمکے۔ مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ عربی شاعری کی ترقی یکایک رک گئی اول تو عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں سرے کلام میں کچھ اضافہ ہی نہیں ہوا اور اگر کچھ ہوا بھی تو معمولی درجہ کا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام جو سرچشمہ علوم ہے شاعری کی راہ میں کیوں سنگ گراں ثابت ہوا۔ کیا شاعری اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور کیا اسلام نے اس کو تباہ کرنے یا کمزور کرنے کی واقعی کوئی کوشش کی۔

بات اصل یہ ہے کہ شعر و شاعری فرصت کے قصے ہیں اور مسلمانوں کے پاس اس وقت اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ «بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے» انھوں نے خدا کی یکتائی کا اعتراف کرکے سارے جہان کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ جان مال، عزت، آبرو ہر چیز خطرے میں رہتی تھی۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑے اور کفار کے نت نئے مظالم و مصائب [illegible]

کی سوجھتی۔ ذرا اطمینان نصیب بھی ہوا تو اسلام کی نشر و اشاعت سب سے بڑا کام تھا۔ اب دھن تھی تو یہی کہ جس طرح ہو اللہ کا نام دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ جائے۔

جناب رسالتمآب کی وفات کے بعد قرآن و حدیث کی حفاظت اور مسائل فقہیہ کا استخراج و استنباط وقت کی پہلی ضرورت تھی۔ ذہین اور تعلیم یافتہ اکابر صحابہ اس طرف متوجہ ہوئے۔ عالموں نے وعظ و تلقین اور درس و ہدایت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ یہی وہ لوگ تھے کہ اگر شاعری کی طرف ذرا توجہ کرتے تو اپنی مصفی و مجلا طبیعتوں اور ذہن رسا کی بدولت اسے کہیں سے کہیں پہونچا کر چھوڑتے مگر جب ان کے سامنے اس سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری کام موجود تھے تو اس کار بے کاراں کی کہاں پوچھ ہوتی لہذا قدرتی طور پر شاعری کا انحطاط شروع ہوگیا۔

اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی نہایت سادہ تھی وہ عام طور پر چھوٹے بڑے گروہوں اور قبیلوں میں منقسم ہوکر رہا کرتے تھے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں چارہ پانی ملا وہیں ڈیرے ڈالدیئے۔ مویشی چرانا اور لوٹ مار غارتگری ان کا پیشہ تھا۔ ان میں نہ کوئی باقاعدہ حکومت تھی اور نہ کوئی نظم و نسق۔ اسلام نے مدنیت حضارت اور تہذیب و تمدن کی بنیاد قائم کی تدبیر منزل اور سیاست مدنی کے قاعدے سکھلائے گلہ بانوں کو جہاں بانی کا درجہ بخشا۔ غرضیکہ دیکھتے دیکھتے عرب کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی۔ وہ اپنے پرانے مشاغل کو چھوڑ کر معلمان عالم کے فرائض بجالانے لگے۔ تسخیر ممالک اور انتظام سلطنت ان کے پیشے

[redacted]

اس کے علاوہ وہ اسباب باقی نہ رہے جن کی بدولت جاہلیت کے دور میں شاعری چمکی تھی۔ ان دنوں قبائل عرب میں مفاخرت و مباہات کا بازار گرم رہتا تھا۔ ہر قبیلہ کو اپنے حسب و نسب پر غرور تھا اور اپنے سامنے دوسروں کو ہیچ سمجھتا تھا۔ شعرا بھی اسی میدان میں زبان کے جوہر دکھاتے تھے اپنے اور اپنے قبیلہ کے محامد و مفاخر کا اشتہار اور غیروں کی ہجو گوئی ان کا شیوہ تھا۔ اکثر آپس میں جدال و قتال کے ہنگامے گرم ہوتے تھے اور رجزیہ اشعار کے ذریعہ اپنے اپنے ہوا خواہوں کی ہمتیں بڑھائی جاتی تھیں جنگ کے ختم پر فاتح قبیلہ اپنی بہادری کے کارنامے بیان کرتا اور شکست خوردہ اپنے مقتولوں پر روتا اور بدلہ لینے کیلئے اپنے طرفداروں کو اکساتا تھا۔ مذہب اسلام جو دنیا میں اخوت و مساوات کا سب سے بڑا علمبردار ہے ان بیہودگیوں کو کب گوارہ کر سکتا تھا۔ قرآن مجید نے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کہہ کر سارے نسبی فخر و مباہات کا یک لخت خاتمہ کر دیا سرورکائنات (روحی فداہ) نے اور زیادہ صاف الفاظ میں تشریح فرما دی، ان اللہ قد اذھب عنکم حمیۃ الجاھلیۃ و فخرھا بالاباء اور آگے چل کر ارشاد ہے الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب (مشکوٰۃ) اس طرح اس وقت کی عربی شاعری کا موضوع ختم ہو گیا۔ ساتھ ہی قبائل کی خانہ جنگیوں اور ہجو گوئی کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ ان بابرکت احکام نے گو ایک بڑی لعنت دور کر کے عرب کی ترقی و خوشحالی کے دروازے کھولدیئے مگر شاعری کی بنیادیں خود بخود کھوکھلی ہو گئیں۔

ایک اور چیز جس نے ایام جاہلیت میں شاعری کو ترقی دی تھی وہ فصاحت و بلاغت کا مقابلہ تھا۔ ہر شاعر ایک دوسرے سے بڑھ کر کہنے کی کوشش کرتا تھا جگہ جگہ میلے لگتے اور مشاعرے ہوتے تھے اور اچھے برے کا فیصلہ کیا جاتا تھا چونکہ ذوق سخن سارے ملک میں سرایت کئے ہوئے تھا اچھے اشعار چشم زدن میں بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور شاعر کو قبول عام کی سند مل جاتی تھی۔ مگر قرآن شریف کے نازل ہوتے ہی ان مقابلہ کرنے والوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔ قرآن شریف نے فصاحت و بلاغت کا ایسا معیار پیش کر دیا جہاں کسی کی رسائی ممکن نہ تھی شعرا اپنی شاعری بھول بیٹھے اور قرآنی لطافت و حلاوت کے مزے میں بیخود ہو کر رہ گئے۔ حضرت لبیدؓ جاہلیت کے بہت ممتاز شاعر تھے توفیق الٰہی مسلمان ہوئے تو شاعری ترک کر دی۔ زمانہ اسلام میں کافی عمر پائی مگر با اختلاف روایت صرف ایک

اور کہا کہ اشعار کے بدلے خدا نے مجھے یہ عنایت کر دیا ہے۔

اس کے بعد شاعری میں اگر کوئی اور اہم چیز تھی تو وہ رندی و مستی کے مضامین تھے مگر اب طبیعتوں کا رنگ ہی بدل چکا تھا۔ عیاشی و ہوسناکی کے بجائے زہد و تقویٰ کا دور دورہ تھا وہ مقدس اور پاک بزرگ گندی چیزوں کے تذکرے سے اپنی زبانوں کو آلودہ کرنا عیب سمجھتے تھے ان حالات میں شاعری پنپتی تو کیونکر؟

مے و معشوق کو بھی جذبات شعری کے برانگیختہ کرنے میں ایک خصوصیت حاصل ہے شراب پینے سے طبیعت میں روانی و جولانی پیدا ہوتی ہے اور حالت سرور میں نہایت بامزہ شعر نکلتے ہیں طبیعت کی رکاوٹ اور انقباض دور کرنے کا نشہ کے استعمال سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر باکمال شعرا نشیات کے عادی رہے ہیں اسی طرح عاشق بھی کامیاب شاعر ہو سکتا ہے وہ خود تجربہ کار ہونے کی وجہ سے معاملات عشق بہت خوبی سے نظم کر سکتا ہے اس کے کلام میں نری نقالی نہیں بلکہ اصلیت ہوتی ہے دوسرے جگ بیتی کہتے ہیں وہ آپ بیتی کہتا ہے عشق سے جذبات لطیف کو تحریک ہوتی ہے طبیعت میں سوز و گداز پیدا ہو کر کلام درد و اثر سے پر ہو جاتا ہے مگر جو سرنشۂ دینی سے مخمور ہو اسے کسی دوسرے نشہ سے کیا سروکار اور جو دل حب الٰہی سے معمور ہو وہاں غیر کا کہاں گذر؟

اس سلسلہ میں ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ خدا نے اپنے پاک کلام میں شاعری کو اپنے نبی کی شان اقدس کے نامناسب بتایا تھا تو وہ شمع محمدی کے پروانے جو اخلاق اور عبادات ہی میں نہیں بلکہ عادات میں اس ذات بابرکات کا اتباع اپنے لئے سعادت کونین اور ذخیرۂ دارین سمجھتے تھے اس جھمیلے میں کیوں پھنستے۔

مگر ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ شاعری مٹ گئی۔ یہ تو انسان کے ساتھ ساتھ ہے۔ وحشت اور تہذیب کے ہر دور میں، ہر ملک اور ہر قوم میں شاعر پیدا ہوئے ہیں اسلام کی آمد پر شاعری کی ترقی رک ضرور گئی مگر اسلام نے شاعری کی جڑ کاٹنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی اور کرتا بھی کیوں شاعری ایک فطری چیز ہے اور اسلام فطرت کے عین مطابق۔ حضور رسالتمآب صلعم تو حضرت حسان کا ممبر خود باہتمام مسجد نبوی میں بچھواتے تھے تاکہ وہ اس پر چڑھ کر کفار کے حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب اشعار میں دیں خلفاء اربعہ چاروں شاعر تھے جن میں حضرت علیؓ سب سے بڑھ چڑھ کر آپ کا دیوان موجود ہے گو کہا جاتا ہے کہ اس کا معتدبہ حصہ الحاقی ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے صحابہ (رضوان اللہ علیہم) سے اشعار مروی ہیں۔ صحابیات میں جناب خنساء بہترین شاعرہ

عربی شاعری

عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں

از مسٹر مستجاب احمد انصاری فاضل ادب

اسلام سے قبل عرب جہالت کدہ بنا ہوا تھا۔ ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی برائیوں ... کی سوجھتی۔ ...
کے علاوہ علمی حالت بھی اس قدر ابتر تھی کہ خام ...

[illegible]

اے طالب حقیقت کچھ اجتہاد بھی کر

[illegible]

تقدیر کی نوازش تدبیر کا مقدر
میں بےخبر نہیں ہوں ایثار چارہ گر سے

میں جانتا ہوں راز حسن بیان و معنی
شکوہ نہیں ہے مجھکو نقاد خوش نظر سے

اے راز اب تو اٹھیے چلیے وطن کی جانب

...بی بی اے...

...ف امتحانات میں بیٹھا اور پی سی ایس

...یابی کی خبر کو مشتہر ہونا تھا کہ بے شمار اپنے پیام آنا شروع

...سامنے... جمیل کے لئے انتخاب ایک مسئلہ لاینحل بن کر رہ گیا۔

...ایک لڑکی کو منتخب کیا اور تقرری کے دو ماہ بعد شادی

...گئی۔ ایک ماہ کی چھٹی لیکر شادی کی تاریخ سے ایک ہفتہ قبل

...گیا۔ لڑکی خوبصورت تھی اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ

...جو سنتا یہی کہتا کہ لڑکی واقعی ایک ڈپٹی کلکٹر کے قابل

...بھی نیک اور باحیا ہے۔ جمیل کو بھی یقین تھا کہ

...گی۔

...کے لئے روانہ ہوا تو اچانک اس کے دل میں

...ہو گیا۔

...ات اپنی پوری رفتار سے جاری تھے۔ دن کو مرد

...کی عورتیں نوشاہ کو دیکھنے آئیں۔ ڈھول پر اس کے بنرے گائے

...تے۔ ہم عمر لڑکیاں اس سے مذاق کرتیں اور وہ شرما شرما کر سر اور آنکھوں کو

...انداز میں جھکا جھکا کر جواب دیتا ——— یہ ہفتہ اس کے لئے

...مسرت و راحت سے لبریز تھا۔

...بھی ... سے ... تھی لیکن پھر بھی وہ کچھ متفکر سا رہنے

...چاہتا ... کہ اس کے گھر آتیں تو وہ ان

...بعض کو دیکھ کر جھجکتا، پھر غور سے دیکھ کر پہچان

...کسی کا انتظار تھا ——— ہر لحظہ انتظار معلوم ہوتا تھا

اس کے ساتھ ہی اسے دیکھنے کا بھی شوق ہے ——— اور ——— اس کے

آنے کا بھی یقین ہے۔

آخر ایک رات وہ متوقع خطرہ آ ہی گیا۔ چند بڑی بوڑھیاں اسے دیکھنے آئی تھیں وہ ان کے پاس گردن جھکائے بیٹھا تھا کہ دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز جھانجھ کی موسیقی ریز آواز سے دست و گریبان سنائی دی۔ دوسروں کے لئے وہ آواز کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن اس جھانجھ کی نازک موسیقی سے جمیل کے کان آشنا تھے اس کا دل ان کی ہم آہنگی میں دھڑکتا تھا ——— جمیل نے نظر اٹھائی ——— جوہی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی......

جمیل کا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی گردن پھر جھک گئی، "جوہی" ایک قلیل توقف کے بعد آگے بڑھی۔ جمیل کی والدہ کو سلام کیا۔ پھر دوسری بڑی بوڑھیوں کو سلام کرکے جمیل کی طرف مخاطب ہوئی اور ایک قہقہہ باش انداز میں کہا: "نوشا میاں! سلام!" نوشا میاں شرما گئے۔ کچھ ندامت کچھ مسکراہٹ کے ساتھ اسکی طرف دیکھا اور پھر گردن جھکالی۔

جوہی جمیل کے لئے یاد ایام کا بہانہ تھی۔ وہ اس کی گذشتہ زندگی کی روح تھی۔ جمیل کی نظر سے یکے بعد دیگرے ماضی کے پردے اٹھنے لگے اور وہ اپنی چھ سال قبل کی زندگی کی سیر کرنے لگا۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب جوہی کی ماں پہلے پہل ملازمت کے لئے اس کے گھر آئی تھی۔ جوہی کی ماں کھانا پکاتی تھی اور جوہی متفرق کام کیا کرتی تھی جوہی اس وقت ایک ... تھی اس کی ... ذہین ڈوبی ہوئی آنکھوں اور لمبی لمبی پلکوں نے پہلی ہی نظر میں جمیل کو موہ لیا تھا اس کی ذہانت آمیز شوخی نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

[illegible]

کنھیا" تھا۔ اس نے شاعرانہ مزے لوٹے تھے۔ دولت اس کے قدم چومتی تھی حسن کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ اکلوتا بیٹا تھا اس لئے گھر بھر پر اس کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ مزاج نہایت خوشگوار طرز گفتگو دلکش اور انداز محبت کا رنگ بہت چوکھا تھا۔ لڑکیوں کی محفل اسے بہت زیادہ پسند تھی اور لڑکیاں اس سے مسحور تھیں لیکن جب جوہی آگئی تو اس نے رفتہ رفتہ دوسری لڑکیوں کو اس کی نگاہ سے اتار دیا اور خود اس کے دل پر حکومت کرنے لگی! جمیل اس کی ہر ہر ادا کا بسمل تھا —— اس کا رنگ چمپئی تھا۔ بدن چھریرا اور صحتمند، مسکراہٹ کا انداز دل آویز اور رس میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کا کیا کہنا! جس کی آنکھیں ہر دم لب جو کے کنول کی طرح مسکراتی رہتی ہوں وہ اگر خود مسکرا دے تو ستم ہے۔ ایسی آنکھوں کے سامنے سحر بابل بھی جھوٹا ہوجاتا ہے —— پھر اس قیامت پر قیامت اس کی شوخی۔

غرض جمیل نے اس البیلی ناگن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اس کنول کے جوڑے کو چوما تھا۔ اس کی گردن میں اپنے بازو حمائل کئے تھے اس کے سیاہ گیسوؤں کو شانوں پر بکھرا ہوا دیکھا تھا۔ اس سے محبت کی شاعرانہ باتیں کی تھیں —— اور —— جوہی نے بھی جان توڑ کر اس کی خدمت کی تھی۔ اس کی محبت کا جواب پرستش سے دیا تھا —— اور —— اپنا سب کچھ اسے دیدیا تھا۔ جو مرد کسی عورت کا سب کچھ لے لیتا ہے اس کا ضمیر اسے اس عورت کا بال باندھا غلام بنا دیتا ہے وہ اگر اس سے بیوفائی کرنے کا خیال کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے لعنت کرتا ہے وہ اگر اسے دھوکا دیتا ہے تو وہ ہمیشہ اپنے پہلو میں ایک چبھن سی محسوس کرتا رہتا ہے۔ جمیل کا یہی حال تھا اسی لئے اس کے دل میں برابر ایک خلش سی محسوس ہوتی رہتی تھی۔ اس نے دو سال مسلسل جوہی سے اپنی پرستش کرائی اس کے بعد الہ آباد پڑھنے چلا گیا پھر بھی جب تعطیلات میں واپس آتا تھا تو جوہی کی سراپا انتظار زندگی کی گود کو گل مراد سے بھر دیتا تھا۔

جوہی وفادار تھی! وہ جمیل اور صرف جمیل کی ہو کر رہ گئی تھی اس کا احساس خود جمیل کو بھی تھا لیکن جوہی حسین تھی اور غربت کی ماری۔ پردہ نہ کرنے پر مجبور، لوگوں کی بری نگاہ سے بچنا ناممکن تھا۔ جب کوئی للچائی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا یا جب کوئی رئیس زادہ اس سے چھیڑ کرتا تو وہ غصہ سے تلملا جاتی مگر اسے زہر کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہو جانا پڑتا۔ ایسی نازیبا باتوں کو ہنس کر ٹال دینا سوسائٹی نے اس کا فرض تصور کر لیا تھا —— اگر سرکشی کرتی تو مار کھاتی۔ بے عزتی کراتی۔ اس کی ماں نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ "دیکھو جوہی! ہم غریب ہیں اور نیچ ذات اور پھر رئیسوں کا پیچ ہے۔ ہر ایک کی اچھی بری بات کا برداشت کرنا ہماری زندگی کے لئے ضروری ہے"

جب تک اس کی ماں جمیل کے گھر میں نوکر رہی سب دبے رہے کیونکہ وہی وہاں کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ لیکن جب جمیل کی غیر موجودگی میں اس کی ماں نے جوہی اور اس کی والدہ کو الگ کر دیا تو یاروں کی بن آئی۔ انور خاں ایک اور نوجوان زمیندار تھے۔ بڑے رسیا تھے انھوں نے جوہی کو دیکھا۔ کلیجے پر ایک سانپ سا لوٹ گیا۔ ان پر روپے کا ایسا نشہ سوار تھا کہ کسی کو حاصل کر لینا اس کے نزدیک کوئی مشکل بات ہی نہ تھی۔ پہلے تو انھوں نے سہولت سے کام نکالنا چاہا۔ طرح طرح کے دام پھیلائے مگر جوہی نے دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اور کسی سے اپنی مصیبت کا ذکر نہ کیا مگر اس کے بعد انور خاں نے تشدد کی ٹھانی۔ جوہی نے خوفزدہ ہو کر بلا کسی سے کچھ کہے سنے ہوئے بغیر ماں باپ کی رائے لئے تھانے میں "رپٹ" لکھا دی۔ انور خاں کے پندار پر جو یہ کاری ضرب لگی تو وہ بیتاب ہوگیا۔ فوراً جوہی کے باپ کو بلوا بھیجا اور اپنے ملازم سے اس کے جوتے لگوا دیئے اور کہا کہ "اب تم ایسے زمین ہو گئے ہو کہ تمہاری لڑکی تھانے میں ہماری رپٹ لکھائے" اس نے اپنی لاعلمی ظاہر کی انور خاں نے کہا "یہ سب بناوٹ ہے —— مجھے ماما کی ضرورت ہے، اگر کل سے جوہی نوکری پر نہ آگئی تو رہنا دشوار کر دونگا۔

وہ جب مار کھاکے اس کے گھر پہونچا تو اس کی بیوی نے اس کا اترا ہوا چہرہ اور خون جیسی لال آنکھیں دیکھ کر سوال کیا کہ "کیا بات ہے؟" اس کے آنسو نکل آئے۔ کمزور جب غصہ کو روکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو ان کے آنسو نکل آیا کرتے ہیں۔ جوہی سب سمجھتی تھی —— اس نے پہلے ہی ندامت سے گردن جھکالی تھی۔

"کیوں ری! یہ تو نے رپٹ کیسی لکھائی؟ انور میاں کے خلاف!" جوہی سے اس کے باپ نے پوچھا۔ جوہی نے نظر جھکائے جھکائے سب قصہ کہہ سنایا اس کی ماں بگڑ کر بولی۔

"اچھا میں جا کر بڑی بیگم (جمیل کی والدہ) سے کہتی ہوں۔ ایسے ظلم ہونگے تو غریب کیسے بسینگے"

جوہی نے منت کے ساتھ کہا۔

"ابھی بڑی بیگم سے نہ کہو۔ جمیل میاں یہاں نہیں۔ وہ عورت ذات کیا کر سکتی ہیں۔ اگر ابکی انور میاں پھر زیادتی کریں تو کہہ دینا۔"

جوہی کا باپ بولا ——— "میں جا کر منشی جی سے جمیل میاں کے نام خط لکھوا آتا ہوں۔"

"نہیں ابا! جمیل میاں کا امتحان قریب آگیا ہے۔" جوہی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"تجھے کچھ معلوم بھی ہے۔" باپ نے حقارت کے ساتھ کہا۔

"بڑی بیگم کے پاس خط آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

اس کے چوتھے روز جمیل ایک مقدمے کے سلسلے میں اپنے مختار کی طلبی پر گھر آیا۔ گھر میں جوہی کو نہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ حالانکہ جب تک وہ الہ آباد میں تھا پڑھائی کی مشغولیت کی وجہ سے جوہی کو بالکل بھولے ہوئے تھا۔ لیکن جب اسے طلبی کا تار ملا تو اسے اپنے گھر کے ساتھ ساتھ جوہی کا خیال آیا اور اس سے ملنے کی امید نے اسے فوراً آمادہ سفر کر دیا۔ گر بہانہ تھا کام کا۔

جوہی سے ملنے کی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ انور خاں ملنے آگئے۔ جمیل کو کچھ تعجب سا ہوا کیونکہ اس سے پہلے انور خاں کبھی اس سے ملنے نہ آئے تھے اور ادھر اُدھر ملاقات بھی ہوئی تھی تو اس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ انھوں نے کبھی نہ کیا تھا۔ لیکن اس کا تعجب بہت جلد فرو ہو گیا کیونکہ انور خاں نے سارا قصہ من و عن بیان کیا اور نہایت لجاجت کے ساتھ مدد چاہی۔ جمیل بے چینی کے ساتھ سُنتا رہا جب انور خاں سب کچھ کہہ چکے تو نہایت سنجیدگی کے ساتھ جمیل نے مخاطب کیا اور کہا۔

"انور صاحب! مجھے آپ نے کیا سمجھا ہے۔ میری آپ کی کچھ ایسی زیادہ ملاقات بھی نہیں لیکن مجھے ہنسی آتی ہے کہ آپ اس قدر جلد مجھ سے بے تکلف ہو گئے۔ مگر خیر آپ نے اچھا کیا جو مجھ سے کہدیا۔ میں آپ کو نہایت دوستانہ رائے دیتا ہوں کہ خیریت اسی میں ہے کہ آپ اس معاملے سے بالکل الگ ہو جائیے ورنہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میری رعایا کے ساتھ زیادتی کرنا آسان نہیں ہے بس آپ تشریف لے جائیے اور یہ یاد رکھئے کہ اگر اب آپ نے میری رعایا میں سے کسی کے ساتھ کسی قسم کا تشدد کیا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ میرے ساتھ تشدد کیا اور اس کا جو کچھ ہوگا اس کے ذمہ دار آپ ہونگے۔"

انور خاں بہت جز بز ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر جمیل نے اور سخت ہو کر کہا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔"

انور خاں مرعوب ہو گئے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اٹھے اور چلے گئے اور جمیل کو خیالات میں ڈوب جانے کیلئے تنہا چھوڑ گئے۔

جمیل یہ سوچ رہا تھا کہ آخر جوہی کیوں نہ آئی ——— اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے خفا ہو جائے، لیکن کیوں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ فوراً جوہی کے گھر جائے اور اس کے شانے پکڑ کر اس سے کہے۔

"یہ کیسی بے نیازی ہے؟"

مگر وہ جوہی کے گھر کس طرح جا سکتا تھا، لوگ کیا کہینگے اسے اپنا بچپن یاد آیا جب وہ بلا کھٹکے اس کے گھر میں دن گذار دیتا تھا۔

جوہی کے باپ کو جمیل کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو دوڑا آیا اور اپنا دکھڑا سنایا۔ جمیل نے اسے پوری طرح اطمینان دلا دیا کہ "اب کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے انور خاں کو خود ڈانٹ دیا ہے اور اب اگر کوئی بات ہو تو فوراً مجھے اطلاع کرنا۔" وہ دعائیں دیکر چلا گیا۔

جمیل جوہی سے ملے بغیر الہ آباد واپس چلا گیا۔۔۔ انور خاں نے واقعی پھر کوئی شرارت نہ کی۔

جمیل روٹھ گیا ——— جوہی کو منانا پڑا ——— تعلقات پھر ہموار ہو گئے۔

اب وفا کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جمیل اگر شادی کرے تو جوہی سے کرے لیکن اس کا اسے کبھی خیال بھی نہ آیا اس مسئلہ پر غور کرنے کی اسے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی یہاں تک کہ جب اس نے اپنی شادی کا مسئلہ طے کیا تب بھی اسے جوہی کا خیال نہ آیا۔

مگر جوہی نے اس پر غور کیا تھا حالانکہ بعد کو اپنی حقیقت محسوس کر کے خود کو بیوقوف کہہ کے اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا تھا ——— وہ جانتی تھی کہ کیا ہوگا، کسی امید کا قائم کرنا نری حماقت تھی۔

جب شادی طے ہو گئی اور رسم شادی کی تکمیل کے لئے اسے وطن آنا پڑا تب اس کا ضمیر جاگا ——— اور وہ پریشان ہو گیا اس نے سوچا کہ جوہی کو شکایت ہوگی اور بجا شکایت ہوگی۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس سے خفا ہو جائیگی بلکہ نفرت کرنے لگے گی ——— اس لئے وہ اس کا سامنا کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔

لیکن جب سامنا ہوا اور حقیقت اس کے توقعات و خدشات کے برخلاف نکلی تو اسے حیرت ہوئی اور بے انتہا حیرت، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوہی کو اس سے کچھ شکایت ہی نہیں، نہ اسے افسوس معلوم ہوتا تھا ——— وہی ناز و عشوہ، وہی بلا کی شوخیاں! مگر نہیں عورت کا اس قدر آزاد خیال ہونا غیر ممکن ہے۔ وہ ضرور دل میں نفرت کرتی ہوگی ——— وہ ہوشیار ہے۔ سب کے سامنے پیشانی پر بل نہیں ڈالنا چاہتی۔ وہ تنہائی اور موقع کی منتظر ہے۔ جمیل بغور اس کا مطالعہ کر رہا تھا ——— !

وہ اپنی ہمسنوں میں بیٹھی ہوئی ہنس ہنس کر باتیں بنا رہی تھی۔ جیسے اسے کسی بات کا غم ہی نہیں۔ شوخیاں رگ رگ میں بیتاب تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جلد کی سطح سے لیکر دل کے مرکز تک مسرت ہی مسرت بھری پڑی ہے جمیل کے پندار کو اس سے ذرا ٹھیس لگی۔ کہیں وہ اس طرح اس سے انتقام تو نہیں لے رہی تھی! عورت کو سمجھنا کس قدر دشوار ہے۔

جمیل کا خیال تھا کہ اسے بیحد صدمہ ہوگا۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ ہوگی۔ وہ رو رو کر اپنا برا حال کریگی۔ مردوں سے اسے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو جائیگی ——— لیکن وہ آئی اور اسی شان سے آئی۔ ملی اور اسی ناز سے ملی۔ مسکرائی اور اسی انداز سے مسکرائی۔ وہ اس سے متنفر نہ تھی۔ بلکہ اب بھی اس پر نازاں معلوم ہوتی تھی ——— اس کے ضمیر کی سرزنش کچھ کم ہو گئی، کیا یہی جوہی کا مقصد تھا؟

جمیل کے دل میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ شاید جوہی اس یقین کی وجہ سے خوش ہے کہ شادی کے بعد بھی میں اسے نہ بھولوں گا اور دلوں کے یہ تعلقات قائم رہینگے۔ یہ سوچکر اسے کچھ اطمینان نصیب ہوا ——— لیکن پھر بھی جوہی کو دیکھ دیکھ کر اسے حیرت ہوتی تھی۔ جمیل کی بڑی بہن ادھر آئیں تو جوہی نے ایک عجیب انداز سے مسکرا کر کہا۔

"شاہدہ بی بی! ڈھول دیجئے ہم لوگ بھیا کے سہرے گائیں گے"

اس کے بعد ڈھول لیکر بڑے شوق کے ساتھ اپنی ہمجولیوں کے ہمراہ اٹھلا اٹھلا اور جھوم جھوم کر گانا شروع کیا اور نصف درجن جوان آوازیں بڑی دیر تک گیت الاپتی رہیں ———،

جب وہ گھر جانے لگی تو جمیل پہلے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ جوہی سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے کہہ دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے کبھی نہ بھولے گا اور ہمیشہ اس کے ساتھ دیرینہ تعلقات قائم رکھے گا۔

باہر نیم کے نیچے دونوں کا سامنا ہوا۔ جوہی نے فوراً جھپٹ کر کہا۔

"افوہ! اتنا فراق بھی کھل رہا ہے! پانچ چھ روز میں وہ آہی جائینگی اس وقت تک صبر کیجئے۔ رات رات بھر کا جاگنا اب گننا چھوڑ دیئے"

جمیل سنجیدہ تھا نہایت سنجیدہ لہجے میں اس نے کہا۔ جوہی! جوہی نے زبان روک لی تھوڑے توقف کے بعد پھر بولی۔

"اچھا معاف کیجئے! میں غلط سمجھی، شاید آپ رات کو جاگنے کی عادت ڈال رہے ہیں!"

جمیل نے اور سخت ہو کر کہا۔

"جوہی! تمہیں مذاق کے علاوہ اور کچھ بھی آتا ہے؟"

"ہاں۔ ہاں ——— محبت کرنا آتا ہے۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔ اور ایک ہلکا قہقہہ لگایا۔

"زور سے نہ ہنسو، تمہیں اس کا بھی خیال نہیں کہ لوگ متوجہ ہو جائینگے" جمیل نے گھبرا کر کہا۔

"میں کسی سے ڈرتی نہیں ——— چاندنی نکھری ہوئی ہے درخت ہوا سے جھوم رہے ہیں ایسے وقت میں کوئی کسی سے ڈرا نہیں کرتا"

"میرے خیال میں تو تمہیں دیوانہ بنانا خوب آتا ہے"

جوہی اور قریب آ گئی اور مسکرا کر کہا۔ "اچھا یہ بتلایئے آپنے مجھ سے اپنی شادی کا ذکر کیوں نہ کیا؟ ——— مجھ سے ڈرتے تھے؟"

"مجھے خود بہت دیر میں اطلاع ہوئی، اس کے بعد ملاقات ہی کب ہوئی؟"

"نہیں ہوئی مگر ہو تو سکتی تھی ——— خیر چھوڑیئے ان باتوں کو"

"جوہی! میں شرمندہ ہوں، میں کم ہمت اور بیوفا ثابت ہوا۔ میں مجبور تھا لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی نہ بھولوں گا اور ———"

جوہی نے قہقہہ لگایا۔ "کم ہمت!" اس نے تعجب کے ساتھ کہا "کیوں آپ کم ہمت کیوں ہیں اور آپنے کیا بیوفائی کی؟"

"شادی ———" جمیل کی زبان سے نکلا۔

جوہی پھر ہنسی۔ "کیا شادی کرنا بیوفائی یا کم ہمتی ہے ——— ؟" اس نے پوچھا۔

"شادی اس سے کرنا چاہئے جس کی محبت کا دم بھرے"

"نہیں!" جوہی نے ٹوکا۔ "جس سے واقعی محبت ہو۔ دم تو مرد کئی کی محبت کے بیک وقت بھر سکتا ہے۔"

"تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں صرف تمھاری محبت کا دم بھرتا ہوں؟"

"اچھا آپ میری بابت کہہ رہے ہیں؟ ——— میرا سوال ہی بیکار ہے کیونکہ میں کبھی اپنے ساتھ شادی کی آپ کو اجازت نہ دیتی۔"

"کیوں؟" جمیل نے پوچھا۔

"میں ایک غریب اور نیچ لڑکی ہوں۔ ان پڑھ جاہل ——— میں آپکے لائق کہاں؟ آپ ایک شریف رئیس زادے، صاحب عزت! کیا میری محبت کا تقاضہ اور آپ کی محبت کا بدلہ یہی ہے کہ میں آپ کی زندگی خراب کر دوں؟ آپ کو بدنام کرکے بستی میں منہ دکھانے کے لائق نہ رکھوں؟ اگر میں ایسا کرتی تو ایک وقت ضرور ایسا آتا کہ آپ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگتے اور مجھ سے نفرت کرنے لگتے ——— آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنے جوڑ کی بیوی ڈھونڈھ لی ——— رہی میں، مجھے آپ ہمیشہ یکساں پائینگے۔ میری محبت میں فرق نہ آئیگا چاہے آپ بدل جائیں۔ اور بدل جانا چاہیئے ——— آخر کچھ اس آنے والی نیک بخت کا بھی تو حق ہے ———"

وہ رک گئی مگر اس کا جی چاہ رہا تھا کہے جائے وہ جذبات سے مغلوب تھی۔ وہ اکدم سنجیدہ ہو گئی تھی۔ جمیل محو حیرت تھا، مسحور تھا۔ پیار آ گیا اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ وہ کچھ نہ بولی لیکن جب جمیل نے اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا تو اس نے اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور کہا۔

"دیکھئے اب یہ باتیں چھوڑ دیجئے۔ اب آپ کی شادی ہو رہی ہے اب آپ کا فرض کچھ اور ہے۔ اب میں آپ کو زیادہ آزادی کی اجازت نہیں دے سکتی آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں، مجھ سے باتیں کر سکتے ہیں لیکن اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ کی نہیں ہوں۔ میں آپ ہی کی ہوں لیکن آپ میرے نہیں ہیں۔ آپ اپنی ہونے والی بیوی کے ہیں ———"

ہوا سے نیب کا گھنا سایہ ہٹا اور چاند کی پوری روشنی جوہی کے چہرے پر پڑی اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔

"کیا رو رہی ہو؟" جمیل نے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھتے نہیں کہ اوس پڑ رہی ہے ——— ؟ چھوڑیئے اب میں جاتی ہوں ورنہ مجھے زکام ہو جائیگا۔" شرارت کے ساتھ مسکرائی اور ہاتھ چھڑا کر چل دی۔

جمیل حد نظر تک اُسے دیکھتا رہا ——— موڑ پر اس نے آخری بار سر پھیر کر دیکھا اور غایب ہو گئی۔ جمیل بھی یہ شعر گنگناتا ہوا گھر چلا آیا۔ ؎

دیدہ صد شکر بجا آورد از دیدن تو،
دل کند سجدہ بایں طرز خرامیدن تو،

جمیل کی شادی ہو گئی۔ چھٹی بھی ختم ہونے کے قریب آ گئی ——— ایک ہفتہ کے اندر اسے بمبئی پہونچکر چارج لے لینا تھا۔ وہ معہ اپنی بیوی شاکرہ کے جانا چاہتا تھا اس کی والدہ نے کہا کہ ایک خادمہ یہیں سے لیتے جاؤ۔ وہاں کی اجنبی خادمائیں معتبر نہ ہونگی ——— خادمہ کی تلاش ہونے لگی۔

جوہی ایک روز پھر دلھن کو دیکھنے آئی۔ اپنی شوخی اور ذہانت سے اس نے پہلے ہی شاکرہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ جمیل کی والدہ نے خادمہ کی ضرورت کا اظہار کیا جوہی نے فوراً اپنے آپ کو پیش کیا اور کہا کہ کسی کو نوکر رکھنے کی کیا ضرورت ہے جب آپ کی لونڈی حاضر ہے۔ ہم لوگوں نے آپ کا نمک کھایا ہے ہم لوگوں پر بہو کی خدمت فرض ہے، میں ان کی خدمت کی ذمہ دار ہوں، ——— کیوں دلھن بھابھی! آپ ہمیں لے چلینگی؟"

شاکرہ نے چپکے سے جواب دیا۔ "اگر تم چل سکتی ہو تو ضرور چلو تنہائی میں جی بہل جایا کریگا۔"

جمیل گھر میں داخل ہوا۔ جوہی نے چہک کر کہا۔

"اے جمیل میاں! آپ کو دلھن بھابی کے لے جانے کی کیا جلدی پڑی ہے ایسی بھی کیا بے صبری! ابھی تھوڑے دن اور ہم لوگوں کے پاس رہ لینے دیجئے۔"

جمیل نے اپنی والدہ کی سماعت سے بچکر کہا۔ "میں کب لئے جا رہا ہوں وہ خود ساتھ چلنے کے لئے ضد کر رہی ہیں۔"

شاکرہ شرم سے گڑ گئی۔ اور دبی زبان سے جوہی کو مخاطب کرکے کہا "توبہ! بالکل جھوٹ!!"

جوہی نے جمیل سے تنک کر کہا۔ "اے ہے! اپنی کشش پر بڑا ناز ہے ان کو کیا غرض پڑی تھی کہ جانے کے لئے کہتیں۔"

"اچھا تمھاری دلھن بھابھی کو اس شرط سے چھوڑ سکتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو"

جوہی لجا گئی اور منہ بسور کر پھیرتے ہوئے کہا ——— "نوج!"

شاکرہ نے چپکے سے کہا۔ "میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

جوہی نے بھی چپکے سے گھرک کر کہا: "ایسی باتیں کرینگی آپ تو میں آپ کے ساتھ نہ چلونگی ــــ آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا"

"یہ کیا صلاح ہو رہی ہے؟" جمیل نے عاجز آکر کہا ــــ "کیا تبادلے کا مسئلہ طے ہو رہا ہے؟"

"بس چپ رہئے۔" جوہی نے تبسم بھرے غصہ سے کہا: "اتنا پڑھ لکھ گئے مگر بہن سے ایسا مذاق کرتے ہیں"

جمیل خفیف ہوگیا۔ اتنے میں جوہی کی ماں بھی آگئی۔ جمیل نے فوراً پکارا ــــ "بوا یہاں آیئے، بوا یہاں آیئے!"

وہ آگئی تو اس سے کہا۔

"بوا کیا تم جوہی کی شادی نہ کروگی ــــ؟"

جوہی نے منہ پھیر لیا۔ اس کی ماں نے دکھڑا رونا شروع کیا کہ "میں تو کروں یہ کم بخت تیار ہی نہیں ہوتی۔ کہتی ہے کہ میں تمہیں نہ چھوڑونگی۔ اس کے علاوہ کوئی اچھی جگہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور آج کل روپے پیسے کی بھی تنگی ہے"

جمیل نے کہا "شروع میں تو سب لڑکیاں یہی کہا کرتی ہیں ــــ روپے پیسے کا خیال نہ کرو وہ سب ہو جائیگا"

جمیل واقعی یہ چاہتا تھا کہ جوہی شادی کرلے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جہاں تک جوہی کا بس چلے گا شادی نہ کریگی ــــ اور جب تک وہ شادی نہ کریگی جمیل کے ضمیر کو کامل سکون نصیب نہ ہوگا ضمیر برابر اسے طعنے دیا کریگا کہ "دیکھو تم نے خود غرضی کے ساتھ اپنی شادی کرلی لیکن جوہی نے تنہا اپنی زندگی بسر کردی" اس کے علاوہ شادی کے جھگڑوں میں پڑ کے وہ اپنا ماضی بھول جائیگی۔ ہر عورت شادی کے بعد اپنا ماضی بھول جاتی ہے جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں ــــ جوہی اسی سے ڈرتی تھی۔ وہ ہرگز شادی کے لئے تیار نہیں تھی۔

جمیل برابر شادی کے قصے پر زور دیتا رہا جوہی کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی جمیل خود اس کی کوششوں کو برباد کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور جب چھلکنے کے قریب ہوئے تو اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ شاکرہ نے یہ حالت دیکھی وہ بھی اس کے پیچھے کمرہ میں آگئی۔ جوہی اسے دیکھ کر گھبرا گئی شاکرہ نے کہا۔ "جوہی بتاؤ کیا بات ہے، تمہیں بتانا ہوگا ــــ دیکھو میں تمہیں اپنی ملازمہ نہیں سہیلی سمجھتی ہوں"

جوہی اس کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی ــــ عرصہ سے یہ بادل امنڈ رہے تھے آخر برس گئے۔ شاکرہ خاموش صبر کئے بیٹھی رہی۔ جیسے برسات کی جھڑی لگ جاتی ہے تو لوگ گھروں میں بند ہو جاتے ہیں۔

جب خوب رو چکی تو جوہی نے سر اٹھایا۔ اب وہ مسکرا رہی تھی یا مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "میں بھی کیسی بیوقوف ہوں" اس نے کہا اس کے بعد شاکرہ کا ہاتھ پکڑ کر بولی: "دلہن بھابھی! دیکھئے یہ بات کسی کو نہ معلوم ہو کہ جوہی روئی تھی"

"اگر تم مجھے اپنا راز نہ بتاؤگی تو میں سب سے کہدونگی" شاکرہ نے موقع پاکر کہا

جوہی نے لجا کر کہا: "اس میں راز ہی کیا ہے؟ آپ سے کچھ راز نہیں سن لیجئے" اس کے بعد تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "مجھے ایک شخص سے محبت تھی، وہ بھی مجھے بہت چاہتا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ شادی اسی کے ساتھ کرونگی، اس کے بعد وہ اپنے گھر سے خفا ہو کر بمبئی چلا گیا اور مجھے قسم دیتا گیا کہ میں اس کی واپسی کا انتظار کروں ــــ اس کا انتظار کرنا میرا فرض ہے ــــ آپ میری مدد کیجئے اور جمیل میاں کو سمجھا دیجئے تاکہ وہ میری کوششوں کو برباد نہ کریں"

جمیل ہر موقع پر یہی چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ شاکرہ نے ایک روز اُسے علیحدہ بلا کر کہا۔ "آپ کیوں جوہی کی شادی کے لئے پریشان ہیں" اس کے بعد سارا قصہ کہہ سنایا اور وعدہ لیا کہ اب وہ اس معاملہ کو نہ اٹھائینگے بلکہ جوہی کی مدد کرینگے۔"

جمیل پر اس کا بہت اثر ہوا ــــ اب وہ جوہی کی شادی کیلئے اور زیادہ کوشش کرنا چاہتا تھا مگر اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔

آخر جمیل و شاکرہ معہ جوہی، اس کی ماں اور اس کے باپ کے بمبئی چلے گئے۔ ماں کھانا پکاتی تھی۔ جوہی متفرق دوسرے کام کیا کرتی تھی اس کا باپ کریم دروازے پر ملازم تھا۔

جوہی کو کام کرتے دیکھ کر جمیل کا ضمیر اسے ملامت کرتا تھا مگر وہ بے بس تھا رفتہ رفتہ یہ حالت بھی نہ رہی اور جمیل اس زندگی کا عادی ہوگیا۔ بقول گولڈ اسمتھ "ضمیر بزدل واقع ہوا ہے۔ تھوڑے دنوں شور مچا کر خاموش ہو جاتا ہے"

لیکن جوہی ابھی بیدار تھی۔ اس نے اس کا انتظام کرلیا تھا کہ زخم عرصہ تک مندمل نہ ہو ۵

آرزو یہ ہے کہ حسرت بن کے دل میں تو رہے
زندگی کے پھول میں جذبات کی خوشبو رہے

جوہی کی ماں کے نام اکثر گھر سے خطوط آیا کرتے تھے۔ شاکرہ ان خطوں کو پڑھ کر سنا دیتی۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ "عظیم اللہ کا پتہ چل گیا اس کے بھائی اسے لینے کے لئے جانے والے ہیں۔" یہ واقعہ تھا کہ جوہی کی برادری میں ایک شخص خفا ہو کر کہیں چلا گیا تھا۔ جوہی اس خبر سے خوش ہوئی کیونکہ شاکرہ کی نظر میں جوہی کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔

دسمبر میں ادریس اشریف اور وحید جو جمیل کے کلاس فیلو رہ چکے تھے یہاں بہ نیت شکار کی غرض سے آئے۔ وحید اور شریف آئی۔ سی۔ ایس ہو گئے تھے اور ادریس پولیس کے امتحان میں اسی سال کامیاب ہوئے تھے جمیل نے شکار کا بندوبست کیا اور ایک ہفتے کا پروگرام بنا کر سب کے سب روانہ ہو گئے۔

موقع پاکر شہر کے بدمعاشوں نے بھی پروگرام بنایا اور جمیل کے جانے کے چوتھے پانچویں روز اس کے گھر میں نقب لگائی۔ اسی روز جوہی کی ماں کے پاس خط آیا تھا کہ عظیم اللہ واپس آ گیا۔ اس خبر سے جوہی پریشان ہو گئی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ اب شاکرہ سے کیا بنا بہانہ کریگی۔ اس روز وہ دونوں بہت رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔

شاکرہ کو اس بات کا افسوس تھا کہ عظیم اللہ کو آئے ایک ہفتہ ہو گیا اسے ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ جوہی کہاں ہے مگر اس نے اس تک آنے کی پرواہ نہ کی۔ مرد کتنے بیوفا ہوتے ہیں۔ وہ بیچاری حقیقت سے کیا واقف تھی۔ اس کے بعد غافل ہو کر سو گئیں۔

جب ایک چیخ کی آواز سے جوہی کی آنکھ کھلی تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا —— ایک شخص منہ کپڑے میں لپیٹے شاکرہ کے سینے پر ایک خنجر رکھے بیٹھا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ زیور کہاں رکھا ہے ورنہ مار ڈالوں گا۔ شاکرہ کی گھگی بندھ گئی تھی۔ جوہی گھبرا گئی اس نے صحن میں دیکھا تو چار پانچ آدمی اسی شکل کے سامان جمع کرنے میں مشغول تھے۔ جوہی نے شور مچانا شروع کیا چوروں میں کھلبلی مچ گئی چوکیدار اور پڑوسی دوڑ آئے اور دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگے چور بھاگے —— وہ شخص بھی گھبرایا جو شاکرہ کے سینہ پر خنجر رکھے ہوئے تھا وہ ہٹا کمرے کے دروازے سے صحن میں جھانکا اس کے ساتھی جا چکے تھے وہ بھی بھاگا لیکن بھاگنے سے پہلے شاکرہ کا نشانہ لیکر اپنا خنجر پھینک مارا مگر جوہی چیخ مار کر درمیان میں آ گئی اور خنجر اس کی کمر میں پیوست ہو کر رہ گیا —— وہ گری۔ شاکرہ نے اسے سنبھالا۔ لوگ دروازہ برابر پیٹ رہے تھے مگر شاکرہ کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ جا کر دروازہ کھول دیتی۔ سہمی ہوئی جوہی کے پاس بیٹھی رہی۔ دل اس قدر زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ بہری ہو گئی تھی۔ آخر دروازہ توڑ کر لوگ اندر داخل ہوئے اور یہ دلخراش منظر دیکھا۔ جوہی بیہوش ہو چکی تھی۔ پانی کے چھینٹے دیئے گئے ایک کراہ کے ساتھ ہوش میں آئی اور ہوش میں آتے ہی کہا۔

"دلہن بھابی! جمیل میاں کو بلوائیے۔"

فوراً ایک آدمی موٹر پر دوڑایا گیا۔ ڈاکٹر آئے انھوں نے خنجر نکالا خنجر نکالتے ہی وہ پھر بیہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ —— "وہ مر گئی —— خنجر کی نوک گردہ میں گڑ گئی تھی"۔ شاکرہ رو پڑی۔ کریم مجنونانہ خاموش تھا۔ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ ماں بین کر رہی تھی۔ جوہی کی لاش زبان حال سے یہ شعر پڑھ رہی تھی۔ ؎

سانس تھی جب تک آتی جاتی آس تھی تم سے ملنے کی
بال سا رشتہ اک تھا باقی اب تو وہ بھی ٹوٹ گیا

تین گھنٹہ کے بعد شکار پارٹی بھی واپس آگئی —— جمیل بوکھلایا ہوا گھر میں گھسا۔ لاش کے پاس گیا۔ نظارے کی تاب نہ لا سکا۔ پلٹا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔ شاکرہ پلنگ پر پڑی رو رہی تھی۔ گھر گھومتا ہوا معلوم ہوا —— آنکھیں بند کر کے ایک قریب کی کرسی پر گر گیا۔

جب بدن کی سنسناہٹ دور ہوئی تو آنکھیں کھولیں —— رونا چاہا مگر آنسو نہ نکلے۔ اس پر وحشت چھا رہی تھی —— اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مکان کے در و دیوار اپنے ہاتھوں میں لے کر توڑ مروڑ ڈالے —— اور یہ اسے اس وقت بالکل ممکن معلوم ہو رہا تھا۔

دوستوں نے سمجھا بجھا کر ہوش بجا کئے۔

اس کے بعد شاکرہ اکثر جوہی کو یاد کر کے کہا کرتی تھی کہ "مرد کتنے بیوفا ہوتے ہیں"۔ اسے عظیم اللہ پر غصہ تھا۔

جمیل کہا کرتا تھا کہ —— "تھی تو وہ قریب قریب جاہل مگر اس کی فطرت لکھی پڑھی معلوم ہوتی تھی۔ تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی مشکل سے اتنی ذہین اور صاحب مذاق ملیں گی"۔

جوہی ہمیشہ کے لئے جمیل کے دل میں ایک داغ چھوڑ گئی تھی۔

عزیز احمد، بی۔ اے

جذبات فضا

از جناب سید دل محمد صاحب فضا جالندہری

راحتِ قلب ہے ہر لغزشِ مستانۂ عشق
اب کھلا راز کہ فرزانہ ہے دیوانۂ عشق

مجھکو تسلیم ہے ناکامیٔ پیہم لیکن
دلِ مایوس پھر اک نعرۂ مستانۂ عشق

بھر دیا رنگ اثر حسن کی نیرنگی نے
دل کا ہر قطرہ بنا سرخیٔ افسانۂ عشق

اب تو شعلے سے نکلتے ہیں ہر اک آہ کے ساتھ
بھر گیا بادۂ سرجوش سے پیمانۂ عشق

ہر طرف دیکھتا ہوں جلوۂ رنگیں کی بہار
رشکِ فردوس ہوا اب عالمِ ویرانۂ عشق

ساقیٔ شوخ ادا خیر مرے دل کی نہیں،
چور ہوتا ہے کوئی لحظے میں پیمانۂ عشق

حسنِ نظارہ جانسوز بنا حسنِ نظر
کس قدر عالمِ حیرت میں ہے دیوانۂ عشق

خاک ہونا ہی حقیقت میں ہے معراجِ کمال
المدد المدد اے ہمتِ مردانۂ عشق

کیفِ نظارۂ رعنا سے ہے دل ذوق پذیر
ذرہ ذرہ نظر آنے لگا میخانۂ عشق

مٹ کے خود حسن بنا راہِ طلب میں کوئی
شعلۂ طور ہے خاکِ دلِ ویرانۂ عشق

دفترِ رازِ محبت ہے دلِ زار کی آہ،
آشنا ہو گیا اب ذوق سے بیگانۂ عشق

نورِ عرفاں سے ہے معمور یہاں کا عالم،
کاش دیکھے تو کوئی جلوۂ میخانۂ عشق

چشم پُر آب ہے، دل زار و حزیں رنگ ہے زرد
آئنہ سب پہ فضا ہو گیا افسانۂ عشق

ایک کامیاب تجربہ

اور اُس کا مآل

ایک سائنسدان جو حیوان غیر ناطق کو ناطق بنانے میں کامیاب ہو گیا

جناب خانصاحب قاضی محمد شفیع صاحب بی۔اے (علیگ)

کئی سال سے پروفیسر جوچک نے اپنے دار التجربہ سے قدم باہر نہ رکھا تھا۔ اس کی انتھک محنت وقت کی پابندی سے بھی ناآشنا تھی اس کے انہماک نے افراط کی بھی حد کردی تھی یہاں تک کہ وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بیخبر بلکہ بے تعلق ہوچکا تھا اس کی بیوی اس کو طلاق دیچکی تھی۔ وہ اس کو ایک مختصر خط بھی بھیج چکا تھا جس میں طلاق دہندہ بیوی کا شکریہ تھا اور دوسرے شوہر سے شادی کرلینے پر ہدیہ تبریک۔ اسی خط میں یہ بھی تحریر تھا "عند الفرصت میں تمہارے نئے شوہر سے ملاقات کیلئے بھی ضرور آؤں گا مگر سردست میرا تجربہ میری مصروفیت کا اجارہ کئے ہوئے ہے۔"

فاضل پروفیسر گو سن و سال سے ادھیڑ عمر کا تھا مگر شکل سے بڈھا نظر آتا تھا۔ اس کی حد درجہ درازریش خصوصاً اس کی کہولت پر دلالت کرتی تھی بالوں کی اس استادہ فصل کی متواتر کئی سال سے دروگی نہیں ہوئی تھی۔ غرضکہ وہ زندگی کے سب شعبوں میں میانہ روی کی حدود کو توڑ چکا تھا۔ تجربہ کی طوالت ابھی سے اس کو بددل کر رہی تھی۔

عالم یاس میں وہ کئی بار اپنے دھندلے سایہ سے جو دار التجربہ میں اس کی تنہائی کا تنہا ساتھی تھا یہ سوال غیر ارادی طور پر کر بیٹھتا: "کیا مجھے کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوگا؟ ـــــ کیا حصول مدعا میں اپنی جان عزیز بھی کھو بیٹھونگا؟"

پروفیسر کا چڑیا گھر

پروفیسر جوچک کی مصروفیتوں کے ضمن میں صرف ایک شخص کا ذکر ضروری ہے۔ یہ شخص اس کا معاون ڈاکٹر داؤد خاں تھا۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ پروفیسر کے تجربوں میں اس کی کوئی مفید مدد کرتا تھا مگر بیرونی دنیا سے پروفیسر کے واسطے کا جو سلسلہ تھا اس کی لازمی کڑی ڈاکٹر داؤد خاں ہی تھا بحقیقت میں یہی شخص پروفیسر کو دار التجربہ کی باہر کی دنیا سے متصل کئے ہوئے تھا۔ اگرچہ پروفیسر اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا مگر وہ مرد مخلص ثابت ہوا۔

دوسرے لوگوں کی طرح داؤد خاں بھی پروفیسر کے دار التجربہ میں داخل ہونے کا مجاز نہ تھا۔ اسے اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ وہ کون سا علمی عقدہ تھا جس کے حل کرنے میں پروفیسر اس انہماک اور جانفشانی سے دن رات مصروف عمل رہتا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت اہتمام سے ان کیمیاوی اجزا ر ادویات اور مصالحوں کی یاد داشت اپنے پاس رکھ لیتا جو اس کے ہاتھ پروفیسر جوچک شہر کے دوا فروشوں سے اپنے روزانہ تجربوں کے لئے منگواتا۔ پروفیسر کو اپنے معاون کی اس عادت کی خبر بھی ہوگئی۔ وہ اسے شک کی نظر سے دیکھنے لگا اور خفیہ پولیس کا کارندہ سمجھنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ پروفیسر اس کو پسند کرتا تھا نہ اس پر اعتبار۔

پروفیسر کے تجربوں کی ماہیت کی نسبت صرف اسی قدر وثوق سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ حیوانات سے متعلق تھے۔ وہ اپنی عمر کا معتد بہ حصہ علم جمادات کی طالب علمی میں صرف کیا تھا مگر اسے علم حیوانات سے بھی حد درجہ دلچسپی تھی چنانچہ اس نے اپنے مکان کے صحن میں خاصہ چڑیا خانہ رکھا ہوا تھا۔ پالتو جانوروں میں بندر۔ ریچھوں کا جوڑا۔ ہاتھی۔ کتے وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر داؤد خاں کی نگرانی میں ان جانوروں کی غور و پرداخت خوب ہوتی تھی۔ جانور بھی ڈاکٹر سے

بے حد مانوس ہو گئے تھے۔

حیوانات میں سے بعض پنجروں میں بند تھے۔ بعض کو زنجیر پہنا ڈال کر ان کمروں کے سامنے باندھ رکھا تھا جن میں پروفیسر اس کے خاندان اور اس کے اعزہ کی رہائش تھی۔ پروفیسر نے خود تو ایک عرصہ دراز سے اپنے دار التجربہ سے باہر قدم نہ رکھا تھا اور نہ ہی اپنے اعزہ سے کبھی ملاقات کی تھی۔ البتہ بندر۔ ریچھ، ہاتھی وغیرہ اپنے انسانی ہمسایوں کو ہر وقت دیکھتے رہتے اور زبان حال سے خوراک مٹھائیوں حتیٰ کہ شراب کے لئے بھی التجا کرتے جو ان جنگلی جنٹلمینوں نے ایک دفعہ کسی تقریب سے اتفاقاً دیکھ لی تھی اور انہیں اس لذیذ شے یعنی بنت رز سے بے حد رغبت ہو گئی تھی۔ ؏

چھٹتی نہیں ہے یہ منہ سے لگی ہوئی

تجربہ

ایک دن علی الصباح پروفیسر چوچک چپکے سے اپنے دار التجربہ سے نکلا اس کے ہاتھ میں روٹی کے متعدد ٹکڑے تھے جن پر شکر سے آمیختہ ایک سفید سفوف نہایت احتیاط سے چھڑکا گیا تھا۔ وہ سیدھا پنجروں کے پاس پہونچا اور دو بندر، دو ریچھوں اور روڈو نام ہاتھی کو ایک ایک ٹکڑے کھلا دیئے۔ پھر اس نے اپنے معاون کو بلا کر ہدایت کی کہ دونوں بندروں مسمی موسیو اور مساۃ لینا۔ دونوں ریچھوں۔ مسمی میکائیل اور مساۃ تاپتی اور ہاتھی مسمی روڈو ۔۔۔ ان سب کی حرکات پر بغور نظر رکھے۔

پروفیسر کے لئے وہ دن بڑی بےچینی سے بسر ہوا۔ گویا اس کی قسمت کا فیصلہ اس کی عمر بھر کی کاوشوں کے نتیجے کے باریک تاگے سے معلق تھا۔ ہر آدھ گھنٹہ کے بعد وہ دوڑا دوڑا ڈاکٹر دادوخاں کے پاس پہونچتا اور دریافت کرتا کہ آیا اسے ان حیوانات کی حرکات میں کوئی جدید اور اچنبہ کی بات تو نظر نہیں آئی۔ بلا کم و کاست اکتیس بار اپنے معاون کے پاس جانے اور نفی میں جواب پانے کے بعد اس نے اسے رخصت دیدی کہ وہ جا کر سو جائے اور حیوانات کو ان کے حال پر چھوڑ جائے۔

دوسرے دن پروفیسر کچھ مٹھائی لے گیا اور حیوانات میں کوئی تبدیلی نہ پاکر پھر ایک ایک خوراک ان کو کھلا دی۔ وہ دن بھی پروفیسر اور اس کے معاون کے لئے کچھ نتیجہ خیز نہ ہوا۔ ڈاکٹر دادوخاں یہ دو دن ان جانوروں کے پاس بیٹھا برابر سوچا کیا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی اس کے سرپرست پروفیسر کو ان جنگلی جانوروں سے توقع ہے۔ اس کا دماغ اس عقدہ کشائی سے عاجز رہا بہرکیف اس نے پولیس کے شکوک یہ کہہ کر رفع کر دیئے تھے کہ "پروفیسر کوئی بم ساز نہیں۔ کوئی زہریلی گیس یا بھک سے اڑ جانے والی تباہ کن چیز تیار نہیں کرتا بلکہ اسے ایک خبطی سمجھئے جو حیوانات سے متعلق کسی ناممکن الحل مسئلہ کے سلجھانے میں منہمک ہے"۔

تیسرا روز بھی گذر گیا اور دادوخاں نے وہی "کوئی تبدیلی نہیں" کی رپورٹ سنائی۔ آج کی رات پروفیسر چوچک کو نیند بالکل نہیں آئی۔ پو پھٹتے ہی اس نے پھر مرکب تیار کیا مگر اب کی بار بجائے جانوروں کو کھلانے کے اس نے ایک نارنگی تراشی اور اس مرکب کو اس کے رس میں حل کر کے ایک ہی گھونٹ میں خود پی گیا۔ تھوڑا سا سفوف کاغذ میں لگا رہ گیا تھا کچھ تذبذب اور تردد کے بعد وہ اس کو بھی نگل گیا۔

چوتھا دن

آج چوتھا دن تھا جب جانوروں کو پہلی خوراک کھلائی گئی تھی۔ کوئی آٹھ بجے صبح کا وقت تھا۔ ہر شخص اپنے کام میں لگ چکا تھا۔ دادوخاں حسب معمول ان جانوروں کی حالت دیکھنے کیلئے آیا اور اپنی بازو دار کرسی پر جو تاپتی فیملی (ریچھوں) کے پنجرے کے سامنے نصب تھی بیٹھ کر پھر اسی سوچ میں پڑ گیا کہ پروفیسر آخر ان جانوروں کا کونسا مخفی راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اسی ادھیڑبن میں اس کا دماغ تھک گیا۔ وہ سو گیا۔ اب سورج خاصہ چڑھ چکا تھا چونکہ پروفیسر بھی حسب عادت جانوروں کو اپنے نسخہ کی خوراک کھلانے نہ پہونچا اور سورج کی گرما دینے والی کرنوں نے دادوخاں کے ماندہ دماغ اور روح پر تھپکی کا کام دیا وہ خراٹے لینے لگا۔ گذشتہ چند روز کی متواتر دیکھ بھال اور محنت سے اس کا دماغ بھی پروفیسر کے دماغ کی طرح ماؤف ہو گیا تھا ۔۔۔ فی الحقیقت اس کو آرام کی بیحد ضرورت تھی۔

"دادوخاں! او دادوخاں!! اٹھو، اب جاگ جاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کو دو"۔

دادوخاں کے چہرے سے کچھ پریشانی ظاہر ہوئی مگر وہ بیدار نہ ہوا وہی آواز پھر آئی ۔۔۔ اگلی مرتبہ اس کا لہجہ زیادہ زوردار اور تحکمانہ تھا۔ "دادوخاں! اٹھو اور میرے لئے ناشتہ منگاؤ ۔۔۔ جلدی ۔۔۔ ورنہ میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا"۔

یہ تخویف آمیز الفاظ سن کر دادو خاں اچھل کر کرسی سے نیچے آ رہا۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ کسی سخت آلۂ ضرب سے اس کا سر کچل دیا گیا ہے اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور سراسیمہ اپنے چاروں طرف نہایت بےچینی سے دیکھنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ پہلے اس کی نظر پروفیسر چوچک کے رہائشی کمرے کی کھڑکی پر پڑی جو چند ہی گز کے فاصلے پر تھی۔ پھر دار التجربہ کی طرف پھری مگر جب اسے کوئی انسان نظر نہ آیا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس نے خواب دیکھا ہے۔ وہ دوبارہ سونا ہی چاہتا تھا کہ پھر آواز آئی۔

"جلدی کرو۔ دیکھو میں بھوکا ہوں"

یہ آواز پہلے سے بہت زیادہ تند تھی اس میں تہدید بھی تھی اور کڑک بھی۔ یہ روڈو ہاتھی کی آواز تھی جس کی سونڈ انتہائی غصہ میں اوپر ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ وہ دادو خاں کو حکم دے رہا تھا۔

دادو خاں اس محیر العقول تبدیلی سے بالکل مبہوت رہ گیا۔ ساتھ ہی اس پر انتہائی خوف طاری ہو گیا۔ مبادا روڈو اس کو پاؤں تلے روند نہ ڈالے ایک ناقابل بیان طاقت کے زیر اثر وہ پروفیسر کے دار التجربہ کی طرف دیوانہ وار دوڑ پڑا تا کہ اسے ان خطرات سے آگاہ کرے جو روڈو میں رونما ہو رہے تھے، دار التجربہ تک پہنچتے پہنچتے دادو خاں بلا مبالغہ کوئی سات مرتبہ گرا اور کئی زخم کھائے۔ اس واہی تواہی دوڑ میں اس نے درد محسوس کیا نہ اس خون کا کچھ خیال جو اس کے زخموں سے نکل آیا تھا وہ صرف اسی قدر کہے جا رہا تھا۔ "روڈو پاگل ——— چوچک! ——— بچاؤ ———" روڈو کو زبان ناطق مل جانے کو اس نے اس کی دیوانگی پر محمول کیا۔ اس لئے وہ پروفیسر چوچک سے امان کی التجا کر رہا تھا۔

پروفیسر چوچک کا حشر

ایک معمول کی طرح دادو خاں یہی الفاظ دار التجربہ کے بند دروازے پر کوئی دو منٹ تک زور زور سے دہراتا رہا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ دادو خاں نے گھبراہٹ میں جلدی سے دروازہ کھول دیا اور سامنے ایک بھیانک منظر دیکھ کر اس کی حسیات کو اور صدمہ پہونچا۔ تجربہ کی ساری بوتلیں اور دوسرے لوازمات ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ کاغذات اور کتابیں پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھیں۔ کرسیاں۔ میزیں اور دوسرا لکڑی کا سامان شکستہ پڑا تھا۔ کھڑکیاں پھوڑ دی گئی تھیں اور پروفیسر ان ٹوٹے پھوٹے اسباب کے ڈھیر میں بیہوش پڑا تھا اس کے بدن سے خون بہ رہا تھا۔

پولیس موقع واردات پر پہونچ گئی اور مختصر معاینہ اور دادو خاں کے بیان کی سماعت کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی کہ پروفیسر چوچک کا ایجاد کردہ سفوف اگر حیوانات غیر ناطق کو کھلا دیا جائے تو وہ ان میں قوت گویائی اور شعور انسانی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے مگر انسانی دماغ پر اس کا اثر برعکس ہوتا ہے چنانچہ پروفیسر چوچک کو مزید معاینہ اور تحقیقات کی غرض سے ایک سائنس کے دار التجربہ میں پہونچا دیا گیا اور سائنسدانوں کا ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا کہ ان جانوروں کے حالات کا مطالعہ کرے۔

ان بندروں۔ ریچھوں اور ہاتھی کے لسانی اور دماغی قواء میں جو محیر العقول تبدیلی واقع ہوئی تھی اس کے سمجھنے کے لئے ان لوگوں نے سخت کاوش سے کام لیا مگر کوئی خاص قابل لحاظ بات سمجھ میں نہ آئی۔ ماسوائے اس کے کہ اس سفوف کے کھلا دینے سے تین روز کے اندر ان کی زبان اور دماغ میں اتنی طاقت آ جاتی ہے کہ وہ انسان کی طرح ہر چیز کا ادراک کر سکتے ہیں اور اپنی حسیات اور خیالات کے اظہار پر بھی انسان کی طرح قادر ہو جاتے ہیں۔ یہ حیوانات اب انسانی قول و فعل کی ہو بہو نقل اتارنے لگے۔ برعکس اس کے اسی سفوف کے استعمال کا پروفیسر کی اپنی ذات پر یہ اثر ہوا کہ اس کے قوائے عقلی ذکاوت کے انتہائی درجہ سے تجاوز کر کے دیوانگی تک پہونچ گئے۔

ان متسادم[1] حیوانوں کو اب انسانی خوراک دی جانے لگی۔ تاپتی خاندان یعنی ریچھ تو جو چیز بہم پہونچتی برضا و رغبت کھا لیتے اور ملازموں کا شکریہ ادا کرتے مسمی موسیو اور مسماۃ لینا (بندر اور بندریا) کو کئی ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ ایک مرتبہ انھیں اتنی بھوک تھی کہ جلدی میں انھیں ابلے ہوئے آلوؤں سے نکلتی ہوئی تیز بھاپ کا بھی کچھ خیال نہ رہا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان جل گئی۔ یہ نظارہ قابل رحم بھی تھا اور مضحکہ خیز بھی۔ بیچاروں کے منہ اس قدر جل گئے کہ ڈاکٹر کی مدد کی ضرورت پڑی۔ ایک اور موقع پر انھوں نے لال مرچ کو شکر سمجھ لیا اور چاولوں کی رکابی پر چھڑک کر جلدی میں اتنے بڑے بڑے نوالے

---

[1] اس من گھڑت اصطلاح کو عربی صرف و نحو کی قواعد کی کسوٹی پر رکھ کر حرف گیری کی زحمت گوارا فرمانے کی ضرورت نہیں ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ہم نے اسے مستعرب مستخدم وغیرہ کے قاعدہ پر بنا لیا ہے مراد ایسے حیوانات ہیں جن میں آدمیت آگئی تھی۔

بے حد مانوس ہو گئے تھے۔

حیوانات میں سے بعض پنجروں میں بند تھے۔ بعض کو زنجیریں ڈال کر ان کمروں کے سامنے باندھ رکھا تھا جن میں پروفیسر اس کے خاندان اور اس کے اعزہ کی رہائش تھی۔ پروفیسر نے خود تو ایک عرصہ دراز سے اپنے دار التجربہ سے باہر قدم نہ رکھا تھا اور نہ ہی اپنے اعزہ سے کبھی ملاقات کی تھی۔ البتہ بندر۔ ریچھ، ہاتھی وغیرہ اپنے انسانی ہمسایوں کو ہر وقت دیکھتے رہتے اور زبان حال سے خوراک مٹھائیوں حتیٰ کہ شراب کے لئے بھی التجا کرتے جو ان جنگلی جنٹلمینوں نے ایک دفعہ کسی تقریب سے اتفاقاً دیکھ لی تھی اور انھیں اس لذیذ شے یعنی نبت رز سے بے حد رغبت ہو گئی تھی۔ ؎

چھٹتی نہیں ہے یہ بریہ منہ سے لگی ہوئی

تجربہ

ایک دن علی الصباح پروفیسر چو چک چپکے سے اپنے دار التجربہ سے نکلا اس کے ہاتھ میں روٹی کے متعدد ٹکڑے تھے جن پر شکر سے آمیختہ ایک سفید سفوف نہایت احتیاط سے چھڑکا گیا تھا۔ وہ سیدھا پنجروں کے پاس پہونچا اور دو بندروں دو ریچھوں اور روڈو نام ہاتھی کو ایک ایک ٹکڑے کھلا دیئے۔ پھر اس نے اپنے معاون کو بلا کر ہدایت کی کہ دونوں بندروں مسمی موبیو اور مساۃ لینا۔ دونوں ریچھوں۔ مسمی میکائیل اور مساۃ تاپتی اور ہاتھی مسمی روڈو ۔۔۔ ان سب کی حرکات پر بغور نظر رکھے۔

پروفیسر کے لئے وہ دن بڑی بے چینی سے بسر ہوا۔ گویا اس کی قسمت کا فیصلہ اس کی عمر بھر کی کاوشوں کے نتیجے کے باریک تاگے سے معلق تھا۔ ہر آدھ گھنٹہ کے بعد وہ دوڑا دوڑا ڈاکٹر دادو خاں کے پاس پہونچتا اور دریافت کرتا کہ آیا اُسے ان حیوانات کی حرکات میں کوئی جدید اور اچنبھے کی بات تو نظر نہیں آئی۔ بلا کم و کاست اکتیس بار اپنے معاون کے پاس جانے اور نفی میں جواب پانے کے بعد اس نے اسے رخصت دیدی کہ وہ جا کر سو جائے اور حیوانات کو ان کے حال پر چھوڑ جائے۔

دوسرے دن پروفیسر کچھ سٹھائی لے گیا اور حیوانات میں کوئی تبدیلی نہ پا کر پھر ایک ایک خوراک ان کو کھلا دی۔ وہ دن بھی پروفیسر اور اس کے معاون کے لئے کچھ نتیجہ خیز نہ ہوا۔ ڈاکٹر دادو خاں یہ دو دن ان جانوروں کے پاس بیٹھا برابر سوچا کیا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی اس کے سرپرست پروفیسر کو ان جنگلی جانوروں سے توقع ہے۔ اس کا دماغ اس عقدہ کشائی سے عاجز رہا بہرکیف اس نے پولیس کے شکوک یہ کہہ کر رفع کر دیئے تھے کہ "پروفیسر کوئی بم ساز نہیں۔ کوئی زہریلی گیس یا بھک سے اڑ جانے والی تباہ کن چیز تیار نہیں کرتا بلکہ اسے ایک خبطی سمجھئے جو حیوانات سے متعلق کسی ناممکن الحل مسئلہ کے سلجھانے میں منہمک ہے"۔

تیسرا روز بھی گذر گیا اور دادو خاں نے وہی "کوئی تبدیلی نہیں" کی رپورٹ سنائی۔ آج کی رات پروفیسر چو چک کو نیند بالکل نہیں آئی۔ پو پھٹتے ہی اس نے پھر مرکب تیار کیا مگر ایکی بار بجائے جانوروں کو کھلانے کے اس نے ایک نارنگی تراشی اور اس مرکب کو اس کے رس میں حل کر کے ایک ہی گھونٹ میں خود پی گیا۔ تھوڑا سا سفوف کاغذ میں گکارہ گیا کچھ تذبذب اور تردد کے بعد وہ اس کو بھی نگل گیا۔

چوتھا دن

آج چوتھا دن تھا جب جانوروں کو پہلی خوراک کھلائی گئی تھی۔ کوئی آٹھ بجے صبح کا وقت تھا۔ ہر شخص اپنے کام میں لگ چکا تھا۔ دادو خاں حسب معمول ان جانوروں کی حالت دیکھنے کیلئے آیا اور اپنی بازو دار کرسی پر جو تاپتی بیمی (ریچھنی) کے پنجرے کے سامنے نصب تھی بیٹھ کر پھر اسی سوچ میں پڑ گیا کہ پروفیسر آخر ان جانوروں کا کونسا مخفی راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اسی ادھیڑبن میں اس کا دماغ تھک گیا۔ وہ سو گیا۔ اب سورج خاصہ چڑھ چکا تھا چونکہ پروفیسر بھی حسب عادت جانوروں کو اپنے نسخہ کی خوراک کھلانے نہ پہونچا اور سورج کی گرما دینے والی کرنوں نے دادو خاں کے ماندہ دماغ اور روح پر تھپکی کا کام دیا وہ خراٹے لینے لگا۔ گذشتہ چند روز کی متواتر دیکھ بھال اور محنت سے اسکا دماغ بھی پروفیسر کے دماغ کی طرح ماؤف ہو گیا تھا ۔۔۔ فی الحقیقت اس کو آرام کی بیحد ضرورت تھی۔

"دادو خاں! او دادو خاں!! اٹھو، اب جاگ جاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کو دو"۔

دادو خاں کے چہرے سے کچھ پریشانی ظاہر ہوئی مگر وہ بیدار نہ ہوا وہی آواز پھر آئی ۔۔۔ اگلی مرتبہ اس کا لہجہ زیادہ زوردار اور تحکمانہ تھا۔ "دادو خاں! اٹھو اور میرے لئے ناشتہ منگاؤ ۔۔۔ جلدی ۔۔۔ ورنہ میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا"۔

یہ تخویف آمیز الفاظ سن کر دادو خاں اچھل کر کرسی سے نیچے آ رہا۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ کسی سخت آلۂ ضرب سے اس کا سر کچل دیا گیا ہے اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور سراسیمہ اپنے چاروں طرف نہایت بے چینی سے دیکھنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ پہلے اس کی نظر پروفیسر چوچک کے رہائشی کمرے کی کھڑکی پر پڑی جو چند ہی گز کے فاصلے پر تھی۔ پھر دارالتجربہ کی طرف پھری مگر جب اسے کوئی انسان نظر نہ آیا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس نے خواب دیکھا ہے۔ وہ دوبارہ سویا ہی چاہتا تھا کہ پھر آواز آئی۔

"جلدی کرو۔ دیکھو میں بھوکا ہوں"۔

یہ آواز پہلے سے بہت زیادہ تند تھی اس میں تہدید بھی تھی اور گرک بھی۔ یہ روڈو ہاتھی کی آواز تھی جس کی سونڈ انتہائی غصہ میں اوپر ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ وہ دادو خاں کو حکم دے رہا تھا۔

دادو خاں اس محیر العقول تبدیلی سے بالکل مبہوت رہ گیا۔ ساتھ ہی اس پر انتہائی خوف طاری ہو گیا۔ مبادا روڈو اس کو پاؤں تلے روند نہ ڈالے ایک ناقابل بیان طاقت کے زیر اثر وہ پروفیسر کے دارالتجربہ کی طرف دیوانہ وار دوڑ پڑا تاکہ اسے ان خطرات سے آگاہ کرے جو روڈو میں رونما ہو رہے تھے، دارالتجربہ تک پہونچتے پہونچتے دادو خاں بلا مبالغہ کوئی سات مرتبہ گرا اور کئی زخم کھائے۔ اس واہی تواہی دوڑ میں اس نے درد محسوس کیا نہ اس خون کا کچھ خیال جو اس کے زخموں سے نکل آیا تھا وہ صرف اسی قدر کہے جا رہا تھا۔ "روڈو پاگل ——— چوچک! ——— بچاؤ ———" روڈو کو زبان ناطق مل جانے کو اس نے اس کی دیوانگی پر محمول کیا۔ اس لئے وہ پروفیسر چوچک سے امان کی التجا کر رہا تھا۔

پروفیسر چوچک کا حشر

ایک معمول کی طرح دادو خاں یہی الفاظ دارالتجربہ کے بند دروازے پر کوئی دو منٹ تک زور زور سے دہراتا رہا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ دادو خاں نے گھبراہٹ میں جلدی سے دروازہ کھول دیا اور سامنے ایک بھیانک منظر دیکھ کر اس کی حسیات کو اور صدمہ پہونچا۔ تجربہ کی ساری بوتلیں اور دوسرے لوازمات ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ کاغذات اور کتابیں پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھیں۔ کرسیاں۔ میزیں اور دوسرا لکڑی کا سامان شکستہ پڑا تھا۔ کھڑکیاں پھوڑ دی گئی تھیں اور پروفیسر ان ٹوٹے پھوٹے اسباب کے ڈھیر میں بیہوش پڑا تھا اس کے بدن سے خون بہ رہا تھا۔

پولیس موقع واردات پر پہونچ گئی اور مختصر معاینہ اور دادو خاں کے بیان کی سماعت کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی کہ پروفیسر چوچک کا ایجاد کردہ سفوف اگر حیوانات غیر ناطق کو کھلا دیا جائے تو وہ ان میں قوت گویائی اور شعور انسانی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے مگر انسانی دماغ پر اس کا اثر برعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر چوچک کو مزید معاینہ اور تحقیقات کی غرض سے ایک سائنس کے دارالتجربہ میں پہونچا دیا گیا اور سائنسدانوں کا ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا کہ ان جانوروں کے حالات کا مطالعہ کرے۔

ان بندروں۔ ریچھوں اور ہاتھی کے لسانی اور دماغی قوا میں جو محیر العقول تبدیلی واقع ہوئی تھی اس کے سمجھنے کے لئے ان لوگوں نے سخت کاوش سے کام لیا مگر کوئی خاص قابل لحاظ بات سمجھ میں نہ آئی۔ ماسوائے اس کے کہ اس سفوف کے کھلا دینے سے تین روز کے اندر ان کی زبان اور دماغ میں اتنی طاقت آ جاتی ہے کہ وہ انسان کی طرح ہر چیز کا ادراک کر سکتے ہیں اور اپنی حسیات اور خیالات کے اظہار پر بھی انسان کی طرح قادر ہو جاتے ہیں۔ یہ حیوانات اب انسانی قول و فعل کی ہو بہو نقل اتارنے لگے۔ برعکس اس کے اسی سفوف کے استعمال کا پروفیسر کی اپنی ذات پر یہ اثر ہوا کہ اس کے قوائے عقلی ذکاوت کے انتہائی درجہ سے تجاوز کر کے دیوانگی تک پہونچ گئے۔

ان متآدم[1] حیوانوں کو اب انسانی خوراک دی جانے لگی۔ تا پتی خاندان یعنی ریچھ تو جو چیز بہم پہونچتی برضا و رغبت کھا لیتے اور ملازموں کا شکریہ ادا کرتے مسمی موسیو اور مسماۃ لینا (بندر اور بندریا) کو کئی ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ ایک مرتبہ انھیں اتنی بھوک تھی کہ جلدی میں انھیں ابلے ہوئے آلوؤں سے نکلتی ہوئی تیز بھاپ کا بھی کچھ خیال نہ رہا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان جل گئی۔ یہ نظارہ قابل رحم بھی تھا اور مضحکہ خیز بھی۔ بیچاروں کے منہ اس قدر جل گئے کہ ڈاکٹر کی مدد کی ضرورت پڑی۔ ایک اور موقع پر انھوں نے لال مرچ کو شکر سمجھ لیا اور چاولوں کی رکابی پر چھڑک کر جلدی میں اتنے بڑے بڑے نوالے

---

[1] اس من گھڑت اصطلاح کو عربی صرف و نحو کے قواعد کی کسوٹی پر رکھ کر حرف گیری کی زحمت گوارا فرمانے کی ضرورت نہیں ضرورت کو پورا کرنے کیلئے میں نے اسے مستعرب، مستخدم وغیرہ کے قاعدہ پر بنا لیا ہے مراد ایسے حیوانات ہیں جن میں آدمیت آ گئی تھی۔

منہ میں ڈالی گئے کہ زبان اور حلق جل جانے سے چھینکنے اور ناچنے لگے۔ یہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بعض لوگ تو خاموشی سے ان کی دیوانہ وار حرکات کو دیکھا کئے مگر بعض کے تو ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

روڈو (ہاتھی) کی اشتہا ایک دم ایسی تیز ہوئی جیسے جنگل کی آگ۔ اس کے پاس تو ہل من مزید کے سوائے دوسری بات ہی نہ تھی اسے بھوک کے مارے چین تھا نہ پیاس کے مارے تسکین۔ یہ ہاتھی نما انسان اکیلے ناشتہ میں اتنا کھاتا جتنا دس معمولی ہاتھی دن بھر میں کھائیں۔ اس پر بھی اسے قلت اشتہا کی برابر شکایت تھی ——— وہ ڈاکٹر سے مشورہ لینے پر مُصر تھا۔

عُریانی کا حُکم

روڈو نے ایک دن صبح ناشتہ کے بعد یہ کہہ کر نوکروں اور سائنس دانوں کو انتہائی پریشانی میں ڈالدیا کہ کپڑے اتار کر ننگے ہوجائیں۔ "تم بونے انسان کیوں اچھی اچھی پوشاکیں پہنے پھرو جبکہ میں ننگا ہوں"۔

لوگوں نے نہایت نرمی اور لجاجت سے اسے یقین دلانا چاہا کہ اس کے لئے بھی بہت جلد لباس کا بندوبست کر دیا جائیگا مگر روڈو کا اصرار تھا کہ سب لوگ ننگے رہیں ورنہ وہ زبردستی ان کے کپڑے اتروا دیگا۔ "ننگے رہنا کپڑے پہن کر رہنے سے زیادہ آرام دہ ہے۔ تم ٹھگنے انسانوں کو میرے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے کیونکہ میں اعلیٰ نسل سے ہوں اور تم تو میرے ان پڑوسیوں (بندروں) سے مشابہ ہو"۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اکثروں نے تو کپڑے اتار دیئے اور جن لوگوں کا اخلاق یا مذاق عریانی کی اجازت نہ دیتا تھا انھوں نے اس کے سامنے آنا ترک کر دیا موسیو اور لینا کپڑے پیش کئے جانے پر کچھ خوش نہیں ہوئے مگر تابیتوں نے بخوشی کپڑے پہن لئے اور اس امر پر اظہار ممنونیت کیا کہ وہ بھی اب دوسرے لوگوں کی طرح مہذب نظر آئینگے۔

رہائش کیلئے جدید مکانات کا مطالبہ

سائنسداں تو اس پر اسرار نسخہ کے تجربہ اور اس کے حیرت انگیز نتائج کے سمجھنے کے لئے سر دھن رہے تھے۔ ان کے فلسفیانہ دماغ علت و معلول کی ادھیڑ بن میں سینکڑوں نظریئے قائم کرتے اور پھر خود ہی ان کو توڑ دیتے مگر جہاں تک کسی تسلی بخش حل کا تعلق تھا ہنوز روز اوّل والا معاملہ تھا۔ دوسری طرف پروفیسر جوچک کے دار التجربہ کے معززین (مستأدم حیوانات) کے نت نئے تقاضوں سے مامورین حکومت کا ناک میں دم آچکا تھا اب انھوں نے رہائش کے لئے نئے مکانات کا مطالبہ پیش کیا۔ "کیونکہ" انھوں نے کہا "ایسے کثیف۔ گندے اور مضر صحت ماحول میں رہنا ہمارے لئے ناممکن ہے تعجب ہے کہ آپ لوگ ہم سے ایسی ناانصافی اور ظلم روا رکھتے ہیں"۔

پروفیسر جوچک کے خاندان کے لوگوں نے حکومت کے مامورین کے انتظام کا بھی انتظار نہ کیا اور ڈر کے مارے فوراً اپنے ہاں کے بہترین کمروں کے دو جوڑے تابیتی اور موسیو خاندانوں کے لئے خالی کر دیئے مگر حضرت روڈو کے لئے مناسب مکان کا ملنا ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ پروفیسر کے محل کا گول کمرہ بحیثیت آرائش و وسعت تو اس کی رہائش کے قابل تھا مگر سوال یہ تھا کہ اسے اس میں داخل کیسے کیا جائے۔ یہ کام آسانی سے اور جلدی ہونا ممکن نہ تھا مگر روڈو کا پیمانہ صبر لبریز ہوچکا تھا۔ اس نے اول التجا کی پھر مطالبہ کیا اور آخر میں دھمکی دی کہ جو کچھ سامنے آئیگا وہ فنا کر دیگا۔ "جب آپ لوگ ہمارے لئے مناسب رہائش کا انتظام نہیں کرسکتے تو ہمیں کاہے کو رکھ چھوڑا ہے" بات بھی معقول تھی ؎

یا مکن با فیلباناں دوستی　　　یا بنا کن خانہ بر بالائے پیل

حکومت کے وفد نے نہایت الحاح کے ساتھ روڈو کی خدمت میں التجا کی کہ جس طرح ہوسکے ایک رات اور اپنے موجودہ مکان میں کاٹنے اور صرف کل تک کی مہلت دے۔ امید قوی ہے کہ کل تک کمرہ کا دروازہ اس کے داخلہ کے لئے تیار ہوجائیگا مگر روڈو نے تخویف آمیز لہجہ میں احتجاج کیا کہ میں ایک منٹ کے لئے بھی ایسے ردی مکان میں رہنے کے تیار نہیں۔ اس کی دھمکیوں سے لوگ ڈر گئے اور فیصلہ کیا کہ چاہے لاگت اور محنت کچھ ہی ہو اس کا معقول مطالبہ پورا ہونا چاہئے۔

ٹینس کھیلنے کے میدان کے وسط میں ایک وسیع قطعہ زمین انتخاب کیا گیا اور جس قدر کمبل ہاتھ لگ سکے ان سے اس پر ایک شامیانہ نصب کر دیا گیا۔ کئی میزیں جوڑ دی گئیں اور ان پر سفید لٹھے کا میز پوش ڈالا گیا کئی کنستروں میں پھول سجا کر گملوں کی شکل میں ادھر ادھر رکھدیئے گئے دو بوتلیں خوشبوؤں کی چھڑکی گئیں اور روڈو کی زنجیر کھول دی گئی اور اُسے

دعوت دی گئی کہ وہ اپنے عارضی میدانی رہائش گاہ میں تشریف لے آوے اس طرح گویا روڈو کا مطالبہ فوراً پورا کر دیا گیا مگر اس سے فارغ ہوتے ہی حکومت کے ماموریں وہاں سے رفوچکر ہو گئے مبادا اس کی فاتحانہ اور آمرانہ رگ پھر پھڑک اٹھے اور اسے کسی نئے تکلیف دہ مطالبے پر آمادہ کرے۔ دوپہر تک نئے کمرے کے دروازے کی ارتقائی تجویز تکمیل پا گئی اور روڈو بہادر کی خدمت میں بذریعہ آلہ مکبر الصوت درخواست کی گئی کہ وہ اپنے جدید مستقل قصر میں نقل مکانی کرنے کی زحمت گوارہ کرے۔ مگر یہ میدانی شب باشی بیچارے روڈو کے لئے اذیت دہ ثابت ہوئی کیونکہ صبح تک حضرت کو کھانسی کا عارضہ ہو گیا۔

موسیو اور تاپتی کنبے اپنے نئے مکانات سے بالکل مطمئن تھے موخر الذکر میاں بیوی اپنے پڑوسی انسانوں کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرتے اور ان کی تقلید کی پوری کوشش کرتے رہے انھوں نے چھری کانٹے سے میز پر کھانا اور کھانے کے لباس پوش (نیپکن) کا صحیح استعمال سیکھ لیا حتیٰ کہ وہ ظہری اور شام کا کھانا بغیر شراب کے ہرگز نہ کھاتے۔ "الکحل (مشروب) میں" وہ کہتے "وٹیامنس (Vitamins) کے اجزاء (غذائیت) باقی جملہ اشیاء خوردنی کی نسبت زیادہ ہیں۔" ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے ماسبقوں سے ایسا ہی سنتے آئے ہیں۔

مادام لینا کا کمرہ سنگار

مادام لینا کو اپنی کنگھی پٹی اور کمرہ سنگار سے خاص رغبت تھی۔ وہ اپنا بیشتر وقت آئینے کے سامنے اپنے پوڈر بکس۔ لپ سٹک (آلہ تزئین لبہائے لعلین) اور تجمل کے دوسرے ادویات کی صحبت میں گذارتی۔ اس میں بانکپن تو کسی قدر آ گیا تھا مگر وہ خود کو اتنا عقلمند اور تعلیم یافتہ خیال کرتی کہ وہ اپنے تاپتی پڑوسیوں سے راہ و رسم پیدا کرنا اپنے لئے کسر شان سمجھتی۔ یہی حال موسیو کا تھا۔ وہ خود کو اتنا خوبصورت۔ طاقتور۔ صاحب تربیت و فضیلت سمجھتا کہ اس نے ان سائنسدانوں سے مخاطب ہونے سے انکار کر دیا جو اس کی ملاقات کو آئے تھے۔ وہ علیحدگی میں بیوی سے کہنے لگا ——— "یہ دو پاؤں پر چلنے والے حیوان کس قدر غیر مہذب ہیں۔ ہمیں ان کو بہت سی باتیں سکھانی پڑینگی۔ یہ ان کے لئے انتہائی خوش قسمتی کا موجب ہے کہ ہم شستہ تہذیب و رشد لئے ان میں موجود ہیں ورنہ کون جانتا ہے کہ ان انسان نما حیوانوں کی بربریت ان کو کہاں لے جاتی۔"

مادام لینا اپنے شوہر کی ان لن ترانیوں کی تائید کرتی اور اپنے چہرے بازوؤں اور کپڑوں پر پوڈر پاشی کرتی جاتی جو اس کی بے احتیاطی سے کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں بھی گر جاتا۔

تاپتی لوگ تربیت کے سب سے زیادہ اہل ثابت ہوئے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ تہذیب جدید کے جن لوازمات سے وہ ناآشنا ہیں وہ ان کو تعلیم کئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف فاکس ٹراٹ (Fox Trot) اور ٹینگو (Tango) (رقص فرنگ کی قسمیں) اچھا سیکھ گئے بلکہ استادان فن اور حکومت کے نمائندوں کو ماننا پڑا کہ جملہ اقسام حیوانات میں وہ سب سے زیادہ سلیم الطبع ہیں۔

روڈو نے سائنسدانوں کو پریشان کر دیا

روڈو نے اب نیا مطالبہ پیش کیا۔ "موسیو اور تاپتی نیچی ذات کے لوگ ہیں۔ وہ میرے برابر کے کمروں میں رہنے کے اہل نہیں ہیں انھیں کسی دوسرے مکان میں منتقل کر دیا جائے۔ تاپتی لوگوں سے مجھے خصوصیت سے نفرت ہے اور تم لوگوں کی تمام تر توجہ کا وہی لوگ مرکز بن رہے ہیں۔"

وہ حسد سے بھن گیا اور ان کے خلاف سازش کرنے لگا مگر وہ ایسے بھانپ گئے اور روڈو کی حرکات پر خوب ہوشیاری سے نظر رکھنے لگے۔ حقیقت میں روڈو کے سلوک نے سب کو اس سے متنفر کر دیا۔ سائنسدانوں نے اس کے چڑچڑاپن پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اسے اپنے ہم صنف ساتھی کی ضرورت ہے جس سے اس کی تنہائی کا ازالہ ہو جائے۔ چنانچہ چند روز بعد ایک بس "پالیا" صحن میں لائی گئی اور روڈو کو نووارد کے آمد کی اطلاع دیدی گئی۔

"وہ میرے کمرہ میں مت آئے۔" یہ کہہ کر وہ صحن میں اس سے آملا۔ پالیا اپنی نسل کا بہترین نمونہ تھی۔ وہ مخلص تھی اور اپنی قوم کے باقی اوصاف سے بھی متصف تھی۔ البتہ وہ انسانوں کی سی قوت فکر نہ رکھتی تھی نہ ہی اسے قوت گویائی اسے ودیعت ہوئی تھی۔

روڈو نے اسے حقارت سے دیکھا اس کے انداز سے اس کی اشرفیت کی شان نمایاں تھی۔ "ہاں" اس نے کہا۔ "مجھے تنہائی بہت ستاتی ہے۔ اس لئے ایک ایسے ساتھی کی بیحد ضرورت ہے جس کی صحبت میں دل بہلے۔ میری خواہش ہے کہ تم اسے وہاں بساؤ جہاں میں پہلے خود بستا تھا۔ اس کی غور و پرداخت خوب کرو مگر اسے زنجیر سے باندھ کے رکھو کیونکہ یہ قابل اعتماد معلوم نہیں ہوتی

میں دیکھی جا کر وقتاً فوقتاً اس سے ملتا رہونگا"۔

روڈو کو اور شکایتیں بھی تھیں مثلاً اس نے حکومت سے خواہش ظاہر کی کہ اس کیلئے کوئی مناسب شریک زندگی تلاش کریں اور کہ سرجنوں (جراحوں) سے کہا جائے کہ وہ اس کے جسم کے بعض اعضا پر بے ضرر اور غیر اذیت دہ طریقے سے عمل جراحی کریں تاکہ اس کے وہ مخصوص اعضاء انسانوں کے اعضا کی طرح کام کرنے لگیں"۔ اس نے یہ بھی کہا۔ "میں آدمیوں کی طرح صرف دو ٹانگوں کے بل چلنا چاہتا ہوں ــــ میرے ہاتھوں کی بھی انگلیاں ہونی چاہئیں ــــ میری دُم بہت بدزیب ہے اسے سرے سے کاٹ ہی دیا جائے"۔

دُم پر عمل جرّاحی

ظاہر ہے کہ اس کے دو ٹانگوں کے بل چلنے اور انگشت دار ہاتھوں کے مطالبے ناممکن التعمیل تھے۔ علیٰ ہذا القیاس اس کے لئے مناسب شریک زندگی کا مہیا کرنا بھی "این خیال است و محال است و جنوں" کی قبیل سے تھا۔ دم کا کاٹ دینا گو ممکن العمل تھا مگر بے معنی تھا۔ تاہم اس کے اصرار اور دھمکیوں سے مجبور ہو کر سائنسدانوں نے وعدہ کر لیا کہ اس کے سارے مطالبے پورے کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ چنانچہ عمل جراحی کیا گیا اور بغیر دکھ درد کے اس کی دم کاٹ دیگئی۔ مگر گھنٹہ بھر بعد درد شروع ہو گیا۔ ماہرین فن نے قصداً اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد درد ہو جائے۔ روڈو دو روز تک درد کے مارے چیختا چلاتا رہا اور جب اس کی ٹانگوں اور ہاتھوں پر عمل جراحی کرنے کی تجویز اس کے سامنے آئی تو گذشتہ تکلیف کے پیش نظر اس نے خود ہی انکار کر دیا۔ رہا مناسب شریک زندگی کا سوال سو اس کے متعلق اس سے کہہ دیا گیا کہ وہ مشرق بعیدہ سے آ رہی ہے اور کئی مہینوں میں پہونچیگی۔

بہا بردس روز تک ان مستادم حیوانوں کی کیفیت اور غیر معمولی اطوار نیز پروفیسر جوچک کی حالت غشی کی نسبت دنیا کو مخابرات خصوصی کے ذریعہ مطلع رکھا گیا۔ ان کی نسبت ایک ایک خبر کو دنیا بھر کے لوگوں نے انتہائی دلچسپی سے سنا۔ اکثر لوگوں کو ڈر تھا کہ پروفیسر جوچک تندرست ہو گیا اور متعدد ہاتھیوں کو اس کے نسخہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تو نسل انسانی تمدن جدید اور تمام طور کا خاتمہ ہو جائیگا۔ موسیو کی ناطق نسل کا بھی اضافہ بعض کے نزدیک سخت پریشانی بلکہ خطرہ کا موجب تھا۔ مگر خاندان تاپتی کے خوشگوار اور مرنجاں مرنج سلوک نے لوگوں میں اُسے ہر دلعزیز کر رکھا تھا۔

دنیا کی رائے غالب کا تقاضہ تھا کہ روڈو کا کام تمام کر دیا جائے۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے اور پروفیسر جوچک کے ایجاد کردہ سفوف سے پیدا شدہ حالات پر غور کرنے کے لئے ممالک متمدنہ کے اکابر کی ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا۔

دوسری فوری تبدیلی

مگر ایک فوری واقعہ سے حالات میں ایک ایسی تعجب خیز اور غیر متوقع تبدیلی ظہور پذیر ہوئی جس سے کانفرنس کا خود بخود ہی خاتمہ ہو گیا۔ گیارہویں دن علی الصباح روڈو اور اس کے دوسرے مہذب ساتھیوں سے قوت گویائی سلب ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی شعور بھی رخصت ہو گیا۔ انھوں نے اپنے نئے رہائشی مکانوں اور اسباب کو تہ و بالا کر دیا اور زبان حال سے خواہشمند ہوئے کہ انہیں کھلی فضا میں پہونچا دیا جائے جہاں آزادی زیادہ ہو اور ماحول طبعی۔

روڈو تو سرے سے دیوانہ نظر آتا تھا۔ موسیو اور لینا صرف پہلے کی نسبت زیادہ وحشت زدہ تھے جونہی ان کی کھڑکیاں کھلیں وہ کود کر درختوں پر چڑھ گئے اور خانوادۂ تاپتی پر گہری نیند نے غلبہ پا لیا۔ اسی کے ساتھ پروفیسر جوچک کی طبیعت نے بھی قدرے پلٹا کھایا۔ وہ کسی حد تک سنبھل گیا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ اس کا دماغ بھی گاہے گاہے کام کرنے لگا۔

تاہم ماہرین طب کا فیصلہ ہے کہ اگرچہ پروفیسر میں اتنی توانائی آ گئی ہے کہ وہ کسی قدر کام کے قابل ہو گیا ہے اور چل پھر سکتا ہے مگر اس کا دماغ ہمیشہ کیلئے معطل ہو گیا ہے۔ اسے ماضی کا بالکل علم نہیں۔ مستقبل کے متعلق اس کی قوت فکر کام نہیں دیتی۔ تجربہ کی پوری کامیابی کا راز پروفیسر کی صحت کلی میں مضمر ہے مگر طبی رائے یہی ہے کہ پوری تندرستی ممکن نہیں۔

(ترجمہ) از انگریزی

خریداران عالمگیر کی خدمت میں اشد ضروری التماس ہے کہ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔ کیونکہ ہزارہا خریداروں میں سے کسی نام کا تلاش کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ آئندہ بغیر نمبر خریداری کے کیسا ہی ضروری خط ہوگا جواب نہ دیا جائیگا۔

نیاز مند منیجر عالمگیر لاہور

رنگِ قدرت

افصح الفصحاء حضرت شفق رضوی عماد پوری

مژدہ ہے زندگی کا پیامِ قضا مجھے — ہستی مری عدم ہے، فنا ہے بقا مجھے
منزل پہ چھوڑ کر صفتِ نقشِ پا مجھے — پامال خود کریگا مرا قافلہ مجھے
اک وہ جو شوقِ زیست میں بےموت مرگئے — اور ایک میں کہ جینے کو مرنا پڑا مجھے
ساحل ہے دور، ناؤ بھنور میں، ہوا خلاف — بس اب خدا پہ چھوڑ دے اے ناخدا مجھے
تجھسا تو میں دکھا نہ سکونگا، یہی سہی — اپنا سا تو دکھا دے کوئی دوسرا مجھے
بابِ اثر سے پھر کے جو آئی ہے ناامید — منہ تک رہی ہے دیکھ کے میری دعا مجھے
اس زندگی سے موت تھی اچھی مرے لئے — مرنے کے انتظار میں جینا پڑا مجھے
کیا جانے کتنی دور ہوں منزل سے میں ابھی — دیتا ہے کیوں فریبِ نظر رہنما مجھے
پہلو میں میرے خیر دلِ ناتواں کی ہو — تڑپا رہی ہے درد بھری اک صدا مجھے
اے خضر جیتے جی وہ تمہیں کس طرح ملا — مرنے پہ بھی ملا نہیں جس کا پتا مجھے
مجھسا گناہگار نہ تجھسا کوئی کریم — یہ بات اگر غلط ہے تو دیدے سزا مجھے
نیرنگیٔ فلک سے بھی بدلا نہیں شفق — قدرت نے اپنے رنگ میں ایسا رنگا مجھے

اودے پور کا مندر

از جمالی

اگرچہ اب تک یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سنہ ۹۰۰ء سے سنہ ۱۱۰۰ء تک کا زمانہ ہندی فن معماری کے لئے بہترین زمانہ تھا۔ چنانچہ اس عہد کا بہترین نمونہ اودے پور کا مندر ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس کا تذکرہ ہماری تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر ہم ہندوستانی فن معماری کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس عہد میں ہندوستان میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

گوالیار اسٹیٹ بھی ایک تاریخی ریاست ہے۔ چنانچہ یہاں کا چپہ چپہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں بہت سی عمارتیں بنیں اور بگڑیں۔ بعض عمارتیں اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ ہندو راجاؤں نے یہاں بہت سے مندر تعمیر کرائے بعض تو ایسے تباہ ہوئے کہ صرف نشان اور کھنڈر سے ان کی جگہ کا تعین ہوتا ہے پیشوا کے دور حکومت میں صدہا تباہ اور شکستہ عمارتیں اپنی اصلی حالت پر لائی گئیں چنانچہ اودے پور کا مندر جو کہ بالکل ویران تھا اس کی مرمت از سر نو ہوئی۔ کسی مرہٹہ حکمران نے مندر پر سونے کا ملمع کرا کر اپنی پرستش اور عقیدت کا ثبوت دیا۔ سابق مہاراجہ سندھیا نے اس مندر کی مرمت کرائی تھی۔ مسٹر Mr. Garde سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ نے کل ریاست کی چھان بین کی اور کافی کد و کوشش کے بعد بہت سی تاریخی عمارتوں اور مندروں کا پتہ بھی لگایا اور ان کی مختصر تاریخ بھی مرتب کی ہے۔ چنانچہ ان دریافت شدہ عمارتوں میں اودے پور کا مندر بھی ہے۔

۲

اودے پور گوالیار سٹیٹ کے ضلع بھلسہ میں واقع ہے۔ کسی زمانہ میں اس کے ہر چہار جانب فصیل تھی۔ فصیل کے نشان اب تک باقی ہیں۔ یہ شہر جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے کے اسٹیشن بینا اور بھلسہ کے درمیان واقع ہے۔ بارٹھ سے اتر کر جانا ہوتا ہے۔ اسٹیشن سے ایک سڑک اودے پور ہوتی ہوئی گئی ہے آمد و رفت کے لئے بیل گاڑی ملتی ہے۔ گوالیار اسٹیٹ میں غالباً یہی ایک ایسی تاریخی جگہ ہے جہاں موٹر کی رسائی نہیں۔ ورنہ سارے علاقہ میں سڑکوں اور موٹروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بارٹھ سے اودے پور پانچ میل کے فصل پر ہے یہاں کی ایک روایت ہے کہ اس مندر کا بنانے والا راجہ بھوج کا بیٹا اودے دیتا تھا۔ یہ روایت حقیقت پر مبنی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مندر میں جو کتبہ ہے اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

گیارہویں صدی میں پرمار خاندان کا راجہ بھوج مشہور حکمران گذرا ہے اس نے سنہ ۱۰۱۰ء سے سنہ ۱۰۵۵ء تک حکومت کی۔ یہ بڑا عالی دماغ۔ عالم۔ فاضل تھا۔ علم نجوم اور جوتش کا ماہر اور موسیقی میں دخل رکھتا تھا۔ سنسکرت اور بھاشا کا زبردست شاعر تھا۔ چنانچہ اس کی کئی تصنیفیں اب تک باقی ہیں خود عالم تھا اور عالموں کی قدر کرتا۔ تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ رعایا کی آسائش کے لئے بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ مالوہ میں "بھوج ساگر" (۲۶۰ مربع میل) جھیل بنائی۔ اودے دیتا لائق باپ کا بیٹا تھا اس نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ باپ کی یادگار ایک عمارت بھی بنوائی اور اپنے نام پر ایک شہر بسایا۔ ایک بڑا تالاب بھی کھدوایا اور اس کا نام اودے ساگر رکھا۔ اس نے بہت سی ویران اور شکستہ عمارتوں کی مرمت کرائی۔ ایک شیو مندر بھی تعمیر کرایا۔ کوئی ٹرسٹ کا تالاب اسی مندر میں وقف کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ مندر ویران ہوتا گیا اور تالاب بھر گیا۔ آخر پیشوا کے وقت میں پھر ان کی مرمت اور صفائی ہوئی۔ راجہ بھوج کی موت کے چار برس بعد اودے پور کا مندر تعمیر ہونا شروع ہوا اور بیس برس میں بن کر تیار ہوا یعنی سنہ ۱۰۵۹ء میں شروع ہوا اور سنہ ۱۰۸۰ء میں اختتام کو پہونچا۔ مندر کے آگے کا حصہ "مرہٹی" یعنی قیام گاہ شیو کہلاتا ہے

مندر بہت بلند ہے اور اس کی چوٹی آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ چوٹی کے انتہائی سرے پر ایک انسانی تصویر نظر آتی ہے۔ جو ممکن ہے عورت کی ہو کیونکہ قدیم سنگ تراشی اور اصنام سازی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان میں عام طور سے نسوانی تصویریں ہی نظر آتی ہیں۔ صدر دروازے کے ہر دو جانب کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں جو آگے نکلی ہوئی ہیں۔ "منڈپ" بہت وسیع۔ کشادہ اور چار ستونوں پر قائم ہے۔ ان ستونوں میں اعلیٰ درجہ کی نقاشی اور سنگ تراشی پیش کی گئی ہے۔ ستونوں کی اونچائی کل دس فٹ ہے۔ بنیاد سے پانچ فٹ تک ستون مربع ہے اس کے بعد ہشت پہل ہو گیا ہے اور سرے پر بالکل گول ہے۔ مندر کی چھت گنبد نما ہے۔ دیواروں پر بہشت کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ مندر طول میں ۹۹ فٹ اور عرض میں ۳۷ فٹ ۹ انچ ہے۔ مندر کا اندرونی حصہ کچھ شکستہ ہے جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مسلم دور میں کسی مسلمان حکمراں نے مندر کو بارود سے اڑا دینے کی ناکام کوشش کی اس واقعہ کی تاریخ عربی کتبہ میں موجود ہے۔ یہ کتبہ مندر کے احاطے والی مسجد میں اب تک لگا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد تغلق نے یہاں کے چند مندروں کو برباد کر دیا اور حاصل کردہ سامان سے اسی مسجد کو بنایا لیکن میرے خیال میں یہ روائت خوش عقیدگی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی سنہ ۱۸۷۱ء تک بقول ایک برطانوی افسر کے وہاں کے مسلمانوں میں بہت سی ہندوانہ رسمیں رائج تھیں چنانچہ پہلے یہ لوگ مندر کی پرستش کرتے اس کے بعد مسجد میں داخل ہوتے۔ نہ معلوم ان میں یہ رسم کب اور کس طرح رائج ہو گئی تھی آج کل تو اس رسم کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔

مندر کا کل احاطہ پختہ ہے اور اس پر پتھر کی سلیں بچھی ہوئی ہیں۔ احاطہ کی وسعت ۲۱۰ × ۲۱۰ فیٹ ہے۔ مندر بہت مستحکم اور اچھی حالت میں ہے اس میں کسی قسم کی سمنٹ نہیں لگائی گئی ہے سنگ سرخ نے اسکی خوبصورتی اور اسکے حسن کو دوبالا کر دیا ہے اسکی بنیاد بہت مضبوط اور بہت پائدار ہے خلاصہ یہ کہ اس مندر میں سنگ تراشی اور فن معماری کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں وہ کھجوراہو کے فن اور نمونے سے بھی بڑھے ہوئے ہیں حیرت تو یہ ہے کہ قدیم ہندوستانی صنعت کا ایک بہترین نمونہ موجود ہے۔ لیکن اب تک ہمارے مورخوں نے اس طرف توجہ بھی نہ کی۔

کمالی

غزل

شام غم کی سحر نہ ہو جائے — زندگی مختصر نہ ہو جائے
آہ میں اب اثر نہ ہو جائے — ختم دردِ جگر نہ ہو جائے
آ گیا ہوں میں انکی محفل میں — بیخبر کو خبر نہ ہو جائے
ہجر کی شب ہے اشکباری ہے — روتے روتے سحر نہ ہو جائے
منقلب ہے زمانہ آہوں کا — ان کا دل میرا گھر نہ ہو جائے
حسن کو بے نقاب کرتے ہو — وقفِ ذوقِ نظر نہ ہو جائے
مجھ سے صیاد یوں بھڑکتا ہے — رخ مرا سوئے در نہ ہو جائے
اے تصورؔ اگر خودی کھو دے — پاک شر سے بشر نہ ہو جائے

تصورؔ میرٹھی

کیفیات

سحبان الہند حضرت علامہ کیفی چریا کوٹی مدظلہ

جنوں کا جب یہ ستم پیشگی شعار نہ تھا — خدا کا شکر کریں مجھکو اختیار نہ تھا
ازل کے روز مجھے ماننا پڑا سب کچھ — میں ان کو کیا کہوں خود میرا اعتبار نہ تھا
نگاہ مست پہ اُنکی نثار تھے شب و روز — خوشا وہ دن کہ مجھے ہوش روزگار نہ تھا
پڑا تھا دست جنوں جب مرے گریباں پر — بڑی یہ خیر ہوئی دامن بہار نہ تھا
دلوں پہ حُسن کو جس وقت اختیار مِلا — وہ دن وہی تھے کہ جس دن مجھے قرار نہ تھا
کمال حُسن کے پردے کو عقل کیا کہتی؟ — یہ راز وہ تھا کہ دل پر بھی آشکار نہ تھا
نگاہ قہر تری، میرے سمت کیا اُٹھتی؟ — ترے حساب میں میرا کوئی شمار نہ تھا
سمجھ میں آنہ سکا راز پردہ داری کا — میں آپ تھا پس محمل مرا غبار نہ تھا
دفور یاس کی حد فتنۂ قیامت ہے — یہ آئی اور مجھے اُن کا انتظار نہ تھا
بناؤں دل کو میں کیا جب یہ غم سے تھا خالی — وہی یہ پھول تھا جس میں کوئی خار نہ تھا

مرے وجود نے اب دُور کر دیا کیفی
انھیں کا تھا جو مجھے اپنا اعتبار نہ تھا

زندگی کا ایک پہلو

شہرۂ آفاق فرانسیسی افسانہ نویس "موپاسان" کے ایک نفسیاتی افسانہ کا اُردو ترجمہ

از مسٹر محمد آصف صاحب بی۔ اے

برسات کی ایک شام کو میں قہوہ خانہ میں خلاف معمول داخل ہوا۔ خدا جانے کیوں؟ اس کی وجہ مجھے خود معلوم نہیں۔ مینہ برس رہا تھا جس سے فضا مرطوب دھندلی اور مکدر سی ہو رہی تھی۔ سڑکیں دھل کر چمک رہی تھیں ....

میں ایک نشست پر بیٹھ کر بیرا کا انتظار کرنے لگا۔ میرے قریب ہی ایک بوڑھا کرسی پر بیٹھا ہوا سفالی پائپ کے بڑے بڑے کش اڑا رہا تھا۔ پائپ زیادہ استعمال کی وجہ سے غلیظ اور روغن آلود ہو رہا تھا۔ میز پر چار پانچ بیر کے خالی گلاس پڑے تھے جو غالباً اسی بوڑھے نے چڑھائے ہونگے میں نے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر بھانپ لیا کہ وہ کوئی کہن سال مینوش ہے جس کی عمر عزیز مینخانوں کی نذر ہوئی ہو۔ میلا، بوسیدہ اور ڈھیلا لباس اس کی گذری ہوئی توانائی کا خاموش گواہ تھا۔ سیاہ آستینوں سے گھن آرہی تھی۔ ہاتھ اور ناخن اس قدر غلیظ تھے جنھیں دیکھ کر ابکائی آتی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا، گھورا اور یوں مخاطب ہوا۔ "کیسے گذرتی ہے؟"

اس کے خطاب سے مجھے تعجب سا ہوا اور اپنی انتہائی کوشش کے باوجود اُسے پہچان نہ سکا۔

"میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"ہاں! میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تمھارا ہمجولی ڈے بارنیٹ ہوں۔"

یہ نام سن کر میں ششدر رہ گیا اور نہایت سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں عجیب خیالات پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ "کیا یہ نحیف بوڑھا جین ڈے بارنیٹ ہے؟ کیا یہ میرا ہمجولی اور ہمدم دیرینہ ہے؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ حیرت اور افسوس سے زبان گنگ ہوگئی بڑی مشکل سے ان الفاظ کو نکالنے میں کامیاب ہوا۔ "تم .... کیا حال ہے تمھارا؟"

"..... تمھاری کیسے گذرتی ہے؟" نہایت متین اور سنجیدہ جواب ملا۔

"عین میری مرضی کے مطابق۔" میں مربیانہ انداز سے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا شغل ہے آج کل؟"

"یہی جو تم دیکھ رہے ہو؟"

"کیا یہ ممکن ہے کہ تم اپنی عزیز زندگی کو صرف شراب نوشی میں صرف کر دو۔"

"میرے لئے زندگی کوئی قیمتی چیز نہیں۔" اس نے ایک لمبا کش لگاتے ہوئے جواب دیا اور ساتھ ہی روپے سے میز کو کھٹکھٹاتے ہوئے قہوہ خانے کے ملازم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"دو گلاس بیر کے۔"

اس نے گلاس لا کر فوراً میز پر رکھ دیئے جن میں سے جھاگ ابل ابل کر میز پر گر رہی تھی۔ ڈے بارنیٹ نے گلاس کو چڑھاتے وقت ایسی تشنگی کا اظہار کیا جیسے وہ چلچلاتی دھوپ میں سفر کر رہا ہو۔ گلاس ختم کر کے زبان کو بڑی بڑی پراگندہ مونچھوں پر پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

"کوئی تازہ بات ہی سناؤ دوست!"

"مجھے کوئی ایسی بات یاد نہیں جو قابل ذکر ہو۔ میں تاجر ہوں اس لیے میری زندگی میں یکسانیت ہے۔"

"کیا تم کام کی یکسانیت کو پسند کرتے ہو؟" اس نے استفسار کیا۔

"کیوں؟ اس میں استفسار کرنے کی کیا بات ہے۔ ہر ایک انسان کام کو پسند کرتا ہے خواہ اس میں کتنی ہی یکسانیت کیوں نہ ہو اگر یہ نہ ہو تو یہ دنیا کا دھندا کیسے چلے۔؟"

"اس سے تمھارا مطلب؟" اس نے کہا۔

"مطلب صاف ہے۔ کیا تم جد و جہد کو پسند نہیں کرتے؟"

"جد و جہد! .... کیسی جد و جہد؟ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اسے پسند نہیں کرتا۔ کام کرے مفلس جس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ ہو غریب آدمی جب کام کرے گا تو اس کے مدنظر محض ذاتی فلاح اور بہبود ہوگی۔ کیا تم اپنی ذات کے لئے یہ عرق ریزی کرتے ہو یا دوسروں کے لئے؟ اگر دوسروں کے لئے کرتے ہو تو اپنے ہاتھ سے احسان فراموشی کا بیج بوتے ہو؟" اس نے پائپ کے لمبے لمبے کش کھینچنے شروع کئے اور ویٹر کو آواز دی۔

"ایک گلاس اور لاؤ۔"

پھر مجھ سے سلسلہ کلام شروع کر دیا۔ "میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں اس لئے آج مجھے پیاس معلوم دے رہی ہے۔ میں دنیا کی کسی خوشی میں حصہ نہیں لیتا کیونکہ مجھے کسی چیز سے دلچسپی اور محبت نہیں ہے۔ مرتے وقت میرے دل میں کوئی حسرت اور آرزو نہ ہوگی۔ میری جان یوں آسانی سے نکل جائیگی جیسے اس پائپ کا دھواں میرے پھیپھڑوں سے باہر نکل جاتا ہے۔ جورو نہیں بچے نہیں۔ فکر نہیں۔ غم نہیں۔ اس لئے میں خوش ہوں۔ آسودہ ہوں۔" اس نے بیر کا گلاس اٹھایا اور پھر اسی طرح چڑھا گیا۔

میں نے تعجب اور حیرت سے دریافت کیا۔ "لیکن تم ہمیشہ ایسے نہیں تھے؟"

"ہاں میں ہمیشہ ایسا نہیں تھا لیکن اب میں ایسا ہی ہوں۔"

"یہ کوئی زندگی نہیں اس کے خیال سے ہی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تم یقیناً زخم خوردہ ہو۔ تمھیں کوئی چوٹ لگی ہے خواہ اس کا باعث کوئی کافر جمال لڑکی ہو یا کوئی بے وفا دوست۔"

"نہیں یہ زندگی میری فطرت ہے۔ مجھے اس میں لطف آتا ہے۔ میں دن چڑھے بستر سے اٹھتا ہوں۔ یہاں آکر کھانا کھاتا ہوں۔ بعد میں شراب نوشی شروع کرتا ہوں یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے۔ پھر کھانے سے فارغ ہو کر شراب نوشی میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ رات گئے یہاں سے اٹھتا ہوں اور مدہوش ہو کر بستر پر جا گرتا ہوں۔ نیند کے لمحات میری زندگی کے درخشاں لمحات ہیں جو میرے ذہنی قوا، کو سکون بخشتے ہیں۔ پچھلے دس سالوں کا زیادہ حصہ اسی کرسی پر گذرا ہے اور باقی حصہ بستر پر۔ میخانہ میری زندگی ہے بستر میری دنیا ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تمھاری فطرت ہو۔ تمھیں صدمہ پہونچا ہے۔ یہ جانگداز تبدیلی یونہی پیدا نہیں ہو سکتی ــــ بھلا تمھاری عمر کتنی ہوگی؟"

"اصل میں تیس سال مگر دیکھنے میں پچاس سال۔"

میں نے اسے گھورا۔ سر سے پاؤں تک نظر بھر کر دیکھا۔ اندوہ و یاس کی چکی میں پسا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ وہ پیر فرتوت ہے۔ مژگاں لمبی۔ مونچھیں غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی اور پراگندہ داڑھی گھنی اور دراز تھی۔

"تم واقعی بہت معمر معلوم دے رہے ہو۔ بغیر کسی دکھ کے تم وقت سے پہلے انحطاط کا شکار نہیں ہو سکتے۔"

"میں تو کہہ رہا ہوں۔ میں اس لئے بوڑھا معلوم دے رہا ہوں کہ میں نے اپنے جسم کو ٹھنڈی ہوا سے محروم کر دیا ہے۔ ایک میخانہ کی کثیف ہوا سے زیادہ ضرر رساں کوئی چیز نہیں۔"

مجھے اس کی باتوں کا یقین نہ آیا بلکہ اس کی عجیب باتوں نے میرے تجسس میں اضافہ کر دیا۔ "یار تم تو بہت جلد گنجے ہو گئے۔ سر کے بال اڑنے کی تین ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ دماغی کاوش، فکر معاش یا محبت۔ کیا تمھاری شادی بھی ہوئی تھی؟"

"میں نے شروع سے لیکر آج تک پاکدامنی کی زندگی بسر کی ہے۔ اگر میرے سر کے بال اڑ چکے ہیں تو اس کی وجہ گیس کی روشنی ہے کیونکہ گیس بالوں کی دشمن ہے۔" .... "ویٹر ایک گلاس اور لانا۔ کیا تم بھی پیاس محسوس کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "نہیں شکریہ! تم سے مجھے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ تم ضرور حزن و ملال کے شکار ہوئے ہو۔ پیش از وقت بوڑھے ہو جانا غیر طبعی ہے۔ آخر کچھ تو ہوا ہے جسے بتاتے ہوئے ہچکچاتے ہو۔"

"ہاں ہوا ہے، اور ضرور ہوا ہے اور جو کچھ ہوا بچپن میں ہوا جب میں کونپل کے مانند تھا۔ ایک جانسوز حادثے نے میری زندگی کو تبدیل کر دیا تاریک کر دیا اور یہ تاریکی موت سے پہلے پیچھا نہیں چھوڑ سکتی۔"

"کیا ہوا آخر؟" میں نے نہایت اشتیاق سے دریافت کیا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ تم میری داستان غم سننے پر تلے ہوئے ہو۔ اچھا سنو تمھیں معلوم ہے میرا باپ ایک نواب تھا۔ وہ قلعہ جس میں میری پرورش ہوئی

تمہارا دیکھا ہوا ہے۔ ایک دفعہ تمہیں وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ تمہیں وہ باغ میں بنی ہوئی خوشنما عمارت خوب اچھی طرح یاد ہو گی۔ وہ روشیں وہ نظر فریب راستے اور سفیدے کے درخت تمہارے دماغ سے کیسے اتر سکتے ہیں تم غالباً میرے والدین کو بھی جانتے ہو جو سنجیدہ۔ متین اور رسوم کے سختی سے پابند تھے۔ مجھے اپنی والدہ سے بیحد محبت تھی۔ وہ بہت شفیق والدہ تھی میں اسے کیسے فراموش کر سکتا ہوں لیکن باپ سے میں ہمیشہ خائف رہتا تھا کیونکہ اس میں سرد مہری کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ میری عمر کوئی تیرہ سال ہو گی۔ میں فطرتی طور پر ذکی الحس مگر خوش باش اور کھلاڑی تھا۔ ستمبر کی ایک شام کو جبکہ موسم نہایت خوشگوار تھا میں باغ کے ایک پارک میں کھیل رہا تھا۔ گلہری کی طرح سفیدے کے درختوں پر چڑھتا اور اترتا۔ لمبی لمبی شاخیں پکڑ کر جھولنے لگتا۔ اچانک میری نظر اپنے والدین پر پڑی جو ایک روش میں سے گذر رہے تھے۔ درختوں کی قطاریں جھوم رہی تھیں۔ ان کی شاخوں سے ایک عجیب قسم کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور اس چیخ و پکار کی وجہ سے گرد و نواح میں ایک ادھم سا مچ رہا تھا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ صدا بہار جھاڑیوں میں تو سیاہی پیدا ہو چکی تھی۔ اس نباتاتی شورش نے میرے دل میں ایک ولولہ سا پیدا کر دیا۔ میں بلند آواز سے بھیڑیوں کی نقل اتارنے لگا۔ اتنے میں میرے والدین درختوں کے پیچھے غایب ہو چکے تھے۔ میرے دل میں بھیڑیئے کی آواز نکال کر انھیں اچانک ڈرانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دبے پاؤں ان کے قریب پہونچا لیکن ٹھٹک کر رہ گیا۔ والد خون آلود آنکھوں سے میری والدہ کو گھور رہا تھا۔ اس قہر باری کے بعد وہ نہایت سنگدلی کے ساتھ والدہ سے یوں مخاطب ہوا "سن رہی ہو مجھے روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ تمہیں اس کاغذ پر دستخط کرنا ہونگے۔"

"میں نہیں کرونگی۔ یہ جین کا ورثہ ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں تم میرے بچے کے حقوق کو نگلنے کی کوشش نہ کرو۔"

اس پر والد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس کے نرم و نازک رخسار پر نہایت بیرحمی کے ساتھ ایک چپت رسید کیا۔ جس کی وہ کمزور اور مظلوم عورت حریف نہ ہو سکی چکرا کر ایک خاردار جھاڑی پر منہ کے بل گر پڑی۔ سفاک خاوند اس پر ایک خوفناک چیتے کی طرح جھپٹا اور پیٹنے لگا۔ لاتیں اور گھونسے بارش کی طرح موسلا دھار برس رہے تھے اور وہ غریب ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایسا معلوم دے رہا تھا کہ یہ بارش کبھی نہ تھمیگی وہ ایک دیوانے کی طرح پیٹ رہا تھا اور میری مظلوم ماں شدت درد سے بیتاب ہو کر زمین پر لوٹ رہی تھی۔ چہرے پر بیشمار خراشوں کی وجہ سے خون بہ رہا تھا۔ کپڑے چیتھڑے ہو کر لٹک رہے تھے۔ یہ درد انگیز نظارہ دیکھ کر کیا ہوا کچھ نہ پوچھو دوست! مجھے اپنے ہر طرف خون ہی خون نظر آنے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا اور میرے واسطے دنیا ہمیشہ کے لئے تاریک ہو گئی۔ اس خوف کا احساس زیادہ ہونے لگا جو انسانی زندگی کا آن واحد میں فیصلہ کر دیتا ہے بیساختہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی جس سے والد چونک کر وحشی درندے کی طرح میری طرف لپکا۔ میں نے سوچا جان کی خیر نہیں یہ بپھرا ہوا ظالم تکا بوٹی کر دیگا۔ سر پر پاؤں رکھ کر بدحواسی کے ساتھ بھاگا۔ بالکل اس ہرن کی طرح جو ایک خونخوار چیتے کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر بھاگتا ہو۔ میں بھاگتا رہا بھاگتا رہا۔ معلوم نہیں کب تک اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ درختوں کے ایک جھنڈ میں غایب ہو گیا پاؤں ایک جھاڑی سے الجھا اور سر کے بل زمین پر آرہا۔ خوف سے ہاتھ پاؤں پھول گئے اٹھنے کی طاقت نہ رہی۔ ننھا سا دل روحانی صدمہ سے پاش پاش ہو چکا تھا۔ سردی سے ٹھٹھر گیا۔ دانت بجنے لگے۔ بدن شل ہو کر بیہوشی کے آغوش میں جا پڑا اور تمام رات یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ آخر خدا خدا کرکے سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔ میں کچھ ہوش میں آگیا لیکن پھر بھی اٹھنے کی ہمت پیدا نہ ہوئی۔ میں باپ کے خوف سے لرزہ براندام تھا مجھے اس کے خیال سے ہی نفرت تھی۔ میں وہیں پڑے پڑے بھوک اور صدمے سے دم توڑ دیتا اگر کہیں چوکیدار کا ادھر سے گذر نہ ہوتا۔ وہ مجھے زبردستی اٹھا کے لے چلا

——— والدین بدستور سابق اسی سنجیدگی سے جو ان کا دستور تھا گھر میں موجود تھے۔ ان کی روزمرہ زندگی میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آرہا تھا۔ والدہ نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور یوں گویا ہوئی "بیوقوف جین تم رات بھر کہاں رہے میں تمہاری وجہ سے سو نہیں سکی۔"

میں بغیر جواب دیئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ والدہ نے آنسو پونچھے گلے سے لگایا لیکن والد کے منہ سے ایک کلمہ تک نہ نکلا۔ ایک ہفتہ بعد میں نے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور اس کے ساتھ ہی میری زندگی کا عیش ایک روح سوز ہچکی لے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ دوست! یہ ہے میری داستان حیات، مجھے زندگی کے ایک ہی پہلو کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور میری بدقسمتی سے وہ تاریک پہلو تھا۔ اس حادثہ کے بعد میں کبھی اس قابل ہی نہیں ہوا

کہ اس کے دلکش پہلو پر بھی غور کر سکوں۔ میرے دماغ میں کیا رد عمل ہوا اور یہ واقعہ کیوں اس شدت سے میری طبیعت پر اثر انداز ہوا مجھے خود اس کا علم نہیں لیکن اتنا مجھے ضرور معلوم ہے کہ اب دنیا کی کوئی نعمت میرے لئے وجہ انبساط نہیں ہے۔ کسی چیز کی خواہش، کسی شخص کی محبت۔ کسی رتبے کی آرزو کوئی امنگ۔ کوئی امید، کچھ نہیں، میرے نزدیک یہ وہ پر فریب الفاظ ہیں جن میں کبھی معنی پیدا نہ ہونگے۔ میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ایک ہی تصویر رہتی ہے۔ میری مظلوم والدہ! میرے اداس تخیل کی دنیا میں وہ اب بھی تڑپ رہی ہے۔ شدت درد سے زمین پر لوٹتے ہوئے کراہ رہی ہے مگر اس شقی القلب کو رحم نہیں آتا وہ اب بھی اسے مار رہا ہے۔ یہ تکلیف دہ نظارہ ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرا کرتا ہے اور معلوم نہیں ابھی کب تک پھرتا رہیگا وہ مظلوم کبھی کی پیوند خاک ہو چکی مگر ہنوز والد زندہ ہے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا اور نہ دیکھنے کی خواہش ہے۔ ویٹر ایک گلاس اور لاؤ...."

ویٹر گلاس لایا اور وہ چڑھا گیا۔ پھر خالی پائپ کو زمین پر پٹخ دیا "واللہ، یہ ایک روح سوز دکھ ہے" وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ ویٹر کی طرف گیا — "ایک شراب کا گلاس اور لاؤ...."

مترجمہ ایس، محمد آصف بی۔ اے۔

حسین ساحرہ — کیٹس کی نظم کا ترجمہ

شاعر:۔ "اے نوجوان ہتھیار بند سوار! تو مغموم کیوں ہے؟ تو تنہا کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے.... جھیل کے کنارے کی سرسبز گھاس خشک ہو چکی ہے، اور مرغان خوشنوا بھی خموش ہیں!!"

"آہ اے نوجوان سوار تو ناشاد کیوں ہے؟ تیرا چہرہ اس قدر پژمردہ ہے۔ تیری آنکھوں میں اداسی اور رنج کے آثار ہیں"

فصل کٹ چکی ہے۔ گلہری نے بھی اپنا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔

"میں تیری پیشانی پر ایک کنول دیکھ رہا ہوں اندوہ و یاس کی شبنم سے نم.... اور تیرے گالوں پر گلاب کا غزان رسیدہ پھول جو مرجھایا جا رہا ہے"

شہسوار:۔ "میں مرغزار میں ایک حسین پری سے دوچار ہوا۔ اس کے بال لانبے لانبے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت تھی۔

میں نے اس کے گلے کے لئے ایک ہار بنایا، ہاتھوں کیلئے گجرے، کمر کے لئے پھولوں کا پٹکا.....!

"اس نے میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا وہ میٹھے میٹھے نالے کرتی تھی"... "میں نے اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا! مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا... کیونکہ وہ گھوڑے پر کبھی اُدھر جھکتی تھی اور کبھی اُدھر!..... اور پریوں کا گیت گاتی تھی..."

"اس نے مجھے جنگل کے پھل اور بوٹیاں کھلائیں، شہد اور کوئی اور میٹھی میٹھی چیز جو شبنم کے پھولوں میں جم جانے سے بنتی ہے لا کر دی اور کسی نامعلوم زبان میں کہا..... "مجھے تم سے محبت ہے..."

"وہ مجھے اپنے پریوں کے مسکن میں لے گئی اور وہاں اس نے سرد آہیں بھریں اور رو دی.... اور میں نے اس کی وحشی آنکھوں کو چوم چوم کر بند کر دیا اور وہاں اس نے مجھے سُلا دیا! آہ! اور وہیں میں نے پہاڑ کی ٹھنڈی زمین پر ایک خواب دیکھا.... آخری خواب!"

"میں نے زرد چہروں والے بادشاہ دیکھے۔ زرد شاہزادے اور زرد زرد سپاہی ان پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ یک زبان چلا رہے تھے۔ "حسین ساحرہ نے تجھے اپنا فریفتہ بنا لیا ہے"... میں نے دھندلکے میں ان کے ہونٹوں کو دیکھا جو کسی خوفناک انتباہ کے لئے کھلے ہوئے تھے!... میں چونک کر اٹھا! اور خود کو پہاڑ کی سرد زمین پر یہاں تنہا پایا!....

اور اس لئے میں نے یہاں ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور افسردہ و تنہا بھٹکتا پھرتا ہوں!.... حالانکہ جھیل کے کنارے کی سرسبز گھاس خشک ہو گئی اور پرندے اپنا گیت ختم کر چکے ہیں!...."

(مترجمہ تمنائی)

سحرِ حلال!

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم اے۔ گورکھپوری

جہاں سے لے لیا میں نے گریبانِ گلستاں کو
وہیں سے دیکھ پیدا ہوتے دامانِ بیاباں کو

یہ سامانِ جنوں سے کر چلا ہے کوئی زنداں کو
نگاہوں میں بیاباں کو لیے بیٹھے ہیں گلستاں کو

ادائے حسنِ آزردہ کے صدقے، کوئی کیا سمجھے
سرشکِ آلودِ مژگاں کو تبسم ہائے پنہاں کو

تماشائے چمن، حسنِ چمن، رازِ چمن کیا ہے
بہانہ چاہیے کوئی جنونِ فتنہ ساماں کو

بہارِ چند روزہ کو بہارِ جاوداں کر دے
قیودِ رنگ و بو سے کچھ الگ کر دے گلستاں کو

یہ کس جانب الٰہی شعلہ ہائے طور لپکے ہیں
نہ ٹھنڈا کر دیں اک لبِ تشنۂ دیدارِ جاناں کو

گلے کا ہار ہے ہستی کا یہ چڑھتا ہوا دریا
تو سمجھا چاک کر دیتے ہیں لے کر ہر گریباں کو

فریبِ حسن کھا جانا نہیں ہر اک کی قسمت میں
کوئی کرتا ہے یاد اب تک کسی کے عہد و پیماں کو

وہیں سے ہیں رگیں وابستہ ہر وحشت بھرے دل کی
جہاں سے جنبشیں ملتی ہیں دامانِ گلستاں کو

ابھی تو اک خلش سی ہو رہی ہے چند کانٹوں سے
انھیں تلوؤں میں اک دن جذب کرنا ہے بیاباں کو

کسی کا لو پھٹے دنیا سے اٹھنا، ہاں یہ ہونا تھا
کن آنکھوں سے کوئی کل دیکھتا تھا شامِ ہجراں کو

اشارے ہوں جنوں کے تیرے دیوانوں سے زنداں میں
جب ابھریں دل کی چوٹیں یاد کر لینا گلستاں کو

کسی کے وحشیوں نے کر لیا پیوند پیراہن
گریبانِ لحد کو، دامنِ شہرِ خموشاں کو

عنایت ہے، توجہ ہے، کرم ہے، لطف و احساں ہے
مگر کیا کیجیے تیرے تغافلہائے پنہاں کو

نگاہِ یار بزمِ ناز میں شہ دیتی ہے کیا کیا
تغافلہائے پیدا سے نوازشہائے پنہاں کو

کسی کے آستانِ ناز تو نے کیا کیا اُن سے
دھرے جو رو رہے ہیں مُنہ پہ دامانِ بیاباں کو

زمین و آسماں روکیں، مکان و لامکاں تھامیں
گریبانِ عدم سے وحشیِ دست و گریباں کو

مبارک اپنے ہی سر سے اب اپنے سر کو ٹکرانا
بہت شوریدہ سر رہتے تھے زنداں میں بیاباں کو

فریبِ رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے
ترے وحشی تو کب کے لے اڑے ہوتے گلستاں کو

مری جمعیتِ خاطر فراق اب یونہی ہے یعنی
پریشاں اور کر لینا خیالاتِ پریشاں کو

کرۂ آفتاب اور ذی روح مخلوق

از حضرت شبیر مارہروی

اس عنوان پر عرصہ سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ آیا چمکدار اجسام فلکی من حیث المجموع یا اس کا کچھ جز جاندار مخلوق سے آباد ہے؟ یہ مسئلہ منصۂ شہود پر آج ہی نہیں آیا بلکہ ہر زمانہ کے علما، حکما، وقتاً فوقتاً اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں میں اس وسیع مسئلہ پر کوئی بحث کرنی نہیں چاہتا بلکہ چند ماہرین فن کے دماغی پھولوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کرنا چاہتا ہوں

اس مسئلہ کے متعلق ماہرین فن کے پیش نظر خاص طور پر دو باتیں ہیں اولاً یہ کہ اگر ان اجسام فلکی میں جاندار مخلوق آباد ہے تو وہ کم از کم مادی اجزاء کے لحاظ سے بالکل کرہ ارضی کے انسان کی طرح ہونی چاہئے۔ دوسرے سورج چونکہ آگ کا پرکالا ہے۔ چاند میں چونکہ خنکی بہت زیادہ ہے اور عطارد میں حرارت حد سے زیادہ ہے اس لئے ان اجسام فلکی میں زندگی ناممکن ہے۔ مگر ذرا غور کیجئے کہ خدائے واحد و برتر خلاق ہژدہ ہزار عالم اگر چاہتا تو ہر کرہ فلکی میں وہاں کی حالت کے موافق جاندار مخلوق عالم وجود میں لا کر آباد نہ کر سکتا۔ کیا وہ جرم جو اصطلاح عام میں سمندر بولا جاتا ہے جاندار نہیں اور کیا اس کا وجود آگ میں نہیں پایا جاتا۔ اللہ پاک کی محدودات تخیل ہماری طرح نہیں ہے اور اس کی فہم و ذکاوت عقل انسانی سے بالاتر ہے۔

ایریگو فرانس کا ایک بہت مشہور منجم و فلاسفر گذرا ہے ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۵۳ء میں سفر آخرت اختیار کیا ۱۸۴۸ء میں فرانس کے انقلاب کے بعد وزیر جنگ اور وزیر بحر مقرر ہوا تھا۔ قوت جاذبہ اور قوت کہربائی کے متعلق اس نے متعدد ذہنی تحقیقاتیں کی تھیں۔ اس نے ایک موقعہ پر خوب کہا ہے کہ "اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ آیا سورج آباد ہے تو میں قطعاً [illegible] اعلان [illegible] گا لیکن۔۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آیا [illegible] ہے کہ سورج آباد کیا جا سکتا ہے تو میں ڈنکہ کی چوٹ سے اس کا جواب اثبات میں دونگا"

ہر زمانے کے علمائے دہر اور ماہرین فن نجم کے خیالات سورج کی جسمانی ساخت کے متعلق ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ دن کے اس سب سے زیادہ حرارت اور روشنی دینے والے بڑے کرہ فلکی پر غور کرنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح سمجھ لیا گیا کہ یہ آتش سیال کا ایک بڑا ڈھیر ہے ایک عرصہ تک لوگوں کا یہی اعتقاد رہا لیکن کچھ عرصہ بعد وقت آیا کہ فلاسفروں نے دوسرا رخ اختیار کیا جس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ سورج روشنی اور حرارت کا ایک گھومنے والا آلہ ہے اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ آتش سیال کا مجموعہ ہو یہ خیال بھی عرصہ تک عوام کے دماغوں پر طاری رہا چنانچہ انیسویں صدی میں تمام فلاسفروں کا یہی عقیدہ رہا۔ آخر ایریگو اٹھا اور اس نے بانگ دہل اعلان کیا کہ "سورج میں سکونت اختیار کی جا سکتی ہے"

پہلے خیال تھا کہ کچھ دھاتیں سورج میں برابر جل رہی ہیں یا تمام سورج آگ کا ایک پرکالا ہے لیکن اب فلاسفروں اور منجموں کی رائے ہے کہ سورج میں آتش فشانی کا جو کچھ بھی عنصر ہے اس کا سورج کے جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اس کے لفافہ میں ہے جو اسے چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے اسی ضمن میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ہم اس دنیا میں بسنے والے سورج میں جو چند سیاہ دھبے دیکھتے ہیں اس کے متعلق اب کہا جاتا ہے کہ یہ سورج کو احاطہ کرنے والے آتش فشاں لفافہ کے سوراخ ہیں جس میں سے سورج کے تاریک جسم کے حصے نظر آتے ہیں چونکہ اب عام طور پر فلاسفروں اور منجموں کی تحقیقات کے بموجب یہ تاریک حصص سورج کے سرد ترین مقامات ہیں اس لئے سورج کا لفافہ اس کو ایسی تصویری نہیں رہا جو امکانی مشاہدات سے مبرا ہو۔

بہرحال یہ فرض کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ سورج میں آبادی ہوسکتی ہے لیکن اس صورت میں اہالیان کرۂ آفتاب کے سامنے کس قسم کے نظارے اور ان کی نظروں میں اجسام فلکی کیسے ہونگے۔ پھر خود سورج کی کیا حالت ہوگی آخری سوال کا کوئی صحیح جواب ہم نہیں دے سکتے کیونکہ سطح آفتاب کے طبعی حال سے ہم ہنوز لاعلم ہیں۔ دوسرے سوالات کے متعلق البتہ کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے اور اس کے لئے مناسب ہے کہ اولاً چند ماہرین فن کے خیالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

جرمنی کا مشہور منجم "بوڈ" کہتا ہے کہ "اگر سورج میں آبادی ہو تو اُن کی مخلوق طرح طرح کے اکرام قدرت سے مالامال اور ہمیشہ ہر وقت سورج کی روشنی سے مستفیض ہوتی رہتی"۔

برخلاف اس کے "فونٹینلے" کہتا ہے کہ "سورج کی مخلوق اندھی ہوگی اور آرام و آسائش سے محض لاعلم"۔ اس کے ثبوت میں وہ دو باتیں کہتا ہے اولاً سورج کی روشنی اندھا ہونے کی صورت میں بھی آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے۔ ثانیاً یہ چمکدار لفافہ جو چاروں طرف سے سورج کو احاطہ کئے ہوئے ہے نظارۂ فلکی سے وہاں کی مخلوق کو محروم رکھے گا"۔

بعض ماہرین فن کا خیال ہے کہ سورج کے اس چمکدار لفافہ میں جو کھڑکیاں یا سوراخ ہیں ان کے ذریعہ سے وہاں کی مخلوق نظارۂ فلکی کی سیر کرسکتی ہے لیکن ایسا ہر شخص کے لئے ناممکن ہے۔ کرۂ آفتاب کرۂ ارض کے برابر نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں بڑا ہے اس کے قطر کو اگر موجودہ جہازات کی مدد سے عبور کیا جائے تو کم و بیش یہاں کی تین صدیاں صرف ہوجائینگی۔ ہمارا کرۂ ارض اپنے محور کے چاروں جانب گھوم کر دن اور رات کی گردش پورے چوبیس گھنٹوں میں ختم کردیتا ہے لیکن وہاں ہمارے یہاں کے خدا معلوم کتنے دن یا ہفتے صرف ہوتے ہونگے اس میں شک نہیں کہ ستارے جیسے ہم کو نظر آتے ہیں ایسے ہی وہاں کے باشندوں کو معلوم ہونگے لیکن ان کی رفتار وہاں بالکل مختلف ہوگی وہاں کے باشندوں کو تمام سیارے ایک ہی سمت میں گردش کرتے معلوم ہونگے وہاں سیاروں کی پیش روی یا واپسی یا اتصال کا کوئی ایسا سوال ہی نہ ہوگا جس نے ہماری دنیا کے گذشتہ منجموں کو سوچ اور حیرت میں ڈال دیا تھا وہاں عطارد اور زہرہ کی وہ مشابہت نہ ہوگی جس کا مشاہدہ یہاں کیا جاتا ہے وہاں اس کا بھی علم نہ ہوسکے گا کہ گردش کرنے والے کرہ ہائے فلکی ستارے ہیں یا سیارے اور یہ کہ انکی روشنی ذاتی ہے یا عارضی۔ فی زمانہ آفتاب کو گردش کرنے والا کرہ نہیں مانا جاتا۔ لیکن یہ کوئی اٹل فیصلہ نہیں ہے ممکن ہے کہ آئندہ چل کر ماہرین فن کا اس پر اجماع ہوجائے کہ وہ گردش کرتا ہے اور کم از کم اپنے محور کے گرد ضرور گھومتا ہے اگر ایسا ہوا تو اس کی ایک پوری گردش ایک سال ہوگی۔ لیکن کیسا سال؟ کرہ ارض کی صدیوں کے برابر۔

اب آخر میں ذرا سورج اور دوسرے اجسام فلکی کی تناسبانہ کیفیت بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ سورج کا قطر کم از کم تین لاکھ ساٹھ ہزار لیگ ہے (ایک لیگ برابر تین میل کے ہوتا ہے) محیط دس لاکھ لیگ سے بھی زیادہ ہے اس کے علاوہ وہ تمام جگہ جس میں سورج کا وجود ہے زمین سے کم از کم چودہ لاکھ گنی زیادہ ہے۔ زمین اور سورج کی کشش مرکزی کی تفریق کا خیال کیا جائے تو یہاں کی ہر چیز کا وزن وہاں ستائیس گنا زیادہ ہوگا مثلاً ایک آدمی کا وزن اس دنیا میں دو من چار سیر ہے اگر وہ کسی طرح کرہ آفتاب پر پہونچ جائے تو وہاں اس کا وزن کچھ کم و بیش ساڑھے چھپن من (۵۶ ½) ہوگا۔

اس وقت تک ماہرین فن نے سورج کے اجزاء وغیرہ کی جو ترکیب دکھائی ہے اس کا تعلق صرف اُس کو احاطہ کئے ہوئے لفافہ سے ہے۔ اندرونی حصہ کا کچھ حال ابھی تک معلوم نہیں۔ لہذا نہیں کہا سکتا کہ اس کی ساخت میں کون کون اجزا شامل ہیں اور اس کی کیا کیفیت ہے لیکن اگر اس کی حقیقت معلوم بھی ہوجائے تو سچ تو یہ ہے کہ انسان لاکھ تحقیقاتیں کرلے اور اپنے نزدیک قدرت کے تمام رازوں کو خوب سمجھ لے لیکن رموز قدرت کے علوم میں وہ بالکل طفل مکتب رہے گا۔ خدا کے کارخانے خدا ہی جانتا ہے۔ اس کے رازوں کو نہ کوئی سمجھ سکا اور نہ سمجھ سکیگا یہ جو کچھ ہے اپنے اپنے قیاسات ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس۔

شبیر مارہروی

لمعات

جناب محمد طفیل صاحب نیر بی۔اے بی ٹی امرتسری

آپ کی خودسری نہیں جاتی
اور مری بندگی نہیں جاتی

غیر سے دوستی نہیں جاتی
ہم سے بیگانگی نہیں جاتی

تنگ اتنا ہوں ضعف کے ہاتھوں
آہ بھی اب تو کی نہیں جاتی

کیونکر آئیں کہ اب مری حالت
اُن سے دیکھی سُنی نہیں جاتی

جان سے بھی گذر گئے ہیں ہم
آپ کی دل لگی نہیں جاتی

دل کو غم ہے عدم سے آنے کا
آج تک بیکلی نہیں جاتی

ولولے دل کے دل میں باقی ہیں
ان کی شرمندگی نہیں جاتی

مر کے ہی ہجر میں قرار آئے
یہ بھی امید کی نہیں جاتی

پی بھی لو آج وہ یہ کہتے ہیں
پارسائی چلی نہیں جاتی

کچھ حیا اور کچھ ندامت ہے
ان سے انگڑائی لی نہیں جاتی

فاقہ مستی ہی کیوں نہ ہو نیتر
مے سے توبہ تو کی نہیں جاتی

پابندِ رسوم

از جناب مولوی شیر محمد صاحب اختر

انند ایک قدامت پرست ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا خاندان پانچ پشت سے کلکتہ جیسے متمدن شہر میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود تہذیب حاضرہ سے کوسوں دور تھا۔ انند کے خاندان کا مورث اعلیٰ لوہار کا کام کرتا تھا لیکن اس کی اولاد نے ہتھوڑے کو کبھی ہاتھ بھی نہ لگایا کیونکہ گذارہ معاش کے لئے ان کی لوہے کی دکان تھی۔ دکان پر ایک لکڑی کا تخت تھا جس پر ایک صندوقچی نقدی ڈالنے کے لئے رکھی تھی۔ تخت پر ایک آدمی بیٹھا بہی کھاتہ لکھتا رہتا۔ حساب کے لئے کوئی عمدہ رجسٹر نہ تھے بلکہ معمولی کھاتے کی کتابیں جن کی جلدیں چمڑے کی تھیں ان پر حساب درج کیا جاتا۔ لکھنے کے لئے معمولی قلمیں استعمال ہوتیں۔ متواتر چار پشتوں سے یہی عمل رہا کبھی کسی کو خیال تک نہ آیا کہ بجائے اس کہنہ تخت کے میز کرسی اور قلم کے بجائے فونٹین قلم کا استعمال کرے۔ وہ برابر پرانے زمانے کی وہی بھدی سی گھڑیاں جیب میں ڈالے پھرتے تھے۔ وہ کمی تعلیم کی وجہ سے موجودہ تہذیب سے کوسوں دور تھے جب ان کے یہاں کا بچہ ذرا کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل ہوتا تو تعلیم چھڑا کر دکان میں لگا لیا جاتا اس لئے ان کے خاندان کا کوئی لڑکا اعلیٰ تعلیم تک نہ پہونچ سکا۔ جس سے ان کو نئی روشنی کی ہوا لگتی اور موجودہ فیشن کے دلدادہ ہوتے وہی سیدھا سادہ لباس اور پرانے فیشن کی طرز۔

مردوں کی طرح عورتوں کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ موجودہ تمدن سے بالکل بے بہرہ تھیں۔ تعلیم ان میں نام تک نہ تھی۔ شادی بارہ سال ہی کی عمر میں کردی جاتی تھی اور خانہ داری کا بوجھ ان پر ڈالدیا جاتا۔ ان کا بچپن گھر کے معمولی کام کاج۔ چھوٹے بچوں کے دل بہلانے یا گڑیوں سے کھیلنے میں گذر جاتا اپنے چھوٹے بھائیوں کے کھلانے کے لئے ہمسایوں کے گھروں میں اکثر جایا کرتی تھیں اور وہاں سے اپنی شادی کے متعلق بہت سی باتیں سن آتیں چھوٹی عمر میں ہی شادی کے لفظ سے ان کے کان آشنا ہوجاتے اس لئے شادی کے بعد ان کی زندگی میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوتا ان کو اپنے ماضی یا مستقبل کا کبھی خیال نہ آتا۔ وہ اپنے حال میں مست رہتے۔

ان کا روزمرہ کا کام صبح بستر سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلا جانا اور باورچی خانے سے اپنے بستر میں پڑ کر سو رہنا تھا۔ چند سالوں میں تین بچے ان کی گود میں کھیلنے لگتے جنھیں آئندہ لوہے کی دکان کا مالک ہونا تھا یا چند بچے عدم توجہی یا کافی نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے مرجاتے۔ اگر خاندان میں لڑکی پیدا ہوجاتی تو وہ حسب معمول چند سالوں کے بعد دوسرے خاندان میں پہونچ جاتی اور محنت سے کمایا ہوا بہت سا روپیہ خرچ کردیا جاتا لڑکیاں مائیں بن جاتیں اور اسی طرح بچے نوجوان ہوجاتے ان کی تربیت میں ماؤں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ ان کے دل میں اپنے بچوں کے مستقبل کے متعلق کبھی کوئی خواہش پیدا نہ ہوتی تھی اور نہ کبھی انھوں نے اپنے بچوں کی زندگی اعلیٰ بنانے کی کوشش کی۔ ان کے بچے جوان ہوکر صاحب اولاد ہوجاتے اور یہ چکر اسی طرح جاری تھا۔

زمانہ گو بہت دور جاچکا تھا مگر اس خاندان میں کوئی نئی چیز داخل نہ ہوئی تھی گھر کا روزمرہ کا کام یا بچوں کی دیکھ بھال ان کا تمام دن کا دھندا تھا ان کے لئے اسی کا نام دنیا تھا۔ ان کے دماغ میں دنیا کا تخیل اس کے سوا کچھ نہ تھا مرد اگر ضروریات سے زیادہ کما لاتے تو اس کے خرچ کا وہی پرانا طریقہ۔ تیوہاروں پر دل کھول کر رشتہ داروں کی دعوت، کپڑے اور زیورات میں خوب اڑایا جاتا۔ آخر اس زائد رقم کا مصرف ایسا ہی لازمی ہے۔

خاندان کے افراد میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور کاروبار میں کمی ہوئی ایسی حالت میں ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انند رکھا گیا۔

جب انند اپنے خاندان کے رواج کے مطابق چند جماعتیں مدرسہ میں پڑھ چکا تو اس کے باپ نے چند دوستوں کے مشورے سے اعلیٰ تعلیم دلانے کا تہیہ کرلیا اور اسے ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر دس سال کی تھی۔ اور لڑکوں کی دیکھا دیکھی انند نے بھی اپنی روش بدلی اور وضع قطع میں اچھا خاصا جنٹلمین بن گیا کیونکہ اب اسے تہذیب حاضرہ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا۔ باپ نے یہ مہربانی کی کہ اس کے لئے ایک معلم رکھ لیا تاکہ وہ جلد از جلد تعلیم حاصل کرے اور مقبول عام ہو۔ گھر میں تو ہمیشہ "بازار مندا ہے"۔ "فلاں کا دینا ہے" اور "فلاں سے لینا ہے"۔ "بازار کا بھاؤ چڑھ رہا ہے"۔ الفاظ سے اس کے کان آشنا ہے مگر اب اسے گویا دوسری دنیا میں پاؤں رکھنے اور امتحان میں زیادہ نمبر لینے کا شوق پیدا ہوا۔ چونکہ اسے بچپن ہی میں دولت پیدا کرنے کی رغبت دلائی گئی تھی اس لئے رہ رہ کے اسے خیال آتا کہ کیا تعلیم میں منہمک رہ کر امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرتا ہوا وہ زیادہ دولت سمیٹ سکتا ہے اگر ایسا نہیں تو یہ لڑکے اس کامیابی پر کیوں اتنا اتراتے ہیں۔

چونکہ نوجوانوں کے دماغ میں تاثرات قبول کرنے کی زیادہ اہلیت ہوتی ہے اس لئے وہ بہت جلد تہذیب موجودہ سے مانوس ہوگیا اور سمجھنے لگا کہ غیر مادی اشیاء مثلاً علم کی تحصیل اور جذبات رغبت و نفرت کا احساس موجودہ تہذیب کے نزدیک اس سے افضل تر تھا کہ دولت جیسی مادی اشیاء کا جنون پیدا کیا جائے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے خاندان میں "جو نئی روشنی سے منور نہ تھا" تہذیب نو کا رہبر خیال کرتا تھا اس کے اطوار اور بول چال میں نمایاں فرق آچکا تھا۔

وہ اپنے لب و لہجہ اور تلفظ کا خاص خیال رکھتا تھا تاکہ اس کی زبان سے ایسا کوئی لفظ نہ نکلے جس کے لئے اسے خفت اٹھانی پڑے وہ انگریزی کے الفاظ اپنی گفتگو میں بولنے کی کوشش کرتا۔ گھر ہو یا باہر ہر جگہ جہاں موقع ملتا وہ انگریزی الفاظ کا استعمال بلا دھڑک کئے جاتا گویا اسے فخر سمجھتا اب انگریزی میں اُسے کافی مہارت ہوگئی اس نے اپنی دکان کا حساب کتاب بھی انگریزی میں لکھنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں اس کی عجیب و غریب انگریزی پڑھنے والوں کے لئے مذاق کا سامان بہم پہنچاتی تھی مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ دوسرے لوگ خواہ کچھ کہیں لیکن اس کے خاندان کے لوگ اس کی عزت کرتے اور خاص کر



اس کی والدہ تو فخر سے کہا کرتی کہ میرا آنند صاحب کی طرح لکھتا ہے۔

اب آنند نے میٹرک کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا اور خوشی خوشی کالج میں داخلہ کی تیاری کرنے لگا۔ لوازمات ضروری اور کتب ہائے جدیدہ کے لئے کافی روپیہ درکار تھا اور خاص کر اپنی نئی وضع کے لئے بھی۔ اس کی نئی تعلیم اور لیاقت پر اس کی والدہ حد درجہ فدا تھی اس سے اسے ماں سے کافی خرچ مل گیا۔ اس نے اپنا پرانا کوٹ پاجامہ اتار پھینکا اور ایک اعلیٰ درجے کا سوٹ تیار کرالیا اور کالج میں داخل ہو گیا۔ اس کا یہ خیال یقین کے درجہ تک تھا کہ اگر میں سوٹ پہن کر کالج میں نہ گیا تو ہم جماعت مجھے حقیر سمجھینگے۔

اسے اپنے اباواجداد کا "لوہے کا کام" یعنی (لوہاروں کا پیشہ) خیال کر کے بہت شرم آتی تھی۔ اسے ہر وقت دل میں یہ خدشہ لگا رہتا کہ اگر کالج کے دوستوں کو میرے اباواجداد کا یہ پیشہ معلوم ہو گیا تو شاید وہ مجھ سے نفرت کرنے لگ جائیں۔ وہ اپنے خاندان کے متعلق کبھی کسی سے گفتگو نہ کرتا۔ لوہے کی تجارت سے ان کو گرانقدر نفع حاصل نہیں ہوا اگر وہ بہت مالدار ہوتے تو بقول "سونا سب عیبوں کو چھپا لیتا ہے" ان کا یہ نقص بھی چھپ جاتا مگر ایسا نہیں ہے وہ ماں سے کہا کرتا۔ اماں اگر ہمارے لوہے کے گودام میں کہیں سے پارس کا پتھر آجائے اور تمام لوہا سونا بن جائے تو کیا ہی اچھا ہو مگر یہ سب کچھ میرے ہی طفیل ہوگا۔ کاش میں اس گھرانے میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ ماں خوش ہو کر کہتی کہ میرے پیارے آنند تم ہی میرے لئے پارس ہو اور تمہاری ہی ہمت اور جوانمردی سے ہمارا خاندان مشہور ہوگا۔

وہ اپنے گھر والوں کو ہمیشہ صحت و صفائی کی طرف توجہ دلاتا رہتا اور پرانے خیالات جو ان کے دل میں جاگزیں تھے احسن طریقہ سے ان کی تردید کرتا اور نئی بودوباش کے طریقے ان کے ذہن نشین کرتا گو اس میں اسے بڑی مشکلات کا سامنا ہوا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔

ایک دن وہ اپنے استاد کے گھر گیا اور ان کی ہر ایک چیز کو غور سے دیکھا۔ ان کے گول کمرے کی آرائش اسے بہت پسند آئی۔ اس نے بھی اپنا کمرہ اسی طرح سجانا تجویز کیا اور میز و کرسیاں خرید لایا۔ پھر تمام دن تعطیل کا اس نے کمرہ سجانے میں صرف کیا۔ اب کمرہ واقعی خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

دوسرے دن جب وہ کالج سے واپس آیا تو دیکھا کہ کرسی پر بھیگا ہوا تولیہ اس کے والد نے رکھا ہے اور دوسری طرف ایک پرانا کوٹ اس کے بڑے بھائی نے۔ اب آگے جو دیکھا تو میز جس پر بجائے میز پوش کے (جو لا نہ سکا) ایک رنگدار کاغذ بچھایا ہوا ہے اس پر کسی نے سرسوں کا تیل الٹ دیا ہے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ الٹنے والے صاحب وہی تیل میز پر سے اپنے پاؤں کو دیوار پر لگا کر ملتے رہے جس سے دیوار پر بھی بدنما دھبے پڑ گئے۔ آنند غصے سے دیوانہ ہو گیا اور حرکت کرنے کی ہمت نہ رہی کوٹ اور تولیہ تو باہر پھینک دیئے پھر اپنی بے بسی پر خوب دل کھول کر رویا۔

آنند کی بدقسمتی کا یہیں خاتمہ نہیں ہوا۔ بیچارے نے ایک پرانی چادر لے کر اس کے چاروں طرف اپنی ماں کی پھٹی ہوئی ساڑی کے کنارے سی کر دروازے کا پردہ تیار کیا تھا کسی نے اس میں سے ایک رومال کے برابر کپڑا پھاڑ لیا۔ باقی پردے سے کسی نے برتن صاف کئے۔ دیوار پر کوئلے سے کسی نے دودھ کا حساب لکھ دیا۔ آنند کو یہ دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے کمرہ میں کوئی شیطان گھس کے تمام کمرہ کا ستیاناس کر گیا ہے۔ بیچارے نے ایک آہ سرد کھینچی اور دل سے گھر والوں کو تہذیب یافتہ بنانے کا خیال نکال دیا۔

جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف سے مایوس ہو گیا تو اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا ہمنشین بنانے کے درپے ہوا اور ہمیشہ اسے اپنے استاد کے گھر لے جاتا کبھی کبھی کالج میں بھی۔

ایک دن آنند اپنے چھوٹے بھائی کو چند ضروری ہدایات دیکر اپنے ساتھ کالج لے گیا۔ لڑکا اپنے بھائی سے بہت ڈرتا تھا اس لئے چپ چاپ بیٹھا رہا آنند اسے کھیل کے کمرہ میں لے گیا۔ لڑکے کا چہرہ گول مول تھا اس لئے ہر ایک طالب علم اسے ٹھوڑی سے پکڑ کر ہلا دیتا۔ اس کے موٹے موٹے گالوں کو پکڑ کر دباتا۔ لڑکے نے ایک دو منٹ صبر سے کام لیا مگر وہ اس حرکت کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اس نے ایک طالبعلم کو ایک گھونسہ لگایا اور کہا "بندر دور ہو" سب لڑکے کھل کھلا کر ہنس پڑے لیکن آنند کا برا حال ہو گیا۔ شرم سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اسے یقین تھا کہ دوسرے لوگ خیال کرتے ہونگے کہ آنند کے خاندان کے لوگ کیسے بدتمیز ہیں کہ پیار کرنے سے بچے چڑ جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد اس نے کبھی بھائی کو کالج لے جانے کی جرات نہیں کی۔

ایک دفعہ اس نے گھر والوں کو لباس تبدیل کرانے کی کوشش کی مگر ہر طرف سے اس کی مخالفت کی گئی۔ نئے لباس کا مطلب نیا خرچ تھا۔ بچوں کے

لئے لباس چنداں ضروری بھی نہ تھا۔ وہ صرف خوراک ہی پر قانع تھے۔ نوجوان طبقہ کے لئے ایک دھوتی یا ساڑھی کافی تھی اس کے سوا لباس میں زیادتی کرنا فضول تھا اس کی باتوں پر سب کہا کرتے۔ "اپنے فیشن کو اپنے پاس رکھو۔ تمہارا خیال یہ ہے کہ بنگالی لوگ اپنے گھروں میں بھی ہر وقت عمدہ کپڑے پہنے رہیں۔ کل تم کہوگے کہ کھانا میز پر کھاؤ۔ ناچا کرو ...... انگریزی تعلیم نے تمہیں تو مکمل فرنگی بنا دیا ہے"۔

انند کے لبوں پر ان بیہودہ اعتراضات کے جوابات آکر رک جاتے وہ بڑوں کو جواب دینا بے ادبی سمجھتا۔ آخر اس نے ہار مان لی اور اسے یقین ہوگیا کہ ان کی ذہنیت کو جو کئی پشتوں سے لوہے کا کام کرنے کی وجہ سے لوہے کی طرح سخت ہوگئی ہے تبدیل کرنا ناممکن ہے اس لئے اس نے خاموشی اختیار کی ان سب تبدیلیوں کو اپنی ذات ہی کے لئے محدود کرلیا۔

اپنے استاد کے گھر آمد و رفت سے آنند کی بہت عزت ہوگئی گویا وہ انہیں میں کا ایک فرد ہے۔ استاد گو خود ایک متوسط درجہ کا انسان تھا مگر لیاقت علمی اور خوش خلقی کی وجہ سے اکثر بڑے بڑے امیروں سے اس کی ملاقات تھی انند کا بھی تعارف کرایا گیا۔ استاد شاگرد۔ ہر مجلس اور سوسائٹی میں یکجا ملتے وہ اپنے خاندان کے متعلق ہمیشہ اخفا سے کام لیتا۔ زیادہ کسی کے اصرار پر یہی کہتا کہ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں ایک نامور استاد کا شاگرد ہوں۔

ایک دن استاد کے یہاں ایک دعوت تھی جس میں بہت سے زن و مرد مدعو کئے گئے۔ کمروں کی درستگی اور زیبائش کے لئے کئی لڑکے کام میں مصروف تھے انند بھی موجود تھا اور اپنی خوش مذاقی اور ذہانت کا سکہ بٹھلانے کے لئے نہایت انہماک سے ڈرائنگ روم کو آراستہ کر رہا تھا۔

انند دیوار پر ایک نقشہ لٹکا رہا تھا۔ شام ہوگئی تھی اچانک ایک نوعمر لڑکی کمرے کی زیبائش دیکھنے کے لئے اندر داخل ہوئی اتفاقاً اسی وقت بجلی بھی روشن ہوگئی۔ جوں ہی انند نے ادہر دیکھا سمجھا کہ اس پر بھی بجلی گر پڑی گویا وہ آگ کا شرارہ تھا جس نے انند کو جلا کر راکھ کردیا۔ وہ بالکل مبہوت ہوگیا قریب تھا کہ وہ اسٹول سے گر کر بیہوش ہوجائے مگر اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

انند کا رنگ یکایک متغیر ہوگیا۔ اسے اپنی اس حالت پر شرم آئی۔ وہ

حیران تھا کہ یہ حسن کی دیوی کون ہے جو ایسے وقت کمرے میں آئی؟ اس لڑکی کے دماغ سے وہ اپنے متعلق یہ غلط فہمی کس طرح دور کر سکتا ہے کہ اس کی حالت اتنی بری نہ تھی جتنی اس وقت صفائی کرنے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ کمرے میں دوسری لڑکیوں نے آنے والی لڑکی کا خیر مقدم ایک بلند قہقہہ سے کیا۔ نوجوان لڑکیوں کے چہرے خوشی سے جگمگا اٹھے۔

صاحب خانہ کی دختر برونا نے کہا "اجالا ذرا ادھر آؤ، میں تمہارا تعارف مسٹر انند سے کراؤں جو پتاجی کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ہونہار اور لائق ہیں۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں اپنی خداداد لیاقت اور قابلیت کے باعث ممتاز ہیں۔"

اجالا مسکرائی اور انند سے مخاطب ہو کر بولی "امید ہے کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح آپ کی تعریف کرنا جلدی سیکھ جاؤں گی۔"

برونا نے کہا "تم بھی تو ہم میں بہت ممتاز ہو۔ مسٹر انند کیا آپ جانتے ہیں کہ جو اجالا کو ایک بار دیکھ لے وہ انہیں کبھی نہیں بھولتا۔ ذرا خیال رکھئے ان کے اور لوگ بھی مداح ہیں۔"

اجالا کے چہرے پر بےچینی کے آثار نمودار ہوئے انند اس کے لئے ایک اجنبی شخص تھا۔ پہلی ملاقات میں اس کے سامنے اس طرح بے تکلفی سے باتیں کرنا مناسب نہ تھا۔ اس نے برونا کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اب اپنی بکواس بند کرو۔" وہ جلدی سے مڑی اور کمرے کے دوسری طرف جہاں دوسرے طالب علم کام میں مصروف تھے چلی گئی۔ جاتے وقت اس نے انند کو خوب غور سے دیکھا۔ مڑتے ہوئے اس کی ساڑی کے کنارے چمکے جن پر زردوزی کا کام کیا ہوا تھا لیکن وہ چلی گئی۔

انند مشتاق نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی رفتار اپنے اندر ایک شان امتیاز لئے ہوئے تھی اس نے کہانیوں کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک شہزادی جب چلتی تھی تو اس کے قدم قدم پر پھول جھڑتے تھے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گویا کتابی شاہزادی اس کے سامنے آ گئی ہے۔ عالم خیال میں وہ سوچنے لگا کہ کیسا خوش قسمت ہوگا وہ شخص جسے یہ اپنی محبت کے لئے منتخب کرے گی۔

انند خیالات کے طوفان میں بہا چلا جا رہا تھا۔ برونا جو اسے بغور دیکھ رہی تھی اس کے دلی جذبات کو تاڑ گئی اس نے انند کے کان میں آ کر کہا "کیا اجالا کے پجاریوں میں تم بھی اپنا نام درج کرانا چاہتے ہو؟ اگر یہ سچ ہے تو تم سب پہ بازی لے جاؤ گے۔"

انند کی نگاہیں شرم سے نیچے جھک گئیں لیکن دل میں وہ بہت مسرور تھا۔ وہ برونا کے الفاظ کو محض مذاق نہیں سمجھتا تھا کیونکہ اس سے اس کے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی لیکن برونا کو ٹالنے کے لئے کہنے لگا۔ "آپ مجھ سے کیوں مذاق کرتی ہیں، بھلا میری قسمت میں یہ عزت کہاں لکھی ہے؟"

اجالا کے چاروں طرف اس کے مداح جمع ہو گئے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا لئے۔ ہر ایک کو وہ رقابت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ اجالا اس کے ساتھ کیوں باتیں کر رہی ہے یا ہنس رہی ہے۔

انند دوسری طرف کچھ اور سوچ رہا تھا اس کا تخیل اس کے سامنے وہ نقشہ پیش کر رہا تھا کہ جب وہ اپنی علمی قابلیت اور خداداد ذہانت سے اجالا کے چاہنے والوں کو زک دیگا اور پھر وہ اس کی ہوگی۔ وہ اس ہنگامے میں اپنے ان خیالات کو پریشان نہ کرنا چاہتا تھا جو اس کے دماغ میں اس وقت آ رہے تھے الفاظ کے جو موتی بکھیر کر وہ اجالا کو اپنا بنانا چاہتا تھا اس شور میں گم ہو جائینگے اور اجالا کی نگاہ ان پر نہ پڑیگی۔

سورج غروب ہو چکا تھا مگر افق پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ اجالا کمرے سے جا چکی تھی مگر کمرے کی فضا میں خوشی کی لہریں ابھی تک متموج تھیں۔ اجالا کی یاد انند کے دل کو جلا رہی تھی وہ اجالا کے متعلق پورے حالات معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے لیکن برونا سے سوال کرتے وقت وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کا مذاق نہ اڑائے۔

پرانے زمانے کے بھیمو کی طرح وہ بھی اپنے دشمنوں کا اکیلا مقابلہ کر رہا تھا گو اس کا مقصد کسی حکومت کا حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ دل کی دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا جس کے لئے زیادہ جرات اور جوانمردی کی ضرورت ہے انند کو یقین تھا کہ وہ ضرور اس معرکہ میں کامیاب ہوگا۔ یہ جنگ اس کے دل کی جنگ تھی اس کا ہتھیار اس کی گفتگو تھی۔ وہ اس ہتھیار کو استعمال کرنے کے متعلق کہا کرتا تھا کہ وہ اس وقت کا منتظر ہے کہ جب اجالا یہ کہنے پر مجبور ہو جائے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

انند حیران تھا کہ بروناکیوں اس معاملہ میں دلچسپی لے رہی ہے اسے اور اجالا کو دوسرے تیسرے دن برونا کی طرف سے چاء پر مدعو کیا جانے لگا۔ برونا انھیں اپنے پائین باغ میں دعوت دیتی تھی جہاں صرف چند لوگوں کی جگہ تھی اصل میں برونا زیادہ مہمانوں کے خرچ کی بھی کفیل نہ ہوسکتی تھی اس لئے محض بے تکلف دوستوں ہی کو بلایا جاتا ان دعوتوں میں انند خاص طور پر مدعو کیا جاتا بعض دفعہ اجالا ہنسی ہنسی میں انند کو کہا کرتی کیا برونا سے تمھارا کوئی خفیہ معاہدہ ہے کہ وہ ہر بار تمھیں ہی بلاتی ہیں اور صرف تم ہی ایک ہو کہ ہمیشہ ہر دعوت میں پیش پیش رہتے ہو ورنہ اور لوگ تو کبھی کبھی آتے ہیں۔" برونا مسکرا کر جواب دیتی کہ ان کا آنا میرے لئے نہیں بلکہ ہر دعوت جہاں اجالا مدعو کی جائیگی مسٹر انند کا ہونا ضروری ہے وہ تمھیں خوش کرنے کے لئے ہر جگہ تمھارے پاس ہوتے ہیں۔"

انند نہایت اخلاق سے ان باتوں کی تردید کرتا اور برونا سے کہتا "میں آپ کی اس عنایت کا ممنون ہوں۔ میرے پاس اتنے الفاظ نہیں کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرسکوں میری خاموشی سے آپ بُرا نہ مانیں۔" پھر وہ اجالا کو مخاطب کرکے کہتا۔ "میں مانتا ہوں کہ میں آپکے دل پر فتح نہیں پاسکا گر آپ کی قربت مجھے بہت زیادہ عزیز ہے لیکن اس عزت کو میں دھوکے سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔

برونا اپنی ہنسی کو روک نہ سکی اور کہنے لگی۔" انند تم دھوکہ باز نہیں مگر حدود سے تجاوز ضرور کر رہے ہو۔ اجالا کے متعلق محبت اور خوشامد کی پردوں میں ملفوف ہے لیکن امید ہے کہ تم اپنی صحیح فطرت سے ان رکاوٹوں کو اپنے راستے سے دُور کرسکوگے تمھیں ایک بات کا ضرور اعتراف کرنا پڑیگا کہ میں اس معاملہ میں کافی مدد کر رہی ہوں۔"

اجالا ان باتوں سے شرما گئی وہ اس قدر کھل کر باتیں کرنا پسند نہ کرتی تھی لیکن برونا بار بار ان باتوں کا تذکرہ کر رہی تھی انند خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہوگیا۔ آخر وہ دن آگیا جس کی انھیں تمنا تھی شام کا وقت تھا اور چاندنی پھیلی ہوئی تھی دونوں برونا کے پاس باغ میں بیٹھے ہوئے تھے برونا کسی کام کے لئے اٹھ کر چلی گئی۔ انند نے آسمان کی طرف دیکھا ہلکے ہلکے سفید بادل بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے پھر اس نے اپنا ہاتھ اجالا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اجالا نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانا پسند نہیں کیا بلکہ وہ شرما گئی اور اس کی آنکھوں سے محبت کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور جسم میں خفیف سی لرزش۔

اُجالا بولی۔" تم میرے دل کے اس قدر قریب کیوں ہوگئے ہو اور مجھسے کیا چاہتے ہو؟"

انند نے کہا۔" پیاری میں تمھارا ہاتھ ہمیشہ کیلئے اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں"

اُجالا:۔ تم جانتے ہو یہ کس کا ہاتھ ہے؟ تمھارے پاس دولت، نام اور عزت ہے لیکن میں کیا ہوں تمھارے لائق نہیں ہوں۔"

انند:۔ میرے لئے تم سب کچھ ہو۔ تمھیں کیا خبر کہ تمھیں حاصل کرنے کیلئے مجھے کن فولادی قلعوں کو سر کرنا پڑا۔ اب تم نے مجھے جو عزت دی ہے وہی میری دولت ہے میں اسی طاقت پر تمھارا طلبگار ہوں ورنہ میرے پاس اور کچھ نہیں۔

اُجالا:۔ آدمی جو کچھ اپنے آپ کو بنالے اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں اگر میں اس نظریہ پر کاربند نہ ہوتی تو شاید تم سے گفتگو کرنے کی جرات نہ کرسکتی۔ دولت، خاندان اور سوسائٹی پر آدمی بجا فخر کرسکتا ہے لیکن یہ فخر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا اصلی سونا کان سے نکلتا ہے بنایا نہیں جاتا۔"

ان کے یہ دن ایک خوشگوار خواب کی طرح گذرتے چلے جارہے تھے ایک دن انند نے اجالا سے کہا کہ ہم ایک دوسرے کو اب مسخر کرچکے ہیں لیکن باہر کی دنیا کا بھی ہم پر کچھ حق ہے میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور کون ہوں۔ تم یہ سن کر حیران ہوگی کہ ہمارے خاندان کی کوئی عورت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ مرد صرف اپنا نام لکھنا جانتے ہیں یا حساب لکھنا۔ میرا دادا ہمیشہ کامکار (لوہار) لکھا کرتا تھا ہم نے اب کامکار کا لفظ اپنے ناموں سے ہٹا دیا ہے کیونکہ یہ لفظ باعث تذلیل ہے۔"

انند کے چہرے پر شرم سے پسینہ آگیا اس کا جسم کانپ رہا تھا وہ بناوٹی ہنسی ہنس رہا تھا اور اس کی نظریں اجالا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اجالا کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا وہ مسکرائی۔" یہ کون سی بات ہے میرا باپ اپنا نام داس چمکار (چمار) لکھا کرتا تھا۔ جب مجھے ہوسٹل میں داخل کرایا گیا تو میری استانی نے یہ لفظ میرے نام سے کاٹ دیا۔"

ممکن ہے کہ یہ کچھ اور بھی طویل ہوسکتا لیکن ہندوستانی سماج کی پابندیوں نے انند کو ذیل کا خط لکھنے پر مجبور کردیا۔

"اجالا میں تمھیں اپنے متعلق کچھ نہیں لکھ رہا کیونکہ مجھے اس کا حق نہیں تم جانتی ہو کہ ماں کی ہستی کتنی قابل تعظیم ہستی ہے اس کا ہماری زندگی پر کس قدر حق ہے؟ میری ماں نے جب سے ہمارے متعلق سنا ہے اسی وقت سے چارپائی پر پڑی ہوئی ہے میں اس کے دل کو مجروح نہیں کرسکتا میں آئندہ زندگی کی اس خوشی اور مسرت کو خیرباد کہتا ہوں جو تم سے وابستہ تھی اور اپنی ماں کی محبت پر اُن کو نثار کرتا ہوں۔ بدنصیب انند کو بھول جاؤ وہ تمھارے قابل نہیں رہا۔

انند

اللہ اکبر

جناب حکیم خورشید حسن صاحب خورشید سہارن پوری

وہ جو ٹوٹی ہوئی کشتی بھنور میں تھام لیتا ہے
وہ جس کا ناخدا طوفاں میں گھر کر نام لیتا ہے

وہ جو بنتا ہے مونس آشیانہ جلنے والوں کا
اسیروں کی خبر جو آکے زیرِ دام لیتا ہے

وہ آملتا ہے دشت آوارگانِ نا امیدی میں
وہ چشمِ یاس سے جو دید کا پیغام لیتا ہے

وہ اک نقشِ حسیں جو کھنچ نہیں سکتا تخیل سے
جو ہنگامِ نظر رنگینیٔ اوہام لیتا ہے

وہ رنگِ ابتدا میں حسنِ بے تمثال کی حیرت
خرابِ جلوہ جس سے عشقِ بے انجام لیتا ہے

وہ کوہِ طور پر جو برق بن کر خود چمک اُٹھا
وہ۔ وقتِ دید۔ جانسوزی کا جو الزام لیتا ہے

بیاضِ صبح جس کے عارضِ تاباں سے وابستہ
وہ مشرق جس کی زلفوں سے سوادِ شام لیتا ہے

شکستہ خاطری میں کاوشِ پیہم مٹانے کو
وہ جو ٹوٹی ہوئی منزل پہ آرام لیتا ہے

خودی ناکام کو وہ۔ ناشناسِ راز۔ جو رکھے،
مئے عرفاں کا جو بیخودی کی خاطر جام لیتا ہے

شکستہ پر قفس بر باد نومیدِ نشیمن بھی
اُسی کا آسرا رکھ کر اُسی کا نام لیتا ہے

ٹپک جاتے ہیں سازِ غم سے بھی نغمے طرب آشنا
ذرا مضرابِ رحمت سے وہ جس دم کام لیتا ہے

وہی مولا ہے میرا جس کی درگاہِ عطوفت سے
دعائے عام پر خورشید خاص انعام لیتا ہے

"شاخِ نبات"

یعنی
طالب باغپتی کے مجموعۂ کلام پر ایک نظر

از جناب مولانا یوسف سلیم صاحب بی۔ اے بریلوی

جہان، انقلاب مسلسل اور تغیرات پیہم کا نام ہے اور حیاتِ ارضی کا ہر شعبہ اس قانون کا پابند ہے پس جس طرح آج کل انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں تبدیلیاں رونما ہیں۔ ہماری شاعری کا انداز بھی بڑی حد تک بدل گیا ہے جن باتوں کو گذشتہ صدی کے شعرا "شعر کی جان" سمجھتے تھے آج کل انھیں بالکل بیکار قرار دیا جاتا ہے۔ اب نہ تعبیر کی "قفس کی تیلیاں" ہیں نہ امانت کی لفظی طلسم آرائیاں۔

اس نئے دور کا آغاز مولانا حالی مرحوم کی شاعری سے ہوتا ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ ہندی شعرا کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ شاعر کا کام صرف یہی نہیں کہ "شکن آلودہ بستر" سے گواہی دلوائے۔ بلکہ روح کو بیدار کرنا اور واردات قلبی بیان کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ حالی کے رنگ کو ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال مدظلہ نے اس درجہ فروغ دیا کہ اب ان کی شاعری نوجوان شعراء کے لئے عیارِ سخن بھی بن گئی ہے اور مشعلِ راہ بھی۔

ان لوگوں میں جنھوں نے قدیم طرز سے ہٹ کر اپنے خیالات کے اظہار کے لئے نئی راہیں اختیار کی ہیں طالب باغپتی ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مجموعۂ کلام جو حال ہی میں شاخِ نبات کے نام سے شایع ہوا ہے خاص طور سے ان نکتہ سنجوں کی توجہ کے لائق ہے جو جنس گرانمایہ کے خریدار ہیں اور بے کیف و اثر کلام سے مجتنب رہنا پسند کرتے ہیں۔

اگرچہ مجھے جناب جگر کے تبصرہ میں جو انھوں نے "شاخِ نبات" پر لکھا ہے بعض نظریات سے اختلاف ہے تاہم ان کی قادر الکلامی اور خداداد شعری قابلیت کا معترف ہوں۔ اس لئے طالب کے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ میری نظر میں مستند ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جناب جگر کی رائے کو پیش کر دینے کے بعد مجھے بطور خود کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔

> "جناب طالب سلیم الفطرت، وسیع المشرب لطیف الخیال انسان واقع ہوئے ہیں اور متاثر ہونے والا دل و دماغ رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں ان کی خصوصیات زندگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے شعر و ادب کو حسن و عشق کی واردات لطیف جذبات و محاکات تک محدود رکھا ہے۔۔۔۔ انھوں نے قیاسات اور تقلید کی بنا پر کچھ نہیں کہا بلکہ سوچ سمجھکر محسوس کر کے اور بصیرت و فراست کے ماتحت۔۔۔۔ ان کے شعر میں ان کی زندگی محسوس طور پر پائی جاتی ہے اور وہ چیز زندگی ہی ہے جو شاعر کے کلام کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔۔۔۔۔۔"

جناب طالب خوش قسمت ہیں کہ انھیں جگر جیسے شاعر باکمال نے مذکورہ بالا الفاظ میں داد دی ہے۔ گو ان سے میری شناسائی نہیں تاہم میں اس عزت افزائی پر انھیں بصمیم قلب مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

طالب کی شاعری میں سوز و گداز کا پہلو بہت نمایاں ہے بعض لوگ اسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے لیکن میں یہ عرض کرونگا کہ شاعر حقیقی شاعر وہی ہے جو واردات قلبی کو نظم کر دے اب جو شاعر فطرت سے سوز و گداز لے کر آیا ہو، یا جسے دنیا میں حرمان اور مایوسی سے دوچار ہونا پڑا ہو وہ اگر ع

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نہ کہیگا تو اور کیا کہے گا؟

اس کے علاوہ حقیقی شاعر حسن مطلق کا پرستار ہوتا ہے نہ کہ "ساق سیمیں" اور "چشم میگوں" کا۔ اور یہ بات حسن مطلق کی ماہیت میں داخل ہے کہ وہ "قابو" میں نہیں آتا اور اگر آجائے تو حسن مطلق نہیں رہتا "سلمیٰ"۔ "لیلیٰ" یا "رامی"۔ بن جاتا ہے ظاہر ہے کہ سب مٹی کی مورتیں ہیں اور فانی اسی لئے شاعر مشرق نے کہا ہے ؎

تو شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام
(اقبال)

اس لئے حقیقی شاعر کے کلام میں سوز و گداز کا رنگ پایا جانا اس کی روحانی بلندی کی دلیل ہے۔ ؏ ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

اب میں شاخ نبات سے کچھ اشعار جو مجھے پسند آئے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

لفظ تو ملتے نہیں اظہار محسوسات کو — اب سمجھیں یا نہ سمجھیں میرے دل کی بات کو
ادھر بھی تم ادھر بھی تم یہاں بھی تم وہاں بھی تم — یہ تم نے کیا قیامت کی نگاہوں سے نہاں ہو کر

تاروں سے پوچھئے مری آنکھوں کو دیکھئے — دنیا کو کیا پتہ شب ہجر دراز کا
یہی نظریں ہوں زباں بند ہو غیروں کو سلام — ان کی محفل کے تو آئینگے نئے آداب مجھے
دل کا کیا مول ہے شرمندہ نہ کیجے مجھکو — آپ کی چیز ہے لیجائیے قیمت کیسی؟
ان کو بھلا رہا ہوں، وہ یاد آرہے ہیں — کس درجہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں
خاموشیوں کو تیری الفاظ مل گئے ہیں — تو کس خیال میں ہے شرم و حیا کے بندے
دل حزیں ترا معیار آرزو کیا ہے — نظر کو اس سے سوا اور کیا نظر آئے
شب فراق کی مایوسیاں معاذ اللہ — وہ خواب میں بھی تو سوتے ہوئے نظر آئے
بیخودی میں ہم تو تیرا در سمجھ کر جھک گئے — اب خدا معلوم کعبہ تھا کہ وہ بتخانہ تھا
زمانے کی زباں پر ہے انہی کی داستاں لب تک — انھیں ہر بات میری داستاں معلوم ہوتی ہے
دل تو سمجھ رہا تھا تمھیں آخری علاج — تم درد دل کو اور بڑھا کر چلے گئے،
ستانا ہی اگر منظور ہے کھل کر ستاتے ہیں — مری تقدیر کے پردے میں میرا امتحاں کیوں ہو
بدل چکا ہوں بہت کروٹیں خدا کے لئے — ذرا تو لے خلش انتظار سونے دے
ضبط کی بات بدستور نبھانا — اچھا! — تم مری موت پہ آنسو نہ بہانا — اچھا!
دل شوق سے جلایئے انکار ہے کسے — لیکن جلا جلا کے بجھایا نہ کیجئے!

یہ تم خاموش سی کیوں ہو گئے سن کر میری حالت — تمہیں بھی کیا پریشانی نظر آتی ہے درماں میں

اپنے دیوانے کو گستاخ بنایا نہ کریں — وہ دمِ عذر نگاہوں کو جھکایا نہ کریں

تقدیر بدلتے ہو تم ایک اشارے میں — ممکن ہے یہ ممکن ہو! اچھا ہمیں دکھلا دو

کافر کہا جو شیخ نے یاد آ گئی نماز — سجدے کئے ہزار ترے در کے سامنے

تم نے تو مارے شرم سے منہ کو چھپا لیا — مجبور ہیں ہوا مہ و اختر کے سامنے

ہوتا آتا ہے وہی دل میں جگہ پاتا ہے — یہ محبت میں نئی طرز کا ارماں دیکھا

اپنے مرنے کا نہیں غم یہ ملال آتا ہے — کیوں زمانے نے تمہیں بال پریشاں دیکھا

کافر عشق سہی مجرم الحاد نہیں — ہوش طالب کو ابھی ہے کہ خدا یاد نہیں

اب سنتے ہیں تو کچھ شکوہ بیداد نہیں — صرف یہ یاد ہے کچھ بھول گیا یاد نہیں

پریشان ہو گے پریشاں کرو گے — مرے حال پر اور کیا غور ہو گا

وہ داغ محبت کا نشاں پوچھ رہے ہیں — حالانکہ سمجھتے ہیں دکھایا نہیں جاتا

ایذا طلبی کی کوئی حد ہو تو جفا ہو — اب وہ بھی ہیں مجبور ستایا نہیں جاتا

تم آؤ گے اور شب کو ذرا سوچ کے کہتے — تم سے تو تصور میں بھی آیا نہیں جاتا

مری آنکھوں سے تارے ٹوٹتے ہیں ٹوٹتے ہو نکلے — تمہیں تو نیند آ جاتی ہے پھر تم بدگماں کیوں ہو

مری خوددارئیِ ضبط کو بھی رشک آتا ہے — یہ کاوش ہے کہ تم بھی واقفِ رازِ نہاں کیوں ہو

رنج دوری سہا نہیں جاتا — سامنے بھی رہا نہیں جاتا،

درد ہی کو دوا سمجھ لیتے — ان سے وہ بھی دیا نہیں جاتا

جب مقدر بدل نہیں سکتا — صبر کیوں دل کو آ نہیں جاتا

وہ سامنے جو نگاہیں چرائے جاتے ہیں — یہ آجکل کے مسیحا بتائے جاتے ہیں

اڑا رہے ہیں شب ہجر کا مری خاکہ — بہانہ یہ ہے کہ گیسو بنائے جاتے ہیں

دور اس دنیا سے دور ایک اور وسعت چاہیئے

دیکھنا یہ ہے کہ کتنی طاقت پرواز ہے

اک لمحہ محبت، مرنا بھی ہے اسی میں — طالب حیات دنیا کس درجہ مختصر ہے

مانا ہزار چند ہیں اب دل کی شورشیں — وہ ابتدائے درد کی لذت کہاں ہے اب

نگاہ شوق نے ہر چیز میں تمہیں دیکھا — ہزار بار خود اپنے پہ اشتباہ کیا

ان سے پوچھا نہ گیا مجھ سے سنایا نہ گیا — حال دل اتنا چھپا کر بھی چھپایا نہ گیا

اپنی ہستی کو مٹا کر بھی بہت کچھ دیکھا — آہ تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہ گیا

دل کی تباہی پہ اُف آداب زنداں کی یہ قید — آہ و نالہ بھی ہم آواز سلاسل چاہیئے

ایک آنسو آنکھ سے طالب نکل کر بہہ گیا — یہ کہاں تھا عمر رفتہ تیرا حاصل چاہیئے

اور کچھ انگڑائیاں لیکر ستارے روک دے — اور سمجھا دے ذرا دنیا کو مفہوم شباب

دم آخر وہ یہ کہہ کہہ کے مرنے بھی نہیں دیتے — علاج درد ممکن ہے یہ کچھ منہ سے بتانے بھی

متانت سے لب نازک تبسم کو چھپا لیں گے — نگاہ ناز لیکن شوخیوں سے باز آئے بھی

دل کو باور نہیں آتا یہ زبانی اقرار — آپ اس ہاں کو نگاہوں سے ذرا کہہ دیجے

رہا سہا بھی دلِ زار کا قرار گیا — وہ بار بار یہ کہتے ہیں بیقرار نہ ہو

ہر شخص سمجھتا ہے ادھر دیکھ رہے ہیں — ہم دیکھ رہے ہیں وہ جدھر دیکھ رہے ہیں

شوق گستاخ نے اکثر تمہیں برہم کرکے — ہائے وہ لطف اٹھایا ہے کہ جی جانتا ہے

درد و غم، رنج و الم، جور و ستم — ایک دل، اتنے کرم، شرمائیے

ہر وقت دیکھتا ہوں نگاہوں کے سامنے — تم خود ہو یا خیال کسے امتیاز ہے

اب ہیں عین اور قلب کی باہم ملائیں — آنکھوں نے آہ دیکھ لیا کیوں تمہیں ادھر

پھر آہ نکل جائیگی ہو جاؤ گے مغموم — کیوں کھیل رہے ہو مرے دکھتے ہوئے دل سے

اب ترے انتظار میں سمجھا — عمر کتنی دراز ہوتی ہے

پلکیں بھی اٹھا لو نگہ ناز کے صدقے — یوں آپ کے اقرار سے تسکیں نہیں ہوتی

حسن کہتے ہیں اسے دیکھ چکے آئینہ — آؤ اب حسن کے معنی تمہیں ہم سمجھا دیں

جب دل کو کوئی وجہ شکایت نہیں رہی — میرے خیال میں تو محبت نہیں رہی

ان اشعار کے مطالعہ سے آپ کو طالب کے انداز تغزل کا کافی اندازہ ہو جائیگا اور میری رائے میں یہ اشعار ایک انسان کو حقیقی شعرا کی صف میں جگہ دلانے کے لئے بالکل کافی ہیں۔

اب میں وہ اشعار درج کرتا ہوں جو خاص میرے مذاق کے مطابق ہیں اور جن کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ زمانہ دور نہیں جب طالب کا شمار فانی، جگر اور اصغر کی صف میں کیا جائیگا۔ طالب ابھی بالکل نوجوان ہیں لیکن انھوں نے اپنے کلام میں فلسفۂ وحدت الوجود کے بعض نہایت اہم نکات اور حقائق بیان کئے ہیں، جہاں تک میرا قیاس ہے، انھوں نے اس فلسفہ کا بالاستیعاب مطالعہ بھی نہیں کیا ہے لیکن وہ فطری شاعر ہیں اس لئے ان کی طبیعت میں حقیقت پژوہی کا مادہ بھی فطری طور پر موجود ہے اور اسی کی بدولت انھوں نے صداقت کے بہت سے جلوے خود بھی دیکھے ہیں اور دنیا والوں کو بھی دکھلائے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں لیکن یہ حقیقت لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ شاعر ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اس ناظورۂ حقیقت کے رُخ پر نور سے کبھی کبھی نقاب کا گوشہ ایک لمحہ کے لئے سرکا دیتا ہے۔

میں نے ایک دفعہ مفکرِ اسلام شاعرِ مشرق علامہ اقبال مدظلہ سے "ہرات و صیت" کے متعلق دریافت کیا تھا تو انھوں نے فرمایا کہ "یاد رکھو اس کی حقیقت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی بلکہ الفاظ تو بسا اوقات موجبِ مذلت اقدام ہو جاتے ہیں"

میں تغزل کے لحاظ سے مولانا حسرت موہانی کو امام الشعرا تسلیم کرتا ہوں ان کے بعد اپنے صوفیانہ مذاق کے مطابق فانی، جگر، اور اصغر کو ان کی تصوف نگاری کی وجہ سے بہت پسند کرتا ہوں لیکن بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ طالب کے کلام میں بھی یہ رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے اور اس لحاظ سے ان کے کلام کا پایہ میری نگاہوں میں بہت بلند ہو گیا ہے۔

ممکن ہے اس جگہ بانگ درا کے پڑھنے والے یہ سوال کریں کہ آپ اقبال کو کس صف میں جگہ دیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال شاعر نہیں ہے، وہ تو پیغام گو ہے اسی لئے اس کا مرتبہ شاعروں سے بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے لئے ایک پیغام لے کر آیا ہے اور اس کا پیغام یا کلام مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے بلکہ ہمیشہ کی زندگی عطا کرتا ہے۔ اصغر، فانی یا جگر کے شعر پڑھ کر ہم لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کے شاعرانہ کمال کی داد دیتے ہیں لیکن اقبال کا پیغام جو زبور عجم، پیام مشرق، جاوید نامہ، بال جبریل یا ضرب کلیم کے صفحات پر منقوش ہے وہ اپنے اندر قوموں کی حیات کا سامان رکھتا ہے اور مردہ اقوام کو حیات تازہ عطا کرتا ہے۔

بہرحال اب میں طالب کے کلام سے صوفیانہ رنگ کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

یا تو خودی کو بھول جا یا پھر اسی کو بھول جا — حسِ مغائرت نہ رکھ بارگہِ نیاز میں

آرزو رکھنا محبت میں بڑا مذموم ہے — سُن کہ ترکِ آرزو ہی عشق کا مفہوم ہے

میں تجھی کو دیکھتا ہوں جلوہ فرما ہر طرف — ماسوا تیرے، مرے نزدیک سب معدوم ہے

زندگی کو موت ہے جب زندگی خود ہو فریب — موت بھی گویا فریبِ ہستی موہوم ہے

ہمیں معلوم ہے طالب حقیقت رازِ ہستی کی — مگر اس بے حقیقت کی حقیقت ہی عیاں کیوں ہو

المختصر حیات تڑپنے کا نام ہے — پہلو میں دل رہے کہ خیالِ بتاں رہے

جمالِ یار تو منت کشِ حجاب نہ تھا — نقاب پردۂ ادراک تھا نقاب نہ تھا

جوان تھے تو زمانہ جوان تھا طالب — شبابِ فلسفۂ حسن تھا شباب نہ تھا

کچھ انھیں دل سے ستانا مجھے منظور نہیں — فطرتِ حسن ازل ہی سے ہے آزار پسند

یقیناً کچھ نہ کچھ روزِ ازل لکھا گیا ہوگا — وگرنہ تیری خواہش اور اک مجبور للچائے

موت کیا چیز ہے تبدیلی زنداں کا فریب
ورنہ انسان کسی حال میں آزاد نہیں

اسی پردہ میں لیلیٰ ہے اسی پردہ میں محمل ہے — یہی منزل ہے گردِ راہِ منزل دیکھنے والے

من و تو کی خلش باقی ہے جب تک قیدِ ہستی میں — فریبِ زندگی ہے یہ تمھارے درمیاں ہونا

یہ کیا ادا ہے کہ مجبورِ زندگی کر کے — ستمگری کے بھی احساں جتائے جاتے ہیں

مجبوریوں پہ اپنی اک آہ سرد کر لے — با اختیار انساں ہے اور اس قدر

فطرت کی امانت ہی بارِ غمِ ہستی بھی — اے دل یہ ہے مجبوری تا موت اٹھانا ہے

ہر شے میں تجھے پایا میں وحدت سے باز آیا — یہ تو ترے جلووں کو پابند بنانا ہے

جزو کو کل سے جدا کر کے انا کہہ دیجئے — ورنہ جس چیز کو جی چاہے خدا کہہ دیجئے

یوں بھی اک جبر مسلسل کی ہے تمثیل حیات — ایک مجبوری آخر کو قضا کہہ دیجئے

خود اوجِ طور پہ تکلیف رونمائی کی — فریبِ پردۂ ہستی ذرا اٹھا نہ دیا

یہ وقفۂ ہستی ہے یا نیند کا عالم ہے — تم کاش جگا دیتے اس خواب پریشاں سے

یہ عمرِ ہجر اگر وقفِ انتظار نہ ہو — تو واقعی مجھے ہستی پہ اعتبار نہ ہو

اک تماشا ہے محبت میں خدا کا دیدار — اک تماشا ہے محبت کا خدا ہو جانا

دنیا خلافِ آپ خفا، خندہ زن نصیب — ترسا رہی ہے موت، یہ کیا زندگی ہوئی

تمھیں دیا نہ مجھے دل پہ اختیار دیا — خدا نے لوٹ لیا آدمی بنا کے مجھے

دل ان کا، خیال ان کا، عمل پر میری پرسش — اللہ مرے کیوں مجھے مجبور بنایا

امید، اسیری کی میعاد بڑھانا ہے — خواہش تری کاوش ہی جینے کا بہانا ہے

طالب اگر نظر نہ ہو پامالِ خواہشات
ہر لمعہ برقِ طور ہے، حسنِ مجاز کا

طالب نے جس قدر نظمیں لکھی ہیں سبھی اپنی اپنی جگہ اچھی اور دل لبھانے والی ہیں لیکن "دوشیزگانِ ساحل"۔ "وہ جاگے"۔ "دہقانی لڑکی" وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ طوالت کے خوف سے ان نظموں پر تفصیلی تبصرہ سپردِ قلم نہیں کر سکتا۔ "وہ جاگے" میں سے صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

کائنات آگئی کھنچ کر تہِ خمیازۂ حسن
چشمِ مخمور ہتھیلی سے کوئی ملتا ہے،

شاخِ نبات کی قیمت ۸ؔ/ ہے اور مکتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتی ہے۔ ناظرین طلب فرما کر لطف اندوز ہوں۔

..یوسف سلیم۔ بی۔ اے

غزل

حضرت آبر احسنی گنوری

بھنور کی لے اماں ٹکرائے یا ساحل کے دامان سے
بہرصورت رہا ہونا، مری کشتی کو طوفاں سے

مجھے فطری تعلق ہے جنونِ فتنہ ساماں سے
فسانہ دستِ وحشت کا سنا برسوں گریباں سے

نویدِ مغفرت بن بن کے دار و گیرِ محشر میں
یہ کیا شے ہے جو لپٹی جا رہی ہے میرے داماں سے

اُٹھیں اب کشتگانِ وعدہ وقتِ دید آپہونچا
ہلالِ حشر چمکا مطلعِ گورِ غریباں سے

ذرا یہ تو بتاؤ ساری دنیا اب کہاں جائے
تمھیں زیبا نہ تھا صیدِ نالۂ محشر بداماں سے

یہ پیغامِ جنوں ہے، ہجر میں یا کان بجتے ہیں
کوئی جیسے مجھے آواز دیتا ہو بیاباں سے

یقیناً سب کو آنا ہے مگر واپس نہیں جانا
اسی گورِ غریباں میں، اسی گورِ غریباں سے

کسے توفیق اتنی چارہ گر کو کون سمجھاوے
یہ ہے دردِ وفا جو اور بڑھ جاتا ہے درماں سے

انھیں سے عرصۂ دنیا ہوا تھا تنگ دنیا پر
کھڑے ہیں سر جھکائے یہ جو محشر میں پشیماں سے

وفا کی وادیوں میں بے نیازِ آرزو بن جا
یہیں آ کر مرادیں خود لپٹ جاتی ہیں ارماں سے

قضا نے مشکلیں دستِ جنوں کی آبر حل کر دیں
الجھ کر رہ گیا ہے خود بخود تارِ رگِ جاں سے

غزل

جناب یوسف علی صاحب تحصیلدار شاہ آباد

بدلا ہوا ہے رنگ گلستانِ آرزو ہر جنبش قدم ہے بیابانِ آرزو
اُٹھتی ہے بار بار دلِ غم نواز میں اک موجِ اضطراب بعنوانِ آرزو
کس کس طرح سے الجھا ہے جوشِ بہار میں دستِ جنوں سے چاک گریبانِ آرزو
کیا چارہ ساز ہو خلشِ درد کا کوئی رگ رگ میں دل کی الجھا ہے پیکانِ آرزو
پھر بیحجاب آ دلِ رنگیں خیال میں مدت سے باز ہے درِ ایوانِ آرزو
اللہ رے سوزِ الفتِ ناکام الحذر اک شعلہ رکھدیا تہِ دامانِ آرزو
یوسف جنونِ عشق کی نیرنگیاں نہ پوچھ ہر داغ دل ہے شمع شبستانِ آرزو

اِطلاعنامہ

نوٹس بنام داعیان نسبت تعین تاریخ سماعت درخواست دیوالیہ۔

نمبر مقدمہ ۵۴ سنہ ۱۹۳۶ء دیوالیہ

بعدالت جناب خورشید حسن صاحب بہادر سول جج اوّل بہرائچ

مقدمہ قرار دیئے جانے دیوالیہ عبدالرحیم ولد مداری قوم جولاہ ساکن عیسٰی پوروہ واقع حسینی پور پرگنہ و ڈاکخانہ نانپارہ ضلع بہرائچ

بنام

۱۔ عثمان خاں ولد ذینا خاں قوم پٹھان ساکن عیسٰی پوروہ واقع حسینی پوروہ
۲۔ کلو خاں ولد شمشیر خاں قوم پٹھان ساکن اسوپور
۳۔ ہردت ولد نہ معلوم قوم کھنک ساکن ٹیر وہیا
۴۔ حسن علی ولد بکا قوم جولاہ ساکن عیسٰی پوروہ واقع حسین پورہ
۵۔ امید علی ولد نہ معلوم قوم جولاہہ ساکن پرگھوا پرگنہ نانپارہ ڈاکخانہ حسین پوروہ

مہاجنان و

درخواست دیوالیہ حسب دفعہ ۱۳ ایکٹ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء

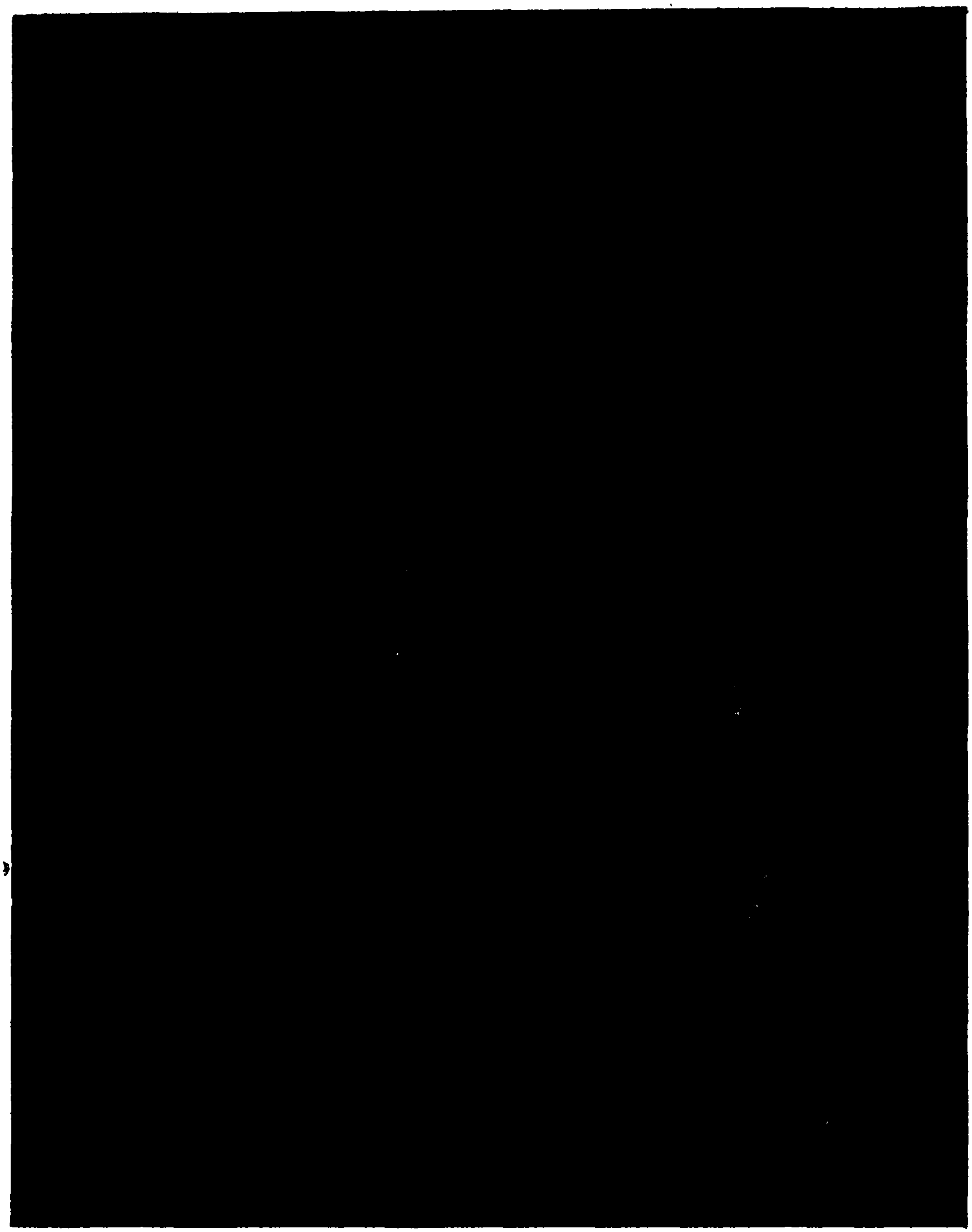
ہرگاہ عبدالرحیم سائل نے عدالت ہذا میں بذریعہ عرضی دعوٰی مورخہ ۲۷ راگست سنہ ۱۹۳۶ء درخواست کی ہے کہ وہ حسب منشا ایکٹ دیوالیہ ۵ سنہ ۱۹۲۰ دیوالیہ قرار دیا جائے اور تمہارا نام فہرست داعیان میں جو مدیوں نے داخل کی ہے پایا جاتا ہے لہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت ہذا نے بیس ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۳۷ء واسطے سماعت درخواست مذکور بصدر اور لینے بیان مدیون کے مقرر کی ہے اگر تم کو اس معاملہ میں پیروی کرنا ہووے تو اصالتاً یا بذریعہ وکیل جو حالات مقدمہ سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو حاضر ہو

آج بتاریخ ۷ ر دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط بخط انگریزی
صاحب سول جج بہادر

مہر عدالت

مفرم



عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے۔

جلد ۲۶ — فہرست مضامین ماہ فروری [illegible]ء — نمبر ۳

عالمگیر کا قابل دید عید قربان نمبر ضرور ملاحظہ فرمائیے

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے مالیہ الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شایع کیا۔

ملاحظات

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

مُوقر وہم عصر روزنامہ زمیندار نے ۷ جنوری ۱۹۳۷ء کے سنڈے ایڈیشن میں عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۷ء کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہارِ خیال فرمایا ہے:

عالمگیر کا خاص نمبر (۱۹۳۷ء)

"رسالہ عالمگیر اپنے خاص نمبروں کی بدولت ہندوستانی رسائل میں امتیازی جگہ حاصل کر چکا ہے لیکن اس سال اس کا جو خاص نمبر شایع ہوا ہے وہ تقطیع کی غیر معمولی وسعت۔ مضامین کی افادی حیثیت منظومات کی وجد آفرینی۔ تصاویر کی جاذبیت، اور کتابت وطباعت کی امتیازی خصوصیات کے اعتبار سے، ایک ایسا آئینہ ہے جس میں شاہدِ اُردو اور حسنِ ادب کی تمام تجلیاں نظر آ رہی ہیں۔ ہندوستان کے اکثر جلیل القدر ادبا اور سحر بیان شعرا کے مضامین و منظومات اس اشاعت کے لئے سرمایہ زینت ہیں۔ تمام علمی گلستانوں سے ایک ایک پھول لے کر یہ گلدستہ تیار کیا گیا ہے۔ اکثر مضامین تو اپنی افادی حیثیت کے اعتبار سے معلومات و حقائق کے خزانے اپنے اندر رکھتے ہیں۔ متعدد سہ رنگی اور یک رنگی تصاویر بھی رسالہ کی حسن و خوبی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ جن میں سے اکثر ہندوستانی مصوری کا ارتقائی نمونہ ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ قارئینِ زمیندار ادب و شعر اور مصوری کے اس دلکش مجموعہ کا ضرور مطالعہ کرینگے۔

عالمگیر کی سالانہ قیمت چار روپے چار آنے ہے جس میں زیرِ تنقید خاص نمبر اور جون میں شائع ہونے والا سالانامبر بھی شامل ہیں اس اعتبار سے عالمگیر سب سے زیادہ ارزاں رسالہ ہے۔ ہم خاص نمبر کی اشاعت پر حافظ محمد عالم صاحب مدیر عالمگیر کی نتیجہ خیز محنت اور مالی قربانی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ منیجر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے طلب کیجئے"

(زمیندار مجریہ ۷ جنوری ۱۹۳۷ء صفحہ ۳ کالم ۵)

معزز اور موقر ہم عصر زمیندار نے جو اُردو زبان کا ایک معیاری روزنامہ ہے عالمگیر کی ناچیز مساعی کی جن قابلِ فخر اور شاندار الفاظ میں داد دی ہے۔ وہ میرے لئے باعثِ صد افتخار و انبساط ہیں اور موجبِ حوصلہ افزائی بھی۔

عالمگیر کے اکثر محترم ناظرین نے بھی خاص نمبر ۱۹۳۷ء کی خصوصیات کی بہترین الفاظ میں تعریف کی ہے۔ نہ صرف زبانی تعریف بلکہ اس کی توسیع اشاعت کیلئے کوشش فرما کر علمی ہمدردی اور صحیح عالمگیر نوازی کا ثبوت دیا ہے میں ایسے تمام حضرات کی ذرہ نوازیوں کا بہ صمیم قلب شکر گذار اور ممنونِ احسان ہوں یقین ہے کہ ان نوازشات بہم کا سلسلہ جاری رکھینگے میں بھی حتی الامکان و استطاعت کے مطابق موجودہ کساد بازاری کے باوجود زیادہ سے زیادہ شاندار شکل و صورت میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں عالمگیر کے ناظرین کرام کی خدمت میں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وہ عالمگیر کی توسیع اشاعت کے علمی فرض کا عملی احساس فرمائیں عالمگیر کی جائز اعانت کی یہ بہترین صورت ہے نیز عالمگیر بکڈپو سے اپنی پسند اور مذاق کی کتابیں (جن کی فہرست صفحہ ۵ رسالہ ہذا سے شروع ہے) خریدیں یہ بھی عالمگیر کی اعانت کی ایک شق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان معروضات پر خاص طور پر توجہ مبذول فرمائی جائیگی۔

(حافظ) محمد عالم عفی عنہ

صحیفۂ زندگی کا ایک ناتمام ورق

جناب ایم اسمٰعیل احمد صاحب رضا

۱

ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالنے والے واقعات جو روزانہ وقوع پذیر ہوسکتے ہیں ان کا ہمیں قلیل ہی سا علم ہوسکتا ہے اور بے شمار ایسے ہی دیگر واقعات (اگر ان کو واقعات کے نام سے موسوم کیا جاسکے) ہیں جو ہمارے قریب ترین ہوجاتے ہیں مگر ہماری زندگی یا ہمارے دلوں پر کسی قسم کا اچھا یا برا اثر ڈالنا تو درکنار اپنی آمد تک کا اظہار کئے بغیر گذر جاتے ہیں۔ اگر ہمیں اپنی زندگی کے ان تمام تغیرات کا علم ہوسکے تو ہماری زندگی یاس و حسرت یا خوشی و مسرت سے اس قدر بھر جائے کہ ایک دم بھی اطمینان قلب نصیب نہ ہو۔ یہ ادعا ڈیوڈ سوین کی پوشیدہ تاریخ کے ایک ورق سے پایہ ثبوت کو پہونچ جائے گا۔

ہم ڈیوڈ کے ابتدائی انیس [19] ابواب زندگی سے قطع نظر کرکے اسے بیسویں باب میں ایک شاہراہ پر اپنے وطن عزیز سے بوسٹن کو جاتے ہوئے دیکھتے ہیں جہاں اس کا چچا جو ایک چھوٹا سا بساطی تھا اس کو اپنا کلرک بنانا چاہتا تھا۔ یہ کہدینا بیجا نہ ہوگا کہ ڈیوڈ نیو ہمپ شائر کا باشندہ اور معزز والدین کی اولاد تھا۔ اس نے اسکول میں معمولی سی تعلیم حاصل کی تھی اور آخر میں گلینٹن اکاڈمی میں ایک سال رہ کر السنہ قدیمہ کا مطالعہ کیا تھا۔

گرمی کے موسم میں ایک دن صبح سے دوپہر تک پیادہ پا سفر کرنے کے بعد تکان اور تمازت آفتاب نے اس سے یہی طے کرایا کہ جہاں کہیں پہلے آرام دہ جگہ ملے وہاں تھوڑی دیر کیلئے سستالے اور اس کی منزل مقصود کو جانے والی گھوڑا گاڑی کا انتظار کرے۔ بہت جلد ہی اسے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ جو خاص ڈیوڈ کے لئے لگایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہاں پہونچکر اس نے دیکھا کہ درختوں کے عین وسط میں ایک ایسا چشمہ ابل رہا ہے جو شاید ہی اس کے سوا کسی اور مسافر کے لئے اس صفائی سے ظاہر ہوا ہوگا۔ وہ جھکا اور اپنے تشنہ لبوں سے پانی کو چوما۔ پھر وہیں چشمہ کے کنارے لیٹ گیا ایک گٹھری جس میں پہننے کے چند کپڑے بندھے ہوئے تھے اپنے سر کے نیچے بطور تکیہ کے رکھ لی۔ یہ دھوپ سے محفوظ جگہ جو جنگلی جانوروں کی جائے رہائش تھی نوجوان ڈیوڈ کو مخملی پلنگ سے زیادہ آرام دہ ثابت ہوئی۔

چشمہ اس کے پہلو میں سستی سے سرسراتا تھا۔ شاخیں اس طرح جھوم رہی تھیں گویا مستی میں آگئی ہیں۔ اور ایک خواب گراں نے جس کی تہہ میں ناواقف بہت سے خواب پنہاں تھے اس کو آدبایا لیکن ہم یہاں وہ واقعات بیان کریں گے جو اس نے خواب میں نہیں دیکھے تھے۔

جب وہ سائے میں سو رہا تھا، لوگ خوب بیدار تھے اور اس کی آرامگاہ کے پاس سے گذرنے والی سڑک پر سے پیدل، گھوڑوں پر، نیز جملہ قسم کی سواریوں پر یکے بعد دیگرے گذر رہے تھے۔ بعض نہ دائیں دیکھتے تھے نہ بائیں اور انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ وہاں محو استراحت ہے۔ بعض صرف نظر انداز نگاہوں سے دیکھتے مگر سونے والے کو اپنے مصروف خیالات دماغ میں لگے رہتے۔ بعض اس کی گہری نیند پر مسکرا دیتے اور بعض مغرور افراد اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

ایک ادھیڑ عمر بیوہ جس وقت اور کوئی شخص پاس نہ تھا درختوں تک آئی مگر نوجوان کو نیند میں غافل پاکر واپس ہوگئی۔ مبادا اس کے آرام میں خلل آئے۔

ایک مست نشے نے اسے دیکھا۔ اور معصوم ڈیوڈ کو لب سڑک سے آشامی کی خوفناک مثال کے طور پر اپنی شام کی تقریر میں خوب آزمانے کا ٹھوں لیا لیکن اس کیلئے مذمت تعریف مرتبت حقارت اور نیز بڑائی سب کچھ برابر تھا یا یہ سب کچھ بھی نہ تھا۔

۲

وہ چند ہی ساعت سویا ہوگا کہ ایک بھورے رنگ کی گاڑی جسے دو خوبصورت گھوڑے کھینچ رہے تھے آرام سے لڑھکتی ہوئی اُس کی خوابگاہ کے بالمقابل آکر کھڑی ہوگئی۔ دُھرے کی میخ کہیں گر گئی تھی جس سے ایک پہیہ نکل گیا تھا۔ گو نقصان کچھ نہیں ہوا مگر اس سے بوڑھا سوداگر اور اس کی اہلیہ جو اس گاڑی میں بوسٹن جا رہے تھے ایک لمحہ کے لئے خوف زدہ سے ہوگئے۔ جس وقت کوچوان اور نوکر پہیہ چڑھانے میں مشغول تھے شریف بوڑھا اور اس کی بیوی درختوں کے نیچے پناہ گزیں ہوئے، وہاں ڈیوڈ کو سوتے ہوئے دیکھا اور اس وحشت سے متاثر ہوکر جو ایک غریب سونے والا اپنے گرد برساتا ہے بوڑھا بڑی سرعت سے الگ ہوگیا۔ اس کی بیوی بھی اپنے ریشمی گون کو احتیاطاً سمیٹتے ہوئے کہ کہیں کپڑوں کی سرسراہٹ سے وہ یک لخت چونک نہ اٹھے ذرا فاصلہ پر ہٹ گئی۔

"کتنی گہری نیند سو رہا ہے۔" سوداگر نے کہا۔ "کس قدر عمیق اطمینان کے سانس لے رہا ہے۔ نیند اور ادویات کے استعمال کے بغیر ایسی نیند میرے لئے میری نصف آمدنی سے کہیں زیادہ غنیمت ہے کیونکہ یہ صحت و اطمینان قلب کی علامت ہے۔"

"علاوہ ازیں شباب کی بھی۔" معمر خاتون نے جواب دیا۔ "تندرست اور مطمئن بوڑھے آدمی اس طرح نہیں سوتے ان کی نیند اور ہماری نیند میں اتنا ہی تفاوت ہے جتنا کہ ہماری بیداری میں۔"

جیسے جیسے وہ معمر جوڑا اسے دیکھتا تھا ان کو اس نوجوان سے زیادہ دلچسپی ہوتی جاتی تھی۔ جس کے لئے لب سڑک پیڑ کا سایہ خیمہ کا کام دے رہا تھا اور جس میں انگاریں دو کی بجائے گہرا سایہ پڑ رہا تھا۔ سورج کی ایک کرن اس کے چہرے پر چمکتے ہوئے دیکھ کر اس خاتون نے اسے روکنے کے لئے ایک شاخ کو موڑ دیا اور یہ چھوٹا سا مہربانی کا کام کرنے کے بعد وہ اس نوجوان کے لئے اپنے دل میں ماں کی سی ممتا محسوس کرنے لگی۔

اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے عموزاد بیٹے کی طرف سے ہماری مکمل مایوسی کے بعد اللہ میاں نے اسے یہاں ڈال دیا ہے اور اس کو پالینے کی غرض سے ہمیں ادھر بھیجا ہے۔ مجھے اس کی شکل و صورت بیٹے مرحوم ہنری سے ملتی جلتی نظر آتی ہے۔ کیا ہم اسے بیدار کریں؟"

"کیوں؟" بوڑھے سوداگر نے کہا۔ "یاد رکھو! اس نوجوان کا چال چلن ہماری طرف سے پردہ میں ہے۔"

"یہ معصومانہ نیند، یہ کھلا ہوا چہرہ کیا اچھے چال چلن کی دلیل نہیں ہیں۔" خاتون نے آہستہ مگر سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

جس وقت یہ سرگوشیاں ہو رہی تھیں سونے والے کا دل نہیں دھڑکا نہ اس کے سانس میں اضطراب پیدا ہوا نہ اس کے خط و خال نے کسی قسم کی دلچسپی کی معمولی سی علامت ظاہر کی۔ لیکن تقدیر سونے کا جھول ڈال دینے کے لئے بالکل تیار محو خواب ڈیوڈ پر جھک رہی تھی۔

بوڑھے سوداگر کا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا۔ اس کی جائداد کا سوائے ایک دور کے رشتہ دار کے جس کا چال چلن اسے ناپسند تھا اور کوئی وارث نہ تھا ایسے حالات میں بعض اوقات لوگ ساحروں سے بھی زیادہ عجیب و غریب کام کر بیٹھتے ہیں اور ایک نوجوان کو جو محض مفلسی کی حالت میں سویا ہو شان و شوکت سے بیدار کرتے ہیں۔

"پھر کیا ہم اُسے نہ جگائیں؟" خاتون نے کہا۔

اتنے میں پیچھے سے نوکر چلایا۔ "گاڑی تیار ہے حضور۔"

سوداگر اور اس کی بیوی دونوں چونک اٹھے۔ ان کے چہرے سرخ ہوگئے اور دونوں تعجب کرتے ہوئے کہ انھوں نے ایسے مضحکہ خیز کام کرنے کا یہ خواب دیکھا ہوگا چلے گئے اور بدنصیب کاروباری افراد کی طرح مصروف توہمات ہوگئے۔ اس عرصہ میں ڈیوڈ اپنی نیند کا لطف حاصل کرتا رہا۔

۳

گاڑی ابھی تھوڑی ہی دور گئی ہوگی کہ ایک حسن و شباب کی ملکہ خراماں خراماں اس طرف آئی۔ اس کی قیامت آفریں چال سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کس طرح اس کا ننھا سا دل اس کے سینے میں ناچ رہا ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے درختوں کی آڑ میں آگئی۔ وہاں ایک نوجوان کو چشمے کے پاس سوتے دیکھا۔ فرط حیا سے اس کا چہرہ گلاب کے مانند سرخ ہوگیا اور اس لحاظ سے کہ اس نے ایک شریف آدمی کی خوابگاہ میں مداخلت کی ہے وہ ایڑیوں پر بھاگ جانے کو تیار تھی۔ لیکن سونے والے کے پاس خطرہ تھا۔ ایک ظالم مکھی سر کے گرد چکر لگا رہی تھی بھیں...... بھیں...... بھیں...... کبھی پتوں میں۔ کبھی دھوپ میں لیکن کبھی تاریکی میں گم ہو جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ڈیوڈ کے پپوٹے پر بیٹھتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دوشیزہ جس طرح معصوم تھی اسی طرح اپنے سینہ میں ایک فراخ دل رکھتی تھی۔ لہٰذا اس خیال سے کہ بعض اوقات مکھی کا ڈنک مہلک ثابت ہوتا ہے

بیچارہ انخلت کرنے والے دشمن پر ہاتھ میں رومال لے کر لپکی۔ اسے خوب جھاڑا اور درختوں کے سائے تلے سے مار بھگایا۔

آہا کیسی دلکش تصویر تھی۔ جب یہ کار خیر سرانجام ہوا۔ لڑکی نے اس اجنبی نوجوان پر جس کی خاطر سے وہ ایک ظالم ہوائی جانور سے لڑ رہی تھی ایک نظر ڈالی

"وہ حسین ہے" اس نے سوچا اور اس کا چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا۔

آہ! یہ کیونکر ممکن ہوا کہ اس وقت ڈیوڈ سوین کے سینے میں کوئی زبردست مسرت انگیز خواہش ہوا کہ وہ بیدار ہو کر اس کی خیالی تصویروں کے درمیان اس مجسمہ حسن و خوبی کو دیکھ لیتا۔ کم از کم ایک متبسم لبوں کے خوش آمدید نے اس کے چہرے کو کیوں نہ چمکا دیا؟ وہ آگئی تھی۔ وہی دوشیزہ جس کی روح اس دقیانوسی مگر خوبصورت خیال کے مطابق کن کے وقت اس کی روح سے جدا کر دی گئی تھی اور جس کو وہ اپنی تمام موہوم مگر پراز اشتیاق خواہشات کے جواب میں دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس وقت اس کی دل افروز تصویر اس کے پہلو میں بہنے والے چشمہ میں کچھ شرما سی رہی تھی۔ اگر یہ اب بھی نکل جائے تو پھر اس کی ضیائے سعید بقیہ زندگی میں کبھی نہیں چمکیگی۔

"وہ کتنا غافل سو رہا ہے" لڑکی کہنے لگی۔

وہ چل پڑی مگر ویسی تیزی سے نہیں جیسی اس نے آتے وقت دکھائی تھی۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ وہ قریب ہی کے قصبہ کے ایک خوشحال سوداگر کی بیٹی تھی۔ جس کو اس وقت ڈیوڈ جیسے نیک دل سنجیدہ مزاج نوجوان کی ضرورت تھی۔ اگر ڈیوڈ سوین اس لڑکی سے راہ چلتی واقفیت پیدا کر لیتا تو وہ اس کے باپ کا کلرک اور لہذا ناں قدرتی سلسلے کی ایک مستحکم کڑی بن جاتا۔

یہاں پھر اچھی، اور نہایت ہی اچھی قسمت اس کے اس قدر قریب ہو گئی تھی کہ اس کی پوشاک نے اس کو چھو لیا۔ مگر وہ بالکل بیخبر تھا۔

۴

ابھی وہ نازنین آنکھوں سے اوجھل ہی ہوئی ہو گی کہ دو متنفس بایں ہیئت درختوں کی طرف آتے ہوئے نظر آئے کہ دونوں کے چہرے سیاہ تھے اور ان پر انھوں نے کپڑے کی نقاب ڈال رکھی تھی جو ابروؤں پر سے ترچھے کھنچے ہوئے تھے ان کے لباس گو میلے تھے مگر پھر بھی ان میں ایک قسم کی صفائی تھی۔ وہ دونوں بدمعاش تھے اور جو کچھ شیطان انھیں بھیج دیتا تھا اس پر ان کی زندگی کا مدار تھا۔ اب خالی وقت میں انھوں نے اپنی گذشتہ بدمعاشیوں کے مشترکہ منافع کیلئے تاش کے ایک کھیل کی شرط باندھ رکھی تھی جس کا ان درختوں کے نیچے فیصلہ ہونے والا تھا۔ چشمہ کے پاس محو خواب ڈیوڈ کو دیکھ کر ایک بدباطن نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"کیا تمھیں اس کے سر کے نیچے وہ گٹھری نظر آتی ہے؟"

دوسرے بدمعاش نے آنکھ پھیر کر دیکھا۔

"میں قسم کھاتا ہوں" پہلا بدمعاش کہنے لگا۔ "کہ اس شخص کے پاس یا تو پاکٹ بک ہے یا نقدی کی ایک خاصی مقدار کپڑوں کے اندر چھپی ہوئی ہے اور اگر وہاں نہیں تو ہمیں اس کی جیب سے تلاش کرنی پڑیگی۔"

"لیکن اگر وہ جاگ پڑے" دوسرے بدمعاش نے کہا۔

پہلے بدمعاش نے حقارت سے اپنے سر کو حرکت دی اور اپنی واسکٹ ایک طرف ہٹا کر ایک خنجر کے قبضہ کی جانب اشارہ کیا۔

"بس اب سب کچھ درست ہے"۔ دوسرا بڑبڑایا۔

دونوں غافل ڈیوڈ کے پاس پہونچے اور جب ایک نے خنجر کا رخ اس کی طرف کیا تو دوسرا اس کے سر کے نیچے کی گٹھری کی تلاشی لینے لگا۔ ان دونوں کے چہروں سے جن پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور جرم و خوف کے باعث سیاہ ہو رہے تھے ڈر لگتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر وہ دونوں بد باطن شیطان صورت انسان خود چشمہ میں ایک نظر کرتے تو وہ اپنے عکس بمشکل ہی پہچان سکتے لیکن ڈیوڈ سوین کے چہرے پر ماں کی گود میں سوتے ہوئے بھی اس سے زیادہ اطمینان کبھی نہ برسا ہوگا۔

"میں یہ گٹھری بالضرور اٹھاؤنگا" ایک نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔

"اور اگر اس نے ذرا سی بھی حرکت کی تو میں یہ خنجر اس کے سینے کے پار کر دونگا" دوسرے نے کہا۔

اسی وقت ایک کتا زمین میں سونگھتا سونگھتا درختوں کے پاس آیا۔ اس نے باری باری دونوں بدمعاشوں کو اور پھر سونے والے کو دیکھا اور چشمہ سے لپ لپ پانی پینے لگا۔

"افسوس!" ایک بدمعاش بولا۔ "اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کتے کا آقا ضرور کہیں نزدیک ہی آتا ہوگا"۔

جس کے پاس خنجر تھا اس نے پھرتی سے خنجر چھپا لیا اور ایک پاکٹ پستول نکالی مگر اس قسم کی نہیں جو ایک ہی وار میں کام تمام کر دے۔ یہ ایک مئے آتشیں کی بوتل تھی جس کے منہ پر ٹین کا گلاس پیچ سے کسا ہوا تھا۔ سر ایک نے

خوب پی اور اپنی ناتمام شوہرت پر ہنسی مخول کرتے ہوئے وہاں سے اس طرح چلدیے جیسے دو مسافر اپنی منزل مقصود کے قریب ہونے پر خوش خوش قدم اٹھا رہے ہوں کہ اب تھوڑی دیر میں منزل پر پہونچنا چاہتے ہیں۔ چند گھنٹوں کے بعد دونوں وہ تمام معاملہ بھول گئے مگر انھیں ایک دفعہ بھی اس بات کا خیال نہ آیا ہوگا کہ لکھنے والے فرشتے نے ان کی ارواح کے خلاف تا ابد قائم رہنے والے قتل کا جرم درج کر لیا ہے۔

رہا ڈیوڈ سو وہ اب تک بیخبر پڑا تھا۔ نہ اسے موت کے ہولناک سایہ کی خبر تھی جو اس پر پڑا اور نہ اسے اس جدید پر توزیست کا کچھ علم تھا —— جبکہ وہ سایہ اس پر سے ہٹا لیا گیا۔

وہ پھر بھی سوتا رہا مگر اس اطمینان سے نہیں۔ بلکہ ایک گھنٹہ کے آرام نے اس کی تمام کلفتوں کو کھو دیا تھا۔ اب وہ ہا اُس نے اپنے ہونٹھوں کو بغیر آواز نکالے حرکت دی۔ بعدہٗ دل ہی دل میں حالت نیم شعوری میں مصروف تکلم ہو گیا۔ لیکن پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کا شور سڑک پر بلند اور بلند تر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ ڈیوڈ کی نیند کو منتشر کرنیوالی دھمک سے ٹکرایا۔

ایک ڈاک گاڑی آ رہی تھی۔ وہ اپنے تمام توہمات کو لئے ہوئے چونک پڑا۔ اٹھا۔ چلایا۔ "او کوچوان! ایک مسافر کو بٹھاؤ گے؟"

"اوپر جگہ ہے۔" کوچوان نے گاڑی کو آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈ گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا اور بصد انبساط و مسرت بوسٹن کی جانب روانہ ہو گیا مگر اس چشمہ پر خاک سے تغیرات کے خراج میں ایک وداعی نگاہ تک بھی نہ ڈالی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دولت کے دیوتا نے اس کے پانی کو سنہرے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ نہ یہ جانتا تھا کہ ایک الفت کی دیوی نے اس پانی کے خروش میں آہستہ سے آہ بھر دی تھی اور نہ اس امر سے واقف تھا کہ ایک موت کے خونخوار بھوت نے اس پانی کو اسی کے خون سے قرمزی بنا ڈالنے کی ڈانٹ بتائی تھی۔

یہ سب کچھ اس قلیل عرصہ میں ہوا تھا جبکہ وہ سونے کیلئے لیٹا تھا۔

ہم ان عجیب و غریب واقعات کے قدموں کی ہلکی سی چاپ بھی نہیں سن سکتے جو سوتے یا جاگتے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں کیا یہ اس امر کی بین دلیل نہیں ہے کہ ایک محافظ کل خدا موجود ہے جس سے ایسے غائبانہ غیر متوقع واقعات ہماری شاہراہ زندگی میں پیدا ہونے کے باوجود انسانی زندگی میں ایک خاص تنظیم رہتی ہے کہ ہماری پیش بینی بھی صرف جزواً ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

(ترجمہ)

ایم۔ اسمٰعیل احمد

رُباعیات

ہنگامِ سحر جب درِ میخانہ کھلا
ساقی کے سر سے سرِ پیمانہ کھلا
تب صبح سے ہوئیں تجلیاں روشن
سرِ رازِ حیات بیحجابانہ کھلا

ساقی کے سوا غنچہ سرشتہ ہو نہ سکا
بے بادہ کبھی کام اپنا روا ہو نہ سکا
اشک بے بادہ کہ ہے آب حیات
سرچشمہ پیا جس نے فنا ہو نہ سکا

از

سعید احمد۔ اعجازؔ

جگر پارے

رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

دل مجسم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو
کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

میری خاطر اب وہ تکلیفِ تجلی کیوں کریں
اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں

تو فنا آمادہ ہے تجھ کو نظر آتی ہے موت
زندگی، تابندگی، پائندگی پاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

(غیر مطبوعہ)

آپ بیتی

بسلسلہ گذشتہ

از جناب ثمر صاحب صدیقی ردولوی

۱۳

دم بھر نظر ایک مزاج ایک نہیں ہے
کیونکر کہوں گردش میں فلک ہے کہ زمیں ہے

روح نواز اختر ——— لاکھوں پیار۔ سواد خط دیکھتے ہی جان آگئی، دل اچھل پڑا۔ بے کیف روح نے انگڑائی لی۔ اس نوازش بے پایاں کے قربان، تمہیں میری دلی کوفت کا احساس تو ہوا یہی میرے لئے کیا کم ہے۔ میرے وجہ حیات ذرا تبسم پاش نظریں اٹھا کر دیکھو تو ——— محروم دید کی آنکھیں امید کی روشنی کھو چکیں۔ ہولناک تاریکی میں قدم اٹھائے نہیں اٹھتے، اب کیا کروں اور کیونکر اپنی روح کو افسردگی کے پنجے سے چھڑاؤں، دلنواز اختر! ——— بولو، تم تو بڑے نکتہ رس ہو، میری روح کو اپنے خیال کی زنجیروں سے کب تک جکڑے رہو گے اُف حبیب تم کبھی میرے نہیں ہو سکتے؟ ——— درد محبت تو دنیا کی تمام خوشیوں سے زیادہ شیریں ہے۔ پھر یہ روح فرسا تلخیاں کیوں جزو حیات بن گئی ہیں تخیل نے دنیائے محبت میں ہزار چکر لگائے مگر دل کی کلفتوں کا راز سمجھ میں نہ آنا تھا نہ آیا! سچ ہے عقل و دلیل کی رسائی ——— "دربار محبت" تک نہیں ہوتی — ہاں تمہاری مرحوم کے نزدیک محبت کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک چیز دوسرے سے مل جائے؟ ——— چشمے دریا سے ملتے ہیں ——— دریا سمندر میں؛ ہوائیں ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک فطری قانون ہے جس نے دنیا کی تشکیل اس طرح کی ہے۔ پھر میرے پیارے بتاؤ ——— تم مجھ سے جدا کیوں ہو؟ ——— اُف بعض اوقات تمہاری جدائی وحشت ناک خواب بن کر مجھے دہلا دیتی ہے اور میں کانپ کانپ کر تمہیں پکارتی ہوں ——— آہ میں اور تمہارے دلکش الفاظوں کی شنوائی نہ کروں ——— مگر جب زمانہ سننے دے تب تو سنوں؛ دنیا سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پھر کیونکر "نوشتۂ محبت" کو منقش کرنے میں کامیاب ہوں۔ میں تمہاری قلبی اذیتوں سے ناواقف نہیں۔ تمہارے دشمنوں کا ماحول تباہ کن ہو۔ جو پلٹتے ہو کہہ جاتے ہو، خدا کے لئے ایسے منحوس الفاظ زبان پر نہ لایا کرو۔ کیا تمہیں عادل اور منصف سلطان کی رحمتوں سے انکار ہے جانتے ہو، اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار، میری دلی آرزو ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ تمہارے تصور میں بسر ہو۔ مگر ہائے میں جذبات کو الفاظ کی بندش میں اسیر تو کر لیتی ہوں لیکن اس کا خیال نہیں آتا کہ نقطوں کی معنوی تصویر کیسی ہوگی۔ اچھا ذرا قریب آ کر سنو تو یہ کیا لکھ گئے؟ "تمہیں مجھ سے ملنے کا خیال کیسے آگیا؟" ——— کیوں بیکار چھیڑتے ہو؟ بس! خدا حافظ،

نامراد ——— نرگس،

۱۴

فریاد کر رہی ہے یہ ترسی ہوئی نگاہ
دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گذر گئے

میرے چارہ ساز اختر! ——— زندہ باد، رات سیہ بختی کے باعث شرف نیاز نہ حاصل ہو سکا۔ کیا کہوں رات کیونکر بسر کی؛ میری جان کچھ خبر ہے موسم غضب ڈھا رہا ہے۔ آہ! اس ننھی ننھی پھوار نے جدائی کے پردے کو بوجھل بنا دیا ہے۔ یہ خوبصورت زمانہ ——— یہ نشاط آگیں وقت میرے لئے سخت تپش آفریں ہے کہو جان بہار! کتنی۔ فضائیں شرربار ہیں گی۔ گستاخی معاف ——— بڑے بیدرد ہو ——— سچ بتاؤ کیا تم جیسے "من موہنے دیوتا" دل والے نہیں ہوتے افسوس

آئے نہ تم بہار میں بیت چلی بہار بھی

ہاں بھئی ہو بڑے خوش قسمت، تمہاری کشش دل کی تو قسم کھانی چاہئے۔ دیکھو! دیکھو بخفانہ ہونا، تمہارا چاند تو تمہیں ابر و باراں میں بھی نظر آگیا۔ گو اتفاق وقت ہی سہی!

کل سے میرا جی ڈوبا جا رہا ہے۔ نہ جانے دل کی رفتار کیوں سست ہوتی جا رہی ہے۔ خدا خیر کرے! تم بادہ پرکیف بھی ہو اور ساغر لبریز بھی! لیکن یہ کیا جذب و کشش کی موجیں ساحل دل سے ٹکرا ٹکرا کر نغمۂ فراق سناتی ہیں۔ بیخودی کی نے گوش تمنا سے روٹھی ہے ــــ اُف دنیائے محبت کا ذرّہ ذرّہ اپنے مرکز سے ہمکنار ہے۔ عالم ہستی تمہاری جمال پاشیوں سے خالی نہیں۔ مگر یہ احساس کہ تم مجھ سے دور ہو محبت کی شادابیوں کو چھینے لیتا ہے۔ اے کاش تمہارا وجود ــــ محبت شناسی کا حق ادا کرتا ــــ خوب جانتے ہو میں کیا چاہتی ہوں کاش کہ طمانیت کے جھرمٹ میں تم پہلی بار مجھے مل جاتے۔ میری ایسی قسمت کہاں خوش رہو یہی مراد زندگی ہے۔ تمہارے سچے تبسم میں میری مسرت حیات کا راز مضمر ہے ــــ میرے ہنسمکھ اختر! مجھے ایک بار تو مسرت کی وادیوں سے روشناس کرا دو۔ بہت دن سے پھولوں کی بارش ہوتے نہیں دیکھی ــــ آؤ میری جان ــــ لبوں کو ہلکی سی جنبش دیکر ہنس دو تاکہ ــــ ساری فضائے حیات تمہارے قہقہوں سے متبسم ہو جائے۔ افکار کی آہنی گرفت سے چھٹکارا نہیں نصیب ہوتا۔ ساری ساری رات جاگتے گذر جاتی ہے۔ زیادہ لکھا نہیں جاتا طبیعت اداس ہے ــــ دیکھوں کب تمہارے نفس کی صدائیں دل کے خوابیدہ نغموں کو بیدار کرتی ہیں۔

کشتۂ حسرت۔ نرگس

۱۵

حسرتِ دل سننے والا ہے بڑا نازک مزاج
ختم اک آنسو میں کل افسانہ ہونا چاہئے

موہنے اختر! ــــ خوش رہو، آج کئی روز کے بعد تم نے قلبی خلجان کا جال توڑا۔ تمہاری خیریت معلوم کرکے اطمینان ہوا لیکن تمہارے تفکرات کا بار ایسا نہیں جو مجھ پر نہ پڑے۔ تمہاری پژمردگی نے فضائے حیات کو غم آلود بنا دیا ہے یہ بھی میری قسمت کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ تمہاری طرف سے بھی میرے دل کو سکھ نصیب نہیں ہوتا۔ محروم سکون کبھی راحت سے بغلگیر نہیں ہوتے۔ خدا تمہارے قلب کو طمانیت کے جلوے بخشے ــــ دعا کرتی ہوں کہ تم بار بار احسان کا لفظ لکھنا بھول جاؤ۔ میرے لئے تو ساری عزت، توقیر یہی ہے کہ تم مجھے فراموش نہ کرو۔ بس یہی میری کائنات ہے۔ خدا شاہد ہے اختر! ساری دنیا سمٹ کر تمہاری ذات میں محدود ہو گئی ہے ــــ پھر تمہیں بتاؤ، تمہاری طویل علالت میرے لئے کیونکر مستقل عذاب نہ ہو۔ کل سے بائیں جانب پہلو میں میٹھا میٹھا درد اٹھتا ہے۔ اٹھا نہیں جاتا۔ ہاتھ پیر جواب دے رہے ہیں۔ لکھنا بہت کچھ ہے معذرت خواہ ہوں، پھر باتیں ہونگی۔ میری خیریت کس دل سے پوچھتے ہو ــــ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔

اسیر محبت۔ نرگس

۱۶

ہو گئیں کیاریاں ہری ایسے کہ رت پلٹ چلی
کون یہ مسکرا دیا۔ ہنسنے لگی ــــ کلی کلی،،

جانِ مسرت! ــــ لاکھوں پیار۔ رات تمہارے قوی ہاتھ کے لمس نے تمام جسم میں برقی لہر دوڑا دی ــــ کچھ نہ پوچھو شب بھر جو کیفیت طاری رہی۔ اُف اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ تمہاری دلکش تحریر کھول کر دیکھوں۔ رات بھر تمہارا کیف آور انتظار رفیق تنہائی بنا رہا لیکن آہ! ــــ تم نہ آنا تھے نہ آئے ــــ بیلی شب بھی آرزوں کا مزار بنا کر چل دی۔ سحر کے سرد جھونکوں نے شمع تمنا گل کر دی ــــ صبح نے سرور آفریں تخیل پر یاس کا سیاہ پردہ چھوڑ دیا ــــ ہوش و حواس غمگسار بنے۔ تمہارا خط پڑھا۔ ارے اختر! یہ کیا میری ذرا سی ناسازی کا اتنا اثر۔ سوچتی ہوں جب ــــ خبر مرگ، سنو گے تو کیا حال ہوگا۔ میں خوب جانتی ہوں جیسا اخلاق آج کل کے نوجوان طبقہ کا ہے۔ بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر لینے سے اخلاق نہیں درست ہوتا۔ رواداری کی آن اور ہے خودداری کی شان دوسری۔ تم سچ کہتے ہو زیادہ جوش و خروش بھی سکون و خاموشی کی دلیل ہے مجھے تو رہ رہ کر ــــ ان پر غصہ آتا ہے کہ دوسرے کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ نام و نمود پر مرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے جواہرات کو آفتاب کی حاجت نہیں ہوتی۔ ہیرے تو تاریکی میں بھی چمکتے ہیں۔ پھر یہ ظاہر پرستی کیسی؟ مجھے تو ایسی خوشامدانہ زندگی سے سخت تنفر ہے۔ میرے بس میں اگر ہوتے تو یہ ساری رنگینیاں جس میں وہ ڈوبتے جا رہے ہیں ختم ہو جاتیں ــــ میں کیا بتاؤں نہ صاحب زر ہوں نہ طمانیت کا سایہ میسر ہے۔ شاید مطمئن لمحے انسان کو بے حس بنا دیتے ہوں۔ واللہ اختر! تمہارے خیالات بیحد پاکیزہ اور قابل احترام ہیں ــــ تمہارے نوٹ نے دل میں غم انگیز ہیجان پیدا کر دیا ہے ــــ میرے عزیز محبوب، تمہیں بتاؤ کیا کروں اور کیونکر تم تک پہونچوں۔ آہ تم کیا جانو، میں تم سے ملنے کیلئے کس قدر بیچین ہوں ــــ

بہت سی ضروری باتیں تم سے کہنا تھیں مگر وقتی مجبوریاں میری آرزوؤں کا خون کئے دیتی ہیں —،

ناکام محبت، نرگس

۱۷

تسلّی میں بھی تخمِ غم بو دیئے
وہ سمجھاتے سمجھاتے رو دیئے

مرکزِ آرزو! — خوش رہو۔ محبت نامہ ملا۔ یہ معلوم کر کے اذیت ہوئی کہ تم نے میرے تفکرات کی زنجیروں میں خود کو بھی گرفتار کر لیا۔ واللہ میں تمہیں اپنا سچا ہمدرد سمجھ کر اپنی ہر تکلیف کا اظہار بلا کم و کاست کر دیتی ہوں۔ جس سے میرے درد میں کمی ضرور ہو جاتی ہے۔ اب اس سے تمہارا فکرمند ہونا میری دردانگیزیوں کا بڑھانا ہے۔ خدا کی قسم میں صرف تمہاری نظرِ التفات کی تشنہ ہوں۔ اگر کچھ چاہتی ہوں تو وہ صرف تم ہو اور تمہاری پیاری ہستی جو میرے لئے مخزنِ سکون و انبساط ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ تمہارا وجود میری پریشانیوں کے آہنی قلعہ کو تارِ عنکبوت کی طرح توڑ سکتا ہے۔ "دکھ اور درد" مسموم ہوا کے جھونکے ہیں۔ دنیا میں رہ کر ان کی گرفت سے بچنا محال؛ بھنور میں پھنس کر ساحل کی عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ناداری کی خلیج عبور کرنا دشوار۔ تمہارے مخلصانہ الفاظ میں جو سکون پرتو ہے وہ مجھے — "زر و جواہرات" کے ڈھیر میں بھی کبھی نظر نہ آئیگا کیونکہ یہ دلِ شکستہ خلوص کے ساتھ تمہاری پرستش کرتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ تم کب تک "تشکر" کی چکی میں پیس پیس کر مجھے سرمہ بناتے رہوگے۔ دیکھو تم جیسے عالی ظرف انسان کے لئے یہ الفاظ کہاں تک موزوں ہیں بس سنبھلو! کیوں اپنے دامن کی پراقیت کو احسان کے غبار سے ملوّ کرتے ہو۔ بیجا امتنان کی بارود کہیں تمہاری نرگس کو اڑا نہ دے۔ سنا مجھے تعریف و تشکریہ کی آرزو نہیں۔ یہ الفاظ کسی اور ہستی کے لئے جمع رکھو۔ میں تو تمہارے لبِ لعلیں سے کچھ اور ہی سننا چاہتی ہوں۔ ذرا اپنا قوی ہاتھ ادھر بڑھاؤ — محبت کے عظیم و لطیف جذبہ کی قسم آج عہد کرو کہ اب کبھی اس خلش افزا ممنونیت کا اظہار مجھ سے نہ کروگے۔ دیکھو دیکھو یہ مجھے ہلاک تبسم بناکر بات کو نہ ٹالو۔ تمہارے سرِ اقدس کی قسم۔ تمہاری غیریت کے تیر بُری طرح دل میں کھٹکتے ہیں۔ اب میں اس پُرتکلف انداز کا نشکار بننا نہیں چاہتی — خدا کی قسم اب اگر تم نے ایسے الفاظ لکھے تو پڑھنے سے پیشتر میں آنکھیں بند کر لونگی۔

مجھ میں اتنی ہمت کہاں، جو تمہاری سچی ہمدردی کا ثبوت دے سکوں گو طاقت نہیں مگر شریکِ درد بننا چاہتی ہوں۔ یہ مثل کتنی سچ ہے کہ — مفلس کی جوانی جاڑوں کی چاندنی ہوتی ہے؟ فی الحال دنیا کا وہ گوشہ جس میں تمول کی روشنی نہ ہو۔ سیاہ اور بے نور ہے۔ تم سچ کہتے ہو زمانہ میں ساری بہار پیسے کی ہے۔ لیکن یہ سمجھ لو — "شمعِ دولت" گو رہبرِ حیات ہے مگر سکون سے بغلگیر نہیں کر سکتی۔ طمانیت کا جلوہ قدرت کا وہ خاص عطیہ ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اسے تو بس قسمت والے ہی پاتے ہیں۔ آج تین روز سے گرمی شدت کی ہو رہی ہے پھنکی جا رہی ہوں۔ ساری رات سخت کرب و بےچینی کے عالم میں کٹتی ہے۔ تمہیں تو پھر صاف ہوا مل جاتی ہے۔ مقیدِ ہستی سے مناظر کی رو پوشی پوچھو!!

محتاجِ نوازش۔ نرگس

۱۸

پتلی مری آنکھوں کی اب صبح کا تارا ہے
آنا ہے تو آجاؤ ایسے میں سویرا ہے

سکون نواز اختر! — نامہ ملا۔ جواب تعویق سے دے رہی ہوں، اسے اتفاق ہی سمجھو، عذر خواہ ہوں، — تم اور میرے، بس بس خدا کے لئے دل کے زخموں کو نہ کریدو۔ اب دل مٹ چکا۔ شمعِ امید گل ہو چکی، میرے دل میں اب کوئی آرزو نہیں۔ صرف تمہاری مسرتوں کی خواہاں ہوں — معبود تمہیں دلی سکون عطا فرمائے۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ میری تحریر پر تمہاری نرم نگاہیں نوازش کی بارش کرتی رہینگی — خدا تمہیں خوش رکھے (آمین) میں کیسی ہوں — اُف! تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام؟ بہرحال زندگی کے خار بُری طرح دل میں پیوست ہیں — خدا کے لئے اپنا جادو آمارو ورنہ انجام کی میں ذمہ دار نہیں۔ محبت کا شعلہ دل پھونک چکا — اب دماغ کی سلطنت بھی چھینی جا رہی ہے — خدا کے لئے آؤ اور مجھے سنبھالو — تمہارے نشاط آفریں تصوّر نے جسم میں کیف آفریں رعشہ پیدا کر دیا ہے۔ ہائے اس وقت تم کہاں ہو پیارے! — کب تک تمہارا انتظار کروں — اُف میری روح کو انتظار کے شعلے پھونکے دیتے ہیں۔

تمہاری بے قرار روحی۔ نرگس،

۱۹

رفتہ رفتہ زخم کے پردے میں غم کے گھر بنے
کل جو روزن دل میں تھے وہ آج بڑھ کر در بنے

سرمایہ حیات اختر! ——— محبت نامہ ملا۔ تمہاری تکلیف سنے تکلیف ہوئی ہر انسان اپنے مصائب پر سرد آہیں بھرتا اور آنسو بہاتا ہے۔ کوئی مصیبت کے اس رخ پر نظر نہیں ڈالتا کہ آلام ——— قلب کو کتنا منور کر دیتے ہیں۔ آہ! سچ ہے دماغ کے منتشر اوراق یکجا کرنا آسان نہیں۔ آدمی زندہ رہنے کے لئے اپنے آنسوؤں کا محتاج ہے اور ہم ایسی غم نصیب ہستیوں کے لئے تو یہ موتی ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کہ بادشاہ کے تاج کے لئے جواہرات، کا ہونا لازمی ہے یا جس طرح ——— شبنم ——— کھیتی کے لئے ناگزیر؟ کسی کا مقولہ ہے اور خوب ہے کہ اگر بعض قدیم آہیں زمین پر موجود نہ ہوتیں تو آسمان کا راگ ——— رات کا سکون بھی بے معنی ہوتا ——— میرے موہنے والے اختر! اپنے قلب ناتواں کو ذہنی خلفشار کی کے پہاڑ سے نہ کچلو ——— قلبی خلجان بھی مرض لا دوا ہے اور زیادہ حساس دلی بھی زندگی کا شدید روگ! ——— برا نہ ماننا تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنی صحت کی خوشگوار کھیتی کو تلوؤں سے مسل ڈالا۔ افسوس، قدرت کی یہ ستم ظریفی کہ احساس کا حصہ بھی تمہارے عناصر کو فیاضی سے عطا ہوا ہے۔ خدا کے لئے اگر میری محبت کی عظمت تمہارے دل میں ذرہ برابر بھی ہے تو تپش آفریں خیال سے دامن بچاؤ۔ تمہاری پریشانیوں کا تصور میرے دل کے ذرہ ذرہ پر لرزہ طاری کر دیتا ہے اور میں غم کی تاریک گھٹاؤں میں کھو جاتی ہوں ———

غم شناس اختر! اپنی صحت کو مقدم سمجھو۔ گو تمہاری طویل جدائی کے شعلے عجب نہیں جو میری ہستی کو بھی خاکستر کر دیں مگر پیارے مجھے تمہاری صحت بہت پیاری ہے۔ تم مسوری جاؤ اور ضرور جاؤ ——— کہو کب تک قیام کا ارادہ ہے، جانتے ہو کہ میں پھانسی کے تختے پر کھڑی ہوں۔ خدا کرے کہ زندگی اور موت کے مراحل تمہاری موجودگی میں طے ہوں ——— ہاں یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں راگ سے ہم آہنگ؟ یہاں تو رونا بھی سوز میں ڈوبا ہوا نہیں آتا تو گانا کیسا؟ ——— میرے عزیز محبوب اگر مجھے چاہتے ہو تو صرف مجھے چاہو اور محبت ہی کی خاطر چاہو۔ میری اجڑی ہوئی پائمال شدہ ہستی میں کسی خوبی و محاسن کی تلاش بے سود ہے ——— میں وہ خاکستر ذرہ ہوں جسے آفتاب کی کرنیں بھی روشن نہیں کر سکتیں، ——— "میں نے تمہاری نظم "بیچارن" کے عنوان سے دیکھی۔ بہت دلکش ہے۔ سلامت رہو، دل بہلانے کا کھلونا ہاتھ آ گیا اب نہ کٹنے والی رات تمہاری نظم کی شیرینی و لطافت میں شاید کیف آور تڑپ کے ساتھ بسر ہو جائے ——— مطمئن رہو، میں ہر مصیبت کے لئے آمادہ ہوں سچ تو یہ ہے کہ ایک حد تک آلام کی عادی ہو چکی ہوں۔ ہاں یہ یقین کر لو کہ میں نے تم کو نہ کسی اندوہگیں لمحوں میں بھلایا ہے اور نہ کبھی فراموش کر سکتی ہوں۔ خواہ لاکھوں کوس تم سے دور رہوں۔ میں اپنے آلام کے عمیق سمندر میں کبھی حشر تک تمہیں غرق نہیں کر سکتی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ اپنے عزیز ترین محبوب کا روشن مستقبل اپنے ہاتھ سے تاریک بناؤں۔ کبھی نہیں ——— میں دل سے جہاد کرونگی ——— آرزوں کو پسپا کرونگی ——— اور آخری سانس تک تمہاری پرستش کرتی رہونگی ——— خدا حافظ،

خاکپائے اختر ——— نرگس،

۲۰

کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں
اے ہجوم نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

جان نرگس! ——— ہزاروں پیار، نامہ جاں نواز ملا۔ اُف تمہاری تحریر کی کیف باریوں نے مجھے دنیائے نشاط میں گم کر دیا۔ مرکز آرزو! ذرا دیکھو یہ جاں بخش تحریر اس قابل ہے کہ اسے نذر آتش کر دوں ——— نہیں کبھی نہیں ——— یہ تحریر یہ طرز تقریر مجھے ہمیشہ خط تقدیر کی طرح عزیز رہے گی ——— ہائے اختر! ادعائے عاشقی میرے ایسے سیماب کا قلب رکھنے والے انسان کے لئے داستان فرسودہ نہیں بلکہ وہ تمہارے ہی الفاظ تھے جس کا اعادہ میری زبان قلم سے ہو گیا تھا۔ ورنہ اظہار مدعا کی لطیف خلش میرے لئے مخصوص ہے۔ جگر نے کہا ہے ؎

یہ ساری لذتیں ہیں میرے شوق نامکمل تک
قیامت تھی یہ پیمانہ اگر لبریز ہو جاتا،

تیوریاں نہ چڑھاؤ ——— تمہارا تبسم ہی میری ہلاکت کو کافی ہے۔ یہ تشنی نہیں ہو سکتی ——— آہ یہ ہے میرے قلبی آئینہ کی شکست، گو بے سرو پا تخیل سہی۔ لیکن یہ تلخی میری ساری شیرینی ختم کئے دیتی ہے۔ ہاں بظاہر کوئی تیر نشتر میرے پاس نہیں موجود، پھر بھی اختر، یہ دلشکن خلش میرے سانس لطف کھینچے لیتی ہے۔ شاید تمہیں مزید تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے قدرت نے

یہ جذبہ مجھے بخشتا ہو ـــــ اُف جب مجھے اس کا احساس ہوگا کہ تم میرے اور صرف میرے ہو تو جانتے ہو یہ دوری میرے لئے کیسی گراں بار ثابت ہوگی اور یہ ساری قید بندگی کی زنجیریں پارہ پارہ ہوکر گر جائیں گی۔ جان نرگس ـــــ کشش کو انجام کا خیال نہیں ہوتا ـــــ خدا شاہد ہے کہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے عمیق تباہیوں میں کودنے کیلئے تیار ہوں لیکن یہ خیال کہ تم میری خاطر اپنا مستقبل کیوں تاریک بنانے لگے جبکہ تم کسی دوسرے کے امین ہو۔ یہ احساس میری ساری ہمتوں اور قوتوں کو توڑ دیتا ہے۔ ارادے سست ہوکر رہ جاتے ہیں اور کچھ نہ پوچھو میں کس کشمکش میں گرفتار ہو جاتی ہوں اف ؎

پھونک دے اے غیرت سوز محبت پھونکدے
اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

تم میری فطرت سے خوب واقف ہو۔ خودداری کا جذبہ جس قدر مجھ میں ہے۔ میں ہی جانتی ہوں۔ خوشامد سے ہمیشہ نفرت رہی۔ یہی اگر ہوتا تو گھر کی ملکہ ہوتی۔ وہ حد درجہ نخوت پسند ـــــ خوشامد پسند ان کی فطرت ٹھہری جس سے مجھے انتہائی تنفر۔ محکوم قدرت نے بنایا ہے۔ لیکن پھر بھی میں ان کی شوکت و ثروت سے کبھی نہیں دبی۔ میں نے ہمیشہ انھیں ٹھکرایا ہے۔ خواہ مجھے کتنی ہی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔ ہر وقت طنزیہ ملامت کون سا روبہ ہے۔ اب تو ساوات ہو چکی۔ لیکن بشر ہوں، اکثر کوفت ہوتی ہے۔ تم مجھکو مجبور کرتے ہو کہ میں ان سے اعتراف شکست کرلوں، انھیں تم سے سخت رقابت ہے اور تم کیسے فرشتہ سیرت ہو، ہائے وہ تم سے کالج میں ہنسکر بولے اور تمہیں اعتماد ہو گیا ـــــ تم نے تو دفتر عصیاں دکھا کر راہ شوق میں جہنم کے شعلے بھڑکا دیئے۔ خدا حافظ۔

گنہگار محبت ـــ نرگس،

۲۱

یہ گردشیں تو ستم ہیں دل حزیں کیلئے
کہاں سے لاؤں نیا آسماں زمیں کیلئے

صبر آزما اختر! ـــــ ہمیشہ خوش رہو۔ محبت نامے نے دل مردہ میں روح پھونکدی۔ تمہاری عدم موجودگی میں قلبی اذیت محسوس ہوتی ہے۔ نہ جانے جی کیوں نہیں چاہتا کہ تم کہیں جاؤ۔ کچھ نہ پوچھو، روحی تکلیف تھی۔ جی بیٹھا جاتا تھا۔ جدائی کے شعلوں میں وہم اور شک کی گرمی حصہ لے رہی تھی

محبت کا واسطہ معاف کرو! گنہگار ہوں ـــــ جانتے تو ہو تو اس شب کو جب تم کوسوں کا فاصلہ طے کرکے دوش ہوا پر پھولوں کی بارش کرتے ہوئے میرے قریب آئے تو میں نے آہ ـــــ نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت تمہیں گھور کر دیکھا اور گردن کو ہلکی سی جنبش بھی دی۔ اُف دنیائے تخیل میں زلزلہ آ گیا، تم غنچہ نوشگفتہ کی طرح کھل گئے۔ ضیائے تبسم نے تشکوک کی تاریکیاں مٹا دیں اور میری فضائے محبت مہک گئی۔ یاد ہے میری آنکھیں خجالت سے جھک گئیں اور ـــ تم نے لپک کر......؟

آرزوں کے طلسمی نگارخانے میں تشکوک کا سیاہ نقطہ آجانا جرم نہیں تو اور کیا ہے؟ ـــــ بولو ـــــ موسم کی کیف سامانیاں آہ نہ پوچھو کتنی کیف آور ہوتی ہیں۔ وہ ہستی جو حوادثات کا شکار ہو چکی ہو۔ دنیا کے دلفریب مناظر سے کیا خاک لطف اٹھا سکتی ہے۔ مدت ہوئی کہ ناکامیوں نے شمع مسرت بجھا دی۔ البتہ قدرت کو میری حالت پر رحم آتا ہے وہ ظالم انسانوں کی طرح بیدرد نہیں ـــــ آہ ٹھنڈی ہوائیں تمہارے جسم کی خوشبو اپنی مٹھی میں چھپا کرکے آتی ہیں۔ بوندوں کا نغمہ تمہاری آواز کی دلکشی میں گم کر دیتا ہے۔ گھٹائیں جھوم جھوم کر تمہاری رفتار کا عالم دکھاتی ہیں ـــــ بادل کی گرج تمہارے قہقہوں کی مشابہت اختیار کرلیتی تھی ـــــ صاعقہ شرربار اس کا ثبوت پیش کرتی تھی کہ تم ایک جھلک دکھا کر روپوش ہوگئے، "پپیہے" کی پرسوز آواز کہہ رہی تھی کہ تم مجھے پکار رہے ہو ـــــ موسم کی نشاط آفرینی میرے دل کو آئینہ دکھا رہی تھی، تم سراپا بہار تھے اور میرے خاکستر دل کا ذرہ ذرہ تڑپ تڑپ کر تمہارے لئے مچل رہا تھا ـــــ آہ تم مجھ سے کتنا دور تھے۔ عقل و خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ ساری رات تمہارے خیال کی رنگین وادیوں میں چکر لگایا کی۔ اف دل نے کراہ کر کہا۔

"پیا بن ـــ ناگن کالی رات"

جان محبت! تم طویل سفر پر آمادہ ہو، آہ میرا جی ڈوبا جاتا ہے۔ کہیں تمہاری جدائی کے شعلے مجھے بھسم نہ کر ڈالیں۔ جاتے تو ہو مگر اتنا خیال رہے کہ تمہاری جنت تک میرے جہنمی شعلے ضرور پہنچینگے۔ دیکھو وہاں کی دلفریبیوں میں محو ہو کر جہنمی نرگس کو بھلا نہ دینا۔ اس سرزمین کا ذرہ ذرہ مجھ سے بیزار ہے۔ آج میں نے تمہیں صبح ہوتے خواب میں دیکھا اور میری نماز فجر ـــــ نماز عاشقی میں گم ہو گئی۔ کسی طرح بستر سے علیحدہ ہونے کو جی نہ چاہا۔ آخر آفتاب کی

کی پہلی کرن نے خط مجھ رسید کیا اور میں تمہارے خیال کا بازو سنبھال کر اٹھ بیٹھی۔
رخصت! ——

دلفگار —— نرگس،

۲۲

پرسش حال پہ ہے خاطر جاناں مائل
جرأت کوشش اظہار کہاں سے لاؤں

شمع تمنا اختر! —— خدا تمہیں باد سموم کے جھونکوں سے محفوظ رکھے۔ خط ملا۔ تحریر کی دلکشی نے دل کو بیحد متاثر کیا۔ دیر تک لطف اندوز ہوتی رہی بیک وقت دو کیفیتیں طاری ہوئیں۔ روح نے گرمی محسوس کی گر دل لرز کر رہ گیا۔ یہ ایک ہفتہ کیونکر بسر ہوا بس نہ پوچھو تمہاری عدم موجودگی نے بیقراری کا سیلاب دل میں اٹھا رکھا تھا۔ توہمات کا ہجوم —— شکوک کی کثرت، الامان؟ سارا سارا دن پریشانی میں کٹتا۔ اور رات رات بھر ہولناک خواب نظر آتے ہیں۔ تمہاری صحت و سلامتی کی دعائیں کرتی اور خاموش رہتی اف —— تمہارے قلم کو دل موہنے کے منتر خوب یاد ہیں۔ میری یاد اور تمہیں آئے۔ بس بس رہنے دو۔ مجھے ایسے پھول نہ چاہئیں جو خوشبو سے بیگانہ ہوں۔ ہاں ہاں مجھے خوب معلوم ہے کہ میرا گزر تمہارے دل کی وادیوں تک نہیں ہو سکتا شاید میرے بعد تم مجھے یاد کرو تو کرو ورنہ زندگی میں تو یہ دولت مجھے ملتی نظر نہیں آتی —— قدرت کے سارے مناظر تم لوگوں کے لئے ہیں۔ ایک بدنصیب و منفعد ہستی کیا جانے کہ دلکش مناظر اور پر لطف صحبتیں کیسی ہوتی ہیں —— نفرت کرنا اگر میرے اختیار میں ہوتا تو تمہاری محبت کے تیروں کو دل میں پیوست کر کے اپنی زندگی کیوں تلخ بناتی۔ تم لاکھ تردید کرو مگر حقیقت مٹائی نہیں جاتی —— یہ روشنی بھی کہیں بجھائے سے بجھتی ہے۔ یہ رنگ طبعزاد افسانوں میں نہیں جھلکتا میں یہ خوب اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم آپ بیتی لکھتے ہو اور بڑھا بھی دیتے ہو کچھ زیب داستان کے لئے؟ یہی تو ایک راز ہے جسے میں آج تک نہ پا سکی تمہارے قلم سے صدا آتی ہے کہ تم کو کسی ستم کیش نے بری طرح مجروح کیا ہے لیکن —— آہ میں شاید زندگی بھر تمہارے دل کی گہرائیوں تک نہ پہونچ سکوں —— واللہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قدر غمگیں کیوں ہو؟ تم میرے درد کے درمان ہو لیکن خدا یہ ستم دیکھو کہ میں تمہارے درد کو تشخیص تک نہیں کر سکتی جب میں اپنی بے بسی اور تمہارے دکھ درد پر نظر ڈالتی ہوں تو ایک ناقابل بیان ہوک سینے میں اٹھتی ہے —— خدا کے لئے مجھے زندگی کی دو دعائیں

اب یہ زندگی روز بروز —— "بار گراں" بنتی جا رہی ہے۔ اکثر جب میں تمہارے خیال میں گم صحن مکان میں ٹہلتی ہوں تو سامنے چولہے کی آگ مجھے پکارتی ہے اور میں شوق کے ساتھ اسے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوں۔ دل کے شعلے آگ کی لپٹ سے کھیلنا چاہتے ہیں لیکن تمہارا جاں نواز تصور میرا دامن پکڑ لیتا ہے۔ بخدا مجھے جب سے ادراک کی دنیا ملی اور مجھے اس کا احساس ہوا کہ —— تم میرے کبھی نہیں ہو سکتے؛ میری زندگی تلخ ہو کر رہ گئی ہے۔ کچھ نہ پوچھو جو دل پر گزرتی ہے۔ آہ! میرے پیارے —— تم میری جان ہو مگر نہ جانے کون سی خوش نصیب ہستی کے جسم ثابت ہو گے؟

تم کب تک مجھے خوش رہنے کی دعائیں دیتے رہو گے جانتے ہو کہ قندیل مسرت گل ہونے کے بعد روشن نہیں ہوتی۔ یہ میری صاف دلی کا بین ثبوت ہے کہ میں تم سے ہر بات کا اظہار کر دیتی ہوں۔ تمہاری قسم مجھ سے . . . نے نہیں کہا۔ یہ میرا راز ہے۔ وہ مجھ سے کیوں کہتی۔ تمہاری دلبستگیاں تمہیں مبارک! ہماری قسمت کی تاریکیاں مٹانے کے لئے ہمارے آنسو کیا کم ہیں؟ میں جس قدر گوشہ نشین ہوں دنیا جانتی ہے پھر بھلا کسی سے کیونکر ملاقات ہو۔ زمانہ گذرا جب میں نے تمہارے "مرکز توجہ" کو دیکھا تھا۔ تم سچ کہتے ہو جب تک خیال تیقن کی صورت نہ اختیار کر لے کبھی ایسے الفاظ زبان پر نہ لانا چاہئے۔ آج سارا دن درد سر رفیق حیات بنا رہا۔ اس وقت خط لکھ رہی ہوں جبکہ شام ہو چکی ہے۔
—— باقی پھر کبھی۔ رخصت

کشتۂ نظر۔ نرگس،

۲۳

زخمی نہ ہوا تھا دل ایسا سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی
پہلے بھی ہوئے تھے کچھ صدمے روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی

مونس تنہائی! —— خوش رہو، ہائے پیارے آج کی رات کیسی سہانی اور دلکش ہے اُف اختر!

یہی موقعے ہوا کرتے ہیں سب کچھ بھول جانے کے

غالباً تم بھی میری طرح قلبی صدمہ انگیزیوں میں مبتلا ہو —— اگر جاگتے ہو تو آؤ —— شب کی تاریکی میں امواج سکون بن کر مجھ تک پہونچ جاؤ۔ دیکھو میں تمہارے نامعلوم انتظار میں سراپا انتظار بنی بیٹھی ہوں۔ آؤ میرے غم آگیں مایوس کن انتظار کو مسرت کی کیف باریوں میں تبدیل کر دو ——

میرے پیارے! مجھ سا حرماں نصیب بھی زمانہ میں کم ہوگا۔ آہ اتنی عمر میں زندگی کی کتنی منزلیں طے کرچکی لیکن ایک شب بھی مجھے ایسی نہ ملی کہ جسے میں سرمایہ حیات وسکون سمجھتی اوراب تو

جو اپنی روٹھی جاتی ہے کسے بھیجوں منانے کو

جانتی ہوں کوئی کسی کا نہیں ــــ مگر محبت کی شعلہ سامانیاں ہوش وحواس کھوئے دیتی ہیں۔ تمہارے مسکراہٹ افزا تبسم کی قسم! دل کے ذروں میں کبھی یہی تڑپ ہوتی ــ ایسی ہی حالت ہوتی تو پانچ سال یوں کامل سکوت سے بسر نہ ہوتے دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ وارفتگی کا یہ عالم شروع شروع تو نہ تھا آہ ــ شعلۂ جانسوز طلب دل وجگر کو پھونکے دیتا ہے ــــ خدا کے لئے آؤ بس تڑپا چکے اپنے امرت بھرے تبسم سے میری ساری تلخیاں مٹا دو ــــ میری مچلتی ہوئی تمناؤں کو سمجھاؤ ــــ میں تو اب سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی۔ مگر کچھ قابو نہیں چلتا۔ رخصت،

سراپا محبت ۔ نرگس

۲۴

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم
ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردش ایام ہم

روح نواز اختر! ــــ اپنی غم نصیب کا سلام قبول کرو۔ نوازش نامہ کی غم انگیزیوں نے دل کی کاوشوں میں افزونیت پیدا کردی۔ آہ! پیارے، ابھی سے موت کا انتظار کیسا؟ بتاؤ کیوں عروس اجل کے لئے آغوش وا کئے ہو۔ دنیا اور اس کی فریب کاریاں ازل سے ہیں اور ابد تک قائم رہینگی، پھر اس کا غم بیکار۔ تمہیں قسم ہے یہ منحوس تذکرہ میرے خط میں نہ کیا کرو۔ آہ میری روح غم کی تاریکیوں میں ڈوب جاتی ہے جب تم موت کی آرزو کرتے ہو حد ہو گئی ــــ اب بہت نہ رلاؤ۔ ذرا نگاہ غور سے دیکھو۔ خوب جانتے ہو کہ میں نے کیسی کڑی اٹھائی ہے۔ اس پرفریب دنیا نے زندگی تباہ کردی۔ آج تک اپنے سائے نے بھی وفا نہ کی تو دوسروں کا کیا شکوہ۔ ایک بار نہیں لاکھوں بار یہ کوشش کی کہ دنیائے حیات کا خاتمہ کرلوں مگر ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اب تو نہ جانے کیوں مرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ پیہم حادثات نے دل میں اتنی ہمت پیدا کردی ہے کہ ہر مصیبت کے لئے تیار رہوں۔ سچ ہے فکر بُری، فاقہ بھلا، مجبوری کا نام صبر ہے۔ ناواقف مسرت کیا جانے کہ راحت کا کیف اور جھونکا کیسا خوشگوار ہوتا ہے؟ خدا کے لئے صبر واستقلال کا دامن نہ چھوڑو بلند خیالی کو سہارے کی حاجت نہیں۔ قناعت، پہاڑ کو اڑا دینے والی بارود ہے اور صبر ــــ سوزش وشورش کا ست۔ آفتاب پر خاک نہیں پڑ سکتی۔ ہیرے کی ضیا کو ذرے نہیں مٹا سکتے۔ انسان کو اگر غیر فانی قوت حاصل ہو جائے تو پھر ابد تک دنیا اُسے فراموش نہیں کرسکتی۔ یہ وہ نقش ہے جسے مٹانے والے خود مٹ گئے۔ بقا کو سعی کی ضرورت نہیں۔ یہ وہ آفتاب ہے جسے صبح صادق کی خواہش نہیں۔ تقدیر کے کرشمے تدبیر کے بازوؤں کو شل کردیتے ہیں۔

اب تو امید کا سرسبز چمن بھی پامال ہوگیا ــــ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیوں زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ آج کل تمہاری محبت کے شعلے بری طرح دل میں بھڑک رہے ہیں۔ میرے دردنواز محبوب سنبھلو۔ دیکھو خود رفتگی کے حدود سے قدم نہ اٹھیں۔ میں اور فرشتہ؟ توبہ کرو کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہارا حسن ظن اتنا بلند نہ ہونا چاہیئے۔ جو حقیقی انسان بھی نہ بن سکا وہ فرشتہ کیا بنیگا تم سچ کہتے ہو آزادی اور بیجا آزادی کی مذموم فضا نے بیباکی کی حدیں وسیع کردی ہیں۔ میں یہاں کی سوسائٹی سے بالکل بیگانہ ہوں۔ دوسروں کو کیوں کہوں خود مجھ میں ہزاروں خامیاں ہیں جو ہر وقت ضمیر کے آئینہ میں نظر آتی ہیں تمہارے افسانے دیکھے اُف نہ جانے تمہارے قلم میں کونسا درد مضمر ہے کہ دل بے قابو ہوجاتا ہے۔ لاکھ ضبط کرو مگر آنسو پردۂ چشم سے جھانک ہی لیتے ہیں۔ افسانے کا ہر ہر لفظ خون جگر میں ڈوبا ہوا ہے آہ ــــ محبت بھی کس قدر ہلاکت آفریں جذبہ ہے اے کاش میں اس جانسوز جذبہ سے واقف نہ ہوتی۔

کشتۂ الم، نرگس،

۲۵

بتا دے ابتدائے سخت جانی مرے مقدر میں کیا لکھا ہے
بسر یونہی ہوگی زندگانی کہ جیسے اب تک بسر ہوئی ہے،

وفا شناس اختر! ــــ سلامت رہو، تمہارے نامہ جانسوز نے ضبط غم کی دنیا پھونک دی۔ آہ دل تفکرات کی تہ میں ڈوب گیا۔ میرے پیارے سخت سراسیمہ ہوں۔ ہائے کیونکر تمہارے دماغ سے روح فرسا خیالات مٹاؤں اف نہ جانے تم نے اپنے دل میں کیا ٹھانی ہے۔ نہ مجھ میں اتنی قابلیت ہے نہ قوت جو تمہارے دل سے یہ جان لیوا خلش مٹا سکوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے ایسے قیمتی الفاظ لاؤں جو تمہیں ذہنی کوفت سے نجات دلا سکیں۔ پیارے

تمہارا اترا ہوا چہرہ دیکھا نہیں جاتا۔ ہائے کیسا ستم ہے کہ تمہیں آلام کی آغوش میں تڑپتا ہوا دیکھوں اور چپ رہوں، اُف بے بسی، زہر ہلاہل کا چھلکتا ہوا جام ہے جسے قسمت جبر سے پلا رہی ہے۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ صاحب علم کبھی ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ علم تو آسمان پر پہونچا دینے والا زینہ ہے۔ خدا کے لئے اپنے کو سنبھالو۔ انسانی تخلیق کا مقصد تفسیر قرآن میں دیکھو ــــ بخدا اسی کو کفران نعمت کہتے ہیں۔ تمہیں تو معبود کا ہزار بار شکر کرنا چاہئے کہ دینے والے نے تمہیں بلند دماغ عطا کیا اور عالی خیالات کا مسکن دل کو بنا دیا۔ بیکار اپنی صحت برباد کرنے پر تلے ہو گھٹ گھٹ کر جان دینے سے حاصل ــــ آہ محبت کی آگ بھی کتنی شدید ہوتی ہے۔

میرے دلنواز اختر! اگر میری خوشی کے خواہاں ہو تو میری خاطر خوش رہنے کی کوشش کرو۔ واللہ دل نہیں چاہتا کہ تمہارے خوشگوار خیالات پر المناک پردے پڑیں۔ لیکن براہو التباس کی پرخار راہوں کا کہ کوئی نہ کوئی کانٹا دل میں چبھ ہی جاتا ہے۔ آہ، میری دلی کلفتوں کا مظاہرہ تمہارے نزدیک مضحکہ خیز ہے۔ لیکن پیارے انصاف کرو جب ایک جانور کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ اس کا مالک اسے پیار کرے چمکارے ــــ تو میں تو ایک دل گرفتہ ہستی ہوں جس کی رگ رگ احساس کی دنیا میں ڈوبی ہے ــــ تمہاری ہر تحریر فسانہ ہوتی ہے۔ سخت رنج ہوتا ہے جب میں اپنے ہاتھ سے "سرمایہ ادب" کو خاکستر کرتی ہوں۔ اس عمر میں ہزاروں افسانے دیکھے مگر یہ سوز و ساز تو کبھی کسی افسانہ میں نہ ملا۔ واقعی آپ بیتی اور جگ بیتی میں فرق ہے رسالہ . . . . . کے سالانہ نمبر میں کچھ خطوط "پریم پجاری" کے نام سے شایع ہوئے تھے جن کی بہت تعریف سنی تھی۔ مجھے بھی دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ دو چار خطوط دیکھے۔ خاک بھی پسند نہ آئے۔ بے اختیار دل چاہا کہ تمہارے اصل خطوط شایع کرا دوں ــــ تمہارا ہر ہر لفظ قیمتی اور گرانقدر ہوتا ہے۔ کوئی تمہاری عظمت میرے دل سے پوچھے۔ نہ جانے وہ کون سی ظالم ہستی ہے جس نے تم جیسے بلند سیرت انسان کو فریب دیا۔ اللہ تم پر رحم کرے اور یہ ہلاکت آفریں خیال تمہارے دل سے دور ہو۔ اپنا حال کیا لکھوں ــــ پریشانیاں روز افزوں ہیں ــــ،

تمہاری پریشان

نرگس،

۲۶

ہم ہی ہیں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

نرگس فراموش اختر! ــــ تمہاری طویل خاموشی میرا خون چوسے لیتی ہے۔ کچھ تو کہو آخر کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی جا رہی ہے ــ بولو۔ دل کی تلخکامیاں، سوگوار رات کی بیچینیاں آہ کچھ نہ پوچھو کتنی روح فرسا ہوتی ہیں ــــ فضا کی رنگینیاں دل میں ناقابل بیان درد پیدا کر رہی ہیں اُف یہ چاند کی سہانی رات اور ــــ تم مجھ سے کوسوں دُور۔ تمہاری یاد کلیجے میں چٹکیاں لے رہی ہے آؤ، آؤ، میرے وعدہ شکن ــــ آؤ۔ آنکھیں تمہارے انتظار میں خون کے آنسو بہا رہی ہیں ــــ ڈوبے ہوئے دل میں جذبات کا طوفان بپا ہے۔ دیکھو دیکھو بادلوں نے مجھ ناکام محبت پر آنسو بہانا شروع کر دیا اُف یہ بوندوں کی رم جھم ہے یا سسکیوں کی آواز؟ ــــ جانتے ہو عورت کو قدرت نے صنف نازک کا خطاب کیوں دیا ہے۔ اس لئے کہ اس کا آبگینہ دل شیشہ سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے جسے ایک خفیف سی ضرب بھی پاش پاش کر دیتی ہے ــــ مرد اس بے بس مجبور ہستی کو مجروح پرند کی طرح زخمی کر کے بغیر ذبح کئے تڑپتا چھوڑ دینا گوارا کر لیتا ہے ــــ اگر کبھی چارہ سازی بھی کرتا ہے تو وقتی ــــ مردوں کو ہر وقت اپنی عزت و وقار قائم رکھنے کی فکر دامنگیر رہتی ہے وہ کیا جانیں کہ محبت کی پجارن کو کس طرح سچی محبت دی جا سکتی ہے؟

میرے بھولنے والے تمہاری نگاہ ونغ کبھی محبت کا فردوسی پیغام بھی سنا ہے اور تمہاری کشادہ پیشانی نے میری روح کو پیام مسرت بھی بخشا ہے پھر پیارے یہ تغافل کیسا؟ یہ دوری کیوں؟ آؤ ہم دونوں ایک ساتھ فضائے محبت میں پرواز کریں۔ ماضی کی یاد، حال کو خوشگوار نہیں بنا سکتی یہ ٹھیک ہے لیکن میں تمہاری ان شیریں نوا رنگینیوں کو کیوں کر فراموش کروں جس نے میری تاریک زندگی کو نئی نئی مسرتوں سے لبریز کر دیا ہے آہ، یہ میرے بس کی بات نہیں کاش تم میرے اور صرف میرے ہوتے۔ جان تمنا! تمہیں بتاؤ، یہ برسات کی سہانی دلکش رات تنہائی میں سر دھننے کے قابل ہے ــ؟ بیمار محبت۔ نرگس

۲۷

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

جانِ بہار! ــــــ لاکھوں پیار۔ محبت نامے نے آبِ حیات کا کام کیا۔ شدید انتظار کی خستگی پر دل مسکرایا۔ خوش رہو، خوب انتظار کی لذت بخشی ــ؟ وہم کہتا تھا کہ کہیں چشمِ التفات تو نہیں پھر گئی اور ــــ شکوک نے دل میں کا ناپوسی شروع کر دی تھی، میرے سرمایہ سکون! افسوس کہ میری ہمدردی تمہارے سکون کا باعث نہیں ہوتی۔ میری قسمت کہ میں تمہارے درد کا درمان ثابت نہ ہو سکی۔ تم مجھے دعوتِ آرزو دیکر ویسا ہی تڑپاتے ہو جیسا کہ مچھلی لبِ ساحل جال میں پھڑپھڑاتی ہے۔ تم مجھ سے زیادہ مجبور اور پابند نہیں مگر دیکھو تمہیں خط لکھنے کا وقت نکال ہی لیتی ہوں۔ تعجب ہے کہ تم میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟ خیر خوش رہو موسم کی خوشگواری بھی میرے لئے تازیانہ ظلم ہے۔ آہ لیلیٰ شب کی زلفیں میرے لئے کمند نہیں بن سکتیں۔ پھر کیونکر تم تک پہونچوں۔ زندگی مجھ پر ہنستی ہے اور میں زندگی پر۔ شاید میری تخلیق تڑپتے ہوئے ذروں سے ہوئی ہے جو متحرک بتوں کی طرح ہر دم بیقراری سے ہم آہنگ ہوں۔ کاش میں بھی "خوش باش دمے کہ زندگانی ایں ست" کے مصداق اپنے کو بنا سکتی لیکن میرے نزدیک جب دل کی قوتِ حیات فنا ہو چکی ہو تو نشاط ذاتی دل کی فرحت کا باعث نہیں بن سکتی۔ یہ میرا تجربہ ہے ــــــ

آہ، میری زندگی دیدہ بینا کے لئے آئینہ عبرت ہے۔ سب کچھ سمجھتی ہوں اس عمر میں خوب خوب سبق دینائے محبت کے باعث ملے۔ کاش یہ خلش ناکامی میری جان لے لیتی۔ دامنِ صبر روز بروز چھوٹتا جا رہا ہے۔ دل مائل فریاد ہے لیکن میری آہیں تمہارے قلب کو متاثر نہیں کر سکتیں۔ وائے مقدر! ــــ تم یقیناً ان پریشان کن تذکروں سے الجھتے ہوگے مگر پیارے میں مجبور ہوں زبان قلم پر قابو نہیں چلتا آہیں شراروں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

یہ سال کے ۳۶۵ دن تم کس کی پوجا کیا کرتے ہو جو ادہر کا پھیرا نہیں کرتے ہیں اور تم سے خفا، خدا نہ کرے۔ یہ کنارہ کشی کیسی؟ موت کے فولادی ہاتھ کے سوا اور کون ایسا ہے جو مجھے تم سے جدا کر سکے ــــــ جانِ محبت! بہار نے میرے گلستانِ دل میں غم کی کلیاں چٹکا دیں ہیں اور میں اس کی مسموم فضا میں غرق ہوں۔ یادِ ماضی کے داغ ابھر آئے ہیں۔ تمہارے شباب کی چھلکتی ہوئی مے کے چند قطرے جو میری نگاہوں نے چرا کر دل کے عمیق خزانے میں پوشیدہ کئے تھے اسے بھی زمانہ مجھ سے چھینے لیتا ہے۔ اگر تمہاری پیشانی سے گرے ہوئے قطروں کو میں لے ــــــ "روحِ شباب" سمجھ کر دل میں جگہ دی تو جانِ آرزو زمانہ مجھے کیوں آنکھیں دکھا رہا ہے؟ ــــ بولو جان نواز کیسے دل نواز ہو ــــ اٹھو اور نافہم دنیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دو ــــــ آج کل زیادہ وقت تنہائی میں گزرتا ہے۔ خاموشی نے پیکرِ سکوت بنا دیا ہے۔ محبت کے شعلے مغموم تاریکی سے نکل نکل کر بھڑک رہے ہیں۔ میرے غمگین حسرت! تمہاری غم آفریں زندگی نے مجھے درد کی گہرائیوں میں ڈبو دیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر تمہارے دل سے رنج و غم کے بادل ہٹاؤں ــ؟ سچ ہے اندھا خود دوسروں کے سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ کیا کسی کو صحیح راستہ بتا سکتا ہے ــــــ خدا کی قسم تمہاری پریشانیاں میرا خون چوسے لیتی ہیں کہاں سے پتھر کا دل لاؤں اور کیونکر تمہیں اندوہگیں شعلوں سے بچاؤں؟ کاش میری خلوص آگیں دعائیں قبولیت کا جامہ پہن لیتیں اور تم پر قدرت رحمت و سکون کی بارش کر دیتی۔ میرے پیارے جب تمہیں سراپا درد بنا ہوا پاتی ہوں بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اجل کا ہاتھ کھینچکر اپنے آنکھوں پر رکھ لوں مگر تمہارے گلاب آسا رخساروں کو پژمردہ نہ دیکھوں۔ آہ! اس بے بسی کا برا ہو کہ تمہارے قلبی درد کو تسلی کے مرہم سے سکون نہیں پہونچ سکتا۔ جانِ تمنا میں شکوک کی وادیوں میں گامزن ہونا نہیں چاہتی۔ ہاں میں نے تمہاری دلفریب آنکھوں کو خلوص و پیار کی روشنی سے معمور دیکھا ہے۔ تمہارے یاقوتی لبوں نے دامنِ سماعت پر الماس پھول برسائے ہیں۔ میری جان تمہاری ہر ہر ادا نے شوخیوں کے ساتھ محبت کی بارش کی ہے۔ اس التباس فطرت کو خدا سمجھے کہ جو سُنی سُنائی باتوں کو جامہ تیقن پہنا کر امیدوں کے فلک بوس قلعہ کو مسمار کر دیتا ہے اور میں آرزوؤں کو سوگوار دیکھ کر لرز جاتی ہوں واللہ تمہاری نظم بڑی دلکش ہے۔ میں بہت متاثر ہوئی۔ تمہارے ہر ہر لفظ سے شعریت ٹپکی پڑتی ہے۔ خواہ تم جس قدر بھی انکسار کے ذروں میں گوہرِ ادب کو چھپاؤ۔ مبالغہ کی رنگینیوں کو یہ سوز کہاں نصیب ــــــ؟ ظاہر پرستیاں، روح کو منور کرنا کیا جانیں؟

ہر شام کو نئے ستارے مجھے پیام ہرشاری دیتے ہیں لیکن میرا دل مسرور نہیں ہوتا۔ میں ردائے یاس کے ساتھ بحرِ تفکر میں غوطہ زن ہو جاتی ہوں ــــ راتیں سہانے راگ الاپتی ہوئی آتی ہیں لیکن میں ان نغموں سے لطف اندوز نہیں ہوتی۔ ساری رات تمہارے نشاط آفریں خیال میں گزر جاتی ہے اور میں عالمِ بیخودی میں اپنے اس بازو کو چوم لیتی ہوں جس کو کبھی تمہارے تکیہ بننے کا فخر حاصل تھا ــــــ

رخصت! ــــــ بدنصیب، نرگس

۲۸

کلمہ پڑھینگے ہم کبھی سجدا کرینگے ہم
سو سو طرح سے عرض تمنا کرینگے ہم

کعبہ محبت اختر! ـــــ عمر دراز ـــ ابھی ابھی خط ملا۔ اور مجھے اپنی زبان قلم کی تیزی پر افسوس کے خار چوست کرنا پڑے۔ آہ، پیارے تم نے بیکار ان مہمل باتوں کا اثر لیا۔ میں اور تم پر غیر اعتمادی کا بار ـــــ نہیں میری جان میرے دل میں سنگریزوں کا وجود نہیں۔ تمہاری جانب سے میرے دل میں نہ اس قسم کی برائی کا احتمال ہے اور نہ حشر تک ہوگا۔ دیکھو میں نے محبت کے عظیم صحیفہ کی قسم کھا کر تمہیں لکھا تھا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ الفاظ تمہاری زبان سے نکلے ہونگے۔ افسوس کہ پھر بھی تم نے اپنے "شفاف آئینہ کو غبار کلفت سے ملوکر لیا۔ اُف میں اور تمہاری اذیت کا باعث بنوں۔ لعنت ہے میری ہستی پر۔ واللہ مجھے سخت قلق ہے۔ ناحق میں نے تم پر اس لغویت کا اظہار کرکے نازک آبگینہ میں ٹھیس لگائی۔ میرے عزیز محبوب! ایسا نہ کہو، اگر میرے دل میں غیر اعتمادی کا خیال قائم ہوتا تو شیرازۂ محبت بکھر کر خاک میں مل جاتا اور میرے گوشہ دل میں تمہارا پر تو کبھی نظر نہ آتا۔ مجھ سے بیزار اختر!۔ یہ کیا۔ میں نے کب تمہاری سعی صداقت کو ـــ نظر استحسان سے نہیں دیکھا۔ خدا شاہد ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو دنیائے محبت کا سنگین استقلال میرے درد کا چارہ ساز نہ بنتا اور تمہاری یاد تاثرات سے ٹھٹھر کر رہ جاتی ـــــ

میں نے وہ خبر کس سے سنی ہوگی خوب جانتے ہو ـــ کچھ نہ پوچھو، رقابت کی آگ مجھے جلائے دیتی ہے ـــ کس تیر افگنی کے ساتھ وہ الفاظ میں نے سنے ـــ مردے کی طرح ساکت ہوگئی۔ مجبوری نے آنکھیں دکھائیں ـــ بے بسی نے قوت گویائی سلب کرلی۔ میں نے کمال ضبط سے سنا اور رشک کا دامن منہ پر رکھ کر خوب روئی اور اپنی سیہ بختی کو آنسوؤں کے سیلاب سے شاتی رہی۔ اسی حالت میں صاحب فراش ہوئی۔ قدرت انسان کی طرح ظالم نہیں۔ زندگی اور موت کی کشمکش سے جلد رہائی نصیب ہوئی مگر دماغ تفکرات کی آماجگاہ بنا رہا۔ دماغی کمزوریوں میں افزونیت ہوتی گئی مگر واللہ کسی طرح باور نہ ہوا کہ تم نے ..... ایسا کیا ہوگا۔ حیران و پریشان تھی کہ یا اللہ وہ بلند نفس ہستی جس نے نہ جانے کن مشکلات سے مقابلہ کرکے مجھے کمند فریب سے نکالا ـــ خود کیونکر ـــ مجھے فریب دینے پر آمادہ ہوگئی ـــ؟

نہ جانے کون سی ساعت تھی جب یہ خبر مخبر نے قوت سماعت کو مجروح کرنے کے لئے سنائی تھی۔ میرے پیارے مجھے یقین تو نہ تھا لیکن پھر بھی میں کوئی فیصلہ کن خیال نہ قائم کر سکی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ زمانہ کیوں درپے آزار ہے۔ یہاں ماننا یہاں کی سوسائٹی کا رنگ اچھا نہیں۔ اس بے کار اور بیفکر طبقے کو فساد کی آتش بازی چھوڑنا خوب آتی ہے۔ آہ، اس زمین کا ذرہ ذرہ میری دل آزاری پر آمادہ۔ مفسدوں کا ہجوم دیکھ کر بعض اوقات ایسا جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس سرزمین کو خیرباد کہہ دوں اور کسی ایسے مقام پر جا بسوں جہاں دوست کا جلوہ نظر نہ آئے نہ سہی، لیکن دشمنی کی بو دماغ میں زہر سرایت نہ کرے۔ آئے دن کی یہ چنگاریاں کاش مجھے ہمیشہ کیلئے خاکستر کرکے دل کی بھڑاس نکال لیں۔ کسی طرح اس پرخار زندگی کا تصفیہ تو ہو۔ خاردار جھاڑیاں آگ لگانے ہی کے قابل ہوتی ہیں پھر دنیا مجھے ـــ "شعلۂ جانسوز" کی نذر کیوں نہیں کردیتی۔ میں تو اب عاجزی کی دنیا میں پرواز کر رہی ہوں۔

اُف یہ تم نے کیا لکھ مارا ـــ کیا "الفاظ محبت" بھی کوئی واپس لینے والی دولت ہے جنہیں میں تم سے واپس لے لوں۔ بولو! ـــ کیا آسمان سے ستارے ٹوٹ کر پھر تم نے واپس جاتے دیکھے ہیں؟ دلنواز اختر، تم خطوط واپس کرسکتے ہو، لیکن میری روح کی تازگی ـــ میرے جسم کا رس ـــ میرے اوائل شباب کی رنگینیاں جو تم نے چرائی ہیں کبھی واپس نہیں کرسکتے کہو ـــ میں جھوٹ کہتی ہوں۔ ہاں تم نے میرا خزینہ مسرت نہیں چھینا اگر تم ان مٹی ہوئی چیزوں کو واپس کرسکتے ہو اور محبت کے ابدی نقوش مٹانے کی قوت تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے ـــ تو لاؤ میرے خطوط واپس کردو میں ان خوش بخت پرزوں کو پہلو میں دفن کرکے دل کی بجھی ہوئی راکھ سے چھپالوں ـــ سُنا! میرے پاس تم مردوں کا ایسا دل نہیں جو شام کی بات صبح کو بھول جائے۔ مجھے افسانہ محبت سارے کا سارا یاد ہے جس کے ایک نقطہ کی بھی کمی نہیں۔ میرا سینہ ایسی شے کا مسکن ہے جو زخم کھا کر مسکرا [illegible] میں راز محبت کو اپنی اجڑی ہوئی ہستی کا راز سمجھ کر اور کائنات حیات جان کر پرورش کیا ہے۔ طوفان مصائب [illegible] کو اپنا رہنما سمجھا ـــ واللہ اگر ایسا [illegible] فراوانی کے جذبے میرے دل میں [illegible]

نہ باتی۔ جانتے ہو محبت ایک روحانی تعلق ہے جو ایک غیر محسوس رشتہ سے دو ہستیوں کو وابستہ کر دیتی ہے۔ پھر کوئی طاقت اس تعلق کو نہیں توڑ سکتی جو محبت کے نام سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت کی محبت ایک دودھاری تلوار ہے جس کا کوئی رخ بیکار نہیں۔ وہ محبوب کی بے اعتنائیوں پر بھی ترک محبت پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اسے کسی دوسرے اختر جمال محبوب پر مرنا نہیں آتا۔ وہ زرلفت کے شامیانے کے نیچے بیٹھ کر بھی اسی سایہ شجر کو یاد کرتی ہے جس کو اس نے اپنے دل کے خون سے سینچا تھا —— اور اُف جو اَب کسی دوسری ہستی کے لئے باعث راحت ہو چکا ہے۔ اے کاش محبت اپنے بس کی چیز ہوتی اور اس دریا میں کودنے سے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ پانی کتنا ہے؟ —— رستم و اسفندیار کے افسانے راہ محبت میں روندنے کے قابل ہیں۔ مردوں میں بہادری کا عنصر غالب ہے وہ عزت و وقار پر جان دینا جانتے ہیں لیکن ان کے دل میں درد محبت کی کسک کا کہیں پتہ تک نہیں ہوتا۔ ہاں تفریح طبع کے لئے حسین پھولوں کا توڑ لینا محبت نہیں کہلاتا۔ تازہ پھول بادشاہ کے ہاتھوں تک پہونچ جاتے ہیں لیکن مرجھائے ہوئے پھولوں کو ایک غریب فقیر بھی پیروں سے نہیں مسلتا۔ پیارے دلنواز! —— اس دنیا میں ساری عزت —— ساری محبت تازگی اور حسن کی ہے جسے یہ دولت نصیب نہ ہو یا چھن چکی ہو اسے اس نافہم دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ محبت بھرے دل کے واسطے —— نگاہ لطف و کرم کی امید کا کم ہو جانا ایک ایسی جانکاہ تکلیف ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی مصیبت نہیں کر سکتی۔ میرے پیارے! میری خواہش ہے کہ اس مفسد دنیا کی نگاہیں چاہے جس انداز سے بھی مجھ پر پڑیں —— پڑنے دو۔ مجھے ان کی ذرہ برابر پروا نہیں اور نہ ہوگی مگر تم اپنی نگاہوں کو نہ موڑو۔ میں اب نظر ملتفت کی آرزومند نہیں۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میری طرف دیکھو۔ ناشناس محبت دنیا کو ہنسنے دو۔ آپ کے پجاری قہقہہ لگا کر ایک روز تھک جائینگے —— مگر میرے جذبہ پرستش میں کمی نہ ہوگی۔ کیونکہ محبت کا تعلق براہ راست روح سے ہوتا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے پہلو میں غیور دل ہے۔ تمہاری شرافت کے نقش پر خود سجدہ ریز ہوں —— تمہارے اخلاق کی بلندیوں کا نور دل کی تاریک گلیوں میں پھیلا ہے —— ہائے میں کیونکر اپنی قلبی کیفیت سے تم کو آگاہ کروں کہ اس مغموم دل میں تمہاری کتنی قدر و منزلت ہے۔ مگر بتاؤ میں تفکرات کے قلعہ پر کیسے فتح حاصل کروں؟ —— اتنی ضبط بھی نہیں کہ —— زمانہ نمک پاشی کرے اور اثر نہ لوں۔ اُف زمانہ کی ناپاک سوزش نے میرے دل و دماغ کو سخت مجروح کر دیا ہے۔ —— شمع حیات بجھنے پر تلی ہوئی ہے۔ ہائے اللہ یہ رات کا سناٹا اور تنہائی —— !

پیارے! —— اس کمزوری اور نقاہت پر بھی میں نے اتنا طویل خط نہ جانے کس طرح لکھ ڈالا۔ اب تو میری خطا معاف کرو۔

تمہاری طالب عفو۔ نرگس،

از قلم:۔ ثمر صدیقی۔ ردولوی

رباعیات

وہ شیشہ بھی شراب بھی ہے ساقی
لا ماہ بھی آفتاب بھی ہے ساقی
گر آج تری چشم کرم ہے مجھ پر
ہاں از سر نو شباب بھی ہے ساقی

مینا میں چھلکتی ہیں سبو بھرتے ہیں
ساقی کے تصدق کہ مزے لوٹتے ہیں
گرتے ہیں قدح سے قطرہ ہائے صہبا
یا تارے ماہتاب سے ٹوٹتے ہیں

سعید احمد اعجاز

جذباتِ عالیہ

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہاں پوری

جوشِ وفا نے جوہرِ قابل بنا دیا، شعلہ جو بجھ رہا تھا اُسے دل بنا دیا
یہ کیا ستم کیا مجھے بسمل بنا دیا تم نے تو ہر نگاہ کو قاتل بنا دیا
موجوں کی بحرِ عشق نے بدلیں یہ صورتیں طوفاں بنا دیا کبھی ساحل بنا دیا
جوشِ جنوں کی ہیں یہ عجب دلفریبیاں صحرا کے ذرّہ ذرّہ کو محمل بنا دیا
منشائے عشق تھا کہ مشیّت کی مصلحت ذرات منتشر کو مرا دِل بنا دیا
نظارۂ جمال بھی اے حسنِ بے حجاب حیرت زدہ نگاہ نے مشکل بنا دیا
مقصد یہ تھا فقط مرے دل کی سرشت سے لیلائے حسن کا اسے محمل بنا دیا
آئی بہار زینتِ گلشن بنی ہوئی ہر گل کو مدعائے عنادل بنا دیا
تمکینِ حسن! کیا یہ محبت کا راز ہے تڑپا کے پھر مجھے متحمل بنا دیا
اے عشق تو نے میرے مقدّر کا فیصلہ آسانیوں کے بعد بھی مشکل بنا دیا
لیلیٰ کہاں نگاہ کی تھیں دلفریبیاں، جن کو کمالِ شوق نے محمل بنا دیا
میں غرق ہو رہا تھا کہ طوفانِ عشق نے ہر موجِ بے پناہ کو ساحل بنا دیا
احساسِ التجا نہیں جسکی سرشت میں اس آستاں کا کیوں مجھے سائل بنا دیا
وارفتگیٔ عشق نے ہر مرحلہ کے بعد ٹھہرا جہاں بھی دل اسے منزل بنا دیا
اے دلؔ بنے نبی مکرّم حبیب حق پھر جملہ کائنات کا حاصل بنا دیا

امرء القیس

از جناب مستجاب احمد صاحب انصاری

بعثت نبویؐ سے پہلے تمام عرب ظلمت کدہ بنا ہوا تھا جہالت کی انتہا ہو چکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مذہبی اور اخلاقی برائیاں جو دنیا کی کسی قوم میں پائی جاسکتی ہیں اس وقت عرب میں موجود تھیں۔ وہ قطعہ زمین جس کو آگے چل کر تمدن و تہذیب کا منبع اور صلاح و فلاح جسمانی و روحانی کا مصدر بننا تھا اس وقت جہالت و سیہ کاری کا مرکز بنا ہوا تھا مگر یہ کلیہ کہ ہر برائی کے ساتھ ساتھ کچھ بھلائی بھی ضرور ہوتی ہے یہاں بھی کارفرما تھا چنانچہ عربی شاعری کا چشمہ آب حیات اسی دور ظلمات میں جاری ہوا تھا۔

چونکہ چھٹی صدی عیسوی سے قبل کے عربی اشعار مدون نہیں ہوسکے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت عربی شاعری کی کیا حالت تھی مگر اسی صدی کے آغاز میں عربی شاعری معراج کمال تک پہونچ چکی تھی۔ عربی زبان کو فطرتاً شاعری کے ساتھ مناسبت ہے اور شاعرانہ خیالات کی ادائگی کے لئے یہ زبان خاص صلاحیت رکھتی ہے اس لئے گو اس زمانے کے عرب تعلیم و تہذیب کے نام سے قطعاً ناآشنا تھے لیکن شاعری کا چرچا ہر گھر اور ہر خیمہ میں موجود تھا اس وقت کے اشعار طبعی اور بدویانہ زندگی کی سیدھی اور سچی تصویر ہوتے تھے نہ ان میں مبالغہ تھا اور نہ مضمون آفرینی۔

ان دنوں جب مرحوم عربی شاعری شباب پر تھی نجد کے علاقہ میں ایک طاقتور قبیلہ کندہ نامی آباد تھا چھٹی صدی کے شروع میں حارث ابن عمرو اس قبیلہ کا سردار یا بادشاہ بن گیا اور بہت جلد ترقی کرکے حیرہ اور غسان کی طاقتور حکومتوں کا مقابلہ کرنے لگا یہاں تک کہ مابین ۵۰۵ء و ۵۲۵ء میں حیرہ کے مشہور بادشاہ منذر اول کو شکست دیکر عراق کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیا لیکن جب ایرانیوں نے منذر کی مدد کی تو اسے عراق سے دست بردار ہونا پڑا۔ امرء القیس اسی حارث کا پوتا تھا۔

حارث کے مرنے پر سرداری اور ریاست اس کے باپ حجر کے ہاتھ آئی اور یوں اس مشہور اور عرب کے مایہ ناز شاعر نے آغوش حکومت میں پرورش پائی۔ امرء القیس ابتدائے عمر ہی سے رند و عاشق مزاج تھا۔ اور عاشقانہ اشعار و قصائد اس کے ورد زبان تھے۔ گھر میں شاعری کا چرچا پہلے ہی سے تھا۔ اس کا ماموں مہلہل عربی شاعری کا باوا آدم کہلاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے کے کسی شاعر کے پورے قصائد ہم تک نہیں پہونچے چنانچہ امرء القیس نے شاعرانہ فضا میں پرورش پائی اور بہت چھوٹی سی عمر سے اشعار کہنے شروع کردیئے تھے کہ اس قدر کمال حاصل کرلیا کہ آج اشعر الشعراء یعنی سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔

امرء القیس عیاشی و عشق بازی میں شہرۂ آفاق تھا اسی وجہ سے "الملک الضلیل" یعنی گمراہ بادشاہ اس کا لقب ہوگیا تھا۔ اکثر قصیدوں میں اپنی داستان عشق نظم کرتا اور بہت خوبی سے۔ گو بعض اوقات زبان فحش کی حد تک پہونچ جاتی ہے مگر اس زمانہ کی سوسائٹی کے عام مذاق کے مطابق یہ کوئی معیوب بات نہ تھی۔

ان دنوں عرب میں سالانہ میلوں کا بڑا رواج تھا۔ بماہ ذیقعدہ سب سے بڑا اور مشہور میلہ عکاظ میں لگتا تھا جو مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے یہ اجتماع سوق عکاظ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں دور دور کے لوگ جمع ہوتے تھے اور ہر قسم کے دینی اور دنیوی قضایا یہاں طے پاتے تھے۔ خرید و فروخت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی۔ شعراء کو بھی یہاں اپنا کمال دکھانے کا موقع ملتا تھا۔ یہیں ان کی قابلیت کی جانچ ہوکر ان کو قبول عام اور بقائے دوام کی سند ملتی تھی ہر سال بڑے بڑے شعراء جمع ہوکر اپنے اپنے قصیدے پڑھتے اور جس کا قصیدہ عمدہ خیال کیا جاتا اسے آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کردیا

جاتا تھا۔ ایسے قصیدوں کی تعداد رفتہ رفتہ سات تک پہونچ گئی جو دنیا کے ادب میں سبع معلقات کے نام سے مشہور اور اپنے ناظموں کی آج تک زندہ اور کبھی نہ مٹنے والی یادگار ہیں یہ قصائد اہل زبان کے نزدیک بدرجہ غایت فصیح و بلیغ اور معتبر و مستند مانے گئے ہیں اور ساری عربی شاعری کا نچوڑ اور لب لباب خیال کئے جاتے ہیں ان میں سب سے بہتر اور غالباً سب سے پہلا قصیدہ اسی امرء القیس اور اسی کے عشق کی داستان کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ یہ شاعر بے بدل اپنے چچا کی بیٹی عنیزہ پر فریفتہ تھا اور اسی کے متعلق ایک پر لطف حکایت اس قصیدے میں بیان کی ہے۔

امرء القیس کے اشعار کی بیساختہ طرز ادا اور روانی و سلاست اگرچہ قابل داد ہے لیکن ہمیں بعض الفاظ مشکل اور مغلق نظر آتے ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے مرادف الفاظ کے باریک فرق کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے اور اسی وجہ سے ہمیں غرابت و خشونت معلوم ہوتی ہے مگر ایک نکتہ شناس طبیعت فوراً کہہ دیتی ہے کہ جو لفظ جس جگہ رکھدیا گیا وہیں پوری طرح چسپاں ہو گیا ہے کہ دوسرے لفظ سے وہ معنی و مطلب ادا ہی نہیں ہو سکتے ہر لفظ گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا گیا ہے۔

کسی شاعر کے کلام پر تنقید کرتے وقت ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ شاعر کس ماحول میں پلا تھا اس کے گرد و پیش کیا حالات تھے۔ زبان اپنے ارتقاء کے کس درجہ پر تھی اور اس وقت کے طرز ادا کی کیا خصوصیات تھیں ان باتوں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو امرء القیس زمانہ جاہلیت کے سب شعراء میں بلند مرتبہ نظر آتا ہے اس نے اپنے کلام میں بہت سی جدید تراکیب اور تشبیہات نادرہ استعمال کی ہیں جو بعد میں شایع ہو گئیں۔ اس کی تشبیہات عموماً دلچسپ اور سادہ ہوتی ہیں۔ کلام تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ہے۔ نیچرل شاعری کے قدرداں اس سے خاص حظ اٹھا سکتے ہیں۔ قصائد کے شروع میں کھنڈروں اور ٹیلوں پر کھڑے ہو کر منازل محبوب کی یاد میں رونے کا تذکرہ اسی کے دماغ کی اختراع ہے جس کی دوسروں نے بھی تقلید کی مگر السابقون السابقون کا مرتبہ اسی کو حاصل ہے۔ چونکہ خود عاشق ہے اس لئے واردات عشق بھی خوب بیان کرتا ہے۔

علمائے ادب یہ مسئلہ طے نہ کر سکے کہ جاہلیت کا سب سے بڑا شاعر کون تھا اور اس کا فیصلہ کچھ آسان بھی نہیں کیونکہ ہر شخص کا مذاق مختلف ہوتا ہے لیکن اتنا امر متفق علیہ ہے کہ امرء القیس۔ زہیر اور نابغہ جس درجہ کمال تک پہونچے ہیں وہاں تک کسی دوسرے شاعر کی رسائی نہیں ہوئی اور ان میں بھی امرء القیس کو ایک خاص تفوق حاصل ہے۔

امرء القیس کا باپ اسکی عیاشی و ہوسناکی کی وجہ سے اکثر کبیدہ خاطر رہتا تھا دوسرے شاعری کو بھی وہ شاہی خاندان کے افراد کے شایان شان نہیں سمجھتا تھا ایک مرتبہ اس نے غصہ میں آکر اپنے ایک غلام کو حکم دیا کہ امرء القیس کو کسی بہانے سے جنگل میں لے جائے اور وہاں اسے قتل کر کے اسکی آنکھیں نکال لائے۔ غلام حکم کی تعمیل میں چلا تو گیا مگر جنگل میں پہونچکر خیال آیا کہ باپ آخر باپ ہے۔ اگر بیٹے کے مارے جانے کی خبر سن کر پدری محبت جوش میں آگئی تو مجھے جیتا نہ چھوڑیگا۔ اس نے امرء القیس کو تو ایک طرف چھوڑا اور ایک نیل گائے کا بچہ پکڑ اس کی آنکھیں نکال کر لے گیا۔ غلام کا اندیشہ بیجا نہ تھا بیٹے کی آنکھیں دیکھ کر باپ کی آنکھیں کھلیں۔ اور بہت پچھتایا غلام نے دست بستہ اصل واقعہ عرض کیا چنانچہ امرء القیس جنگل سے واپس بلا لیا گیا اور پھر سے باپ بیٹے میں ملاپ ہو گیا مگر آئندہ شعر نہ کہنے کا قول و قرار ہوا کچھ دنوں تو منافی اشعر امرء القیس نے جوں توں کاٹے مگر پھر عادت سے مجبور ہو کر شاعری اختیار کی۔ آخر باپ نے گھر سے نکالدیا۔

ادہر اس کے باپ کو قبیلہ بنی اسد کے کسی شخص نے قتل کر ڈالا۔ یہ ان دنوں یمن میں تھا جس وقت اسے اطلاع پہنچی تو یہ شراب نوشی میں مشغول تھا کہنے لگا۔ الیوم خمرٌ و غداً امرٌ (آج شراب پی جائیگی اور کل کام ہوگا) اب یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا ہے۔

اس نے جاہلیت کے دستور کے مطابق قسم کھائی کہ جب تک باپ کا بدلہ نہیں لیلوں گا نہ نہاؤں گا۔ نہ سر میں تیل ڈالوں گا نہ گوشت کھاؤنگا نہ شراب پیونگا وغیرہ وغیرہ اور فوراً ہی بنی اسد پر چڑہائی کر دی۔ تغلب وغیرہ دو ایک اور قبیلوں نے اس کا ساتھ دیا جن کی مدد سے اس نے بہت سے اسدیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ منذر والی حیرہ سے اس کی پشتینی دشمنی تھی۔ یہ وہی منذر تھا جس کو اس کے دادا نے شکست دی تھی۔ یہ ابھی تک زندہ تھا اس نے موقع پاکر اب بنی اسد کی مدد کی۔ متحدہ طاقت کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر امرء القیس بھاگ نکلا اور چلتے وقت اپنا سامان اور اسلحہ سموآل ابن عادیا (جس کا نام امانت میں ضرب المثل ہے) کے پاس رکھتا گیا۔ پھرتے پھراتے قیصر روم سے امداد حاصل کرنے کے لئے قسطنطنیہ پہونچا۔ قیصر نے امداد کا وعدہ کیا اور اس کی بہت خاطر و مدارات کی۔ مگر یہ وہاں قیصر کی بیٹی پر عاشق ہو گیا حاسدوں نے یہ بات قیصر سے جا لگائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ وہاں سے بھی بھاگا

راستہ میں انگورہ کے قریب قیصر کے آدمیوں نے اس کو آپکڑا اور یہ کہہ کر ایک زہر آلود جوڑا اسے پہننے پر مجبور کیا کہ یہ بادشاہ نے اپنا ملبوس خاص تمہارے اعزاز کے لئے بھیجا ہے۔ زہر کے اثر سے اس کے جسم پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے جنھوں نے پک کر زخموں کی صورت اختیار کرلی۔ ان زخموں کی وجہ سے اسے ذوالقروح بھی کہنے لگے۔ مگر یہ کچھ ہی دن بعد مرگیا۔ اور اس طرح یہ عرب کا مایہ ناز شاعر عالم شباب ہی میں چل بسا۔ عاشق مزاجی آخر دم تک قائم رہی۔ مرنے سے قبل معلوم ہوا کہ اسی نواح میں پہاڑی پر ایک حسین شہزادی کی قبر ہے وصیت کی کہ مجھے اس کے پہلو میں دفن کیا جائے۔

مستجاب احمد انصاری

عورت!

از جناب سید انتظام الدین شاہ صاحب جمالی ایم۔ ایس۔ سی (علیگ)

عورت - حوا کی آرزو زلیخا کا عشق - ہیلن کی عشوہ سازیاں کلوپیٹرہ کی فریب کاریاں ہے

عورت - شاعر کا ایک بدیع تخیل ہے۔

عورت - تفصیل تعالی ہے۔

عورت - خزینہ محبت ہے۔

عورت - ایک جہنمی بھٹی کی چمک ہے جو مردوں کے معصوم خیالات کو جھلس دینے کے لئے ہر وقت شعلے بھڑکاتی رہتی ہے۔

عورت - سندرتا کی دیوی اور خوبصورتی کی ملکہ ہے۔

عورت - ایک ساز حقیقت اور راز مشیت ہے۔

عورت - پیمانہ زریں اور بادۂ رنگیں ہے۔

عورت - ایک لذت شیریں اور تصویر مروت ہے۔

عورت - فطرت کی گلکاری اور نعبت کی تنویر ہے۔

عورت - فطرت کا میخانہ اور قدرت کا جلوہ ہے۔

عورت - ایک کالی ناگن ہے جس کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں

عورت - ایک قدرتی عطیہ ہے جس کی بدولت مکمل راحت و خوشی انسان کو نصیب ہوتی ہے۔

عورت - ایک انمول ہیرا ہے جسے یہ حاصل ہو وہ فیض بیکراں سے مالا مال ہے۔

عورت پیکر نغمہ اور شعریت خیال ہے۔

عورت - ایک گوہر بے بہا اور جوہر نایاب ہے۔

عورت - خدا کا عطیہ اور پیدائش کا کمال ہے۔

عورت - تمناؤں کی جان اور آرزوؤں کی ایمان ہے۔

عورت - موسم بہار کی خوشنما نیتری ہے۔

عورت - محبت کی دیوی محبت کی بندی اور مجسم پیمانہ ہے۔

عورت - ایک شیرینی ہے تلخی سے پر ایک درد ہے مسرت کا سرمایہ دار۔

عورت - نیلگوں فلک کا درخشندہ سیارہ ہے۔

عورت - چودھویں رات کی چاندنی ہے۔

عورت - عندلیب کی حسرت خیز تان ہے۔

عورت - حیرت کا آئینہ اور فرحت کا سرچشمہ ہے۔

عورت - ہر وقت اپنے خیال اور ارادہ کو تبدیل کرسکتی ہے۔

عورت - سمجھتی ہے کہ وہ مرد کے دل و دماغ پر حکومت کرنے کیلئے پیدا ہوئی ہے اگر قدرت عورت کی تخلیق نہ کرتی تو دنیا کا اور ہی رنگ ہوتا۔

عورت - حسین ہے اور ہر حسین چیز اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے۔

عورت - شباب و شعر کا پیکر جمیل ہے جو شاعر کے تخیل سے زیادہ اچھوتا نغمے کی کیفیت سے زیادہ لطیف تصویر کی رنگینی سے زیادہ خوش منظر ہے۔

عورت - ندرت کا گنجینہ اور حسن کا مرقع ہے۔

جمالی (علیگ)

اک شعرِ مجسّم ہے

یہ عنفوانِ شباب اور پھر شباب ترا
جہانِ حسن میں دیکھا نہیں جواب ترا

نہ پھوٹتی ہوئی کونپل نہ مسکراتی کلی
کچھ اور چیز ہے یہ حسنِ نیمخواب ترا

یہ تیری اٹھتی جوانی، یہ چھاؤں تاروں کی
یہ بھینی بھینی مہک یہ نیا شباب ترا

ترے حضور میں میری ہر آرزو ناکام
مری نظر میں ہر انداز کامیاب ترا

تری نظر میں مری ہر نگاہ گستاخی
مرے خیال میں پُرکیف ہر عتاب ترا

یہ نرم نرم تبسّم، یہ گرم گرم نگاہ،
مٹا نہ دے کہیں سائل کو یہ جواب ترا

تجھے خبر بھی ہے او شوخ کیا قیامت ہے
شراب و شعر میں ڈوبا ہوا شباب ترا

کورا پرل

ایک عبرت انگیز تاریخی واقعہ

جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب بسمل

اس دنیائے فانی میں ہزارہا نامور پیدا ہوئے اور چند روز اختیارات
... بجا کر رخصت ہوئے۔ ہزاروں تاجدار جو پھولوں کی سیج پر سوتے تھے
... منوں مٹی کے نیچے دفن ہیں۔ وہ بادشاہ جس کا لشکر ریت کے ذروں اور
... کے ستاروں سے بھی زیادہ تھا بالآخر نامرادی کی نذر ہوا۔ کارسیکا کا یتیم بچہ
... کی ٹھوکر سے یورپ کا قصر ملوکیت تھرا کر گر پڑا آخر کار دیار غیر میں محکوم
... اس دنیا سے رخصت ہوا۔ بے سروسامان عربوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت
... دیئے۔ دنیا میں تہذیب و تمدن کی دولت تقسیم کی۔ عصر جدید کی بنیادیں
... کیں مگر انجام کار تاریخ کی زبردست موجوں نے ان کا سفینہ منجدھار میں
... ہندوستان میں مغل شہنشاہ قدرت خداوندی کا نمونہ تھے مگر آج ان
... خس و خاشاک کی طرح پامال اور بے وقعت ہے۔ ہیل سلاسی ایک
... تغاری کا صوبیدار تھا پھر شہنشاہ بنا اور آج اس کی کشتی حیات
... نامرادی کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ دنیا میں ابتدا سے عروج
... کا چکر چل رہا ہے اور ازل تک یونہی چلتا رہیگا۔ اسی سلسلہ میں پیرس
... آراستہ پیراستہ مکان کی سیر دیکھئے۔

فرانس کے دارالسلطنت میں ایک شاہانہ محل میں معزز مہمانوں کا ہجوم
... فرانس، جرمنی، سپین اور انگلستان کے اونچے گھرانوں کے اکثر افراد وہاں
... امارت اور اسراف کی کامیاب نمائش ہے۔ میزبان ایک لالہ رو
... اور پرشباب حسینہ ہے جو چند سال میں اپنے قاتل حسن
... عالمتاب بن چکی ہے۔ اکثر مہمان اس کے
... رہائش پر بیس لاکھ فرانک

کی غیر معمولی رقم صرف کی گئی ہے۔ کئی اس کی ہمشیاں اور رنگینیا خوبصورتی کے دلدادہ ہیں اور بعض دنیا کے ماہر فن راگنیوں کے ترنم سے دل کی پیاس بجھانے آئے ہیں نوکر چاکر ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ ہر ایک آدمی اپنی دھن میں مست ہے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی شراب گلفام کے دور چل رہے ہیں اور کسی کا فرادا کے حسن کو دیکھ کر دل سینوں میں مچل رہے ہیں۔ پیانو کے پاس ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی ہے جو کسی زمانہ میں انگلستان کے حسن پرستوں کی قبلہ گاہ تھی مگر اب اس کے بہار حسن پیاوس پر ٹپکی ہے۔

"میں نے آج آپ کے لئے ایک نیا گیت سیکھا ہے"۔ اس نے مالکہ کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"کون سا؟" ملکہ حسن نے پوچھا۔

"یہ گیت، آپ کے ایک ہم وطن کا بنایا ہوا ہے"۔ مغنیہ نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ یہ آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا اور آپ کو بچپن کے بھولے بسرے واقعات یاد دلا دیگا"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی نوٹ بک سے ایک ورق پھاڑا اور اس ساحرہ کے ہاتھوں میں دیدیا اس نے سرسری طور پر اسے دیکھا اور پھاڑ کر پھینکدیا۔

"میں اسے سننا نہیں چاہتی۔ اس نے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں نے اسے سینکڑوں بار سنا ہے اور درحقیقت اس سے اکتا چکی ہوں"

مغنیہ جھک کر آداب بجالائی مگر ملکہ حسن کورا پرل وہاں سے جا چکی تھی۔

اس نے گیت کو کیوں ناپسند کیا؟ وجہ یہ تھی کہ وہ شہرہ آفاق گیت اس کے والد کا بنایا ہوا تھا۔ بچپن میں بارہا وہ اس کے سُریلی تانوں سے

پیروں متاثر رہی اور اسی گیت کی فروخت سے اس نے تعلیم حاصل کی۔ وہ گیت اس کو وہ زمانہ یاد دلاتا تھا جب وہ معصوم، آزاد اور مطمئن زندگی بسر کر رہی تھی۔ انگلستان کے ایک دور افتادہ گوشہ میں خاموش دیہاتی زندگی اسے ناپسند تھی اسے اپنے حسن کا احساس تھا اور اس کے بل بوتے پر وہ دنیا میں ہلچل پیدا کرنا چاہتی تھی۔ انجام جوش جوانی اس کے تنگ سینے میں سما نہ سکا اور وہ شرم و حیا اور رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑ کر حسن فروشی کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکی۔ حال میں اس کے پاس زر و جواہر کے انبار تھے۔ ایک مہینہ کا متفرق خرچ آٹھ ہزار پونڈ تھا مگر اطمینان قلب کھو چکا تھا اور دل ہی دل میں وہ اپنی امارت اور شان و شوکت کو اپنی پہلی خاموش زندگی کے مقابلے میں پر کاہ سے بھی زیادہ حقیر سمجھتی تھی۔

جب کورا کی عمر پندرہ برس کی ہوئی تو ہر ایک اس کے حسن خداداد کی تعریف کرتا تھا۔ جدھر جاتی اس پر انگلیاں اٹھتیں۔ کئی منچلے نوجوان سیرگاہ میں اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے گھنٹوں وہاں منتظر رہتے اس نے اچھی خاصی تعلیم پائی تھی اور ایک سہیلی کی مدد سے فرانسیسی زبان بے تکلف بولتی تھی۔ اپنے خاموش اور دیہاتی مکان میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ قاتل نگاہوں سے دنیا کو مسخر کرنے کے لئے وہ ہر وقت پا بہ رکاب تھی۔ آخر کار اس نے رقص کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ممکن تھا کہ فن کے لحاظ سے اس میں کچھ نقائص رہ جاتے مگر اسے یقین تھا کہ رقص کے لباس میں اس کی مکمل خوبصورتی دنیا میں تہلکہ مچا دیگی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کا خاندان لندن میں آ گیا اور اپنے والدین کو مطلع کئے بغیر وہ ہر روز مختلف تھیٹروں کے مالکوں سے ملتی مگر چونکہ وہ ناتجربہ کار تھی اس لئے کوئی آدمی اسے یکلخت ملازم رکھنے کی حامی نہیں بھرتا تھا۔ اس کے حسن کی تعریف کی جاتی۔ اظہار عشق کیا جاتا مگر تجربے کے بغیر اسے کوئی موقع دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

قہوہ خانہ میں

آخر کو یہ بات گھر والوں کو معلوم ہو گئی اور اسے گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا اس لئے وہ اندھا دھند زندگی کی کشمکش میں کود پڑی۔ جیب خالی تھی مگر حوصلے بلند تھے۔ ویسٹ اینڈ کے ایک حقیر قہوہ خانہ میں اسے رقاصہ کی ملازمت مل گئی اور اس طرح کورا پرل کے نام سے اس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔

اس وقت اس کا حسن چاند اور ستاروں کو شرماتا تھا اور لندن کا ایک گمنام قہوہ خانہ اس کے لئے موزوں مقام نہیں تھا۔ اس کا دل ولولوں اور امنگوں سے لبریز تھا اور حسن کے بل بوتے پر وہ کشمکش حیات میں سربلندی حاصل کرنے کے لئے بیتاب تھی۔ اس لئے چند مہینوں کے بعد ایک دوست کے مشورے سے وہ پیرس چلی گئی۔ انگلستان چھوڑنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی بالغ نہیں تھی اور قانون اسے والدین کے پاس رہنے پر مجبور کرتا تھا حالات انتہا کو پہونچ چکے تھے۔ گھریلو زندگی کی مسرت اس کے لئے ختم ہو چکی تھی اس لئے وہ چھپ چھپا کر انگلستان سے نکل گئی۔ پیرس میں حسن خداداد کے علاوہ اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا اجنبی ملک، غیر مانوس اطوار مگر کورا پرل بالکل نہ گھبرائی اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے تمام قہوہ خانے چھان مارے۔ بعض دفعہ کوئی آشنا اسے کھانے پر مدعو کر لیتا اور اکثر وہ بھوکی سو رہتی مگر اس کے باوجود اس کے دل میں یاس و حسرت کا گزر نہیں تھا۔ وہ شہر جہاں حسن کی نیلامی میں بڑھ چڑھ کر بولی بولی جاتی ہے زیادہ دیر تک اس کے قاتل حسن سے بے پرواہ نہیں رہ سکتا تھا۔

آخر کار اس کی قسمت نے کروٹ بدلی اور اس کی خوش بختی کا ستارہ کرب و انتظار کے بادل کو چیر کر نکل آیا۔ شام کو وہ ایک قہوہ خانہ میں رقص کرنے گئی اور وہاں سے لوٹتے وقت اقبال اس کے دائیں بائیں پھول برسا رہا تھا، قہوہ خانہ میں ایک نوجوان فرانسیسی نے اسے کھانے پر مدعو کیا اور تھوڑی دیر میں وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ وہ نوجوان کی حیثیت سے بے خبر مگر اس کی وجاہت سے متاثر تھی۔ جب اس نے اظہار محبت کیا تو کورا پرل مسکرا دی اور جب نوجوان نے پیرس کے بیش بہا جواہرات اس کے قدموں پر ڈال دینے کی تمنا ظاہر کی تو وہ اپنے قہقہہ کو ضبط نہ کر سکی۔ اس قہوہ خانہ میں عموماً نوجوان شاعر، مصور اور دستکار آیا کرتے تھے اور ان کے کیسوں میں چاندی کے دو چار سکوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ کورا دل سے چاہتی تھی کہ وہ نوجوان اپنی آخری پائی اس کی خاطر صرف کر دیں۔ مگر ان کے ہمراہ زیادہ وقت صرف کرنا اسے ناگوار تھا۔

شہزادہ

"اگر اجازت ہو تو چل کر کھانا کھائیں ——" نوجوان نے شراب کا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔

کورا مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اس کا اپنا ایک اور نمدار کو فوراً

خوشگوار نہیں تھا اور وہ پریشانی سے بچنے کے لئے حتی الوسع اس سے دور رہنا چاہتی تھی۔

"آؤ چلیں"۔ اس نے نوجوان کے گلے میں باہنیں ڈالتے ہوئے کہا۔

ان کی گاڑی ایک عظیم الشان ہوٹل کے سامنے جاکر رکی۔ کورا نے تعجب سے سنگ مرمر کی خوبصورت عمارت کو دیکھا۔ ہوٹل کا مالک انہیں دیکھ کر باہر نکل آیا اور ادب سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ملازم جھک کر آداب بجالائے اور کمال احترام سے انہیں ایک آراستہ کمرے میں جابٹھایا۔ دروازوں پر مخمل کے قیمتی پردے لٹک رہے تھے۔ فرش پر ایران کے خوبصورت قالین بچھے تھے اور گلدستوں کی کثرت سے وہ کمرہ رشک فردوس نظر آتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں"۔ کورا نے حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا خادم ہوں"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

حقیقت کے انکشاف کے بعد کورا پرل جوش مسرت سے بیخود ہو گئی، شہنشاہ فرانس کے چچا زاد بھائی کا دل اس کے گیسوؤں میں اسیر ہو چکا تھا اور وہ اپنی تمام دولت اس کے قدموں پر نچھاور کرنے کے لئے تیار تھا۔ دوسرے دن شہزادے نے کورا کے لئے سنگ مرمر کا ایک عالی شان مکان خریدا اور اس کی آرائش پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ دوپہر کے وقت کورا کا دسترخوان بادشاہی سازوسامان کو مات کر رہا تھا اور ملازموں کا ایک لشکر اس کے اشارہ ابرو کا منتظر معلوم دیتا تھا۔

شاہانہ اخراجات

"مجھے پھولوں سے محبت ہے"۔ ایک دن کورا نے شہزادے سے کہا۔

"بہتر، اب یہ ہمیشہ درگاہ حسن میں حاضر رہا کرینگے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

شہزادے نے قلیل عرصہ میں شام، روم، ایران، انگلستان، چین جرمنی اور روس سے خوبصورت اور سدا بہار پھولوں کی قلمیں منگوائیں اور کورا کے مکان کا صحن پھولوں کی کامیاب نمائش نظر آنے لگا۔ ان کے علاوہ شہزادہ ہر ماہ اس حسینہ بے مثال کے لئے سات ہزار پونڈ کے پھول خریدتا اور بندۂ عشق بن کر خوشنودی حسن حاصل کرنے کے لئے اپنی دولت اندھا دھند لٹاتا۔ کورا دنیا کے نشیب و فراز سے واقف تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ شباب کی دوپہر ڈھل جائیگی اور جوانی کی رات گذرنے کے بعد وہ پھولوں کی اس مالا کی طرح پامال ہونے کے لئے پھینک دی جائیگی جو شب بھر کسی مہ جبین کے گلے میں لپٹی رہی ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ دنیا کے سامنے اپنے حسن و شباب کا غیر فانی ثبوت مہیا کرے اور اس غرض کے لئے ہر قسم کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس نے فرانس کے بہترین بت تراش کو بلا بھیجا اور تین لاکھ فرانک ادا کرکے سنگ مرمر سے اپنا مجسمہ تیار کروایا جو ابھی تک موجود ہے اور وینس کے بت سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ مجسمہ کے اخراجات کے علاوہ کورا نے اس سال ذاتی خرچ کی مد میں دو لاکھ پونڈ صرف کئے اور تمام یورپ میں اسکی شاہانہ زندگی کی دھوم مچ گئی۔

کچھ عرصے کے بعد شاہزادہ ایک ہنگامے میں مارا گیا اور اس کی جگہ ڈوول نامی ایک امیر نے لی جس کو اپنے باپ کے ورثہ سے عمارات اور جائداد کے علاوہ بیس لاکھ پونڈ نقد ملے تھے۔ ڈوول نے کورا سے اس کے محل میں ملاقات کی اور اس کافرہ کے حسن کو دیکھ کر دیوانہ وار اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔

"اگر اجازت ہو تو اپنی محبت کا ثبوت پیش کروں"۔ اس نے کورا کے چاند جیسے چہرے کو تکتے ہوئے کہا — "مجھے حکم دو اور میں مرنے کیلئے تیار ہوں"

"نہیں میں چاہتی ہوں کہ تم زندہ رہو اور میرے بل ادا کرو"۔ کورا نے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کے ایک عظیم پلندے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے آمدنی اور خرچ کا میزان برابر کرنے کے لئے یہ مکان بھی فروخت کر دیا ہے مگر کامیابی نہیں ہوئی"۔

ڈوول اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور کورا کے بل ادا کرنے کے لئے پیرس کے بازاروں میں بارہ ہزار پونڈ تقسیم کئے اور اس کے علاوہ ایک لاکھ پونڈ کی رقم اس کے نام بنک میں جمع کرا دی۔

ملکۂ حسن

"مجھے امید ہے کہ یہ رقم ایک مدت تک آپ کے اخراجات کے لئے کافی ہوگی"۔ ڈوول نے دوسرے دن کورا سے کہا۔

"دیکھا جائیگا"۔ کورا نے جواب دیا اور اس کے خوبصورت ہونٹوں پر دلفریب تبسم ظاہر ہوا۔ اس روز شام کو اس نے ایک دعوت کا انتظام کیا جس پر چھ ہزار پونڈ صرف آئے۔ بارہ سو پونڈ کے پھول خریدے گئے اور

کورا کی خواہش کے عین مطابق مہینوں اس ضیافت کا پیرس میں چرچا رہا۔

ڈوول نے اس کے لئے ایک مکان بنوایا جو شاہی محل کا ہمسر تھا اور دولت کے بل بوتے پر کورا نے سوسائٹی میں ایک معزز درجہ حاصل کر لیا۔ فرانس کے امراء ہر وقت اس پر فدا ہونے کے لئے تیار تھے۔ جب کوئی سیاح یا غیر ملکی امیر پیرس میں آتا تو ہوٹل کے ملازم پوچھتے —— "کیا آپ میڈم کورا پرل کا مکان دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"ضرور، ضرور، اس کی دید کے بغیر پیرس کی سیر نامکمل رہ جاتی ہے۔"

دن رات نوجوانوں اور سیاحوں کی ٹولیاں کورا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اس کے مکان کے دریچوں کے سامنے جمع رہتیں اور پیرس کا بچہ بچہ اس کے شاہانہ محل کی طرف جانے والے راستوں سے واقف تھا۔ اس زمانہ میں فرانس میں نپولین سوم کی حکومت تھی۔ نپولین بونا پارٹ کے زمانہ میں یورپ کی دولت سمٹ کر فرانس کے امراء کے پاس جمع ہو گئی تھی۔ دلاور سپاہی مر چکے تھے اور انکے ورثا داد عیش دے رہے تھے۔

شاہانہ اخراجات کے باوجود کورا ہر ماہ کافی رقم پس انداز کرتی تھی وہ جانتی تھی کہ محض حسن کی وجہ سے اس نے سوسائٹی میں بلند مرتبہ حاصل کیا تھا اور جوانی ڈھل جانے کے بعد کوئی اس کا پرسان حال نہ ہوگا۔ کبھی کبھی وہ پیرس کی دنیا میں ہیجان پیدا کر کے بہت خوش ہوتی۔ ایک دفعہ وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہی تھی ایک آدمی ڈنلف نامی جو نامہ نگاری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا اس کے قریب سے گذرا۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے سے آشنا تھے مگر ڈنلف نے عمداً ٹوپی نہ اتاری۔ یہ دیکھ کر کورا طیش میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے ٹوپی اتارنے کا حکم دیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔" نامہ نگار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

کورا نے قریب رکھا ہوا ایک بید اٹھایا اور ڈنلف کی ٹوپی اتار پھینکی تمام ہوٹل قہقہوں سے گونج اٹھا۔ نامہ نگار کمال شرمندہ ہوا مگر اس نے جلد ہی انتقام لے لیا۔ کورا دیگر اشیاء کے علاوہ موتیوں کی بہت شایق تھی اور اس وقت ایک ہار پہنے تھی جو ڈوول نے بیس ہزار پونڈ میں خرید اتھا پیرس میں افواہ تھی کہ وہ مالا نقلی ہے گر کورا کو اس پر یقین نہیں تھا۔ جب قہقہوں کا شور ختم ہو گیا تو ڈنلف اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کورا کی طرف بڑھا۔ کورا پرل اس وقت جنوبی فرانس کے ایک رئیس [illegible] گل مل کر باتیں کر رہی تھی جو اس کے قاتل حسن کی جی بھر کر تعریف کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ہیلن کے بعد چشم فلک نے تم جیسی حسین اور خوبصورت عورت دوسری نہیں دیکھی۔

"کیا آپ ان موتیوں کا اس کے الفاظ کے ساتھ تبادلہ کرنے کو تیار ہیں؟" ڈنلف نے مالا کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

کورا اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی مگر رئیس نے فوراً جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔"

"کیوں نہیں؟" نامہ نگار نے بلند آواز سے کہا۔ "دونوں جھوٹے ہیں۔"

کورا پرل طیش میں اٹھ کھڑی ہوئی اور مالا کو نوچ کر توڑ دیا۔ تمام موتی فرش پر گر پڑے اور ادھر ادھر بکھر گئے۔

فیاضی

بہت سے آدمیوں نے رضا کارانہ موتی کی جستجو کی مگر سات موتی گم ہو گئے

"مسٹر ڈنلف آج رات آپ کے چند احباب ضرور یہاں تشریف لائے ہیں۔" کورا نے طنزاً اور غصے سے کہا۔

نامہ نگار گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"میرے سات موتی چرا لئے گئے ہیں۔" کورا نے طنز سے مسکراتے ہوئے کہا "اور سب جانتے ہیں کہ تم غریب نامہ نگار بڑی مشکل سے روح اور جسم کا تعلق کو قائم رکھ سکتے ہو۔"

ڈنلف اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دوسرے دن تمام پیرس میں یہ افسانہ مشہور ہو چکا تھا۔ بلاشبہ کورا کے سات موتی گم ہو گئے مگر اس طرح جو شہرت اس نے حاصل کی۔ وہ بہت قیمتی تھی۔ اسی ہفتے میں اس نے فیاضی اور علو ہمتی کی ایک ایسی مثال قائم کی کہ پیرس اس کی تعریف سے گونج اٹھا۔

اس کے عشاق کے گروہ میں ایک نوجوان کاونٹ بھی شامل تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد ایک دوسری لڑکی کو دل دے بیٹھا۔ چونکہ دونوں اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی منگنی عام طور پر مشہور ہو گئی۔ کونٹ دل ہی دل میں کورا سے ڈرتا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ وہ اس کی محبت کو ایک

ٹریجڈی تباہ کی۔ اس لئے ایک وکیل کے مشورے سے اس نے کورا کو رشوت دینے کا ارادہ کیا اس نے ایک دستاویز لکھی جس میں کورا کو پچاس ہزار فرانک دینے کا وعدہ کیا اور اسے لیکر وہ کورا کے پاس گیا۔ وہاں جاکر وہ دیر تک کورا کے حسن کی تعریف کرتا رہا اور پھر اپنی شادی کا ذکر چھیڑا۔ کورا نے مڑکر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اپنی شادی کی تقریب پر آپ کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں" کونٹ نے کہا اور دستاویز اس کی طرف سرکا دی۔

کورا نے مسکراتے ہوئے اسے پڑھا اور تہ کرکے رکھ لیا۔

"شکریہ" کورا نے کچھ دیر کے بعد کہا —— "میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کی محبوبہ کو کہیں دیکھا ہے"

جب وہ چلا گیا تو کورا نے دستاویز کو پھاڑ دیا اور اس کے پرزے ایک لفافے میں بند کرکے کونٹ کی محبوبہ کو بھیج دیئے۔ دراصل وہ کونٹ سے خود اکتا چکی تھی اور اس کی شادی پر دل سے خوش تھی۔

تھیئٹر میں

کونٹ کی محبوبہ کو ڈاک کے ذریعہ کورا کا لفافہ ملا۔ وہ اس کی فیاضی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی اور بذات خود اس کا شکریہ ادا کرنے کیلئے اس کے پاس آئی۔ دوسرے دن پیرس کے تمام اخبارات میں کورا پرل کی فیاضی کی کہانی نمایاں الفاظ میں درج تھی۔ شام کو جب وہ گاڑی میں بیٹھ کر ہواخوری کو نکلی تو لوگ اسے دیکھنے کے لئے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے اور اس کی سواری بادشاہوں کے لئے قابل رشک تھی۔ ہر ایک قہوہ خانہ میں اس کا ذکر ہو رہا تھا اور اس کے حسن جانسوز کا چرچا فرانس سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل چکا تھا۔ ایک تھیئٹر کے منیجر نے اس سے درخواست کی کہ وہ رات کو کیوپڈ کے سوانگ میں سٹیج پر ظاہر ہو اور اس کے عوض میں کافی معاوضہ دینے کا وعدہ کیا۔ کورا نے مان لیا۔ اگرچہ ٹکٹ کی قیمت تگنی کردی گئی تھی مگر وقت مقررہ پر تمام تھیئٹر کھچا کھچ بھر گیا۔

خودکشی

بارہ بجے کے قریب جب وہ گھر جانے کے لئے اپنی گاڑی میں سوار ہوئی تو پیرس کے سینکڑوں کا ہجوم اسے اپنے نرغے میں لئے ہوئے تھا اور تالیوں سے اس کے حسن کی داد دی جا رہی تھی۔ کورا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی اور مخمور نگاہوں سے چاروں طرف اپنے مشتاقوں کو دیکھ رہی تھی۔ ناگہاں ایک زرد رو اور افلاس کے مارے ہوئے آدمی نے اس کا دامن تھام لیا۔ کورا نے مڑکر دیکھا اور ڈوول کو وہاں موجود پاکر حیران رہ گئی وہ مدت سے اسے بھلا چکی تھی اور خصوصاً اس وقت جب پیرس جوش عقیدت میں اس کے قدموں پر جھکا ہوا تھا وہ اس فاقہ کش بھکاری سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی وہ خوبصورت گاڑی جس میں وہ سوار تھی ڈوول نے خریدی تھی۔ گھوڑوں پر اس غریب کی کافی رقم صرف آئی تھی۔ اب ڈوول کی دولت کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا اس لئے کورا کو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

خادم نے دروازہ بند کیا۔ گاڑی میں حرکت پیدا ہوئی اور ہجوم نے راستہ دے دیا۔ دیر تک کنارہ دریا سیر کرنے کے بعد وہ اپنے عالیشان محل کے قریب پہونچی جس کی تعمیر اور آرائش پر ڈوول نے آنکھیں بند کرکے روپیہ صرف کیا تھا، وہاں صدر دروازے کے سامنے سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر ایک پھٹا پرانا کمبل بچھائے ڈوول بیٹھا تھا۔

"کورا کیا میں اندر آجاؤں؟" اس نے مجسم التجا بن کر پوچھا۔

"نہیں نہیں، اب کافی دیر ہو چکی ہے" کورا نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"کیا تمھیں میری ضرورت نہیں ہے؟" ڈوول نے بے اختیار ہوکر کہا۔

اگر کورا کے سینے میں دل ہوتا تو وہ ان الفاظ کو محسوس کرتی ڈوول نے اپنا سب کچھ اس کی نظر کردیا مگر انجام کار کورا نے اسے دھتکار کر باہر نکالا۔

کورا کمال سرد مہری سے ڈوول کی التجا کو ٹھکراتی ہوئی اندر چلی گئی دروازہ بند کردیا گیا اور وہ اطمینان سے سوگئی۔ صبح گیارہ بجے جب وہ بستر میں بیٹھی قہوہ پی رہی تھی تو خادمہ نے اسے بتلایا کہ رات ڈوول نے صدر دروازے کی سیڑھیوں پر خودکشی کرلی تھی۔ کورا یہ سن کر دنگ رہ گئی۔ اسے ڈوول کی موت کی کوئی پرواہ نہ تھی مگر اپنی شہرت کو خاک بسر دیکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی بعد میں اطلاع ملی کہ زخم خطرناک نہیں تھا اور اسے ہسپتال میں داخل کرلیا گیا ہے۔ اگرچہ کورا نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر ڈاکٹروں کی توجہ سے ڈوول کی جان بچ گئی۔

انگلستان میں

دوسرے دن رات کو وہ ڈرتی ہوئی تھیئٹر میں گئی۔ درحقیقت اس کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔ جس وقت وہ اسٹیج پر ظاہر ہوئی تو تماشائیوں

نے غل مچا دیا۔ اس پر گندے انڈے اور سڑے ہوئے پھل پھینکے گئے اس پر پردہ گرا دیا گیا اور کورا بڑی مشکل سے وہاں سے جان بچا کر نکلی۔

اس واقعہ کے بعد وہ ہفتوں تک اپنے مکان میں بند رہی اسے امید تھی کہ لوگ چند روز تک اس واقعہ کو بھول جائیں گے مگر ڈوول سے اس کا وحشیانہ سلوک آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ انہیں دنوں میں ایک انگریز ڈیوک نے کورا کو لندن آنے کی دعوت دی اور اس نے خوشی سے قبول کر لی۔ وہ چاہتی تھی کہ لندن میں اس کی آمد بچے بچے کی زبان پر ہو مگر پیرس میں ایک دوست نے اسے مشورہ دیا کہ ڈوول کی داستان۔ انگلستان کے اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اس لئے وہاں اپنا اصلی نام ظاہر نہ کرنا ورنہ تمہیں کسی ہوٹل میں جگہ نہیں مل سکے گی۔ کورا نے اس وقت اس کی کوئی پرواہ نہیں کی مگر لندن میں پہونچکر اسے نہایت تلخ تجربہ ہوا۔ مزدوروں نے اس کا اسباب ایک مشہور ہوٹل کے صحن میں ڈھیر کر دیا اور مزدوری لے کر چلے گئے۔ جب اس نے ہوٹل کے مینجر کے سامنے اپنا نام کورا پرل ظاہر کیا تو اس نے اسے ہوٹل میں جگہ دینے سے صاف انکار کر دیا ——— کورا طیش میں آ گئی اور اسے اپنے رعب حسن سے مرعوب کرنے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں ناکام رہی بالآخر اس نے امیروں کے محلے میں ایک عالی شان مکان کرایہ پر لیا جس کا ماہانہ کرایہ دو سو پونڈ سے بھی زیادہ تھا۔

لندن میں اس کے حسن نے زبردست فتوحات حاصل کیں۔ انگلستان کے امراء اس کے آستان ناز پر سر بسجود تھے اور کورا اپنی غیر معمولی کامیابی پر پھولی نہیں سماتی تھی۔ آخر کار ہر ایک ملک میں اپنے حسن کا پرچم اڑانے کے لئے اس نے تمام یورپ کا دورہ کیا۔ ہر جگہ لاکھوں پروانے اس کی شمع جمال پر جل مرنے کے لئے آمادہ نظر آتے اور اس کے حسن جہانسوز نے کروڑوں دلوں میں محبت کی تپش پیدا کر دی۔ بیڈن کے قمار خانے میں کورا قیصر جرمنی کے چچیرے بھائی کے بازوؤں پر جھکی ہوئی داخل ہوئی۔ اس کے ملازموں کے پاس آتشبازی کی چھچھوندریں تھیں کورا کے حکم سے انہیں آگ لگا دی گئی۔ قمار خانے میں شور مچ گیا اور جواری کھیل چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۱۸۷۰ء کی لڑائی

چند سال اسی طرح کمال مسرت اور عیش و عشرت میں گذرے تمام یورپ کی دولت اس کے قدموں پر ڈھیر تھی۔ اس کا گھر ایک خزانہ تھا جہاں سونے اور جواہرات کے ڈھیروں کے علاوہ دنیا بھر کے عجائبات جمع تھے اور اس کی دید کے بغیر پیرس کی سیر نامکمل رہ جاتی تھی۔ حسن و جمال میں اس کا کوئی ہمسر نہیں تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابد تک ملکہ حسن بنی رہیگی۔

جب اس کی عمر اٹھائیس برس کی تھی تو انقلاب نے فرانس کو دبوچ لیا ۱۸۷۰ء میں پرنس بسمارک نے فرانس پر حملہ کر دیا اور فرانسیسی افواج کو شکست دیتا ہوا پیرس کی طرف بڑھا اس واقعہ نے کورا کو بہت متاثر کیا وہ یکلخت عیش و عشرت سے دست بردار ہو گئی۔ اپنے خزائن حکومت کو دیدیئے اور اس کا عالی شان محل زخمی فرانسیسی سپاہیوں کے لئے ہسپتال بنا دیا گیا۔ کورا ہر روز ۱۴ گھنٹے نرس کے فرائض ادا کرتی اور پیرس کے محاصرے کے دنوں میں اس کی کارگذاری نے تمام فرانس سے خراج تحسین وصول کیا۔ خطرہ اس کے لئے ایک موہوم شے تھی، اور توپوں کی باڑھ میں وہ اپنے فرائض خندہ پیشانی سے ادا کرتی تھی۔ بارہا آگ اور لوہے کی بارش میں اس نے زخمی سپاہیوں کے حلق میں پانی ٹپکایا اور مرنے والوں کی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کیں۔

آخر کار جرمنی کی فتح ہوئی۔ فرانس میں جمہوریت قائم ہو گئی اور امراء کے وہ خاندان تباہ و برباد ہو گئے جو اس کے حسن کی قربانگاہ پر زر و جواہر کے انبار نذر کرتے تھے۔ کورا کے پاس ابھی تک جواہرات کی ایک کثیر مقدار موجود تھی اور اگر وہ احتیاط سے زندگی بسر کرتی تو تمام عمر اطمینان سے گذرتی مگر اسراف کی عادت پختہ ہو چکی تھی اس لئے دس سال کے عرصہ میں جواہرات۔ زیور عجائبات ہر ایک

چیز فروخت ہوگئی۔ افکار نے اس کے چہرے کی سرخی کو زردی سے بدل دیا خزاں نے بہار حسن کو پامال کر دیا اور بہر سال کے سن میں وہ غریبوں کے محلے میں درد ناک زندگی بسر کر رہی تھی۔

ایک پراسرار اجنبی

سالہا سال وہ افلاس و تنگدستی کی زندگی بسر کرتی رہی اس کے حسن کا افسانہ داستان ماضی بن چکا تھا۔ پیرس نے اسے بھلا دیا۔ یورپ نے فراموش کر دیا اور آخرکار جب ۱۸۹۶ء کے موسم سرما میں وہ فاقہ کشی سے ہلاک ہوگئی تو یورپ کے کسی اخبار نے اس کی موت کی خبر شائع نہ کی حالانکہ یہی واقعہ اگر بیس سال پیشتر ہوتا تو تمام اخبارات ہفتوں اس کے ذکر سے اپنے کالم سیاہ کرتے غریبوں کے قبرستان میں کورا پرل کیلئے ایک حقیر قبر کھودی گئی اور ادنیٰ قسم کا کفن مہیا کیا گیا۔ جب اس کا جنازہ اٹھانے لگے تو سفید بالوں والا ایک خوش پوش آدمی وہاں آنکلا۔ اس نے پوچھا۔

"اگر میڈم کورا پرل کا جنازہ شان و شوکت سے اٹھایا جائے تو کیا صرف آئیگا؟"

گورکن نے اصلی رقم سے دگنی بتلائی اور اجنبی نے اسکی مطلوبہ رقم سے دگنے کرنسی نوٹ اسے دیدیئے اور وہاں سے چلا گیا اور کورا کا جنازہ دھوم دھام سے دفن کیا گیا۔

چشم بینا کے لئے اس داستان میں عبرت اور نصائح کا خزینہ ہے کورا نے ایمان اور عزت دیکر دولت، امارت اور شان و شوکت خریدی مگر آج پیرس کے قبرستان میں اس کی قبر کا نشان تک نہیں ملتا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

شہرت

(ماخوذ از لارڈ ڈن سنے)

شہرت کوہساروں میں نغمے برساتی ہوئی اور قسمت آزما لٹیروں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی۔ جال میں ہزار دل پائمالیاں لئے ہوئے شاعر کے سامنے سے بے نیازانہ گزرتی چلی گئی۔ لیکن شاعر نے پھر بھی اپنے اشعار کے خوبصورت ہار بنا کر اسے مزین کرنے کے لئے **وقت** کے دربار میں پیش کئے لیکن وہ ذرا ملتفت نہیں ہوئی اور بدستور وہی کمزور ہار پہنے رہی جو ہنگامہ پرور شہریوں نے فانی چیزوں کے بنا کر اس کے راستے میں ڈال دیئے تھے۔

تھوڑی دیر میں جب وہ ہار مرجھا چکے تو شاعر اس کے پاس آیا اور اپنے اشعار کی مالا اس کی خدمت میں ہزار نیاز مندیوں کے ساتھ پیش کی لیکن وہ بدستور مسکرائی اور وہی معمولی ہار پہنے رہی جو روزانہ شام کو مرجھا جایا کرتے تھے۔

ایک روز شاعر نے بالکل عاجز آکر اس سے شکایت کی اور کہا۔ "پیاری **شہرت** تم نے کوہساروں، میدانوں۔ گلی اور کوچوں میں نکمے آدمیوں کے ساتھ ٹھٹھے کئے ہیں ان کے ساتھ ہنسی ہو اور مسکرائی ہو لیکن بتاؤ کہ آخر میری نیازکیشیوں کے ساتھ کیوں تمسخر اور استہزا روا رکھتی ہو خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ میں تمہارے ہی لئے سرگرداں ہوں اور تمہارا ہی خواب دیکھتا رہتا ہوں"۔

شہرت نے اپنی پیٹھ پھیر لی اور چلنے لگی لیکن رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے خوبصورت شانے کی طرف دیکھا اور ایسے انداز سے مسکرائی جو بالکل نیا تھا۔

اس نے شاعر سے بہت ہی آہستہ آواز میں کہا۔

"میں سو برس کے بعد اسی کارخانے کے پیچھے قبرستان میں تم سے ملوں گی"۔

(لارڈ ڈن سنے) ←—— خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

تجلیات

جناب حکیم خورشید حسن صاحب خورشید،

فنا سے کرتے ہیں آغازِ انتہا معلوم ۔۔۔ ہم اپنے آپ کو سمجھے ہیں کیا خدا معلوم
بڑھے ہیں شوق میں پاؤں سے آبلے آگے ۔۔۔ ہوئی جو گرمیٔ آغوشِ نقشِ پا معلوم
غرض تھی اتنی کہ حسرت بدوش ہو مری نعش ۔۔۔ تمہارے حسن کا مفہوم اور کیا معلوم
رہِ نفس میں اٹھا پھر غبار آہوں کا ۔۔۔ روا روی میں ہوا غم کا قافلا معلوم
ازل سے تا بہ ابد ایک رنگِ حیرت ہے ۔۔۔ کہاں چھپا ترا جلوہ کہاں ہوا معلوم
جہانِ عشق میں نیرنگِ انقلاب ہے، وہ ۔۔۔ جہاں جفا تری ہونے لگی وفا معلوم
کہاں پہونچکے ملی ہائے سرحدِ ادراک ۔۔۔ خبر ہوئی تو بس اتنی کہ کچھ نہ تھا معلوم
ہوئے جو ہمرہِ اشکِ الم جگر پارے ۔۔۔ تری کی راہ میں اک کارواں ہوا معلوم
زباں سکوت میں کر مدعا ادا پیدا ۔۔۔ نیاز کیشِ گذارش کا مدعا معلوم
بجز لحد رہِ ہستی میں چلنے والوں کو ۔۔۔ کہیں ہوئی نہ کوئی کارواں سرا معلوم
فنا کے بعد بھی ہم تو بقیدِ ہستی ہیں ۔۔۔ جزا مآل کی آسائشِ فنا معلوم

الم نصیب ہے خورشید اپنی فطرت کا
فلک کے جامۂ ازرق سے ہوگیا معلوم

سکوت

ایک انگریز سیّاح کا نظریہ

از مجید بشارتی صاحب

میرے خیال میں سب سے گہرا سکوت تو اس آدمی کو نصیب ہوگا جو کسی غبارہ میں آسمان پر لٹکا رہے مگر غبارہ ایسا ہو جو کسی مشین کی وساطت کے بغیر دنیا کے شور و شغب سے دور ایک خاموش فضا میں جہاں سکوت ہی چھایا ہو لٹک رہا ہو کاش کہ میں بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا۔

اس کے دوسرے درجہ پر سب سے گہری اور شدید خاموشی کا احساس کسی معدن کے عمق میں ہوگا جہاں اندھیرا اور سیاہی ہیں سما جانے کے لئے بیتاب نظر آئے اور یوں محسوس ہو کہ اس قید تنہائی سے کبھی نجات نہ مل سکیگی اور اگر ایسے موقع پر مشینری خراب ہو جائے اور گھر گھر کی سی صدا معاً سرد پڑ جائے تو یہ سکوت انتہائی مہیب ہو جائیگا کیونکہ اس قسم کی محدود صدائیں پتھر کی چار دیواری میں بہت زود اثر ہوتی ہیں۔

مجھے بھی ایک واقعہ یاد ہے۔ جب میں اپنے ہم مکتبوں کے ہمراہ ایک کوئلے کی کان کی سیر کے لئے گیا تھا۔ یہ انگلینڈ کی عمیق ترین کان تھی میرے شاداب دماغ پر تنہائی ایک غبار بن کر چھا گئی اور خاص کر ایک مقام پر تو اس نے انتہائی خوف کی صورت اختیار کر لی۔ بات یوں تھی کہ میں اور میرا ایک دوست مشین یا کچھ اور دیکھنے کے لئے کان کی سب سے ساکت اور گہری جگہ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے۔ ہم نے اپنے رہنما کے پیچھے قطار بنا رکھی تھی۔ اور خدا جانے ان بھول بھلیوں میں ہم نے کتنے چکر کاٹے تھے اور کتنے پیچ و تاب کھا کر یہاں تک پہونچے تھے۔ ہمارے بچھڑ جانے کے باعث وہ ہم سے کوئی تیس گز آگے نکل گئے اور یوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہم تنہا ہیں اور ساتھیوں سے علیحدہ نہ جانے وہ کس طرف مڑ گئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم راستہ کھو بیٹھیں جو ہمیں نہ معلوم کہاں سے کہاں لے پہونچے صرف اس ایک لمحہ کیلئے ہم انتہائی خوف سے لرز گئے اور دم بستہ ہو کر رہ گئے۔

ہمیں سکوت کامل حاصل نہ تھا کیونکہ ہمارے دوستوں کے قدموں کی آواز مدھم سے مدھم تر ہوتی ہوئی سنائی دے رہی تھی اور اس خفیف سی حرکت نے خاموشی کو اور بھی برہم کر دیا تھا۔ ہمارے پاؤں سے جنبش کی قوت سلب ہو گئی اور کچھ لمحے کی کوشش کے بعد ڈر زائل ہو گیا اور ہم اطمینان سے آگے بڑھے

اس قسم کی زمین دوز تنہائی کا احساس لندن میں کسی ٹیوب ریلوے کے مسافر کو ہوگا جب ٹرین دو اسٹیشنوں کے درمیان کسی سرنگ کی چپ چاپ فضا میں یکلخت ٹھہر جائے۔

تھوڑے عرصے کے لئے تو اتنا سکوت چھا جائیگا کہ آدمی صرف اپنی سانس کی رفتار ہی سن سکے۔ یا صرف اس تنہائی سے متاثر ہو کر پہلو بدلنے والے کے اخبار کی سرسراہٹ جو نزدیک ہی بیٹھا ہو۔

مجھے بچپن کا اسی قسم کا ایک اور واقعہ یاد ہے جب میں کرسمس گزارنے کے لئے اپنے دادا کے یہاں جایا کرتا تھا جو ایک کتب خانہ کا افسر تھا اور ایسے گھر میں رہتا تھا جو کتب خانہ سے ملحقہ تھا بلکہ ایک حصہ تھا۔ اندرونی حصے کے وسیع ہال اور دیگر کمروں کی ساخت سے مکان نیا نظر آتا تھا اور اگر باہر سے اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ عمارت پرانی وضع کی تھی۔ اس میں بہت سے پیچیدہ راستے تھے جن میں لکڑی کے رخنوں میں کتابوں کی دیواریں بنا رکھی تھیں۔ میرے دادا کا بڑا لڑکا یعنی میرا ماموں بھی کتبخانہ کے ملازمین میں سے تھا اور اس کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ رات کے وقت اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان طلسمی راستوں کا چکر کاٹے اور چراغوں کو حفاظت سے گل کر دے

مبادا کوئی دروازہ یا دراز کھلی رہ جانے سے کسی نقصان کا احتمال ہو۔

کئی سال ہم یونہی کرسمس گزارنے کے لئے وہاں جاتے رہے اور میرے کھیلوں میں ایک یہ بھی کھیل میری دلچسپی کا باعث رہا کہ اس اندھیرے میں اپنے ماموں کے کوٹ کا کنارہ پکڑ کر پیچھے پیچھے لڑھکتا ہوا جاؤں۔ اس تاریکی میں ماموں کے صحیح سلامت گزر جانے کو میں ایک معجزہ تصور کیا کرتا تھا اور حیران تھا کہ وہ کیونکر ان پیچیدگیوں میں اپنا راستہ ڈھونڈھ نکالتا ہے، وہ ہر قدم کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھا اور عموماً جاتے جاتے ٹھہر جاتا اور کہتا "سنبھل کر، بائیں طرف سے ہوکر دو قدم اوپر کی طرف بڑھاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھسل پڑو۔" کبھی کبھی وہ کسی کواڑ کو مضبوطی سے بند کرنے کیلئے کھڑا ہو جاتا اور یوں مجھے اس کا کوٹ چھوڑ کر اس سنسان اندھیرے میں اس کا انتظار کرنا پڑتا۔ آہ کس قدر ساکت اور ویران ہوتی تھی وہ فضا، بوسیدہ کتابوں کے تعفن سے سانس گھٹنے لگتا تھا اور میں اپنے ماموں کی دلیری کی داد دیتا ہوا خاموش رہتا اور سوچتا تھا کہ وہ میرے بغیر کیونکر اکیلا ان دشوار گزار راستوں سے گزرتا ہوگا۔

بہت کم تنہائیاں جنگل کی بیابانیوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں جنگل بھی وہ جنگل جو گھنے اور وسیع ہوں محض جھاڑیوں کے جھنڈ نہیں۔ ویرانیاں جہاں، لمبے لمبے اشجار تاریک سایوں کی طرح ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے بڑھتے چلے گئے ہوں، گھنی بیلیں آپس میں ایسی گتھی ہوں کہ سورج کی کرنیں اوپر کی سطح سے نیچے نہ چھن سکیں۔

ایسی جگہ جہاں تنہائی اور خاموشی کا بسیرا ہو۔ جھکی ہوئی افسردہ ٹہنیاں باہم مدت سے بچھڑے ہوؤں کی طرح بیٹھی ہوں۔ اس سبز مخمل کی چادر کے نیچے خشک پتوں کی تنہائی اور سکوت کس قدر مہیب ہوگا۔ شاید ایسی ہی جگہوں پر بھولی بھٹکی روحیں دنیا کے افکار و حوادث سے دور چین کے چند لمحے گزارنے کے لئے آنکلتی ہیں۔

سیلون کی گرم مرطوب آب و ہوا میں ایسے دشوار گزار اور گھنے جنگل بہت سرعت سے بڑھتے ہیں۔ اگر ایک سال کے لئے کسی چٹان کو صاف کیا جائے تو اس پر اس قدر گھاس اور جھاڑیاں اُگ آئینگی کہ ان میں گزرنا محالات سے ہوگا اور ایک صدی تک تو یہ حالت ہو جائیگی کہ کوئی اسے چٹیل چٹان تصور بھی نہ کرسکے گا اور ہر سو سبزہ ہی سبزہ چھا جائیگا۔ سیلونی جنگل میں مختلف اقسام کے درخت ہیں مگر نشو و نما اور تنوں کی ساخت میں بالکل یکساں ہیں اگر ان کی شکل اور لمبائی کا اظہار کیا جائے تو یہ بالکل ان درختوں کے برعکس ہونگے جو عموماً آپ نے سرد اور خشک آب و ہوا میں دوسرے پہاڑوں کے ڈھلانوں پر دیکھے ہونگے۔ بجائے اس کے کہ وہ صنوبر اور چیل کے درختوں کی طرح سیدھے اوپر کی طرف بڑھیں اور الگ الگ رہیں یہ آپس میں بے طرح خلط ملط ہوجاتے ہیں۔ ایک کی ٹہنیاں دوسرے میں الجھی ہوتی ہیں۔ پتیوں نے دوسرے تنوں کے گرد حلقہ کیا ہوتا ہے اور تنوں پر سانپوں کی طرح بل کھائی ہوئی بیلیں چڑھی رہتی ہیں۔

سیلون جانے والے متذکرہ بالا بیابانی کولمبو کے ساحلوں پر نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ مدت ہوئی کہ ان ساحلوں سے جنگل کاٹ کر ناریل کے درخت لگا دیئے گئے تھے۔ ساحلوں کی زندگی تو بالکل شہری، کثیف اور شور و شغب والی زندگی کے مترادف ہے۔ سیلون کے وسط میں بہت سی پہاڑیاں جنگلات سے اٹی ہوئی نظر آئینگی۔ ان میں چند ایسی بھی ہیں جو مدت ہوئی کہ بالکل صاف کردی گئی تھیں مگر وقت اور بے احتیاطی نے اب پھر ان پر جھاڑیوں اور درختوں کے جال بچھا دیئے ہیں۔

کچھ سال گذرے کہ میں نے بھی دو رنگین راتیں اس قسم کے جنگل میں بسر کی تھیں۔ چاروں طرف پتے اور ٹہنیاں ہی نظر آتی تھیں۔ دیودار کے ہرے بھرے فلک بوس جنگلات میں ایک پتوں کی جھونپڑی میں سوئے ہوئے تھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیبی ہاتھ نے یہاں قوی ہیکل دیودار کے بکھیرنے میں فراخدلی سے کام لیا ہے۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو نہایت ہی تیز تھی جس سے ہوا نہایت ثقیل محسوس ہو رہی تھی۔ میرے دو ساتھی اور بھی تھے۔ ہم سب پر ایک خواب آور کیف اور غیر مبہم سی مستی چھا گئی تھی تین کمبلوں، ایک چاقو اور کچھ سامان خورد و نوش کے سوا ہمارا کوئی اسباب نہ تھا۔ ہم کسی دیہات میں رات بسر کرنا چاہتے تھے مگر دیہات پہونچنے سے قبل ہی سورج پہاڑ کی چوٹیوں سے پیشانی گھستا ہوا ان کے پیچھے غایب ہوگیا تھا گذشتہ رات بارش ہو جانے کی وجہ سے ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی پناہ کی جگہ تلاش کریں۔ آخر کار ہمیں کچھ ٹہنیاں توڑ کر ایک جھونپڑی سی بنانی پڑی جس پر پتوں سے بستر بچھایا گیا۔ اس رات بھی بادل خوب جی بھر کر برسے مگر ہماری خوابگاہ نے ہمیں کچھ کچھ بھیگنے سے بچا ہی لیا۔ مجھے

احساس ہوا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں باوجود ہزارہا قسم کے شور و غوغا کے بھی سکوت کا تسلط ہے اور انسان اپنے کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ کہیں کوئی مینڈک بول رہا ہے۔ بول نہیں بلکہ دہاڑ رہا ہے کہیں جنگلی جانوروں کے چلنے سے پتوں میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوتی ہے اور سوکھی ہوئی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر تسکین دل چھینے لیتی ہیں۔ ادھر کوئی پرندہ جھٹ سے پھڑپھڑاتا ہوا فضا میں غائب ہوا اور ادھر دل دھک دھک کرنے لگا۔

یہاں تو موت کا سا ہیبت ڈر چھایا ہوا ہے۔ زندگی کے آثار تو نظر آتے ہیں مگر موہوم اور خواب آلود ——— شاید یہی ہے بیابانی جنگل اور سکوت کامل ——!

(ترجمہ) مجید لشاری

"گلاب کا پھول"!

مسٹر سعادت حسن صاحب منٹو

اگست کے آخری ایام ..... خزاں قریب تھی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ بارش کا ایک چھینٹا بغیر رعد اور بجلی کے ہمارے وسیع میدان پر پانی برساتا ہوا گذر گیا۔

گھر کے سامنے والا باغ غروب آفتاب کی احمریں آگ سے معمور اور بارش کے پانی سے بھرا ہوا انجار افشاں و تاباں تھا۔

وہ ملاقاتی کمرہ میں ایک میز کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اور خوابگیں نگاہوں سے نیم وا دروازے میں سے باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ اس وقت اس کی روح میں کیا گذر رہا ہے مجھے علم تھا کہ ایک تھوڑے مگر تکلیف دہ عرصہ کشمکش کے بعد وہ اس لمحہ اپنے آپ کو ایک ایسے احساس کے حوالے کر رہی تھی جس پر اس کا قابو پانا محال تھا۔

دفعتہً وہ اٹھی اور بڑی سرعت سے باغ میں جا کر نظروں سے پوشیدہ ہو گئی۔

ایک گھنٹہ گذر گیا۔ دوسرا بھی مگر وہ نہ آئی۔

میں اٹھا اور گھر سے باہر نکل کر اس روش کی جانب رخ کیا مجھے یقین تھا کہ وہ اس طرف سے گئی ہے۔

میرے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات پڑ چکی تھی مگر روش کی گیلی ریت پر ایک گول سی چیز نظر آ رہی تھی۔ کہر کے ہوتے ہوئے اس کا سرخ رنگ چمک رہا تھا۔

میں جھکا ——— یہ ایک تازہ کھلا ہوا گلاب کا پھول تھا دو گھنٹے پیشتر میں نے یہی پھول اس کے سینہ پر آویزاں دیکھا تھا۔

میں نے احتیاط سے پھول کو اٹھا لیا جو کیچڑ میں پڑا تھا اور واپس ملاقاتی کمرہ میں جاتے ہوئے اس کی کرسی کے سامنے والی میز پر اسے رکھ دیا۔

آخر کار وہ آئی اور ہلکے قدموں سے کمرہ کو طے کر کے میز کے قریب بیٹھ گئی اس کا چہرہ بیک وقت زرد اور تاباں تھا اسکی جھکی ہوئی آنکھیں جو قدرے چھوٹی معلوم ہو رہی تھیں بڑی تیزی سے فرط مسرت سے ادھر ادھر آوارہ گھوم رہی تھیں۔

اس نے پھول کو دیکھا جھپٹ کر میز پر سے اٹھایا۔ اسکی کیچڑ آلود اور کچلی ہوئی پنکھڑیوں کی طرف دیکھا اور میری طرف نگاہیں اٹھائیں اسکی آنکھیں جو اب اچانک ایک جگہ پر ساکن ہو گئی تھیں آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔

"تم کیوں رو رہی ہو؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"کیوں؟ اس پھول کو دیکھو ——— دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے؟"

اس وقت میں نے ایک اشارہ کرنا مناسب خیال کیا۔

"تمہارے آنسو اس کیچڑ کو دھو ڈالیں گے"۔

"آنسو دھوتے نہیں وہ جلاتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا اور انگیٹھی کی طرف مڑ کر گلاب کے پھول کو بجھتے ہوئے شعلے میں پھینک دیا۔

"آگ آنسوؤں سے بڑھ کر جلانے کی قدرت رکھتی ہے" وہ خوش ہو کر چلائی۔ اسکی خوبصورت آنکھیں جو ہنوز آنسوؤں سے منور تھیں بیباکانہ ہنسی ہنس رہی تھیں۔

مجھ پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ خود آگ میں کود چکی تھی۔

سعادت حسن منٹو

ٹیگور کی ایک نظم!

از جناب علی احمد صاحب علی فرزند نواب فصاحت جنگ مدظلہ

ہر طرف چھائی تھی خاموشی اندھیری رات تھی
ظلمتِ شب تھی در و دیوار پر چھائی ہوئی

میں لبِ ساحل کھڑا تھا گھاس پر سہما ہوا
آئی واں اتنے میں اک دوشیزۂ رنگیں ادا

میں نے چپکے سے کہا "اے غیرتِ صد مہوشاں
جا رہی ہے تو کہاں لیکر چراغ ضوفشاں

اپنے آنچل سے اسے سایہ کیئے، ڈرتی ہوئی
ہر قدم پر فتنۂ محشر بپا کرتی ہوئی،

گھر مرا تاریک ہے، تاریک یہ کبتک رہے
مستعار اس کی ذرا سی روشنی دیدے مجھے"

ایک لمحے کو نظر اس نے اٹھائی پھر ذرا،
میرے چہرے پر نظر کی اور زیرِ لب کہا

"میں یہاں آئی ہوں دریا پر بہانے کے لئے
چھیڑتے ہیں آپ کیوں ناحق ستانے کیلئے"

میں تحیر میں کھڑا ابھر کر نظر دیکھا کیا
روشنی کو ہوتے ضائع بے اثر دیکھا کیا

رات کی خاموش تاریکی میں پھر میں نے کہا
"اب تو روشن بھی چراغ اک ایک گھر کا ہو گیا

کیا کریگی اب تو یہ بے کار ہے تیرے لئے
گھر مرا تاریک ہے یہ روشنی دیدے مجھے"

یہ سنا اس نے تو ڈالی مجھ پہ اک غائر نظر،
پھر سنبھل کر مجھ سے یوں کہنے لگی اے بیخبر

تو سمجھتا ہے کہ ہے بے سود یہ میرا دیا؟
آسماں کی نذر کو لائی ہوں میں اپنا دیا

میں تحیر میں کھڑا ابھر کر نظر دیکھا کیا
روشنی کو ہوتے ضائع بے اثر دیکھا کیا

نصف شب کی خامشی میں میں نے پھر اس سے کہا
قفلِ خاموشی کو توڑا اس طرح گویا ہوا،

"اے حسین نزدیک دل کے روشنی رکھے ہوئے
سچ بتا گر مجتسس ہے تو اب کس کے لئے

گھر مرا تاریک ہے تاریک یہ کبتک رہے
مستعار اس کی ذرا سی روشنی دیدے مجھے"

دیر تک وہ بحرِ غور و فکر میں ڈوبی رہی
غور سے پھر مجھ کو دیکھا اور یوں گویا ہوئی

"اجنبی! یہ روشنی بہرِ خدا مجھ سے نہ لے
دیپ مالا میں میں شامل کرنے لائی ہوں اسے"

میں تحیر میں کھڑا ابھر کر نظر دیکھا کیا
روشنی کو ہوتے ضائع بے اثر دیکھا کیا

(ترجمہ)

برجیس!

از کیوپڈ

(۱)

برجیس ایک خوبصورت، تعلیم یافتہ اور فیشن پرست لڑکی تھی اس کے بھائی بیرسٹر اور والد ڈپٹی مجسٹریٹ تھے اور یہ لوگ اس وقت تک لڑکیوں کو پردہ میں بٹھانا تعلیم میں روڑا اٹکانا سمجھتے تھے جب تک کہ لڑکیوں کی تعلیم مکمل نہ ہوجائے اس لئے اس کو بڑی آزادی مل گئی تھی۔ وہ آزاد تھی اور آزاد خیال۔ والدین کے احکام کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے وہ ہر اس فعل کو جائز سمجھتی جسے اس کا دل چاہتا۔ اس کے پندار میں والدین کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ اولاد کے طریق کار پر حرف گیری کریں۔ مشن اسکول کی تعلیم اور یورپین لیڈیوں کی صحبت نے اس سے مشرقی تہذیب کا زیور اتار لیا تھا۔ کلبوں تھیئٹروں اور سنیماؤں کی شرکت سے اس کی شرم و حیا اس سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ وہ کلب میں غیر مردوں کے ساتھ رقص کرنے میں ذرا نہ جھجکتی تھی۔ نغمہ و سرود کے جلسوں میں وہ غیر محرموں سے کبھی نہ گھبراتی تھی۔ اس کو اپنی آرائش و زیبائش سے دوسرے کی آنکھیں خیرہ کرنے میں ذرا شرم نہ آتی تھی۔ غرضکہ وہ انگریزی تہذیب کی دیوانی اور مغربی معاشرت کی سودائی تھی۔

برجیس کی شادی بمبئی ہی کے ایک بیرسٹر کے لڑکے سلمان کے ساتھ ہوئی تھی۔ سلمان گریجویٹ تو ضرور تھا لیکن اس کے دامن تہذیب پر انگریزیت کا ایک ذرہ برابر بھی بدنما داغ نہ لگا تھا۔ وہ نہایت نیک طینت اور ماں باپ کا فرمانبردار لڑکا تھا۔ عورتوں کی آزادی کا سخت مخالف تھا اور مشرقی تہذیب کا شیدائی و دلدادہ تھا۔ وہ ہرگز برجیس سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھا، مگر والدین کی ضد اور ہٹ سے مجبور ہو کر اس کو اپنی زندگی اس کے ساتھ وابستہ کرنی پڑی کیونکہ ایک شریف اور لائق بیٹے کے یہ شایان شان نہیں کہ ماں باپ کی حکم عدولی کرے۔ گو وہ جانتا تھا کہ اس شادی میں ہزاروں خوفناک جراثیم پنہاں ہیں اور اس کے نتائج نہایت ہی تلخ اور ناگوار ہیں لیکن پھر بھی وہ مجبور تھا، اس لئے بہتری کوششیں کیں کہ کسی طرح اس کی شادی برجیس کے ساتھ نہ ہو لیکن اس کی کل سعی لاحاصل ہوگئی اور وہی ہوا جو اس کے والدین کرنا چاہتے تھے۔ اس نے والدین کو ہزار سمجھایا کہ میری شادی اس کے ساتھ نہ کیجئے کیونکہ مجھے اس کے تہذیب و تمدن سے سخت عداوت ہے اور اسکی آزادی سے قطعی نفرت و دشمنی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ زنجیر میں نہ باندھئے میری شادی ایک غریب، جاہل، بدصورت لیکن شریف و باحیا لڑکی سے کر دیجئے مجھے منظور ہے لیکن اس تعلیم یافتہ، امیر اور خوبصورت زہریلی ناگن سے نہ کیجئے کیونکہ ایسے ہی ایسے پیکر جمیل اپنے اندر سم قاتل لئے ہوتے ہیں ورنہ میری تو زندگی تباہ ہی ہوگی ساتھ ہی آپ لوگوں کے ماتھے پر بھی کلنک کا ٹیکہ لگ جائیگا۔ اور تمام عزت و شرافت خاک میں مل جائیگی لیکن اس بات پر اس کے والدین کسی طرح رضامند نہ ہوئے کہ ایک امیر، تعلیمیافتہ، خوبصورت، ثروت مند لڑکی کو چھوڑ کر کسی غریب، جاہل، مفلس لڑکی کے ساتھ اس کی مناکحت کی رسم انجام دیتے اور انھوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے بارنہ آکر سلمان کی شادی برجیس کے ساتھ کر ہی دی۔

(۲)

آزادی کی اس رنگین فضا میں سانس لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے دو ماہ بعد ہی سے میاں بیوی میں کشیدگی شروع ہوگئی اور مخالفت رہنے لگی آئے دن دونوں طرف سے ذرا ذرا سی باتوں پر غصہ اور نفرت کا اظہار ہونے لگا۔ اور اسی اظہار نفرت نے آگے چل کر ایک خوفناک صورت اختیار کر لی، جس کی ابتدا برجیس ہی کی طرف سے یوں ہوئی کہ ایک روز برجیس نے سلمان

سے کہا کہ چلو آج ذرا سینما چلیں۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا اس لئے سلمان انکار نہ کر سکا۔ موٹر پر پردہ کا انتظام کرکے سینما گیا۔ اسی طرح اسے چند مرتبہ اپنی طبیعت پر جبر کرکے برجیس کو تماشہ گاہوں میں لے جانا پڑا لیکن اگر یہ دو چار دفعہ ہی پر موقوف ہو جاتا تو سلمان کو جنبش لب کی ضرورت نہ پڑتی مگر برجیس نے اب روز تنگ کرنا شروع کیا۔ کبھی تھیئٹر جانے کو کہتی تو کبھی سینما چلنے کو۔ کبھی کلب میں شریک ہونے کہتی تو کبھی نمائش دیکھنے۔ غرض کہ وہ روزانہ سیر و تفریح چاہتی اور جب کبھی سلمان جانے سے انکار کر دیتا تو وہ بلا اجازت چپکے سے پائیں باغ کی کھڑکی سے نکل جاتی جس سے سلمان کو سخت غصہ ہوتا۔ اول تو سلمان اس بات سے ناراض ہوتا کہ بلا حکم چلی جاتی دوسرے بے نقاب و چادر۔ ایک دو مرتبہ سلمان نے اسے منع بھی کیا لیکن اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ اور حسب دستور بلا ناغہ شام کو چلدیتی۔ پہلے تو خیر اتنی بات بھی تھی کہ سلمان کو بھی چلنے کو کہا کرتی لیکن اب تو اس کی پرواہ بھی نہ کرتی اور بلا اطلاع چلی جاتی اور بارہ ایک بجے رات کو واپس آتی۔ جب سلمان نے دیکھا کہ میری باتوں کا اس پر الٹا اثر ہوتا جا رہا ہے تو ایک روز برجیس کو جب کہ وہ ایک بجے رات کو تھیئٹر سے واپس آئی چند سخت و سست الفاظ کہے اور تاکید کی کہ اب حضور کو مکان سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ سیر و تفریح کی لیکن ان باتوں کو اس نے اس طرح سنا گویا سنا ہی نہیں اور دوسرے دن پھر سر شام ہی فرار ہو گئی اور جب دو بجے رات تک واپس نہ آئی تو سلمان کو تشویش ہوئی۔ وہ اٹھا اور کلب کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں پہونچکر جس منظر سے اسے دوچار ہونا پڑا وہ قابل بیان نہیں۔ ممکن تھا کہ مارے غیرت کے بیہوش ہو کر گر پڑتا یا پستول ہوتا تو خودکشی کرکے اس خاکی جسم سے آزاد ہو جاتا لیکن اس نے اپنی مردانہ قوت سے کام لیکر اپنے آپ کو سنبھالا اور الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ مکان پہونچکر والدین کی جرمی اور ان کی ناقابل تلافی غلطی پر خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

(۳)

جس وقت سلمان کلب پہونچا تھا وہاں رقص و سرود کا بازار گرم تھا اور برجیس بھی اپنے ایک محبوب یا دوست فرخ کے ساتھ رقص میں مصروف تھی اور فرخ اپنے ہونٹوں سے اس کے لب لعلیں کو چوم رہا تھا۔ ایک تو یوں ہی فطرت نے برجیس کو حسن کا ایک مکمل نمونہ بنایا تھا۔ دوسرے اس کی اس وقت کی زیبائش اور بھی چار چاند لگا رہی تھی۔ اس کے جلد کے رنگ کی ساری اس کے بلوریں جسم کی نقرئیت کے ساتھ مل ہو کر اسی میں مدغم ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے مینائے شباب کی خمار آگیں کیفیات کو بلوز کا خاص تراش اور بھی نمایاں کر رہا تھا اور وہ اس وقت پری پیکر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں سے جوانی کی امنگیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ نشۂ شراب سے بیخود ہو ہو کر وہ فرخ کے سینے سے چپٹ جاتی تھی اور کبھی کبھی اپنے نازک ہونٹوں کو دانتوں سے چبانے لگتی تھی۔ اس کی رسیلی آنکھیں ہر شخص کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں فیاضی دکھا رہی تھیں اور وہ شراب حسن کے دو چھلکتے ہوئے ساغر معلوم ہو رہے تھے۔ کلب کے لوگوں کی نگاہیں اس مرکز حسن و جمال سے اکتساب نور و سرور کر رہی تھیں۔ اس کے ایک ایک قدم پر قیامتیں اٹھتیں اور فتنے جاگتے تھے وہ اپنا ایک نرم و نازک اور بلوریں ہاتھ فرخ کی کمر میں ڈالے تھی اور دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ملائے اوپر کو اٹھائے ہوئے رقص کر رہی تھی تھوڑی دیر میں جب سب ناچ ختم کرکے میز پر پہونچے تو سبھوں نے مل کر برجیس کی صحت کا جام پیا۔ برجیس نے گھڑی دیکھی اور فرخ کے ہونٹوں سے اپنے لب ملا کر جانے کی اجازت یہ کہہ کر مانگی کہ "تین بج رہے ہیں اب مجھکو گھر جانا چاہیئے" فرخ نے بھی ایک رخصتی بوسہ کے بعد اس کو خدا حافظ کہا اور آن کی آن میں ساری محفل درہم برہم ہو گئی۔

(۴)

فرخ ایک اوباش، آوارہ اور بدمعاش شخص تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خوبصورت اور شریف خاندان کا تھا اور سلمان کا خالہ زاد بھائی تھا۔ لیکن آوارہ اور پہلے درجہ کا شرابی تھا۔ کچھ روز تک سلمان کے ساتھ اس نے پڑھا بھی تھا اور ہمیشہ سلمان اس کو اپنا دوست سمجھ کر محبت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا لیکن جب سے سلمان کو اس کی خبر ملی کہ وہ پہلے درجہ کا شرابی ہے تو اس نے اس کو سمجھانا شروع کیا لیکن جب دیکھا کہ یہ کسی طرح راہ راست پر نہیں آتا تو اس نے فرخ کی طرف سے بے التفاتی شروع کی مگر اس طرح پر کہ اس کو محسوس نہ ہونے دیا۔ کتنی دفعہ یہ بھی ہوا کہ فرخ کو خرچ کی تنگی ہو گئی تو سلمان نے اس کی امداد کی۔ ان دنوں وہ ایک فلمی جریدہ کا ایڈیٹر بنا ہوا بیٹھا تھا جس کی مالکہ برجیس تھی چونکہ اس کے پاس روپیہ تو تھا نہیں اس لئے برجیس کو مالکہ بنا کر اپنا الو سیدھا کر رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ فلم کمپنی میں ملازمت بھی کر چکا تھا لیکن اپنی آوارگی کے سبب وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ بہر کیف،

جس وقت برجیس مکان پہونچی اس کا کمرہ مقفل تھا۔ وہ کمرہ کو بند پاکر سلمان کے کمرہ میں پہونچی۔ سلمان کو سوتا دیکھ کر اس کے دل میں ایک غیر معمولی امنگ پیدا ہوگئی ایک طرف جوش جوانی کا غلبہ تھا دوسری طرف نشہ شراب کی مدہوشی اس کو گدگدانے لگی۔ سلمان اس کے بوں کے مس ہوتے ہی جاگ پڑا اور برجیس کو اپنے پاس دیکھتے ہی آگ بگولا ہوگیا۔ فوراً اس نے شراب کی بو محسوس کی بس پھر کیا تھا گویا کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ سلمان کی آنکھیں مارے غصہ کے سرخ ہوگئیں لیکن پھر اس نے بہت ہی ضبط سے کام لیتے ہوئے حقارت بھری نظر برجیس پر ڈالکر اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ برجیس نشہ کی حالت میں اس کو کچھ نہ سمجھ سکی اور اپنے آپ کو سلمان کی گود میں ڈالتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیوں فرخ! آج تم مجھ سے ناراض کیوں ہو۔ کیا مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوگیا ہے یا آج کی دعوت تمھارے حسب خواہ نہ ہوئی؟ مُنہ سے بولتے کیوں نہیں ہو؟ بولو کچھ کہو تو سہی۔"

ان جملوں کو سنتے ہی سلمان نے اس کو گود سے نیچے ڈھکیل دیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ ادھر برجیس کا نشہ زمین پر گرتے ہی ہرن ہوگیا اور اس کو خیال آیا کہ میں فرخ کے پاس نہیں بلکہ سلمان کے نزدیک ہوں اور فوراً ہی اس کو کہے ہوئے جملے بھی یاد آگئے جس سے اس پر خوف و ہراس طاری ہوگیا وہ متوحشانہ نظروں سے سلمان کو گھورنے لگی۔ سلمان نے آنکھوں سے شعلے نکالتے ہوئے کہا۔ "کمبخت، آوارہ، ذلیل عورت، شوہر کے سامنے اس قدر بے حیائی خاوند کو عاشق تصور کرنے میں ذرا شرم نہ آئی۔ نشہ شراب نے تیرے دماغ کو اس قدر ماؤف کردیا ہے کہ تو شوہر کو عاشق تصور کرنے لگی۔ شام کی گئی تین بجے رات کو آئی۔ تف ہے تجھ پر، لعنت ہے۔ خبردار جو میرے گھر میں رہی نکل جا چڑیل ابھی۔ فوراً چلی جا بے حیا کہیں کی تو اپنے آپ کو بہت ہی خوبصورت سمجھتی ہے لیکن تجھے خبر نہیں کہ تیرے حسن کی تابش کو تیری بدکرداری کا سیاہ داغ تاریک بنائے ہوئے ہے۔ ہاں یہ تو بتا کہ تو اتنے رات تک کہاں رہی؟"

برجیس جو اتنی دیر میں اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی لڑکھڑاتی ہوئی زبان اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں پر قابو پاتے ہوئے اسنے جواب دیا۔

"پیارے سلمان! تم مجھ سے خفا نہ ہو۔ میں اصلی بات تمھیں بتائے دیتی ہوں چونکہ آج بلقیس کے یہاں چاء کی دعوت تھی اور میں بھی مدعو تھی اس لئے شام کو وہیں چلی گئی۔ دعوت کے بعد آزادی نسواں پر بحث ہونے لگی اس لئے مجھے بھی اس عنوان پر کہنے کی ضرورت پڑ گئی۔ تقریر کے خاتمہ پر تمھارے کلاس فیلو فرخ نے جو بلقیس کے چچازاد بھائی اور منگیتر بھی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے روک لیا اور میری تقریر پر نقد و تبصرہ کرنے لگے جب میں رخصت ہونے کے لئے اٹھی تو فرخ نے بلقیس سے کہا کہ برجیس جارہی ہیں انھیں ایک گلاس شربت پلادو۔ بلقیس شربت لائی اور مجھکو دیکر ان دونوں نے خود بھی پیا۔ جب میں نے پینے کے لئے گلاس مُنہ میں لگایا تو میری ناک میں ایک عجیب قسم کی بو پہونچی۔ میں نے کہا۔ "بہن اس میں تو شراب کی سی بو ہے اسے نہیں پیونگی"۔ ان دونوں نے کہا۔ "نہیں جی لاحول ولاقوۃ تم یہ کیا بک رہی ہو اس میں اسنس ہے اس لئے ایسی خوشبو ہے۔ آخر ہم لوگوں نے بھی تو پیا۔ پی کر دیکھو تو پتہ چلے گا"۔ غرض ان دونوں کے کہنے سے میں نے بھی پی لیا۔ جب تلخی محسوس ہوئی تو میں نے کہا۔ "اچھا یہ تلخی کیسی تھی"؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اسنسوں میں تلخی تو ہوتی ہی ہے یہ کوئی تعجب کی بات تھوڑی ہی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے پھر تین گلاس بھرے ایک میری طرف بڑھا کر دو خود دونوں چڑھا گئے۔ میں نے انکار کیا کہ اب میں نہیں پیونگی مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ان دونوں نے پھر سمجھانا شروع کیا۔ آخر بہت ہی اصرار پر میں نے یہ گلاس بھی حلق سے اتار لیا۔ راستہ میں مجھے نشہ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی اور میں بیہوشی کے عالم میں گھر پہونچی اور تم کو سلمان کے بدلے فرخ کہہ گئی۔ میں نے بلقیس کو فرخ سے کہتے ہوئے سنا تھا "کیوں فرخ تم مجھ سے ناراض کیوں ہو کیا مجھ سے کوئی قصور ہوگیا ہے یا آج کی دعوت تمھارے پسند کے لائق نہیں ہوئی ہے۔ یہی جملہ میرے دماغ کے اندر چکر لگاتا رہا اور تمھارے نزدیک بھی یہی زبان سے نکل گیا اور تو میں کہیں نہیں گئی البتہ دشمنوں نے مجھے شربت کہہ کر شراب پلادی جس کو میں اب سمجھی اس میں تو میرا کوئی قصور نہ تھا"

ان جملوں کو سنتے ہی سلمان کا چہرہ اور سرخ ہوگیا اٹھا اور برجیس کے زلفوں کو جو جو اس کے چاند سے چہرے پر کالی گھٹا بن کر چھائی ہوئی تھی زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"جھوٹی، شیطان، فریبی، مکار عورت اپنے ساتھ تو غریب بلقیس کو بھی بدنام کرنا چاہتی ہے اور اس نادان کے شیشہ ننگ و ناموس پر بال لانے کی فکر کر رہی ہے۔ کہتی ہے بلقیس کے یہاں دعوت تھی اور وہیں "آزادی نسواں" پر تقریر کر رہی تھی۔ یہ کہتے کیوں شرم آتی ہے کہ کلب میں محبت کا درس

اور رقص و سرود کی تعلیم دے رہی تھی، بول! او کمینہ خصلت عورت! کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں کیا تو فرخ کے ساتھ کلب میں ڈانس نہیں کر رہی تھی۔ کیا وہاں تونے شراب نہیں پی ہے؟ بول جواب دے"

برجیس نے اس پر کہا "بیشک میں کلب گئی تھی اور فرخ کے ساتھ رقص بھی کیا ہے اور شراب بھی پی ہے لیکن تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے چونکہ آج رقص و سرود کا جلسہ تھا اس لئے مجھے بھی اپنے کمالات دکھلانے پڑے اور تمہیں اس لئے اطلاع نہ دی کہ میں جانتی تھی کہ تم شریک نہ ہو گے لہذا مجھے مجبوراً فرخ کے ساتھ رقص کرنا پڑا۔ ہاں سلمان! جب تم کلب گئے ہی تھے تو پھر رقص میں حصہ کیوں نہیں لیا اور نہ ہم کو صورت ہی دکھائی۔ کیا چور کی طرح جانا اور چھپ چھپ کر تماشہ دیکھنا شریفوں کا کام ہے اور پھر جب تم نے رقص کرتے دیکھا ہی تھا تو دوبارہ دریافت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر گالیاں بکنے اور مارنے کی غرض سے تم نے دریافت کیا تھا تو تمہاری یہ کل باتیں سراسر ظلم پر مبنی ہونگی۔ میں تمہاری گالیاں نہیں سن سکتی اور نہ مار کھا سکتی ہوں۔ میرے والدین نے تمہارے یہاں مجھے مغلظات سننے کے لئے نہیں دیا ہے۔ تمہارا یہ برتاؤ ایک شریف لڑکی کے لئے بیہودگی پر دلالت کرتا ہے"

سلمان جس کا غصہ ابھی کم نہ ہونے پایا تھا کہ "بیہودہ اور کمینہ" کے الفاظ اس کو کہے گئے جس سے وہ اور بھی خشمگیں ہو گیا لیکن اپنی مردانہ قوت سے کام لیکر برداشت کر کے دریافت کیا۔

"تو کیا تمہارے والدین نے میری عدول حکمی کرنے کیلئے حوالہ کیا ہے؟"

"نہیں، ہرگز نہیں، میں بیشک ہر حکم کو ماننے کیلئے تیار تھی اور ہوں"

"لیکن تم نے میری بات سنی تو کب سنی۔ میں نے کہا باہر نکلنے اور سیر و تفریح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن تم نے اس کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا"

"باتیں ماننے کے یہ معنی نہیں کہ میں صرف تمہاری خوشی کیلئے اپنے سیر و تفریح اور خوشی و مسرت کو خیرباد کہہ کر گھر کی چار دیواری میں مقید رہ کر ایک گوشہ میں پڑی رہوں یا بیٹھی چولہا کا رہتی رہوں۔ اگر تمہاری یہی خواہش تھی کہ کہ میری بیوی مکان میں بند رہ کر گھٹ گھٹ کر مرا کرے اور میرے ذرا ذرا سے اشاروں پر اپنے عیش و مسرت کو قربان کیا کرے تو کسی ناخواندہ گنوار لڑکی سے بیاہ رچاتے کیونکہ تم مجھے جانتے ہی تھے اور میری کوئی بات تم سے پوشیدہ نہیں تھی پھر کیوں مجھ سے شادی کی۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مکان میں بند رہ کر اپنی صحت خراب کر لوں"

"اگر پردہ میں نہیں رہ سکتی ہو تو چلی جاؤ میرے یہاں سے مجھے تمہاری ایسی بے شرم عورت کی ضرورت نہیں ہے"

"اچھا صبح چلی جاؤنگی، لاؤ میرے کمرہ کی کنجی دو"

(۵)

چونکہ گرانٹ روڈ سے ٹیمنگ ٹون روڈ کچھ زیادہ دور نہ تھا اس لئے برجیس صبح ہوتے ہی وکٹوریہ پر سوار ہو کر مکان چلدی۔ گو اس کے والدین کو اس کے اس طرح آنے پر ایک گونہ تشویش ہوئی لیکن اس کو غضب آلود دیکھ کر کسی کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کے بھائی مسٹر ضیا حیدر خود سلمان کے یہاں گئے اور چلے جانے کا سبب دریافت کیا سلمان نے کل باتیں من و عن ان سے بیان کر دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر یہی طریقہ آپ کی بہن کا رہا تو میں کبھی ان کو اپنے گھر میں رہنے کا روادار نہیں ہوں۔ اس کے بھائی کل حالات سن کر واپس آئے اور اپنے والد ڈپٹی رضا حیدر کو کل باتوں سے آگاہ کر دیا اور انھوں نے بیگم تک یہ خبر پہونچائی تو بیگم صاحبہ الٹا انہیں کے اوپر برسنے لگیں کہ اور انگریزی پڑھاؤ۔ ارے ابھی کیا ہوا ہے ابھی تو شوہر ہی سے لڑ کر آئی ہے۔ آگے نہ معلوم کیا کیا آفت ڈھائیگی۔ میں نے ہزار کہا کہ لڑکیوں کو انگریزی پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں محض تھوڑی بہت اردو نوشت و خواند کافی ہے اور بس لیکن میری باتیں سنتا کون ہے۔ انگریزی تعلیم دلوائی اور وہ بھی مشن سکول میں۔ میں بارہا کہتی رہی کہ لڑکی اب ماشاءاللہ سیانی ہوئی باہر نکلنے نہ دو اور ساتھ ہی تعلیم بھی بند کر دو اور تم لوگ اپنی ضد سے باز نہ آئے اور کہتے رہے کہ ایک سال اب الیف۔ اے کے امتحان کو باقی رہگیا ہے مکمل کر لینے دو۔ بھلا جو لڑکی ہمیشہ باہر نکلتی رہی وہ اب گھر میں بند کیسے رہ سکتی ہے اور بائیسکوپ دکھا دکھا کر تو اور بھی شوخ کر دیا۔ ٹھیک بوا رحیمن کہتی تھی کہ "بیگم صاحبہ لڑکی کو بائیسکوپ دکھاتی ہیں لیکن شریف لڑکیاں بھی کہیں تماشہ دیکھا کرتی ہیں اس سے تو مردوں کی عادت بگڑ جاتی ہے اور عورتیں غریب کیا ہیں" لیکن میں نے اس کی بات پر کچھ توجہ نہ کی اور پھر توجہ کر کے کر ہی کیا سکتی تھی نقارہ میں طوطی کی آواز سنتا کون؟ یہاں تو بیٹی کو انگریزی پڑھا کر جیسے خود ڈپٹی اور بیرسٹر ہیں ویسے ہی اس کو بھی

جج بنانے کا خبط سمایا ہوا تھا اور اسی خبط نے آج یہ دن دکھایا۔ کاش میں یہ دن دیکھنے سے قبل ہی مرگئی ہوتی۔"

ڈپٹی صاحب نے کہا ارے بھئی اب تو جو ہونا تھا تو ہو ہی چکا اب تو کوئی تدبیر بتاؤ کہ عزت بچ جائے اور لوگوں میں سبکی نہ ہو۔ جاؤ اسے کسی صورت سے سمجھاؤ کہ شریف لڑکیوں کا یہ قاعدہ نہیں کہ سسرال سے لڑکر چلی آیا کریں"۔

بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔" نہ بابا! میں جانے کی نہیں، وہ تو مجھ سے یہ باتیں سنتے ہی نوچنے کو دوڑیگی۔ مجھے معاف ہی رکھو، تم خود اسے جاکر سمجھاؤ، میری وہ سننے کی نہیں۔ میں زبان کھولکر ذلیل نہ ہونگی۔ تم ہی لوگ جاکر سمجھاؤ۔ میں تو ایسی لڑکیوں کو دور ہی سے سلام کروں"۔

ڈپٹی صاحب نے جواب دیا۔ یہ ذلیل ہونے کی کون سی بات ہے چونکہ تم اس کی ماں تھیں اس لئے میں نے تم سے کہا۔ اچھا اگر تم کہنا پسند نہیں کرتی ہو تو کم از کم میرے ساتھ آؤ۔"

یہ کہہ کر دونوں دالان سے اٹھے اور ایک کمرے میں جاکر مغلانی کو آواز دی وہ فوراً حاضر ہوئی، ڈپٹی صاحب نے برجیس کو بلانے کے لئے کہا۔ مغلانی سر جھکا کر چلی گئی اور دبے پاؤں برجیس کے کمرہ میں کمرہ میں پہونچی۔ وہ اس وقت خط لکھ رہی تھی۔ مغلانی نے ڈرتے ڈرتے سلام کیا اور کہا کہ ابا جان یاد فرماتے ہیں برجیس نے ایک لمحہ خاموش رہ کر جواب دیا کہ "اچھا چلو آتی ہوں"۔

مغلانی کے چلے جانے کے بعد میاں بیوی پھر گفتگو کرنے لگے کہ دیکھو کس قدر ناخلف لڑکی ہے شوہر سے لڑکر چلی آئی اور کچھ خاندان کی ناک کٹنے کا بھی خیال نہ کیا۔ اگر خدانخواستہ کسی کو ان باتوں کی خبر ہوجائے تو کس قدر بدنامی ہو۔ اس نے تو بالکل انگلش لیڈیوں کا شیوہ اختیار کرلیا ہے کہ جہاں ذرا سی بات میاں بیوی میں ہوئی۔ بس فوراً آپس میں نااتفاقی ہوگئی اور دونوں طرف سے نفرت و حقارت کا اظہار ہونے لگا۔"

اتنی ہی باتیں ہوئی تھیں کہ برجیس آداب کرتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی والدین نے جواب سلام دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا جب برجیس کرسی پر بیٹھ گئی تو ڈپٹی صاحب نے یوں سلسلۂ کلام جاری کیا۔

"بیٹی برجیس! دشمنوں کی طبیعت تو اچھی ہے چہرہ اترا ہوا کیوں ہے خیریت تو ہے؟"

"جی ہاں! آپ لوگوں کی دعا اور اللہ کا احسان ہے۔ محض سر میں درد کی شکایت ہے اور بس"۔ برجیس نے جواب دیا۔

"تو سر میں تیل کیوں نہ مالش کرا ڈالا؟"

"شام کو غسل کرکے مالش کراؤنگی!"

"ہاں بیٹی! تم آج گرانٹ روڈ سے بغیر اطلاع دیئے کیوں چلی آئیں"؟

برجیس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیوں بولتیں کیوں نہیں؟ کیا سلمان نے کچھ کہا تھا؟"

برجیس اس پر بھی خاموش رہی۔

"بولو، مجھ سے کہنے میں کیا حرج ہے۔ سلمان نے کس بات پر ڈانٹا تھا۔"

اب برجیس بولی۔" یہی سیر و تفریح پر! اور کس پر۔ وہ کہتے ہیں سیر و تفریح کی کوئی ضرورت نہیں ہے چپ چاپ گھر میں رہو اور اگر گھر میں نہیں رہ سکتی ہو تو میرے یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے تم جیسی عورت کی ضرورت نہیں ہے اور بہت سے بیہودہ الفاظ بھی کہے جو میری قوت برداشت سے باہر تھے"۔

"اے بیوقوف تو کیا وہ غلط کہتے تھے۔ اگر انھوں نے روزانہ بے نقاب و چادر باہر نکلنے سے منع کیا تو کیا برا کیا۔ کہیں شریف لڑکیاں بھی باہر نکلتی ہیں تم خود سوچو کہ تمھارے خاندان میں آج تک کسی نے ایسا کیا ہے۔ تم کو تو صرف تعلیم کے زمانہ تک باہر نکلنے دیا گیا نہ کہ شادی کے بعد بھی اور اس پر تم سخت و سست کہہ کر چلی آئیں۔ تم بھی عجب بیوقوف ہو۔ جاؤ ان سے جاکر معافی مانگو کیا تمھیں معلوم نہیں کہ شوہر عورتوں کا مجازی خدا ہوتا ہے۔ تم تو ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہو سمجھانے کی کیا ضرورت ہے اگر ایک ذرا انھوں نے ڈانٹا تو کیا بیجا کیا عورتوں کو شوہر کی فرمانبرداری کرنی چاہیئے نہ کہ لڑائی ـــ شام کو ضیاء کے ہمراہ چلی جاؤ گی؟"

"جی نہیں، میں تو اب وہاں جانے کی نہیں مجھے طلاق ہوجائے پروا نہیں لیکن اب میں اس گھر کا منہ نہ دیکھونگی۔ (رو کر) جس نے میری اتنی توہین کی اس کے یہاں جاؤں اور معافی مانگوں۔ ابا مجھ سے یہ کبھی نہ ہوگا آپ لوگ مجھے زیادہ مجبور نہ کریں ورنہ میں خودکشی کرلونگی"۔

بیگم صاحبہ اس پر بولیں۔ "ارے دیوانی یہ کیا بکتی ہے۔ نوج کہیں شریف لڑکیاں بھی ایسے الفاظ زبان سے نکالتی ہیں۔ شیطان کے کان بہرے نہ معلوم تیرے دماغ کو کیا ہوگیا ہے جو اس طرح کی بکواس کررہی ہے"۔

"دیکھیے اماں! بس اب کچھ نہ کہئے!"

"پاگل! تو کیا تو اپنے خاندان کی ناک کٹوائیگی اور ہمیں رسوا کریگی۔

وہاں نہ جائیگی تو کیا کریگی - وہ تیرا سسرال ہے - کہیں شوہر سے بھی شریف لڑکیاں علیٰحدہ ہوتی ہیں - کچھ میرا کہنا بھی تو کرو - اچھا جا کر نہیں تو صرف ایک معافی نامہ لکھ کر بھیجدو اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر کردو کہ میں دو ایک روز میں آجاؤنگی - جاؤ بیٹی میری اتنی سی بات جا کر کردو۔"

"نہیں آبا! آپ ضد نہ کریں مجھ سے یہ نہیں ہونے کا۔"

اس کے والدین نے ہزار سمجھایا لیکن وہ اپنی نہیں شے سے باز نہیں آئی اور جب ان لوگوں نے زیادہ اصرار کرنا شروع کیا تو وہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی اور جو خط قبل سے لکھ رہی تھی اس کو مکمل کیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

ڈیر فرخ!

آج آٹھ بجے شب کو تم دفتر میں میرا انتظار کرنا - تمہیں آج بمبئی کو خیرباد لہہ رہی ہوں اور تم کو بھی میری تقلید کے لئے تیار رہنا چاہیئے - باقی بوقت ملاقات

تمہاری اور صرف تمہاری

برجیس

خط کو لفافہ میں بند کرکے اپنی خاص ماما کو دیا جو اس کے رازوں سے آگاہ تھی اور کہا کہ جلد اسے فرخ کو پہونچا آؤ - اس کے جانے کے بعد اس نے کچھ نقد اور طلائی زیورات ایک چھوٹے سے بکس میں بند کئے اور اس کو پائین باغ کے ایک گوشے میں چھپا آئی - آٹھ بجے رات کو حویلی سے نکل کر پائین باغ میں پہونچی اور بکس لے کر فرخ کے دفتر کا رخ کیا - تھوڑی دیر بعد دونوں ایک بند کار میں بیٹھ کر وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پہونچے اور ۱۰ بجے کی گاڑی سے دہلی روانہ ہوگئے۔

(۶)

آج گول پٹیا کے کروَن سینما میں بہت چہل پہل نظر آرہی ہے - اول تو آج اتوار کا دن ہے اس لئے افسر سڑک پر نظر آرہے ہیں - دوسرے ایک مشہور فلمی رقاصہ یہاں وارد ہوئی ہے جس کے اشتیاق دید میں لوگ جوق در جوق چاروں طرف سے سمٹے چلے آرہے ہیں - سینما ہال دلہن کی طرح سجا ہوا ہے ہر جگہ بجلی کے رنگ برنگ قمقموں کے ذریعہ خوش آمدید وغیرہ لکھا گیا ہے - جو سینما ہال کے حسن کو دوبالا کر رہا ہے - موٹر پر موٹر چلی آرہی ہے - دیکھئے

اس موٹر سے جو لوگ اتر رہے ہیں۔ کل اعلیٰ افسران ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا مسٹر ضیا حیدر بھی ہیں۔ ان لوگوں نے جگہ قبل ہی سے محفوظ کرالی تھی۔ اس لئے بغیر ٹکٹ خریدے بکس پر جا بیٹھے۔ اندر بھی ہال قسم قسم کے قمقموں اور تصویروں سے آراستہ ہے اور تمام ہال برقی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ بمبئی کے گوشے گوشے سے حسن کھینچکر اس جگہ جمع ہو رہا ہے اور سارا ہال مختلف النوع خوشبوؤں سے مہک رہا ہے اور ہر آنے والے شخص کو اس سیلاب رنگ و تعطر اور طوفان حسن و نور کو عبور کئے بغیر اپنی نشست پر پہونچنا محال تھا۔ دوسری گھنٹی ہو چکی ہے تیسری کا انتظار ہو رہا ہے کہ ٹن ٹن کی آواز کے ساتھ ہال کی کل روشنیاں گل ہو گئیں اور تماشہ شروع ہو گیا۔

آج کا کھیل ساگر فلم کمپنی کا مشہور و معروف تماشہ "زرینہ" تھا جس کے ہیرو مسٹر جال مرچنٹ اور ہیروئن مس زبیدہ تھیں۔ تماشہ کے دو ریل کے بعد ہال کے کل قمقمے جگمگا اٹھے اور سٹیج کے دائیں جانب سے گھونگھروں کی چھما چھم کی آواز سنائی دینے لگی۔ معاً ایک حسینہ اپنے ان تمام رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جو سٹیج پر اسے آسمانی دیوی بناکر پیش کر رہی تھی دونوں ہاتھوں سے رومال کا کونا پکڑے سرنگ اٹھائے چھم چھم کرتی نمودار ہوئی اس کے سٹیج پر پہونچتے ہی ہال میں بالکل خاموشی چھا گئی اور تمام لوگوں کی نظریں حسینہ کی برق پاش کیفیتوں اور بے باک تبسموں، جانفزا و حیات بخش اثرات میں جذب ہو کر رہ گئیں۔ اس کے ایک ایک عضو سے پھٹ پڑنے والا شباب معلوم ہوتا تھا کہ دینا سے آثار حیات مٹا کر رہیگی۔ تھوڑی دیر تک وہ حسینہ مختلف حرکات و سکنات اور عشوہ و انداز دکھا دکھا کر تماشائیوں کو محظوظ کرتی رہی اور جب گھونگھروؤں میں ساز کے ساتھ جنبش پیدا کرنے لگی تو ایسا معلوم ہوا کہ کائنات کی ہر شے میں تھرتھری پیدا ہو گئی گویا اب سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائیگا پورا ہال بیکسی سے معمور ہو گیا اور ہر دیکھنے والے کی روح اس لرزش سے بیتاب وہ آگے بڑھی لیکن چاندنی کی طرح غیر معلوم طریقے پر۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ سر پر اور بایاں کمر پر رکھ کر اپنی لانبی گردن میں ایک خفیف سا متکبرانہ خم سر میں ہلکی سی مغرورانہ جنبش، آنکھوں میں ایک شاہانہ استغنا ظاہر کر دینے والی نیم خوابانہ کیفیت پیدا کرکے اہل ہال کے صبر و ضبط کا امتحان لیتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ ابروؤں سے خنجر چلاتی ہوئی ایک مغرورانہ تبسم کے ساتھ مور کی طرح تھرکتی ہوئی اندر گھس گئی۔ یک بیک ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور پھر باہر آکر اپنے سر کو جھکا کر ایک مخصوص تبسم کے ساتھ جو صرف نوجوانوں ہی کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ پردہ کے پیچھے غایب ہو گئی اور ہال میں پھر اندھیرا ہو گیا اور تماشہ کا تیسرا ریل شروع ہو گیا۔

نصف تماشہ کے بعد وہ حسینہ پھر انگریزی لباس پہن کر ایک مرد کے ساتھ ظاہر ہوئی جو بالکل انگریزی لباس میں ملبوس تھا اور تھوڑی دیر تک دونوں انگریزی رقص کا کمال دکھاتے رہے۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو یہ دونوں صورتیں پہچانی ہوئی ہیں۔ انکی صورتیں فرخ اور برجیس سے بالکل ملتی جلتی ہیں اور کیا عجب ہے کہ یہ دونوں وہی ہوں۔ لیکن برجیس میں پہلے اتنے عشوہ و غمزے نہ تھے گو خوبصورت اس وقت سے بھی زیادہ تھی اور اس وقت بھی حسین ہے لیکن مصنوعی ناز و انداز بڑھا ہوا ہے یعنی یہ دونوں برجیس اور فرخ ہی ہیں۔ مسٹر ضیا حیدر بھی نظریں نیچی کئے ہوئے دریائے فکر میں غوطہ زن ہیں اور چہرے سے غم و نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ آنکھیں مارے غصہ کے شعلہ کی طرح چمک رہی ہیں۔ رہ رہ کر پیچ و تاب کھاتے ہیں یقینی انھوں نے بھی ان دونوں کو پہچان لیا ہے۔ لیجیے تماشہ ختم ہو گیا اور مسٹر ضیا حیدر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔

(۷)

برجیس بمبئی کو خیرباد کہنے کے بعد دہلی چلی گئی تھی اور وہاں جاکر ان دونوں نے "دہلی فلمز لمیٹڈ" میں ملازمت کر لی۔ تھوڑے ہی دنوں میں برجیس "ملکہ رقص" ہو گئی کیونکہ پہلے ہی اس نے کافی مہارت پیدا کر لی تھی اور اس وقت وہ ایک مایہ ناز ممثلہ تھی لیکن نہ معلوم کیوں اس کا جی فلمی زندگی سے اکتا گیا۔ اور سینما کے اسٹیجوں پر ڈانس کرنے کے شوق نے اس کو گدگدایا اور وہ ایک سال کے قریب ملازم رہ کر استعفا دیکر دہلی سے چلتی بنی اور یہاں آکر پہلی مرتبہ اس نے سٹیج پر اپنے رقص کے کمالات دکھلائے۔

(۸)

مکان پہونچتے ہی مسٹر ضیا جلدی سے اپنے کمرہ میں گھسے اور میز کی دراز سے کوئی چیز نکال کر پھر گول پٹیا پہونچے۔ چلے یہ "ٹینی شو" دیکھنے گئے تھے جو ساڑھے پانچ بجے ختم ہو گیا تھا اور پھر دوسرا شو ساڑھے چھ بجے شروع ہونے والا تھا۔ انھوں نے ڈرائیور کو روپیہ نکال کر دیا اور کہا کہ ایک ٹکٹ معمولی درجہ کا لے آؤ۔ جب وہ ٹکٹ لیکر واپس آیا تو انھوں نے اس کو

تاکہ کی وہ موٹر اسٹارٹ رکھے اور خود تیسری گھنٹی ہوتے ہی ہال میں گھس گئے حسب دستور دو ریل کے بعد ہال روشنیوں سے بقعہ نور بن گیا اور رنگ برنگ کی روشنیاں برجیس اور فرخ کے اوپر پڑنے لگیں برجیس اس وقت فرخ کے ساتھ فرانسیسی رقص میں مشغول تھی اور تمام تماشائی لطف اندوز ہو رہے تھے کہ برجیس نے فرخ کے سینے سے اپنے سینے کو ملا دیا اور جوں ہی فرخ نے اپنا ہونٹ اس کے لبوں سے مس کرنا چاہا کہ تڑا تڑ چار فیر ہوئے

اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے ایک آہ کے ساتھ دھڑ سے گر پڑے اور تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔

ان کے گرتے ہی ہال میں ایک واویلا مچ گیا لیکن باوجود تلاش وجستجو کے قاتل کا سراغ نہیں ملا۔

"کیوپڈ"

تخیلات

مولانا شبیر مارہروی

میرا دماغ میری سلطنت ہے جس میں طرح طرح کی مسرتیں مصروف رقص ہیں ....

میں بھی بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے دماغی مشیر مجھے اس کوشش سے روکتے ہیں۔

میں قانع ہوں۔ قناعت میرا اصول ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کی خواہش نہیں جو میرے لئے کافی ہو۔ میرا دماغ اور میرے تخیلات میری تمام ضرورتیں مہیا کرتے ہیں۔ اس طرح دیکھو میں ایک اولوالعزم بادشاہ کی طرح زبردست فاتح ہوں۔

میری آنکھیں روز دیکھتی ہیں کہ تیزی سے اوپر چڑھنے والا فوراً اور جلد نیچے گرتا ہے میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ خاموشی سے محنت کرنے والا اور رشک و حسد سے پاک رہنے والا بالآخر عروج پر پہونچتا ہے۔ میں دوسروں کے نقصان پر نہیں ہنستا ہوں؛ اوروں کے منافع پر حاسدانہ نگاہیں نہیں ڈالتا دنیوی سمندر کی کوئی لہر میرے دماغ میں تلاطم پیدا نہیں کر سکتی۔ میرا دماغ کہتا ہے کہ یہ تکلیف دہ تخیلات دوسروں کے لئے ہیں .... میرا نہ کوئی دشمن ہے نہ دوست۔ میں نہ موت سے ڈرتا ہوں، نہ اپنے خاتمہ سے

بعضوں کے پاس بہت کچھ ہے مگر ان کے حریص ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس خواہ دولت دنیوی کے کتنے ہی انبار ہوں لیکن میں انھیں، غریب کہونگا۔ میرے پاس گو کچھ نہیں لیکن میں امیر ہوں .... وہ غریب میں امیر، وہ دندان آز تیز کرتے ہیں میں داد و دہش سے کام لیتا ہوں وہ ضرورتمند رہتے ہیں میں دوسروں کی ضرورت پوری کرتا رہتا ہوں۔ وہ جل جل کر تنگ ہوتے ہیں اور میں خوشی خوشی اپنی زندگی بسر کرتا ہوں۔

میں خواہش کرتا ہوں لیکن اس چیز کی جس کو میرا دماغ مہیا کر سکے۔ میں زمین سے نکلی ہوئی دھاتوں کے خزانے نہیں چاہتا۔ میں پہاڑی پر چڑھنے کا خواہشمند نہیں۔ مجھے میدان پسند ہے۔ میں طوفان کے وقت ساحل پر بیٹھ جاتا ہوں اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو بیکار ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ وہ چیز حاصل کرنے کے لئے جو پھر ضائع ہو جائیگی ....

میرا اعتقاد یہی ہے۔ ــــ لیکن کیوں؟

میں محسوس کرتا ہوں کہ ساکت و ہموار دماغ کا مقابلہ دنیا کی کوئی دولت نہیں کر سکتی

شبیر مارہروی

اعجاز بیان

از جناب سعید احمد صاحب اعجاز

کیا کہئے شباب اُن کا اب کیا نظر آتا ہے
اک جام چھلکتا ہے بادہ نظر آتا ہے

کیا بعد مرے ہائے میخانہ کی حالت ہے
اک کونے میں اک ٹوٹا شیشہ نظر آتا ہے

پہلو میں وہ بیٹھے ہیں سینے سے وہ لپٹے ہیں
کیا حسنِ تصوّر ہے کیا کیا نظر آتا ہے

مجھ سے نہ چھپاؤ تم ہوگا یہ کسی کا دِل،
جو کاکلِ مشکیں میں شانہ نظر آتا ہے

فطرت کے پسِ پردہ اس دیدۂ بینا کو
اک شاہدِ رنگیں کا جلوہ نظر آتا ہے

سرمستِ نظارہ ہے دل اس کے حرم کے پاس
پر چشمِ مظاہر کو پردہ نظر آتا ہے

پھر فصلِ بہار آئی، ہر غنچہ سبوچہ ہے
ہر موجۂ بوئے گل صہبا نظر آتا ہے

بکھری ہے ثریّا تک سرمستی و سرشاری
یہ گنبدِ مینائی مینا نظر آتا ہے

اعجاز یہ میخانہ مدت سے تھا ویرانہ
پھر آج ترے دم سے شیشہ نظر آتا ہے

موسیقی

تحریک عدم تعاون اگرچہ ظاہر میں لوگوں کو ناکام معلوم ہوتی ہو مگر نکتہ رس اور منصف دل رکھنے والے اس امر میں متفق ہیں کہ ہندوستان کی معاشرت کا ہر ہر شعبہ اس تحریک کا زیر بار احسان اور مرہون منت ہے اس تحریک نے جو کچھ بھی گہرے اثرات سیاسیات اور اقتصادیات پر چھوڑے ہوں ان پر اس وقت روشنی ڈالنا مقصود نہیں۔ سب سے زیادہ قیمتی اور نادر شے جو ہم کو اس سے حاصل ہوئی وہ احساس قومیت اور خودداری ہے، واقعی یہی وہ اکسیر اعظم ہے جس کو ہمارے قبضہ میں آتے دیکھ کر خود غرض اغیار ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ صرف یہی وہ جذبہ تھا جس نے ہم کو اپنے ملک کے علوم وفنون سے ایک صدی کی کامل بے توجہی اور لاپروائی کے بعد پھر مانوس کرنا شروع کیا ہے۔ گذشتہ دس سال کی سرگذشت پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان ایک مسلسل صدسالہ خواب غفلت کے بعد بیدار ہوتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ملک میں جابجا اس امر کی کوششیں جاری ہیں لہ ہندوستانی فنون لطیفہ کو ترویج دی جائے۔ زمانہ موجودہ میں نقاشی اور موسیقی کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ جس کا بین ثبوت مختلف گوشہائے لک میں کانفرنسوں اور جلسوں کے انعقاد سے مل سکتا ہے۔

یوں تو فنون لطیفہ کا کوئی شعبہ دلچسپی سے خالی نہیں لیکن زیادہ لفریب اور لطف اندوز موسیقی کو کہا جائیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے اس لہ کے ساتھ ناقدری اور بے توجہی کا پورا ثبوت دیا ہے لیکن اس نے مخلوق خدا ہ ایک طبقہ کو روزی پہونچانا اپنے ذمہ لے لیا اور عرصہ تک اس خدمت کو خوش لوبی سے انجام دیتا رہا۔

ہم ماہرین کے ساتھ اس قول میں ہم آواز ہیں کہ موسیقیت سے لم کی کوئی صدا خالی نہیں اور یہ کہ خلقت عالم سے لے کر اس وقت تک کوئی نہ اس علم کی نواسنجی سے خالی نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو علمیت کے لباس سے کس نے اور کس وقت ملبوس کیا؟ اس معاملہ میں محققین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ اس کی ابتدا حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ہوئی اور اس اہم ترین فرض کی انجام دہی حکیم فیثاغورث کے حصّہ میں آئی۔ بعض کا قول ہے کہ انسان نے اس علم کو ققنس سے اخذ کیا ہے۔ اس پرند کی خصوصیات میں بہت کچھ نواسنجی کی گئی ہے چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی منقار میں ہزار سوراخ ہوتے ہیں اور جب یہ چہچہانے کا قصد کرتا ہے تو ان سوراخوں میں سے ہوا گذرتی ہے اور صدہا قسم کی رنگین صداؤں سے فضائے عالم معمور ہو جاتی ہے۔ اس کی عمر کے متعلق ان لوگوں کا اندازہ ہے کہ یہ ہزار سال تک زندہ رہتا ہے۔ اس کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ تنہا راہبانہ زندگی بسر کرنا گوارہ لیکن حصول مقصد کے لئے کسی، دوسرے کے سامنے جبین نیاز گھسنا منظور نہیں۔ یہاں تک کہ اس کا جوڑ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں بقائے نسل کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی عمر طبعی کو پہونچتا ہے تو چند تنکے اور خشک لکڑیاں جمع کرکے اپنا مزار تیار کرتا ہے اور اس میں بیٹھ کر منقار کے سوراخوں سے آواز نکالتا ہے۔ چنانچہ فرداً فرداً ہر سوراخ سے ایک ترانہ پیدا ہوتا ہے۔ جب دیپک راگ کی باری آتی ہے تو یہ تنکے سلگ اٹھتے ہیں اور ققنس خوش الحانی کرتے کرتے اسی میں جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ اس سانحہ کے بعد پہلی بارش اس خاک کو ایک انڈے کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے کچھ عرصے کے بعد ایک پرند اسی نوع کا اس انڈے سے برآمد ہوتا ہے جو اپنے متقدمین کی تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لیتا ہے اہل فارس اس پرند کو آتش زن اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔

متذکرہ بالا نظریوں کو جانچ کرنے میں اگر تاریخ سے مدد لی جائے تو اول الذکر زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مورخین اس بارے میں متفق ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السّلام کے زمانے میں (ایکہزار چودہ سال قبل مسیح)

غنا کا بڑا چرچا تھا۔ بنی اسرائیل میں بڑے خوش الحان لوگ موجود تھے اور ان کو اس کمال پر ناز تھا۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام کو خوش الحانی بدرجہ اتم بارگاہ رب العزت سے بطور معجزہ عنایت ہوئی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جب آپ آیات زبور کی تلاوت فرماتے تھے تو انسانوں کا کیا ذکر چرند و پرند تک مسحور ہو جاتے اور قاری مقدس کے گرد آ کر جمع ہو جاتے تھے۔ آپ کے زمانے میں موسیقی کو اس قدر عروج ہوا کہ حمد و مناجات کا ذریعہ قرار پائی۔ ان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام پسر جناب داؤد مبعوث برسالت ہوئے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ علم و حکمت کے بڑے شایق اور مربی تھے اور بڑی عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا تھے لہذا کیا عجب ہے کہ حکیم فیثا غورث نے جو آپ کا ہمعصر تھا اسی زمانہ میں علم موسیقی کے اجزائے پریشان کو مرتب کیا ہو۔

دوسرے نظریہ کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ شاید ققنس محققین کی جدت طبع کا مخلوق معلوم ہوتا ہے۔ ماہرین علم الحیوانات باوجود اپنی سرگرم کوششوں کے اس کا سراغ لگانے سے قاصر ہیں۔ شاید یہ پرند بھی حضرت سلیمان کے ہدہد کی صنف کا ہو جس کے متعلق اب کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام کسی پرند کا نہ تھا بلکہ اُس شخص کو کہتے تھے جس کو سلیمانؑ کی وسیع سلطنت کا قلمدان وزارت تفویض ہوا تھا۔

بہرحال اس فن کا موجد حضرت انسان کو قرار دیا جائے یا ققنس کو دیکھنا صرف یہ ہے کہ ہندوستانی موسیقی کو ماہرین نے کیونکر منظم کیا ہے۔ ہند کے لوگ آواز کو سر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور سر کو آواز کے اتار چڑھاؤ کی مناسبت سے ۷ قسموں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۱) سرپا کھوب (۲) رکھب (۳) گندھار (۴) مدھم (۵) پنچم (۶) دیھوت (۷) نکھاد۔

ان الفاظ میں اول چار لفظوں کا سر حرف لے کر "سرگم" بناتے ہیں اور ان سب کو بنظر سہولت سرگم کہتے ہیں۔ سروں کی تقسیم راگوں پر کی گئی ہے اور راگ کو راگنی پر تقسیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر سُر میں متذکرہ بالا چھ راگ ہوتے ہیں۔

(۱) مالکونس راگ (۲) ہنڈل راگ (۳) دیپک راگ (۴) میگھ راگ (۵) بھیروں راگ (۶) سری راگ،

اور ہر راگ میں چھ مختلف راگنیاں ہوتی ہیں جن کو ذیل میں بہ تفصیل درج کیا جاتا ہے۔

راگ	راگنیاں
(۱) مالکونس راگ	(۱) باگیسری (۲) گوری (۳) دیسی (۴) سوہا (۵) کھری (۶) ملتانی۔
(۲) ہنڈول راگ	(۱) پوربا (۲) بسنت (۳) للت (۴) پنچم (۵) دھناسری (۶) مارواہ۔
(۳) دیپک راگ	(۱) چھایانٹ (۲) ہمیر (۳) کلیان، (۴) کدارا (۵) بہاگ (۶) رمین۔
(۴) میگھ راگ	(۱) مدمات (۲) گونڈ (۳) سدارنگ (۴) بڈہنس (۵) ساونت (۶) سورٹھ۔
(۵) بھیروں راگ	(۱) بھیرویں (۲) رام کلی (۳) گوجری (۴) کہٹ (۵) گندھاری (۶) اساوری
(۶) سری راگ	(۱) گدری (۲) پوربی (۳) گدر، (۴) تروَن (۵) مالسری (۶) سری جیت

بعض لوگ متذکرہ بالا تقسیم میں کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ راگنیاں ۳۶ نہیں صرف تیس ۳۰ ہیں چنانچہ ان کے نزدیک ہر راگ میں بجائے چھ کے ۵ راگنیاں ہوتی ہیں۔ وہ ایک تقسیم کو ایک درجہ اور بڑھاتے ہیں اور ہر راگ میں آٹھ آٹھ پتر کے بھی قائل ہیں۔ پتر کی کل تعداد ۴۸ ہے پتر بھا رجا پر منقسم ہیں جن کا شمار کرنا آسان نہیں۔

بلحاظ وقت راگنیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک کو سنکرن کہتے ہیں اور دوسری سالنگ کہی جاتی ہے۔ سنکرن ایسی مخصوص راگنیاں ہیں جو اپنے راگ کے مخصوص وقت پر گائی جاتی ہیں۔ ورنہ وہ لطف اور سوز حاصل نہیں ہوتا۔ سالنگ وہ راگنیاں ہیں جن کے لئے کسی وقت کی تخصیص نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر موسم میں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ماہرین فن نے مختلف راگ اور راگنیوں کا تعین وقت اس طرح کیا ہے۔

(۱) مالکونس راگ

اس راگ کی فصل ماہ پھاگن ہے جو انگریزی مہینوں جنوری اور فروری سے مطابق ہوتا ہے۔ طلوع آفتاب سے ایک پہر دن تک اس کے گانے کا مخصوص وقت ہوتا ہے اس راگ کی سنکرن اور سالنگ حسب ذیل ہیں۔

سینکرن ۔ (۱) گوجری (۲) بلدولی (۳) ٹوری (۴) مالسری (۵)
اساورن ۔

سالنگ ۔ (۱) الیا (۲) مکال (۳) گندہاری (۴) کلیان
(۵) ایمن (۶) بنگالی (۷) پٹ منجری (۸) بیر ٹھہ

(۲) ہنڈول راگ

موسم بہار جیسا کہ اس کے لئے مخصوص زمانہ ہے جو انگریزی
مہینوں میں (مارچ ۔ اپریل) کے مطابق ہوگا ۔ اس کے گانے کا وقت ایک
پہر دن چڑھے سے دوپہر تک ہے ۔

سینکرن ۔ (۱) للت (۲) بسنت (۳) بھیم پلاسی (۴) دیسکار
(۵) لنتھاوتی ۔

سالنگ (۱) پنچم (۲) دھول (۳) بدہنس (۴) بھوپالی ۔
(۵) سیام (۶) جنت سری (۷) پرج (۸) ٹہیار ۔

(۳) دیپک راگ

اس راگ کے گانے کا خاص زمانہ جیٹھ اساڑھ (مئی ، ورجون)
ہے اس کے گانے کا معین وقت دوپہر سے پہر دن باقی رہے تک ہے ۔

سینکرن ۔ (۱) سارنگ (۲) دیوگری (۳) کافی (۴) نٹ
(۵) گور سارنگ ۔

سالنگ ۔ (۱) کیدارا (۲) شگل (۳) کوکب (۴) مدہاوہ ۔
(۵) پوریا (۶) بردی (۷) کہارچ (۸) کلد یکی ۔

(۴) میگھ راگ

ساون بھادوں (جولائی ۔ اگست) اس کے گانے کا خاص زمانہ ہے
اس راگ کا مخصوص وقت تو نصف شب سے صبح کاذب تک ہے لیکن
اگر بارش ہوتی ہو تو دن گذرنے کے بعد سے تمام رات گایا جا سکتا ہے ۔

سینکرن ۔ (۱) ملہار (۲) جھنجوٹی (۳) کانرا (۴) سورٹھہ ۔
(۵) سنکرابھرن ۔

سالنگ (۱) کودھ (۲) اڈانا (۳) گونڈ (۴) بھاگ
(۵) جھنجوٹی (۶) کلاپرین (۷) سانونت (۸) ملہاری

(۵) بھیرول راگ

اس راگ کی فصل کنوار کاتک (ستمبر۔ اکتوبر) ہے وقت گانے کا دو گھنٹے رات رہے سے صبح تک ہے۔ یہ راگ مشہور بہت ہے۔

سنگرن ۔۔۔ (۱) کھٹ راگنی (۲) رام کلی (۳) دیوگندہار (۴) بھیاس (۵) بلدول۔

سالنگ ۔۔۔ (۱) سوہو (۲) کھٹ سار (۳) جوار سنگ (۴) دیوسا (۵) سنکرن (۶) سودھ (۷) ہیر (۸) بھیروی

۶۔ سری راگ

اس کی فصل اگھن پوس (نومبر دسمبر) ہے اس گانے کا وقت پہر دن رہے سے شام تک ہے۔

سنکرن ۔۔۔ (۱) دھناسری (۲) ٹنک (۳) پوربی (۴) گوری (۵) ککلی۔

سالنگ ۔۔۔ (۱) سرپوں (۲) مالی گودا (۳) ترون (۴) ہراج ہنس (۵) مروا (۶) بچھڑا (۷) مالوار (۸) اگرنت بہاری

اس تقسیم کے ختم کرنے کے لئے بھار جا اور باقی رہے۔ ماہرین ان کا تمام کرنے سے قاصر ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کو بھی منضبط کرنے کی کوشش کی لیکن یہاں ان کا تذکرہ بہ سبب طوالت بے محل معلوم ہوتا ہے اس کے لئے مبسوط کتابوں کے ورق زیادہ مناسب ہونگے۔

قبل اس کے کہ ہم اس مضمون کو ختم کریں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً تال کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ اس لئے کہ ساز موسیقی کا جزو اعظم ہے اور بغیر اس کے زندہ جادو ہونے کی صفت اس پر چسپاں نہیں ہوتی۔

"تال" ۱۲ قسم کی ہوتی ہیں (۱) جلد اکتالہ (۲) تال ہوتی یا دھیما تالہ (۳) تال سہ ایک اس کو دو ضربہ بھی کہتے ہیں (۴) جلد تالہ یا ترستھا (۵) تال سہ ضرب (اس کی آواز جلد تالہ اور دھیمے تالہ کے درمیان ہوتی ہے)۔ (۶) دھیما تالہ (۷) یتوروا (۸) سورفاختہ (۹) جھپ تالہ (۱۰) چوتالہ (۱۱) آڑا چوتالہ (۱۲) تال سواری (اس کو لوگ چپ لگن بھی کہتے ہیں)۔

یہ ہیں سُر اور تال کی غیر محدود اقسام جو ماہرین موسیقی نے وضع کی ہیں۔ جو لوگ اس علم کی مختلف شاخوں سے نابلد ہیں وہ ان راگنیوں کے غیر محسوس فرق کو ذرا مشکل سے معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا جانے کہ ان تمام متذکرہ بالا راگنیوں کا بھی ماہر کوئی مثل تان سین وغیرہ آج کل موجود ہے یا نہیں؟ (ماخوذ از انگریزی)

نوٹ ہر قسم کی لکھائی چھپائی۔ عمدہ۔ بارعایت اور حسب منشا کرانے کیلئے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور کی خدمات حاصل کریں۔ (مینجر)

غزل

از جناب خان جمیل نعمانی رامپوری

نہیں کہ واقفِ ایمائے چشمِ ناز نہیں
مگر فسانۂ غم بھی تو کچھ دراز نہیں

یہی ہے ہوش تو بس کامیابیاں معلوم
کہ پیرہن بھی ابھی تک جنوں نواز نہیں

بہ لطف خاص جو دیوانہ بن گیا ہوں میں
وہ جانتے ہیں کہ کچھ اس کو امتیاز نہیں

یہ بتکدہ ہے یہ کعبہ ہے ہمنشین لیکن
مجھے جو یاد ہے وہ جلوہ گاہ ناز نہیں

گذر گیا ہوں حجابات عارضی سے جمیل
مجھے بہار و خزاں کا اب امتیاز نہیں

غزل

از جناب نثار فیروز آبادی

تغافل پسندی سے باز آئیے گا ۔۔۔ نہ تڑپائیگا نہ تڑپائیے گا
جو کل کی طرح سے نہ آج آئیے گا ۔۔۔ تو پھر مجھکو زندہ نہیں پائیے گا
محبّت کی تکمیل ہے غیر فانی ۔۔۔ میں دیکھوں کہانتک ستم ڈھائیے گا
وہی ہر طرف ہے محبّت کا رونا ۔۔۔ جہاں جائیے گا جدھر جائیے گا
ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمھاری ۔۔۔ نہ شرمائیے گا نہ شرمائیے گا
یہ دعوٰی ہے مشقِ تصوّر کا میرے ۔۔۔ جہاں جائیے گا نظر آئیے گا
نہ رکھو مقابل میں آئینہ دیکھو ۔۔۔ تحیّر کے عالم میں رہ جائیے گا
کوئی دم کا مہماں ہے بیمارِ الفت ۔۔۔ جواب بھی نہ آئے تو پچھتائیے گا

بُھلا دو گے جتنا نثارِ حزیں کو
اُسے آپ اتنے ہی یاد آئیے گا

قاتل

اپنی نوعیت کا نرالا افسانہ!

ہندوستان میں اس فلم سے پہلے ایسا خوفناک اور بھیانک فلم تیار نہیں کیا گیا تھا۔ فلم سٹار کمپنی کی بھی یہ پہلی کوشش تھی جسے کامیاب کہا جا سکتا تھا۔ اس فلم میں ہندوستان کا مشہور و معروف اداکار مسٹر پرتاپ نے بہرام کا پارٹ کیا تھا۔ بہرام نے اپنے رقیب سہراب کو تاریک شب میں اس بیدردی اور ظالمانہ طریقہ سے قتل کیا کہ اسے دیکھ کر سنگدل سے سنگدل انسان کا دل بھی دہل جاتا تھا۔ بہرام تنگ و تاریک گلی میں خوفناک صورت بنا کر سہراب پر جھپٹتا ہے اور اس کے گلے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اس قدر طاقت سے دباتا ہے کہ اس کی انگلیاں سہراب کے گلے میں دھنس جاتی ہیں۔ ایک چیخ سنائی دیتی ہے اور اس کے بعد اس کی آنکھیں باہر کی طرف اُبھر آتی ہیں۔ زبان باہر نکل آتی ہے۔ بہرام اس کے گلے کو اپنی پوری قوت سے گھونٹتا ہی جاتا ہے اُس کی بڑی بڑی آنکھیں پریشان بال اور بھیانک صورت دیکھتے ہی خوف طاری ہو جاتا ہے۔

مسٹر پرتاپ نے قاتل کے پارٹ کو اس عمدگی سے ادا کیا کہ خود ڈائرکٹر نے کہا کہ ایسا خوفناک اور بھیانک پارٹ ادا کرنا پرتاپ ہی کا کام تھا اور یہ اس کا بہترین اور کامیاب فلم ہے حالانکہ پرتاپ حقیقت میں انتہائی رحم دل ہے اور ساتھ نازک مزاج مگر اس فلم میں بہرام کا پارٹ ادا کر کے پرتاپ نے اپنی اداکاری کا کمال ظاہر کیا ہے۔ اگر یہ فلم بھی ہمارے ملک میں کامیاب نہ ہوا تو اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے۔ ڈائرکٹر کا کہنا درست ثابت ہوا فلم کی تعریف ملک کے تمام اخبارات و رسائل نے کی۔

جس وقت یہ فلم سینما ہال میں دکھایا جاتا لوگ خوفزدہ دم بخود رہ جاتے عورتیں چیخ چیخ کر ہال سے باہر نکل جاتیں۔ کئی تو خوف کے مارے غش کھا جاتیں ملک کے گوشہ گوشہ میں جہاں یہ فلم دکھایا گیا یہی حالت ہوئی۔ لوگ سینما ہال سے نکلتے ہوئے کہتے۔ "کس قدر ہولناک فلم ہے۔" جو رات کو فلم دیکھ کر سوتے وہ سوتے سوتے چیخ مار کر جاگ اُٹھتے۔ لوگوں کی زبان پر "قاتل بہرام" چڑھ گیا۔ سنگدلی و بیرحمی کا جہاں ذکر ہوتا بہرام قاتل کا نام خود بخود لوگوں کی زبان پر آجاتا۔

عجب پرتاپ پر اس ایکٹنگ کا کیا اثر پڑا وہ تو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ گو اس کے لئے یہ ایک معمولی بات ہونی چاہیے تھی وہ کوئی قاتل نہ تھا لیکن اس پر سب سے بُرا اثر پڑا۔

پہلا واقعہ جس سے وہ زیادہ متاثر ہوا تھا یہ تھا کہ ایک دن وہ پارک میں سیر کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دو حسین لڑکیاں اس کی طرف بغور دیکھ رہی ہیں۔ یہ ان کے پاس سے گذرا انھوں نے مُنہ پھیر لیا۔ اس نے دھیمی آواز میں ان کو کہتے سنا ــــ "بہرام قاتل یہی ہے"!

"ہاں جانتی ہوں۔" دوسری نے کہا۔ "مجھے ابھی تک یاد ہے بہرام قاتل"۔

وہ اس کا اصلی نام پرتاپ نہیں جانتی تھیں۔ وہ تو صرف بہرام قاتل کو پہچانتی تھیں۔

اس واقعہ نے اس کے دماغ پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ وہ پارک سے چلا گیا اور سیدھا کمپنی کے ڈائرکٹر کے پاس پہونچا۔ اس نے ملتے ہی کہا۔ "دیکھئے آئندہ مجھے کبھی ایسا پارٹ ادا کرنے کے لئے مجبور نہ کیجیئے گا۔ بلکہ اس دوسری فلم میں میرا پارٹ نرم ہونا چاہئیے۔"

"ہاں میں سمجھتا ہوں۔" ڈائرکٹر نے کہا۔ "لیکن کیا کروں ہمارے ہندوستان میں تو تمہارے کمالات اداکاری کیلئے کوئی بہترین افسانہ ہی نہیں ملتا۔ مجبوری ہے۔" ڈائرکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پرتاپ جب سڑک پر سے گزرتا تو لوگ اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے "دیکھو وہ ہے بہرام قاتل"۔ یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کا سین آجاتا۔ وہ اپنی خوفناک قاتلانہ صورت تصور میں دیکھتے ہی گھبرا اٹھتا۔ اپنی اس موجودہ حالت سے نفرت کرتا۔ اس کے جان پہچان والے اس سے خوف کھاتے۔ اگر راستے پر ملتے بھی تو کنارہ کاٹ جاتے۔ ایسی حالت میں وہ اپنے دماغ پر قابو نہ پا سکتا۔ ایک دفعہ تو اس نے دیکھا کہ جب وہ اپنے مکان سے باہر نکلا تو ایک عورت نے دوڑ کر اپنے بچوں کو جو گلی میں کھیل رہے تھے پکڑ کر اپنے مکان میں لے گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ یہ دیکھ کر وہ اور ضبط نہ کر سکا۔ وہاں سے سیدھا اسٹیڈیو پہونچا۔ وہاں منیجر اور ڈائرکٹر بیٹھے باہم باتیں کر رہے تھے اس نے جاتے ہی کہا۔

"آہ، بہرام قاتل کا پارٹ دیکر آپ نے میرے سکون دل و دماغ کو مٹا دیا ہے۔ میرے دل و دماغ میرے قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور روز بروز میں پاگل پن کے نزدیک ہوتا جا رہا ہوں۔ مجھے خود اب شک ہونے لگا ہے کہ میں حقیقت میں کیا ہوں؟ لوگ جانتے ہیں کہ میں فلم میں صرف ایکٹ کر رہا تھا لیکن پھر بھی آہ!.... میں ان کی نظر میں بہرام قاتل ہی ہوں۔ اب جلد ہی کوئی ایسا فلم پردہ پر لائیے جس میں مجھے رحمدلی کا پارٹ ادا کرنا ہو۔ نہیں، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤنگا۔"

منیجر نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں کہا "پرتاپ کیا غضب کرتے ہو؟ تم بہرام قاتل........"

بات کو کاٹتے ہوئے پرتاپ چیخ اٹھا۔ "آہ تم بھی مجھے بہرام قاتل سمجھتے ہو" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل بھاگا۔ اس کی صورت وحشتناک بنی ہوئی تھی آنکھیں سرخ ہو گئیں تھیں اور وہ ہو بہو قاتل نظر آتا تھا۔

وہاں سے وہ سیدھا اپنی محبوبہ کماری کے یہاں چلا۔ راہ میں لوگ اس کی اس حالت کو دیکھ کر کہتے۔ "وہ، وہ بہرام قاتل ہے"۔ اس بیقراری کی حالت میں وہ کماری کے دروازے پر پہونچا۔ وہ ابھی کہیں باہر سے آئی تھی اور دروازہ ہی پر کھڑی تھی۔ اس کی خوفناک اور متوحش صورت کو دیکھتے ہی چیخ مار کر مکان کے اندر بھاگ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ یہ دیکھکر وہ اور گھبرا اٹھا وہاں سے اپنے مکان پر پہونچا اور تمام دن اپنے کمرہ میں پڑا رہا۔

رات کو اسے بالکل نیند نہ آئی۔ اس کے دل و دماغ کو سکون حاصل نہ تھا ذرا آنکھ لگتے ہی وہ دیکھتا کہ اس نے سہراب کا گلا پکڑا ہوا ہے اور زور سے دبا رہا ہے۔ وہ اس کی گرفت سے چھوٹنے کیلئے پوری جد و جہد کر رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ اسی طرح رات بھر اسے چین نہ ملا۔ اس کے کمرے کی ہر ایک چیز سے اس کو اپنی قاتلانہ صورت نظر آتی۔ ہوا کے سرد و لطیف جھونکوں میں اسے سنائی دیتا۔ "بہرام..... قاتل..... سہراب..... قتل...." وہ چیخ اٹھتا اس کا تمام بدن پسینہ پسینہ ہو جاتا اور وہ مٹھیاں بھینچ کر کہتا۔ "کاش! میں اس بہرام قاتل کو قتل کر سکتا اور مجھے راحت، تسکین اور اطمینان نصیب ہوتا اور میں اپنی شخصیت کو دوبارہ زندہ کر سکتا۔

دوسرے دن بھی پرتاپ بالکل گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس کے دل و دماغ اپنا توازن کھو چکے تھے۔ اس پر قاتلانہ جذبات قبضہ پا چکے تھے۔ اس کی صورت و شکل ایک حقیقی قاتل کی طرح تھی وہ ایک جگہ پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ تمام دن اسے کمرہ میں ٹہلتے گذر گیا۔

رات کی تاریکی بڑھتے ہی وہ وحشت زدہ گھر سے نکلا۔ اس کا خون رگوں میں کھول رہا تھا۔ آنکھیں پھوٹی پڑتی تھیں۔ زبان خشک تھی۔ لب تھرتھرا رہے تھے۔ بال پریشان تھے ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں اور اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اسے ایک آدمی ملا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا آگے بڑھ کر اس سے نام پوچھا۔ اس نے نہایت نرمی سے بتایا۔ "بہرام" یہ نام سنتے ہی اس کے دل کی آگ بھڑک اٹھی۔ قاتلانہ جذبات نے دل میں ایک طوفان بپا کر دیا۔ وہ خبط الحواس لڑکھڑاتا اس کا تعاقب کرنے لگا اور بہرام کو مار ڈالنے کے لئے موزوں جگہ کے انتظار میں تھا۔ کتنی بار اس نے دل میں کہا "آج۔ آج ضرور بہرام کو مار ڈالوں گا۔ اب موقعہ ہے..... اب وقت ہے کہ میں اپنے گم شدہ اطمینان و سکون کو حاصل کروں"۔

آگے آگے جانے والے بہرام کو مڑ کر دیکھنے کا موقع بھی نہ ملا کہ پرتاپ نے پیچھے سے اس کے گلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دبانا شروع کیا۔ وہ شہر کے بالکل غیر آباد حصے میں تھے۔ گلی میں صرف ایک مدہم لیمپ جل رہا تھا۔ بہرام نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن پرتاپ کی مضبوط گرفت سے وہ اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔ پرتاپ اس وقت مجسّم بہرام قاتل بنا ہوا تھا جس طرح اس نے

اس نے فلم میں سہراب کو مصنوعی بہرام بن کر قتل کیا تھا۔ آج اسی طرح حقیقت میں بہرام کی شمع حیات کو اپنے ہاتھوں سے گل کر رہا تھا۔ آج اس نے نقل کو اصل کر دکھایا۔ وہ اپنے قاتلانہ جذبات کے جوش میں عقل و ہوش سے بے نیاز بہرام کا گلا اپنی پوری طاقت سے گھونٹ رہا تھا۔ آہ! اس نے چند لمحوں میں اندر بہرام کا خاتمہ کر کے اسے وہیں گرا دیا اور کچھ دیر اسے فاتحانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

اس رات پرتاپ میٹھی نیند سویا۔ کیونکہ اس نے سہراب کا بدلہ بہرام سے لے لیا تھا۔ اب دنیا میں بہرام قاتل نہیں ہے۔ دوسرے دن وہ اٹھا۔ اس کا دل مطمئن تھا۔ تاریک قاتلانہ خیالات کا پردہ دماغ سے اٹھ چکا تھا۔ اس نے غسل کیا کپڑے بدلے اور مکان سے نکل کر سیدھا کوتوالی پہونچا۔

"شہر کے غیر آباد حصے میں لرزہ خیز قتل" کی خبر اخبارات میں جلی حروف سے شائع ہو چکی تھی۔ اور درج تھا کہ پولیس کو قاتل کا سراغ مل چکا ہے اور پورا یقین ہے کہ پولیس قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگی۔ لیکن پرتاپ نے ابھی تک اخبار نہ دیکھا تھا۔

"میں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے آیا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"کس لئے؟" انسپکٹر پولیس نے پوچھا۔

"گزشتہ شب ...... بہرام کے قتل کے جرم میں۔"

"تم کون ہو؟"

"میں سٹار فلم کمپنی کا ایکٹر پرتاپ ہوں۔"

"اوہ ٹھیک ہے مسٹر پرتاپ۔"

انسپکٹر پولیس کو معلوم تھا کہ لوگوں نے پرتاپ کے ایکٹ سے کیا اثر حاصل کیا ہے اور خود پرتاپ نے اپنے ایکٹ سے کیا حاصل کیا ہے۔ انسپکٹر پولیس نے پرتاپ کے یہاں کوتوالی میں آنے کا یہی نتیجہ نکالا کہ اس کا دماغ اس کے ایکٹ کے زیر اثر ہے۔

"بالکل درست۔ تم نے تو مسٹر پرتاپ فلم میں کمال ہی کر دیا۔" پولیس انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پرتاپ کو کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے اشارہ کیا۔

"لیکن میں کہتا ہوں۔" پرتاپ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ "میں نے بہرام کو قتل کیا ہے۔"

"ہاں ہاں، درست ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہمیں سراغ مل چکا ہے اور ممکن ہے کہ قاتل گرفتار بھی ہو چکا ہو۔"

"کیا ..... آپ نہیں ..... جانتے ..... کہ قتل تو ..... میں ..... میں نے ....."

"میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں مسٹر پرتاپ۔ لیکن بہرام تو گزشتہ شب کوئی مارا ہی نہیں گیا۔ مقتول کا نام تو سہراب جی تھا ..... لیکن آپ کا فلم تو اب صحیح واقعات پر مبنی ہو گیا ہے کیونکہ قاتل تو سہراب جی کا بہرام ہی ہے۔"

بچپن کی یاد

جناب اقبال الدین احمد صاحب،

بچپن: میرے پیارے بچپن! تیا... ہاں سچ بتا!!... تو اس قدر جلد مجھ سے کیوں خفا ہو گیا؟ مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟ آخر کائنات کے کن پردوں میں جا کر روپوش ہو گیا؟ کتاب زندگی کے نہ جانے کتنے ورق الٹ ڈالے۔ منزل حیات کی خدا معلوم کتنی مسافتیں طے کر ڈالیں اور دریائے زیست کو عبور کرتے ہوئے اس کی عمیق ترین گہرائیوں تک پہونچنے کی کوشش کی... مگر تیرا نشان کہیں نہ ملا۔ تیری جستجو میں... تیری تلاش میں... تمام قوتیں صرف ہو گئیں... تمام کاوشیں سرد پڑ گئیں۔ جذبات فنا ہو گئے اور تمنائیں برباد۔ مگر پھر بھی تجھے کہیں نہ پایا۔ کوکو کی صداؤں میں... بلبل کی نواؤں میں... خزاں اور بہار میں!!... ربط گل وخار میں... ہر چیز میں تجھے تلاش کیا مگر پھر بھی تیرا سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

اے فکروں سے آزاد زمانے تیری یاد دل میں ایک ٹیس پیدا کر رہی ہے اور پہلو میں ایک ٹپک! تو میرا مونس وہمدم تھا۔ میرا رفیق وغمخوار تھا اس وقت مجھے نشیب وفراز کا امتیاز نہ تھا اور نہ سرد وگرم کا احساس زمانے کی تمام تر فکریں اور دنیا کے سارے مصائب وآلام سب میرے لئے موہوم تھے اور بے معنی۔ حسن کی شوخیوں اور عشق کی گرمیوں سے میں نا آشنا محض تھا۔ کسی دوشیزہ کی خمار آلود نگاہوں اور اس کی دلکش اداؤں میں میرے لئے کچھ بھی کشش نہ تھی۔ کسی پری پیکر کا گداز جسم' اس کے نرم ونازک ہونٹ، اس کے سرخ اور چکنے عارض...... یہ سب میرے لئے قطعی جاذبیت کا باعث نہ تھے۔ اکثر حور شمائل نازنینیں مجھے کھلونا سمجھ کر مجھ سے کھیلتیں مجھے چھیڑتیں اور میری طفلانہ شوخیوں سے خوش ہوا کرتیں مگر میں ان سے گریز کرتا اور پیچھا چھڑا کر دور بھاگ جاتا۔

مگر آہ!...... شباب کا پہلا حملہ ہوتے ہی میرا عزیز ترین بچپن مجھ سے چھن گیا۔ وہ آزادیاں مجھ سے دور ہو گئیں اور وہ بے فکریاں سب جاتی رہیں...... یکایک نظام ہستی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ دماغی سکون کو اضطراب نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بے نیاز نگاہیں حسن سے مرعوب ہو کر محو تماشا بن گئیں۔ حرکت قلب مضراب بن کر ساز ہستی کو چھیڑنے لگی اور معصوم روح میں تاثرات ذہنی نے ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ غرضکہ آمد شباب نے میری دنیا کو بالکل ہی بدل دیا اور مجھے ایک نئے عالم میں پہونچا دیا جس کی ہر چیز مجھے نئی اور ہر شے انوکھی نظر آنے لگی۔ اب دریا کی نرم نرم لہریں اور سمندر کی طوفان بدوش موجیں مجھے ایک پرکیف منظر پیش کرنے لگیں۔ موسم بہار کی رعنائیاں اور طائران خوش الحان کی نغمہ سرائیاں مجھے ایک کیف آگیں سرور بخشنے لگیں۔ باغہائے سرسبز کی سیر وتفریح میرا مشغلۂ خاص بن گیا۔ کلیوں کا چٹک کر مسکرا دینا اور پھر پھول کی شکل اختیار کر لینا مجھے بے حد بھلا معلوم ہونے لگا۔ گلاب کی نرم ونازک پنکھڑیاں اور اس کی ملاحت ونزاکت بیحد لطیف ودلپذیر معلوم ہونے لگی۔ غرضکہ جذبات کی شورش اور تاثرات کی فراوانی کے باعث دماغ کی گہرائیاں احساس حسن کا گہوارہ بن گئیں۔ چونکہ حسن وعشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے حسن کی نیرنگیوں نے عشق کی بیتابیوں کو فوراً اپنی آغوش میں لے لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ میرا معصوم دل رفتہ رفتہ محبت سے بھی آشنا ہو گیا۔ میری حسیات خوابیدہ پر جواب بیدار ہو چکی تھیں محبت کے بادل امنڈ آئے اور عشق کی گھٹائیں چھا گئیں۔ اب وہ وقت آ گیا کہ محبت کے ہاتھوں میں حسن کا پجاری بن گیا اس کو پوجنے لگا...... اور اس کی پرستش کرنے لگا۔ مگر آہ! یہ حسن کس کا تھا...... ؟ صنف لطیف کا۔ جس کو دوسرے لفظوں میں عورت بھی کہتے ہیں ایک کمسن ماہرو کا...... جس کو دوشیزہ کے نام سے بھی پکارتے ہیں...... اب

میری طمانیت کا باعث صرف اس کی ہم آغوشی تھی اور میری تسکین کا ذریعہ صرف اس کی ہم نشینی۔ میں جب اس کو پہلو میں نہ پاتا تو بے اختیار ہو جاتا میری بیتاب نگاہیں دیوانہ وار اس کو تلاش کرتیں اور سرگرداں پھرا کرتیں جب پا جاتیں تو فرط مسرت میں اس کے قدموں پر بکھر جاتیں اور تصدق ہو ہو کر اس کو چومنے لگتیں۔ میری تمام دلچسپیاں صرف اسی ملکہ حسن تک محدود ہو گئیں۔ کائنات کی کوئی شے اور دنیا کی کوئی ہستی مجھے اس کے آگے بھلی نہ معلوم ہوتی۔ الغرض میرے دل میں اس کی محبت کے شعلے بلند ہونے لگے، میرے قلب کی گہرائیوں میں اس کی محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ مجھے اس سے سچی محبت پیدا ہو گئی اور میں دنیائے محبت میں گم ہو کر رہ گیا...... مگر آہ وہ جور شمائل نازنیں...... وہ نازک اندام دوشیزہ جس کی محبت میں میں سرشار تھا...... جو میری دیوی تھی اور جس کا میں پجاری ...... آہ اس نے میری محبت کی کوئی قدر نہ کی...... اس نے میرے آرزوؤں بھرے دل کو نخوت کے بیدرد پیروں سے ٹھکرا دیا۔ اس کے حسن کی کشش آفرینیوں سے جب میں زیادہ متاثر ہوتا تو اپنے بانہوں کو اس کے گلے میں حمائل کر دیتا اور اس کے تروتازہ رخساروں سے اپنے تشنہ لبوں کو سیراب کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن میری یہ کوشش بے سود ثابت ہوتی وہ مجھ سے خوش نہ ہوتی بلکہ مجھے جھٹک کر مجھ سے دور ہو جاتی اور اپنی آتشیں نگاہوں سے میری خرمن ہستی کو جلا کر خاک سیاہ کر دینا چاہتی۔ آہ اس کی سرد مہریاں اور بے پناہ سختیاں مجھے کس قدر صدمہ پہونچاتی تھیں...... میں نہیں بیان کر سکتا...... اس کی سختیوں سے عاجز ہو کر میں دردبھری آواز میں اس سے التجا کرتا۔ خوشامد کرتا کہ للہ تو میری حسرتوں کو پامال نہ کر......

میری تمناؤں کو نہ ٹھکرا۔ میرے ارمانوں کا خون نہ کر اور اپنے حسن کے تصدق مجھے ناکام تمنا نہ بنا...... مگر آہ میری درخواستیں میری التجائیں بے سبب ردی کر دی جاتیں۔ اور بجائے اظہار ہمدردی کے دیوانے کا خطاب دیکر مجھ سے کشیدگی اختیار کر لی جاتی......

آہ...... افسوس...... کیا سچی محبت کا یہی احترام ہے؟ کیا محبت کا جواب اسی طرح دیا جاتا ہے...... آہ مجھے دھوکا ہوا اور سراسر دھوکا! میرا دل معصوم تھا۔ میں دنیائے محبت سے ابھی ناآشنائے محض تھا میں نہیں جانتا تھا کہ حسن میں غرور ہوتا ہے۔ ہاں میں یہ سمجھتا تھا کہ عورت ایک نرم و نازک شے ہے لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ اس کے پہلو میں دل کے بجائے ایک آہنی ٹکڑا ہوتا ہے۔

خیر! مجھے کسی سے نہ شکایت ہے نہ گلا۔ اگر ہے تو اپنے بچپن سے کہ اے میرے پیارے بچپن! اگر تو مجھ سے جدا نہ ہوتا تو میں عالم شباب میں ہرگز قدم نہ رکھتا اور جب شباب کی منزلیں مجھ سے دور رہتیں تو پھر جذبات وحسیات سے آزاد رہ کر میں حسن کا پجاری ہرگز نہ بنتا......!

اے بچپن! میں نے تجھے بہت پکارا۔ بہت آوازیں دیں مگر افسوس میری آواز صدائے صحرا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ میں تجھے باواز بلند پھر پکارتا ہوں کہ اے میرے پیارے بچپن! میرے عزیز ترین بچپن!...... تو آ ہاں...... جلد آ۔ اور مجھے اپنی آغوش اجابت میں لیکر...... دنیا کی اس بدترین ذات سے...... نہیں نہیں! بلکہ اس لطیف شے سے جس کو عورت کے نام سے پکارتے ہیں مجھے جلد نجات دلا......! آمین

ناکام تمنا...... اقبال مرزاپوری

ٹھیرو

ٹھیرو! جیسا کہ میں اب تجھے دیکھ رہا ہوں اسی طرح میری یاد میں ہمیشہ کے لئے آباد رہو!

تیرے ہونٹوں سے آخری طمع آواز بلند ہو چکی ہے۔ کوئی شعلہ، کوئی روشنی تیری آنکھوں میں نہیں ہے۔ وہ دھندلی ہیں، مسرت کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہیں۔ حسن کو ظاہر کرنا تیرا کام ہے جس کو حاصل کرنے کیلئے تو نے اپنے خواہشمند ہاتھ بڑھائے تھے — اپنے فاتح اور ماندے ہاتھ!

وہ تجلی کیا ہے — سورج کی تابانی سے کہیں بلند و شفاف — جو تیرے بازوؤں، تیرے لباس سے جلوہ ریز ہے؟

کس کے دلنواز تنفس نے تیری پریشان زلفوں کو ہوا میں بکھیر دیا ہے۔ اس کا بوسہ تیری پیشانی پر دھک رہا ہے جو اب مرمر کی طرح سپید ہے۔

یہ ہے محبت، حیات، اور شاعری کے اسرار کی نقاب کشائی! یہ، یہ ہے ابدیت۔ اس کے سوا اور کسی ابدیت کا وجود نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے

اس لمحہ — تم غیر فانی ہو۔

یہ وقت گذر جاتا ہے اور تم پھر ایک دفعہ مٹھی بھر خاک رہ جاتے ہو۔ تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے اس لمحہ تو بہت بلند ہے تو ان تمام عارضی چیزوں سے دور ہے جو گذر جانے والی ہیں۔

ٹھہرو! مجھے اپنی ابدیت میں شریک ہونے دو — میری روح کو اپنی ہمیشگی کی روشنی سے منور کر دو۔

سعادت حسن منٹو

مری انتہائے نگارش یہی ہے - ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

عالمگیر
لاہور

قیمت فی پرچہ پانچ آنہ قیمت سالانہ چار روپے چار آنے

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرہ آفاق تصنیف

تمدنِ عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بصفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ اور

نواب جیون یار جنگ بہادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے

عالمانہ، بصیرانہ، ناقدانہ مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے

جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۰) سادہ تصاویر (۲) نقشوں کے ہمراہ جسکی قیمت پچاس روپے

تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی اب

اعلحضرت فرمانروائے دکن و برار مدظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکا ہے قیمت فی [illegible] روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

سید عبدالقادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

بسرپرستی خاص اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

دکن ہیر آئیل کمپنی

(ہندوستان کی مشہور نمائشوں سے طلائی تمغے یافتہ)

حیدرآباد دکن میں اپنی نوعیت کا یہی وہ واحد کارخانہ ہے جس کو اپنی نیک نامی اور دیانتداری کی بدولت آج تاجدار دکن کی خاص سرپرستی کا شرف حاصل ہے پس مبارک ہیں وہ ہستیاں جو ان مفید او رمستند مصنوعات سے مستفید ہو رہی ہیں اور قابل فخر ہے ہمارا کارخانہ جس نے اپنی ایمانداری سے دنیا بھر پر اپنا اعتماد قائم کرلیا ہے ؂

نظام وجیٹیبل ہیر آئیل

تقویت دماغ اور درازی گیسو کا تنہا ضامن۔ شاہ کا پسندیدہ معزز طبقہ کا مرغوب طبع۔ بہترین تیلوں سے سو فیصدی بہتر۔ لاثانی و پائدار خوشبو ؂
قیمت علاوہ اخراجات عہ سکہ کلدار یا عمہ سکہ عثمانیہ

گولڈن اسنو

یہ وہ افضل ترین غازہ ہے جو کہ ممالک یورپ کے مماثل تسلیم کرلیا گیا ہے رخساروں میں سرخی اور جلد میں خاص نرمی پیدا کرتا ہے شیونگ کے بعد اس کے استعمال سے جلد سیاہ نہیں ہوتی۔ بالحاظ موسم و وقت استعمال کیا جاتا ہے۔

قیمت علاوہ اخراجات :-
۱۲ سکہ عثمانیہ ۱۰ سکہ کلدار ؂



دکن ہیر آئیل

ملک کا مایہ ناز اور غیر ممالک میں ممتاز مستند ڈاکٹروں اور حکیموں کا آزمودہ۔ سرکار نظام کے کیمیکل اگزامینر کا امتحان کردہ یہی وہ تیل ہے۔ جس کے مفید ہونے سے دنیا کی کوئی ہستی انکار نہیں کرسکتی ؂

قیمت علاوہ اخراجات :-
۱۴ سکہ عثمانیہ ۱۲ سکہ کلدار ؂

پتہ :- دکن ہیر آئیل کمپنی حیدرآباد دکن

تخیلات عالیہ

معلی القاب عالیجناب امیر اکبر نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر دام اقبالہ امیر پائگاہ

وہی ہے فرقت کی آہ وزاری نہ پوچھو رنج و ملال کیا ہے
ہمارے چہرے کا رنگ اڑ کر بتا رہا ہے کہ حال کیا ہے

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی کدورتوں کی کچھ انتہا بھی
زباں رکھتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو سوال کیا ہے

جناب دل خاک پہ نہ لوٹو ذرا تو ٹھیرو ذرا تو سنبھلو
کہاں کی الفت بتوں کو چھوڑو خدا کو مانو خیال کیا ہے

یہ بے نیازی کی شان کیسی یہ دلربائی کی آن کیسی
مسیح ہو کر مریض غم سے کبھی نہ پوچھا کہ حال کیا ہے

کہا جو میں نے کہ جان مضطر تڑپ کے دوں گا تمہارے در پر
تو بولے شوخی سے مسکرا کر کہ آخر میں کمال کیا ہے

یہ شام وعدہ ہوئی قیامت اجل سے دم بھر ملی نہ فرصت
سمجھ میں اپنی نہ یہ بھی آیا کہ وصل کیا ہے وصال کیا ہے

نہ درد فرقت میں لطف پایا نہ وصل میں کچھ مزا اٹھایا
چلا نہ یہ بھی پتہ خدایا کہ عاشقی کا مآل کیا ہے

حباب دریا ہے دہر فانی اجل کی خاطر ہے زندگانی
یہ راز کی بات کس نے جانی عروج کیا ہے زوال کیا ہے

معین برہم سہی وہ ہم سے مگر ہیں ان کو بھی اتنے دعوے
رقیب محفل میں بار پائے یہ تاب کب ہے مجال کیا ہے

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۳۷ء

جلد ۲۶ — نمبر ۴

[illegible]

ملاحظات!

کاغذ کی گرانی۔ تاجران کتب اور مالکان اخبارات و رسائل کے لئے آج کل کاغذ کی گرانی سخت تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ تقریباً تمام روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات نے کاغذ کی اس تشویشناک گرانی پر مقالات لکھے ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ولایتی کاغذ کا بھاؤ تیز ہوا اور اس کے بعد دیسی کاغذ بھی فوراً گراں ہو گیا اور آج کل حالت یہ ہے کہ صرف ایک رم کی خریداری پر سابقہ نرخ کی نسبت کم و بیش ایک روپیہ زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بیک وقت دو ہزار رم خریدے گا اُسے دو ہزار روپیہ زیادہ دینا پڑیگا اور موجودہ مالی پریشانیوں کے دور میں یہ عظیم و کثیر رقم زائد ادا کرنا بیحد مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کاغذ کی فرمیں اس افراتفری کے زمانے میں خوب روپیہ کمالینگی لیکن کتابوں کی تجارت اور اخبارات و رسائل پر اس کا بہت بُرا اثر پڑیگا۔

تاجران کتب اور مالکان اخبارات و رسائل کی بےبسی

ہمیں اس امر واقعہ کا نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ تاجران کتب اور مالکان رسائل و اخبارات کی کوئی ایسی انجمن نہیں جس کے ذریعہ ایسی تکالیف کے مواقع پر کوئی موثر صدائے احتجاج بلند کی جاسکے جب کتابوں کا کوئی تاجر اپنی کتب کی قیمت زیادہ کرتا ہے تو وہ اپنے خریداروں کو ان وجوہ اور اسباب و علل سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جن کی بنا پر وہ کتابوں کی قیمتیں بڑھا رہا ہے۔ لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ کاغذ کا نرخ بلا کسی وجہ کے زائد ہو گیا۔ کیا وہ سامان جس سے کاغذ تیار کیا جاتا ہے گراں ہو گیا۔ کیا مزدوروں کی یومیہ مزدوری یا ماہانہ تنخواہوں میں اضافہ ہو گیا؟ کیا ریل کا محصول بڑھ گیا؟ کیا ہندوستان کی میونسپل کمیٹیوں نے کاغذ کی تجارت پر کسی نئے محصول کا اضافہ کر دیا؟ یقیناً ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر ہم دیسی ملوں کے ارباب حل و عقد سے یہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ آخر کاغذ کا نرخ کیوں بڑھا دیا گیا لیکن یہاں اکیلے حافظ محمد عالم کے دریافت کرنے سے کیا ہوتا ہے اس نقارخانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے۔ اس لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ مالکان اخبارات و رسائل اور تاجران کتب کسی انجمن کی داغ بیل ڈالیں تاکہ ضرورت کے وقت ہم اس کے مشوروں سے مستفیض ہو سکیں ورنہ ہمیں اس سے زیادہ پریشانیوں سے دوچار ہونے کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ کیا امید کی جاسکتی ہے کہ معاصرین کرام اور تاجران کتب اس تحریر پر متوجہ ہونگے؟

ناظرین عالمگیر سے کاغذ کی گرانی سے متاثر ہو کر بعض اخبارات و رسائل نے بھی اپنی قیمتیں بڑھا دی ہیں لیکن میں مناسب نہیں سمجھتا کہ عالمگیر کی قیمت میں کوئی اضافہ کیا جائے بس صرف عالمگیر کے محترم ناظرین کرام سے صرف یہ عرض کرونگا کہ وہ اپنے حلقۂ احباب میں اپنے عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرمائیں اور عالمگیر بکڈپو سے اپنی ضرورت کی کتابیں خریدنے کا سلسلہ جاری رکھیں اس جائز اور قابل قدر اعانت سے عالمگیر موجودہ حالات کا نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے۔

آہ! بابا غلام محمد ایجنٹ اخبارات۔ ہم نہایت افسوس کے ساتھ اس خبر کو حوالہ قلم کرتے ہیں کہ لاہور کے بہت پرانے، بہت نیک اور بہت متدین بزرگ بابا غلام محمد ایجنٹ اخبارات ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو گئے مرحوم بہت خوبیوں کے آدمی تھے آج سے تقریباً پچیس ۲۵ سال پیشتر آپ نے اخبارات کا کام بہت معمولی سرمائے سے شروع کیا اور اپنی نیک نیتی، دیانتداری، وعدہ کی پابندی اور حسن اخلاق کی بدولت اس کام کو اتنا فروغ دیا کہ آج لاہور بھر میں ان سے زیادہ کوئی بڑا ایجنٹ اخبارات نہیں تھا۔ مرحوم کی ہردلعزیزی کا یہ ایک بین ثبوت ہے کہ ان کے جنازے کے ساتھ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے علاوہ ہندو بھی تھے ہر شخص کو ان کی دائمی جدائی کا دلی قلق اور غم تھا۔ ہمیں بابا غلام محمد صاحب کے فرزندوں سے دلی ہمدردی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جن فرزندوں کے سر سے ایسے نیک اور شفیق باپ کا سایہ اٹھ گیا ہو وہ بہت زیادہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔ م

م اللہ تعالیٰ ان کو اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور وہ بھی اپنے احباب کو اپنے حسن اخلاق اور حسن [illegible] سے مسخر کرتے رہیں۔ آہ! بابا غلام محمد اگرچہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں کو اپنا مسکن بنائے رکھے گی ہم مرحوم کی روح کی اس کے سوا اور کیا خدمت کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے (آمین) حافظ محمد عالم عفی عنہ

"اردشیر بابکان!"

۲۲۴ - ۲۴۱ء

جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب مستین

ذیل کا مضمون برلن کے ماہوار مجلّہ "ایران شہر" (سال سوم شمارہ ۱ و ۲) کے فاضل مقالہ نگار میرزا عباس خاں اقبال آشتیانی کے ایک تحقیقاتی مقالہ کا ترجمہ ہے جو اختصار کے باوجود تاریخی وانتقادی نقطہ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

فاضل موصوف طہران کے مدارس دارالمعلمین میں تاریخ وادب فارسی کے معلم ہیں جن کے متعدد مقالے عہد حاضر کے ایرانی جرائد اور مجلّوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ غالباً آٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے موصوف نے ثانوی طبقے کی جماعات اول کے تاریخی درس کے لئے "دورۂ تاریخ عمومی" کے نام سے (۱۳۴۸ ہجری میں) ۲۴۰ صفحے کی ایک کتاب تالیف فرمائی تھی جس میں واقعات ماقبل تاریخ اور تاریخ مصر و کلدہ آشور و فنقیہ، ایران و یونان موافق لائحہ "وزارت معارف ایران" شامل کئے گئے ہیں۔

کتاب مذکور پر علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے ایک عالمانہ تنقید لکھی ہے جو مجلّہ "ایران شہر" (سال دوم شمارہ ۸) میں شایع ہوئی ہے۔ تنقید مصرحہ صدر کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف نے کتاب زیر تنقید میں تاریخ ملل قدیمہ سے متعلق جس قدر بھی مواد پیش کیا ہے وہ جدید معلومات اور اطلاعات پر مبنی ہے۔ نیز زبان و اسلوب کے اعتبار سے کتاب مذکور حالیہ متداول فارسی اور جدید طرز نگارش کا اولین نقش ہے (مستین)



اردشیر بابکان

راقم کے عقیدے میں جن بلند قدر ستارے نے ایرانی نسل کے آسمان شوکت و عظمت پر جلوہ گر ہوکر۔ اپنے نور وجود سے اس قوم کے لئے راہ استقبال کا ایک

بڑا حصہ روشن کردیا ہے وہ بابک کا بیٹا اردشیر ہے جس کو اس کے باپ کے نام کی مناسبت سے "بابکان" اور اس کے خاندان کو اس کے دادا کے نام سے "سلسلہ ساسانی" کہتے ہیں۔

بابک باپ اردشیر کا، ایرانی نسل کے بادشاہوں میں ایسا شخص گزرا ہے جو استخر فارس کے نواح میں اپنے لئے ایک نیم مستقل سلطنت رکھتا اور باوجود اشکانیوں کے غلبہ کے سرزمین ایران کے اس مختصر سے خطہ پر صاحب اقتدار تصور کیا جاتا تھا۔

اس کے انتقال کے بعد، اس کا بیٹا شاپور نواح استخر کی سلطنت پر بادشاہ مقرر ہوا۔ لیکن اس کا دوسرا بیٹا جس کو اردشیر کہتے ہیں بھائی پر حملہ آور ہو کر سلطنت پر خود قابض ہوگیا۔ یہ وہی اردشیر ہے جو ساسانی سلسلے کا بانی سمجھا جاتا ہے اس وجہ سے کہ ساسانیوں کی عظمت وو قار کی اسی سے ابتدا ہوتی ہے۔ اردشیر سے پہلے کے بادشاہ ناموری و شاہانہ وقار نہ رکھتے تھے اور طرفہ یہ کہ وہ دوسروں کے زیر سیادت بسر کرتے تھے۔

اردشیر کا اصلی نام جو پہلوی کتبوں سے معلوم ہوتا ہے "ارتخشتر" ہے اور اسی لفظ کو یونانیوں نے کسی قدر تحریف کے ساتھ "ارتاکزرس[1]" لکھا ہے اور اہل یورپ نے بھی اس کو اسی طور پر استعمال کیا ہے۔ اردشیر سے پہلے جس سے کم و بیش سب واقف ہیں ایران اشکانیوں کے تصرف میں تھا اور یہ لوگ تقریباً ہم صدیاں گزری ہونگی جو کیخسرو (کورس = سیرکس) اور دارا (داریوش = داریوس) کے وطن میں یونانی آداب و رسوم، اصنام پرستی اور زبان یعنی ہیلنیقیت (ہیلنیزم[2]) کے رواج دینے میں مصروف رہے اور ان میں سے کوئی شخص ایرانی و ایرانیت کی جانب ذرا بھی توجہ نہ کرتا تھا۔

پانچسو سال کے عرصے اور ایران پر بیرونی اقوام (یونانیوں سلوکیدوں اشکانیوں) کے نیم غلبہ کے زمانہ میں ایرانی نسل اخلاق و عادات کے اعتبار سے نہایت پست حالت میں ہوگئی۔ بیرونی اقوام خاص کر ناقص العقل تورانیوں کے ساتھ میل جول کے باعث اپنی بہتیری فضیلتوں اور بزرگیوں کو ہاتھ سے کھو بیٹھی، یہاں تک کہ انھیں کے اخلاق و آداب بھی اختیار کر لئے۔

باوجود ان تمام حالات کے ایرانی قومیت کا برقرار رہنا اور اس قوم کا صفحہ تاریخ سے نہ مٹنا عجیب بات ہے کیونکہ چھ سو سال کے قریب قریب تک

---

[1] ARTAXERXES.
[2] HELLENISME

غیروں کے دباؤ اور قبضے کا متحمل ہونا اور قومیت و شعار قومی یعنی بقائے اصلی سے دست کش نہ ہونا حیرت ناک استقلال و ثابت قدمی کی دلیل ہے اور اس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ دنیا کی بہت کم قومیں ان کے مقابلے میں عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔

اگرچہ اس قومیت کے بقاء کا اشکانیوں کا اپنی رعایا کو مذہبی رسوم کی ادائی میں آزادی دینا اور ان کا مغلوبوں کے آداب و آثار کے مٹانے کی کوشش میں نہ رہنا بڑا سبب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس طویل عرصے میں ایرانی قومیت کے برقرار رکھنے اور ایرانیت کی روح کی نگہداشت کا موجب زردشتی پیشواؤں اور اس مذہب کے متبعین کی بے انتہا کوششیں تصور کی جانے لگیں اس وجہ سے کہ صرف یہی وہ جماعت تھی جو اس زمانے میں مذہبی رسوم کے برقرار رکھنے کی ذمہ دار تصور کیجاتی تھی۔ اوستا کو اپنے سینوں کے گنجینوں میں محفوظ رکھ کر ایک دوسرے کو سینہ بسینہ پہونچاتی اور ہمیشہ یونانیوں اور پارتھیوں کے خارجی (غیر اقوام سے) ہونے کو ظاہر کرتی رہی۔ ان کے برے افعال خاص کر ایسی قباحتوں کو جو اس جماعت کی جانب سے "بے دین" اور تمام ایرانی قومی شعار پر اثر انداز ہوئی تھیں، گوش زد عوام کرتی یا ان کے تعصب کو دلوں میں جگہ دیتی اور تدبیریں آزادانہ زندگی کے تجدید اور غاصبوں سے انتقام لینے کے لئے کرتی رہیں۔

اس قسم کے جذبات آئے دن ترقی کر رہے تھے۔ آخر کار اشکانیوں کے زوال کے زمانے میں ایک ایرانی شریف زادے کے سینے سے یعنی اردشیر بابکان شعلہ زن ہوا اور اس نے بیرونی اقوام کے خرمن ہستی کو جلا کر ایران کو از سر نو آزاد کرا دیا۔

اردشیر بابکان نے سال ۲۲۴ عیسوی میں خوزستان کے دشت ہرمزان میں اشکانی سلسلے کے آخری بادشاہ اردوان چہارم کو شکست دیدی اور اس سلطنت کے خاتمے کے ذریعہ ایران کو پارتھیوں کے پنجے سے نجات دلانے کے بعد ملوک طوائفی کے اثرات زائل کر دیئے اور اس طرح ساڑھے پانسو سال بعد ملک کو سیاسی وحدت و مرکزیت کی جانب لے آیا۔

ایرانی قوم سے متعلق اس نامور شخص کی خدمات اور احسانات کو جن کے مرہون اس ملک کے لوگ ہیں تفصیل وار بیان کرنے کے لئے ایک علحدہ رسالہ کے تدوین کی ضرورت ہے چونکہ سر دست اس بحث پر قلم اٹھانا مقصود

نہیں ہے اس لئے صرف ان کی تعداد پر اکتفا کرتے اور تفصیل کو کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

۱۔ اردشیر بابکان نے ایران کو آزادی دلائی اور بیرونی اقوام کو مغلوب کیا۔ ملوک طوائفی کے استیصال کے ذریعہ اندرونی بدنظمیوں اور کمزوریوں کا قلع وقمع کردیا اور رومیوں کے ساتھ جنگ کرکے ملک کے بیرونی وقار میں بھی اضافہ کیا۔

۲۔ اردشیر ایک رعیت پرور، بہی خواہ ملک اور منصف مزاج بادشاہ گزرا ہے۔ وہ تقریر جو اس نے جلوس کے موقع پر کی ہے اور اس کا خلاصہ مسعودی کی مروج الذہب اور شاہنامہ فردوسی میں مرقوم ہے اس کی بلند نظری کا ایک سرسری خاکہ ہے اس کی ستودہ خصلتوں اور اس کے عہد کی حسین یادگاروں کی مشرقی ممالک میں برسوں شہرت رہی اور اس کے اقوال واعمال اب تک بھی اہل نظر اور مبصرین کا محل توجہ بنے ہوئے ہیں۔

۳۔ ایرانی قوم سے متعلق اردشیر کی، زردشتی مذہب کو سلطنتی قرار دینا اور اس کی تبلیغ واشاعت میں کوشش کرنا سب سے بڑی خدمت ہے جو ایرانیوں کی قومیت کی بنیاد سمجھی جاتی ہے اور بغیر اس کے اس قوم کے لئے حقیقی زندگی کا میسر آنا ناممکنات سے ہے۔

زردشتی مذہب جیسا کہ جدید تحقیقات سے ثابت ہے۔ سلسلہ ساسان کے وجود میں آنے سے پہلے ایرانیوں میں صرف عوام کا مذہب رہا ہے اور سلطنتی مذہب نہیں قرار دیا گیا اور سلطنت صفویہ کی بنیاد پڑنے سے پہلے مذہب تشیع کی بھی یہی حالت رہی۔ جس طرح شاہ اسمٰعیل صفوی نے تشیع کو سلطنتی مذہب قرار دیا تھا۔ اردشیر نے بھی اسی طرح مذہب مزدیسنی یعنی زردشتی کو سلطنتی بنا دیا تھا یہاں تک کہ وہ سلطنتی اور ملکی مذہب بن گیا۔ ؎۱

زردشتی مذہب کے عالموں، زاہدوں اور پیشواؤں کو جمع کرنا اور اوستا کے جدید نسخے فراہم کرنا اور اس کا زبان پہلوی میں ترجمہ وتفسیر کرنا نئے آتشکدوں کی بنیاد ڈالنا، ساسانی عہد کی مذہبی تنظیمیں، یہ تمام امور اردشیر ہی کے کارنامے کو ظاہر کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس بادشاہ نے زردشتی مذہب کے احیاء کے بارے میں بے انتہا کوشش کی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اردشیر زردشتی مذہب کا ایک پیشوا گذرا ہے جو تاج شاہی بھی سر پر رکھتا تھا۔ ؎۲

مرتے دم بھی اردشیر مذہب زردشت کو نہ بھولا، اور اپنے بیٹے شاپور کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے بیٹے! مذہب اور ملک دو بھائی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے، مذہب ملک کی بنیاد ہے اور ملک مذہب کا نگہبان، جو چیز بے بنیاد ہے وہ برباد ہے اور جس چیز کا کوئی نگہبان نہ ہو وہ معرض تلف میں ہے۔" ؎۳

۴۔ ایرانی قومیت کے احیاء کا موجب بھی اردشیر بابکان ہے اس کے متعلق یورپ کے ایک محقق پروفیسر کرسٹنسن ڈنمارکی کی رائے ملاحظہ ہو وہ کہتا ہے۔

"دارائے اعظم ایرانی ہونے کے ذکر کے فخریہ اظہار پر اکتفا ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو آریائی نسل کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اشکانی نیز پارتھی (دونوں) یونانیوں کے دوست رہے۔ ایرانی قوم بھی اردشیر سے پہلے وحدت قومی کے احساسات سے بہت کم آشنا تھی۔ ساسانی سلطنت کا بانی زردشتی مذہب کو سلطنتی قرار دینے کے ساتھ ساتھ ایران کے لئے ایسی قومی اساسی تنظیم عمل میں لایا جو اسی قدیم کاویانی درفش کی علمبردار تھی ؎۴ علاوہ اس کے اردشیر پہلا شخص ہے جس نے حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو ایران کے بادشاہ کی حیثیت سے ظاہر کیا۔ یہ وہی بادشاہ ہے جو آدمیوں کی جماعت بندی کی ترتیب عمل میں لایا اور ایرانی اجتماع کی بنیاد رکھ دی۔"

۵۔ اردشیر خود بھی ایک تعلیم یافتہ اور دانشمند آدمی تھا اور اس کا زیادہ میلان علماء اور حکماء کی طرز معاشرت کی جانب رہا اس کے حکیمانہ اقوال بلند پایہ فرامین اور کتاب کارنامہ (کتاب آئین حکومت) بہت مشہور ہے۔

بوذرجمہر سے اردشیر کی سیرت کی بابت سوال کیا گیا انھوں نے کہا۔ وہ راتوں کو تحصیل حکمت کی غرض سے بیدار رہتا اور دن میں امور سیاست کی انجام دہی میں مصروف ہوجاتا تھا ؎۵

CHRISTENSEN. EMPIRE SASSANIDE ؎۱

DAREMESTETER. COWP DOELSUR ؎۲

؎۳ مروج الذہب مسعودی ص۱۱۹ ج ۱ وعقد الفرید ابن عبد ربہ صفحہ ۱

؎۴ .... ؎۵ کتاب الفخری ابن طقطقی ص۵۰،

ابو علی مسکویہ کہتا ہے کہ اردشیر ایک محتاط، دانشمند، بیدار مغز اور مدبر شخص تھا۔ وہ سیاست و تدبر میں ایک فاضل ایرانی شخص پر جس کا نام تنسر تھا بڑا اعتماد رکھتا تھا اور یہ شخص زردشتی مذہب کا بڑی سختی کے ساتھ پابند تھا۔ [1] تنسر یہ وہی شخص ہے جس نے مشہور تاریخی مکتوب کو بادشاہ طبرستان کے نام لکھا تھا۔

اردشیر نے ان مذہبی، طبی اور نجوم سے متعلق کتب کے جمع کرنے اور ترتیب و تہذیب کے لئے جن میں سے اسکندر نے بعض کو جلا دیا اور بعض بہترین کتب کو روم و یونان میں منتقل کر دیا تھا حکم دیا کہ دوبارہ ان کی نقلیں حاصل کر کے محفوظ رکھی جائیں اور اس بارے میں بے انتہا توجہ صرف کی اور بے دریغ روپیہ صرف کیا مذہب زردشت کے پیشواؤں اور پرستاروں کے مراتب (عہدے) جو دینی احکام اور حلال و حرام کا فرق ظاہر کرنے پر مامور تھے مقرر کئے۔ [2]

بہر حال اردشیر ان خدمات کے نظر کرتے جو ایرانی قوم سے متعلق انجام دیئے اور ان معلومات کے اعتبار سے جو ایران کے مذہب، تمدن اور قومیت کی تعمیر کی نسبت رکھتا تھا اس ملک کے بلند پایہ مشاہیر اور سلاطین میں سے تھا۔ اگر ساسانی بادشاہوں میں کوئی شخص اس پر تفوق رکھتا بھی ہے تو نوشیرواں اس کا نعم الخلف (قابل فرزند) ہے جو زیادہ تر اپنے علو ہمت اور بلند پایگی کے لحاظ سے ان ودائع کا حامل تھا جنھیں اردشیر سے وراثتہً پایا تھا۔ اردشیر کی سیاسی سطوت و عظمت کا یہ حال تھا کہ قدیم زمانے میں کہا کرتے تھے کہ دنیا کی کوئی قوم ہرگز اپنے بادشاہ سے اس قدر خائف نہ رہتی ہوگی جس قدر کہ ایران کے لوگ اردشیر سے اور اسلام میں عمرؓ ابن خطاب سے تھراتے تھے۔ [3]

[1] تجارب الامم

[2] غرر اخبار ملوک الفرس ثعالبی صہ ۲۹۵

[3] کتاب المحاسن المساوی بیہقی صہ ۱۱۵ ج ۱ مطبوعہ مصر

رباعیات

تا منزلِ راہِ عشق ہو طے ساقی
لا اب طربناک پیاپے ساقی
میخانۂ کائنات سے رندوں کے لیے
تشنہ [illegible] سے ساقی

لا جامِ نشاطِ زندگانی ساقی
لا کاسِ مسرتِ جوانی ساقی
ہو جائے گا کہیں غم سے جینا بھی حرام
دے جلد مجھے جامِ ارغوانی ساقی

جناب سعید احمد صاحب اعجاز

کیفستان

حضرت فراق ایم۔ اے گورکھپوری

تدبیر سہی جب تدبیر نہیں، تقدیر سہی جب تقدیر نہیں
جو کچھ بھی ہو عشق کے حصے میں تقدیر نہیں تدبیر نہیں

یہ راز و نیازِ حسن و عشق ہیں، وصل کہاں فرقت کیسی
ہے کارگر اس میں اور ہی کچھ، تدبیر نہیں تقدیر نہیں

یہ گردشِ دوراں اے ساقی، ہے کس کی لغزشِ مستانہ
گردش کا سبب تدبیر نہیں وجہ لغزش تقدیر نہیں

کمیاب سہی، نایاب سہی، گمنام سہی بے نام سہی
تاثیر محبت کو کیسے یہ کہدیں عالمگیر نہیں

ہم دیکھ چکے، ہم جان چکے، غافل تجھے ہم پہچان چکے
سوئی بھی سہی تقدیر مگر، ایسی سوئی تقدیر نہیں

اکثر راتوں کو یہ کہہ کہہ کر اک درد کا مارا روتا ہے
دنیا میں محبت سے بڑھ کر سچ ہے کوئی تقصیر نہیں

شبنم نے بھری ٹھنڈی آہیں، دل خون ہوا ہر غنچے کا
کیا اٹھتے درد کی عالم کی تھی موجِ صبا تصویر نہیں

سب کردیں، فطرتِ حسن و عشق کس طرح بدلیں چند آہیں
آہوں میں مری تاثیر سہی، ایسی بھی مگر تاثیر نہیں

ذرات پریشاں پر دل کے لئے مہر و ماہ اک عالم ہے
اور یوں تو چمکنے کو چمکی کس ذرے کی تقدیر نہیں

جانے بھی دے باہم روٹھ چکے، ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے
تقصیر مری تقصیر نہیں، تعذیر تری تعذیر نہیں

کیوں چوٹ نہ دل کی ابھر آئے کیوں نہ نداں یاد نہ آجائے
کیا موجِ ہوائے بہارِ چمن، لہراتی ہوئی زنجیر نہیں

مانا کہ نگاہ بھی قاتل تھی مانا کہ اٹھی بھی تیری طرف
یہ حال ہوا جس سے اے دل! ایسا بھی تو مارا تیر نہیں

امید پہ جیتی ہے دنیا، ہم مایوسوں کا جینا بھی
اے خوبیٔ قسمت اس کے سوا کچھ بگڑی ہوئی تقدیر نہیں

اک درد بھری آواز نئی پھر بزمِ جہاں کو رولاتی ہے
یہ طرزِ فراق سے پھر نکلی کہدے کوئی طرزِ میر نہیں

قاتل!

جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب بسمل سیالکوٹ



گھڑیال نے بارہ بجائے۔ رام سنگھ نے غسل خانے کے دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں سیٹھ سدہول کے دیوانخانے کا وزنی تالا ایک عظیم سیاہ دھبے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جنوری کا آغاز تھا۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے تیز اور تند جھونکے چاروں کھونٹ اپنا پرچم اڑا رہے تھے۔ سردی کی شدت سے تمام ذی روح کونوں کھدروں میں دبکے پڑے تھے۔ سیٹھ صاحب کے مکان پر ہیبت ناک خاموشی طاری تھی۔ نوکر چاکر دیر سے لمبی تان کر خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور مکان کا محافظ کتا باورچی خانہ میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ رام سنگھ اور اس کا ساتھی پورن دیر سے غسل خانے میں سیٹھ صاحب کے منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں علاقہ کے مشہور بدمعاش تھے۔ بارہا پکڑے گئے سزایاب ہوئے مگر قید خانہ ان کے سمند شوق پر تازیانہ ثابت ہوا۔ رام سنگھ ایک معزز گھرانے کا فرد تھا۔ زمانہ تعلیم میں اس کی شرافت اور خوش اخلاقی کی دھوم تھی اس کے ہم جماعت اس کی ذات پر فخر کرتے تھے اور استاد اسے اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے تھے۔ کئی نکمّے اور آوارہ لڑکے اس کے فیض صحبت سے سُدھر گئے اور نیک نام بن گئے تھے۔

رام سنگھ نے میٹریکولیشن کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ مگر چونکہ غریب والدین کا بیٹا تھا اس لئے کسی جگہ شنوائی نہ ہوئی اور سفارش کی عدم موجودگی میں اس کی قابلیت صفر بن کر رہ گئی۔ اس کے غریب والدین نے اپنے ہونہار بچے کی تعلیم کے لئے سودی قرضہ لیا تھا۔ جائداد قرضخواہوں نے قرق کروالی رام سنگھ کے والدین اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور اسے اس وسیع دنیا میں تنہا چھوڑ کر عدم آباد کو سدھار گئے۔ رام سنگھ لاہور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس گیا مگر وہاں سے دھتکار دیا گیا۔ انہیں دنوں پولیس نے اسے آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کر لیا اور اس طرح پہلے پہل وہ قید سے آشنا ہوا۔

قید خانہ میں اس کی ملاقات شہر کے مشہور بدمعاش پورن سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے رفیق بن گئے۔ پورن کی صحبت میں رام سنگھ نے اپنی دیرینہ عادات کو خیرباد کہا اور چوری چکاری میں اس کا معاون بن گیا۔

چوروں اور رہزنوں کے لئے سیٹھ سدہول کا وجود بہت غنیمت تھا۔ سیٹھ صاحب شہر کے مشہور صراف تھے اور چوروں سے چوری کا مال بے جھجک خرید لیتے تھے۔ رام سنگھ اور پورن بارہا سیٹھ صاحب کی دوکان پر مال غنیمت کو ٹھکانے لگا چکے تھے مگر اس روز وہ خود سیٹھ صاحب کو لوٹنے کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے اور دیر سے غسل خانے میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

سیٹھ صاحب عام طور پر ساڑھے بارہ بجے رات کے قریب دوکان بند کرتے اور قیمتی سامان اور دن بھر کی آمدنی لا کر دیوانخانہ میں لوہے کی پیٹی میں بند کر دیتے اور اس کے ساتھ بجلی کی رو کا تعلق قائم کر کے اپنی خوابگاہ میں چلے جاتے بعد میں اگر کوئی بدمعاش دیوان خانے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو سیٹھ صاحب کے مکان میں متعدد گھنٹیاں بجنے لگتیں اور ملازم بیدار ہو جاتے۔ پورن دیر سے سیٹھ صاحب کی تاک میں تھا مگر ان کے انتظام سے خائف تھا۔ آخر کار اس نے سیٹھ صاحب کو دوکان سے آتے وقت بے خبری میں پھانسنے کی تجویز کی اور موقع پا کر رام سنگھ کے ہمراہ دیوان خانے کے پہلو میں غسل خانے کے اندر چھپ رہا۔ سیٹھ صاحب کے ملازم انہیں جانتے تھے اور اگر انہیں دیکھ لیتے تو یہ جواب کافی تھا کہ ہم سیٹھ صاحب سے ملنے آئے ہیں۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب رات کی سائیں سائیں میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ صدر دروازہ کھولا گیا اور سیٹھ صاحب اپنے دوستوں سے بے خبر ٹہلتے دیوان خانے کی طرف بڑھے۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر تالا کھولا اور اندر قدم رکھا۔ عین اس وقت رام سنگھ اور پورن سنگھ

بجلی کی طرح جھپٹے اور پیچھے سے سیٹھ صاحب کے منہ پر ایک کپڑا پھینک کر خوب کس کر باندھ دیا۔ سیٹھ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ رام سنگھ نے فوراً اسے اپنے طاقتور بازوؤں میں دبوچ لیا اور پورن نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ بعد ازاں سیٹھ کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا اور دونوں دوستوں نے صندوقچی اور پیٹی کھول کر اپنے کیسے بھرنے شروع کئے۔ اس جستجو میں تین چار منٹ صرف ہوئے۔ صحن میں سیٹھ صاحب کے نوکروں کے بائیسکل موجود تھے اور اپنا کام ختم کرنے کے بعد دونوں دوست ان کی مدد سے بھاگنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پورن نے مڑ کر دیکھا۔ سیٹھ صاحب کی آنکھوں سے پٹی اتر چکی تھی۔ یا اتاری جا چکی تھی اور وہ حیرت سے چپ چاپ اپنے پرانے واقفکاروں کو دیکھ رہے تھے۔

"چلو، جلدی چلو۔" رام سنگھ نے پورن کو دھکیلتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر کے دونوں چپ چاپ وہاں سے چل دیئے۔

صحن میں پہونچکر پورن نے کہا ——— "تھوڑی دیر کیلئے یہاں ٹھہرو میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

"کیوں؟" رام سنگھ نے پوچھا۔

"دیوانخانہ میں روشنی ہے بجھا آؤں۔"

"رہنے بھی دو، ہمارا کیا ہرج ہے۔"

"واہ، ابھی پولیس ادھر سے گذریگی اور روشنی دیکھ کر اسے شبہ پیدا ہو جائیگا۔ تحقیقات کی جائیگی اور فوراً شہر کی ناکہ بندی کر دی جائیگی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اطمینان سے راوی تک پہونچ جائیں۔"

رام سنگھ نے دونوں بائیسکل سنبھال لئے اور تیس چالیس سکنڈ میں پورن بھی پاس سے آ ملا اور دونوں دوست بائیسکلوں پر سوار ہو کر چل دیئے۔ گلی کے موڑ پر بجلی کا لیمپ روشن تھا۔ رام سنگھ نے مڑ کر اپنے دوست کی طرف دیکھا پورن کی قمیض کا کف خون آلود تھا۔ رام سنگھ یہ دیکھ کر خوف سے لرز اٹھا اگرچہ وہ بارہا پورن کے ہمراہ لوٹ مار کر چکا تھا مگر قتل کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"یہ کیا؟" اس نے سرگوشیوں میں کہا ——— "کیا تم نے سیٹھ کو قتل کر دیا ہے؟"

"ہاں۔" پورن نے بے پرواہی سے کہا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"پاگل، اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہمیں جانتا ہے اگر وہ زندہ رہتا تو صبح پولیس شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے پڑ جاتی اور یقیناً یاد رہے کہ مردہ تمہارے خلاف شہادت دینے کے لئے عدالت میں حاضر نہیں ہو سکتا۔" پورن نے دانت کٹکٹاتے ہوئے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں سڑک تک آ پہونچے وہاں ایک آدمی کمبل میں لپٹا ہوا گلی کی طرف آ رہا تھا۔

"پورن غضب ———"

رام سنگھ کا فقرہ ناتمام رہ گیا۔ کمبل پوش پورن کے بائیسکل سے ٹکرا گیا اور سر کے بل گر پڑا۔ پورن نے اس وقت ٹکر کھانے والے کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر چونکہ وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا اس لئے دونوں دوست تیز رفتاری سے سڑک کو طے کرنے لگے اور تھوڑی دیر کے بعد کھلے میدانوں کی سرد اور تند ہوا ان کی گرم پیشانیوں کو چھونے لگی۔ ایک گھنٹے کے بعد دونوں راوی کے کنارے گھنے جنگل میں مطمئن بیٹھے تھے اور اپنی کامیابی پر مسرور تھے۔

"اس دفعہ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔" پورن نے مسکرا کر کہا۔ "یہ نقد و جواہر کا انبار" اس نے کیسے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کسی نے اتنی سہولیت سے حاصل نہیں کئے ہونگے۔"

"ان باتوں کو چھوڑو۔" رام سنگھ نے کہا۔ پورن کے برعکس وہ خوف سے سہما جاتا تھا۔ "آؤ مال غنیمت کو تقسیم کریں اور اپنی اپنی راہ لیں۔"

"کیوں اتنے بیقرار ہو۔" پورن نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ——— "ہم بالکل محفوظ ہیں۔ پولیس سر ٹپک ٹپک کر مر جائیگی مگر ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکتی۔"

"میں آپ سے متفق نہیں،" رام سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "ہمیں ہر حالت میں محتاط رہنا چاہیئے۔"

"احتیاط کی ایسی تیسی۔" پورن نے غصے سے جواب دیا۔ "رامو آج تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اپنا حصہ لے کر فوراً یہاں سے چلا جاؤں۔ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ پولیس ایک ایسا پھندا تیار کرے جس میں ہم از خود پھنس جائیں ——— میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے فوراً آزاد سرحد یا تبت کی طرف نکل جاؤں اور وہاں سے ترکستان یا چین میں جا کر آباد ہو جاؤں، میری دلی تمنا ہے کہ آپ میرا ساتھ دیں۔ کیونکہ ———"

رام سنگھ اپنی تجویز بیان کر رہا تھا مگر پورن کا دماغ کسی اور خیال میں مصروف تھا۔ اسے ہیرا بائی طوائف کی یاد گرما رہی تھی۔ رام سنگھ کی آمد سے پہلے ہیرا بائی پورن کو بہت چاہتی تھی۔ مگر رام سنگھ کی خوبصورتی اثر کئے بغیر نہ رہ سکی اور ہیرا بائی بتدریج رام سنگھ سے مانوس ہوتی گئی۔ اب حالات یہاں تک تبدیل ہو چکے تھے کہ ہیرا بائی رام سنگھ کے ہمراہ پورن کے وجود کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور اپنے پرانے آشنا سے کمال سرد مہری سے پیش آتی تھی۔ پورن نے اسے اپنی طرف مائل کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر بے سود۔ مگر چونکہ رام سنگھ اس کے لئے مفید ثابت ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کے خلاف شدید کارروائی کرنے سے باز رہتا۔ ایک طرف رام سنگھ چین یا روس کے کسی دور افتادہ شہر میں شاہانہ زندگی کا خواب دیکھ رہا تھا اور دوسری جانب پورن اپنے رقیب کو خاک اور خون میں سلانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رامو کی موت ہر لحاظ سے اس کے لئے مفید تھی۔ رام سنگھ کی کمزور فطرت سے بعید نہیں تھا کہ کسی روز سیٹھ کے قتل کا راز افشا کر دے مگر اس کی موت تمام خطرات کا بخوبی سدباب کر سکتی تھی۔

ابھی رام سنگھ کا فقرہ ختم نہیں ہوا تھا کہ اچانک پورن کا خنجر چمکا اور قبضہ تک اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ رام سنگھ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ تڑپ تڑپ کر تھوڑی دیر میں ٹھنڈا ہو گیا۔ پورن نے خنجر سے رام سنگھ کے رخسار کان، ناک وغیرہ کاٹ دیئے اور اس کی لاش گھسیٹ کر دریا میں ڈال دی پھر بائیسکلوں کو گھسیٹ کر لہروں کے سپرد کر دیا۔ اور لوٹ کا مال سنبھال کر وہاں سے چل دیا اس وقت وہ کامرانی کے نشے میں چور تھا۔ ہیرا بائی کا تصور اس کے پہلو میں چٹکیاں لے رہا تھا اور ہوا میں اسے گیسوئے یار کی خوشبو بسی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور مال غنیمت میں سے ہیرا بائی کے لئے کوئی موزوں تحفہ تلاش کرنے لگا۔ اس نے تمام زیورات اور جواہرات کو ٹارچ کی روشنی میں پرکھنا شروع کیا۔ زر و جواہر کے اس انبار میں سونے کی ایک انگوٹھی تھی جس میں ایک بیش بہا ہیرا جڑا ہوا تھا۔ پورن نے اسے ہیرا بائی کی نذر کے لئے انتخاب کیا اور جوش مسرت میں ایک گیت گنگنانے لگا۔ اس وقت کامیابی اس کے پاؤں چوم رہی تھی اور عیش کی زندگی آغوش میں لینے کے لئے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اگرچہ اس وقت وہ پر لگا کر ہیرا بائی کے پاس پہنچنا، چاہتا تھا مگر احتیاط مانع تھی اور سپیدہ سحر نے اسے لاہور سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں دیکھا۔ جہاں اس کا بچپن کا ایک دوست مقیم تھا جو پورن کی عادات سے واقف اور اکثر اس سے نذرانے وصول کیا کرتا تھا۔ اس گاؤں میں ایک ساہوکار کے پاس ایک سہ روزانہ اخبار آیا کرتا تھا۔ تیسرے دن پورن نے اس میں مندرجہ ذیل خبر جلی حروف میں لکھی ہوئی دیکھی۔

"سیٹھ سندر ہومل قتل کر دیئے گئے!"

"بیشمار زر و جواہر اور سیٹھ صاحب کے

دو بائیسکل غائب ہیں پولیس تحقیقات

کر رہی ہے۔"

دوسرے دن سرورق پر مندرجہ ذیل اطلاع درج تھی۔

"دریائے راوی میں ایک لاش پائی گئی۔"

"قاتل نے مقتول کا چہرہ بگاڑ دیا ہے!"

چند روز کے بعد خبر آئی۔

"سیٹھ سندر ہومل کے گمشدہ بائیسکل مل گئے۔"

"پولیس نے انہیں راوی میں سے ڈھونڈھ نکالا۔"

اس کے بعد ہفتوں اس واقعہ پر رائے زنی ہوتی رہی۔ مگر یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔ پورن پولیس کی دوڑ دھوپ اور تحقیقات کا حال پڑھ پڑھ کر مسکراتا اور ان کی پریشانی کو اپنی عظیم فتح خیال کرتا۔ دو مہینے گذر گئے۔ مطلع صاف ہو گیا۔ اخبار کے صفحات سیٹھ کے قتل کے تذکرے سے خالی نظر آنے لگے۔ یہ حادثہ لوگوں کے حافظے سے اتر گیا اور پورن مطمئن ہو کر لاہور جا پہنچا۔

لاہور پہنچ کر اس نے ہیرا بائی سے ملاقات کی اور انگشتری نذر گذرانی ہیرا بائی نے رام سنگھ کے متعلق دریافت کیا مگر پورن نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔

"اپنے گھر چلا گیا ہے۔ کھیتی باڑی سے پیٹ پالے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہیں ناگن اور ڈائن خیال کرتا ہے اور آئندہ کبھی تم سے ملاقات نہیں کریگا۔"

"شریف اور شریف زادہ۔" ہیرا بائی نے آہ بھر کر کہا۔ "میں اس کی پیروی کرونگی ــــ یہ شرمناک زندگی ترک کر کے اس کے چرنوں میں جا رہونگی اور باقی عمر اس کی خدمت میں بسر کروں گی۔"

"اس کی زندگی مشقت کا خارزار ہے۔" پورن نے طنز سے کہا۔

"میں اسے گلزار بنا دونگی۔ دن رات اس کے ہمراہ کام کرونگی۔ اور اس کی آسائش کا بجان و دل خیال رکھونگی۔"

"میری جان" پورن نے مجسم التجا بن کر کہا۔ "رامو آپ کو گالیاں

دیکھا ہے اور میں آپ پر جان فدا کرتا ہوں مگر آپ کو وہ بدبخت مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔

"میں سمجھ رہا ہوں"۔ میرا بائی نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"میں امیر ہوں۔ آپ کے قدموں پر ہیرے جواہر کے انبار لگا سکتا ہوں۔ وہ غریب ہے۔ تہی دست، ایک مزدور"۔

عین اس وقت دروازے پر کسی نے دستک دی ملازمہ نے کواڑ کھولا اور خفیہ پولیس کا انسپکٹر مجید پولیس کی ایک جمعیت کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ پولیس کی وردی دیکھ کر پورن کے ہوش اڑ گئے مگر حوصلہ سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"پورن! میں تمہیں سیٹھ سد ہوپال اور رام سنگھ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں"۔ مجید نے چلا کر کہا اور سپاہیوں نے پورن کو اپنے نرغہ میں لے لیا۔

"غلط، بہتان"۔ پورن نے گرج کر کہا۔ "آپ کو خواہ مخواہ ایک بے گناہ آدمی کو گرفتار کرنے کا کوئی حق نہیں"۔

"خوب، بے گناہ"۔ مجید نے جواب دیا۔ "پورن تمہیں یاد ہوگا کہ جب تم سیٹھ کی گلی سے باہر نکلے تھے تو ایک آدمی بائیسکل کی ٹھوکر سے گر پڑا تھا۔ وہ دھنو تھا۔ تم اُسے جانتے ہو وہ تمہارے جتھے میں شریک رہ چکا ہے اور اس رات تمہارے نقش قدم پر چلتے ہوئے سیٹھ کو لوٹنے آیا تھا مگر تم نے عجلت کی، فرش پر گرنے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا ہوش میں آنے کے بعد اس نے روپوش ہونے کی کوشش کی مگر ہم نے اس کا سراغ لگا لیا اور اس کی شہادت پر تمہیں گرفتار کیا گیا ہے"۔

جیل خانہ کی تاریک کوٹھری میں پورن نے تمام حالات کو بغور پرکھنا شروع کیا اگرچہ اس نے خود جلدی میں دھنو کو نہیں دیکھا تھا مگر رام سنگھ کا "غضب ہو گیا" کہنا اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ رام سنگھ نے دھنو کو دیکھ لیا تھا اور آنے والے خطرے کو بھانپ گیا تھا اسی لئے وہ ہندوستان سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ پورن نے زیر لب بڑبڑا کر کہا

"آہ میں کامیابی کے نشہ میں مخمور رہا اور اس سے تمام حالات دریافت نہ کئے"۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے یاد آیا کہ جب اس نے رامو کو خنجر مارا تھا تو وہ کوئی اہم بات کہنے کو تھا اور غالباً دھنو کے متعلق ذکر کرنا چاہتا تھا۔ اپنی غلطیوں کو بے نقاب دیکھ کر پورن کا دل بھر آیا مگر اس کی پشیمانی بعد از وقت تھی —— دو مہینہ کے بعد پھانسی کے تختے پر اس کی ناپاک زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

ممتاز حسین بسمل،

نمودِ سحر

شام صفحۂ کائنات پر پھیلی ——
ستارے صف بستہ ہوئے —— چاندنی نے سیمیں قمقمے روشن کئے —— کہکشاں نے پھولوں کی سیج بچھائی —— شمیم عطر بیز ہوئی —— فضائیں خاموش ہو گئیں —— سکوت نے ادب سے سر جھکا لیا ——
شاہزادی شب کی سواری دوش قمر پر نکلی ——
شہزادی نے سیج پر پائے نازک رکھا —— زہرہ نے رباب چھیڑی —— مشتری نے دھیمے سُروں میں نیند کی راگنی الاپی —— شاہزادی محو خواب ہوئی —— کائنات تاریک ہو گئی ——

——— ⁘ ———

تاروں کی آغوش میں نگاہ نے دم توڑا ——
عارضِ فطرت سے نقاب اٹھی —— نسیم کونپلوں میں اتری —— نے کے راحت آفریں نغموں نے سکوت شب کو توڑا —— بھینی بھینی خوشبو صحن گلشن سے نکلی —— سنبل کے بریدہ گیسو ہوا میں لہرانے لگے —— گھنیری شاخوں کی سیاہی میں کلیاں مسکرائیں —— غنچوں پر سیاہ بھونرے جماہیاں لینے لگے —— شمع جھلملائی ——
شہزادئ شب نے کروٹ بدلی ——
چہرے سے گیسو ہٹائے —— آنکھیں کھولیں —— پو پھٹی —— صفحۂ دہر پر ہلکی ہلکی روشنی پھیلی
شہزادی نے انگڑائی لی —— کائنات روشن ہو گئی ——

شاہزادہ ایاز

اعجاز بیان

از جناب سعید احمد صاحب اعجاز

کاش اک روز تو یوں رونق محفل ہوتا
پاؤں رکھتا تو جہاں واں پہ مرا دل ہوتا

حسن کامل تھا ترا عشق بھی کامل ہوتا
یعنی ہاتھوں ہیں مرے پردۂ محمل ہوتا

دل ساحل کو ہے ارماں کہ وہ ہو جائے بحر
بحر کو ہے یہ تمنا کہ وہ ساحل ہوتا

حسرت دید کو یکساں ہے ظہور و پردہ
ہوش کس کو کہ تجلّی کے مقابل ہوتا

داغ دل چیر کے سینہ جو دکھا دیتا میں
دعویٰ خورشید قیامت کا بھی باطل ہوتا

دل نہ زنہار نوا سنج شکایت ہوتا
لطف بھی کچھ جو ترے جور میں شامل ہوتا

خوگر جور ہیں ہم جاں سے گذر ہی جاتے
گر ستم چھوڑ کے تو لطف پہ مائل ہوتا

کاش اس طرح سے یہ چاندنی راتیں کٹتیں
کہ ہم آغوش مرے تو لب ساحل ہوتا

ترے پہلو میں گذرتی مری اک ساعت عیش
خوب ہوتا، یہ مری عمر کا حاصل ہوتا

کس قدر یاس فزا شام اجل تھی اعجاز
کاش بالیں پہ مرے وہ مہ کامل ہوتا

ٹیکسلا

پنجاب میں ڈھائی ہزار سال کا ایک قدیم و پرانا شہر

از جناب مرزا عزیز صاحب فیضانی (دارا پوری)

سیر ٹیکسلا کا حال بہت تفصیل طلب ہے اور اتنا ہی دلچسپ بھی اس لئے اس کا خلاصہ ترتیب دیتے ہوئے بہت کوفت ہوتی ہے۔ جس حد تک میں ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں ٹیکسلا جا کر اس دلکش تاریخی سیرگاہ کے حالات معلوم کر سکا ہوں، ان کا مختصر بیان بھی ایک فرصت چاہتا ہے مگر یہاں صرف چند اہم اور عام دلچسپی کی چیزیں اشارتاً بیان کردی جاتی ہیں سیر و سیاحت سے مقصود، تفریح کم اور عبرت زیادہ ہوتا ہے اور سیر ٹیکسلا میں عبرت ہی کا بہترین سرمایہ ہے۔

(ب) جس جگہ کو اب ٹیکسلا کہتے ہیں وہ راولپنڈی کے شمال مغرب کی طرف بیس میل کے فاصلے پر ٹیکسلا اسٹیشن کے مشرق اور شمال مشرق میں ایک خوشگوار وادی کے اندر واقع ہے جس میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور ایک پہاڑی نالہ بھی جسے تمراہ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دریا ہرو اور ایک نالہ لنڈی بھی اسے سیراب کرتے ہیں۔ اس کے ایک طرف ہزارہ کا برفانی پہاڑ اور کوہ مری اور دوسری طرف مارگلہ کی مشہور پہاڑی اور چند دیگر پست پہاڑیاں ہیں۔

یہاں قدیم زمانے میں ایک بہت بڑا شہر آباد تھا جو ویران ہو کر زیر زمین ہو گیا تھا اور اس کی جگہ پر کئی بستیاں آباد ہو گئیں مثلاً بھڑ۔ سرکپ سرسکھ۔ موہڑہ مرادو۔ جولیاں۔ بادل پور۔ جنڈیال اور لال چک۔

اس شہر کی اہمیت اس سے واضح تھی کہ وہ اس تجارتی شاہراہ پر واقع تھا جو ہندوستان کو وسطی و مغربی ایشیا سے ملاتی تھی۔ نیز علاقہ نہایت زرخیز تھا۔ قدرتی قلعہ یعنی اردگرد کی پہاڑیاں بھی اہمیت میں اضافہ کرتی تھیں سکندر یونانی کے حملے کے وقت دریائے جہلم اور اٹک کے درمیان جس قدر شہر تھے ان میں ٹیکسلا سب سے زیادہ آباد اور بڑا تھا۔

اب تک تین قدیم شہروں کے کھنڈر ملے ہیں جن کا باہمی فاصلہ قریباً ساڑھے تین میل ہے۔

(ج) ٹیکسلا یکے بعد دیگرے مندرجہ ذیل حکومتوں کے زیر نگین رہا۔

(۱) اہل ایران
(۲) اہل مقدونیہ (وطن اسکندر)
(۳) خاندان موریہ
(۴) یونانی باختری
(۵) قوم شاکا
(۶) اہل پارتھیا
(۷) خاندان کشان

ٹیکسلا کے تاریخی حالات قریباً ۵۵۸ ق م تک معلوم ہیں جب یہاں ایرانیوں کی حکومت تھی۔ ۵۶۳ ق م میں بدھ پیدا ہوا تھا۔ ٹیکسلا سے جس قدر چیزیں دستیاب ہوئی ہیں غالباً ان کا نوے فی صدی حصہ بدھ مت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مذہب والوں کو بت سازی کا بیحد شوق تھا، اس لئے ہر جگہ بدھ کے لاتعداد بت برآمد ہوتے ہیں۔ ٹیکسلا کا بھی یہی حال ہے اس لئے یہاں بدھ مت کا ذکر کر دیا گیا۔

۵۲۱ ق م میں ٹیکسلا دارا کی حکومت میں شامل ہوا۔

۳۲۶ ق م میں اسکندر یونانی نے فتح کیا اور آگے بڑھ کر دریائے جہلم پر پورس کو شکست دی۔

۳۱۷ ق م میں چندر گپت نے پنجاب کو فتح کیا اور خاندان موریا کی بنیاد ڈالی۔ ٹیکسلا بھی اس کے زیر نگین آیا۔

۲۹۸ ق م میں موریا شہزادہ اشوک جو بعد میں اشوک اعظم ہوا ٹیکسلا میں نایب مقرر ہوا۔ اس راجہ کے عہد میں یہاں بدھ مت کو بہت فروغ حاصل ہوا اور بعض قدر مندر، یادگار قائم کرنے والے مینار (سٹوپہ) بُت اور تبرکات برآمد ہوئے ہیں زیادہ تر اسی کے عہد کی پیداوار ہیں۔

۱۹۰ ق م میں والی باختر ایران نے ٹیکسلا بلکہ پنجاب کو فتح کر لیا۔

۱۷۵ ق م میں باختر والوں سے بھی ٹیکسلا چھن گیا اور ساتھ کے شہر سرکپ کی بنیاد پڑی۔

۸۵ ق م میں ٹیکسلا تورانی بادشاہ مائیز کے قبضہ میں آیا۔

۳۹ ق م میں مسیح کے ایک حواری طامس بھی دربار ٹیکسلا میں تشریف لائے تھے (بقول روایات نصاریٰ)

۶۰ء میں قندھار اور ٹیکسلا کا الحاق ہوا اور کشان کی سلطنت قائم ہوئی۔

۱۱۵ء میں ٹیکسلا کے ساتھ ہی سرکپ کی طرح شہر سرسکھ کی بنیاد پڑی۔

۳۱۹ء میں گپتا خاندان کی بنیاد پڑی (بعہد چندر گپت اول)

۴۵۰ء میں سفید ہنوں کا حملہ ہوا اور ٹیکسلا کی اکثر عمارات کی تباہی و بربادی رونما ہوئی۔ یہ ظالم جہاں گئے قتل و غارتگری ان کا شغل رہا اس صدمۂ عظیم کے بعد ٹیکسلا پھر کبھی نہ پنپ سکا۔

اب اس کے بعد ٹیکسلا اور مضافات کیونکر برباد ہو کر زیر زمین آ گئے اس کے متعلق مختلف روایات ہیں مثلاً زلزلۂ عظیم، مگر مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور ضروری بھی نہیں۔ مقصود عبرت ہے جو کھنڈروں کے چپہ چپہ سے آشکارا ہے۔ تباہی کے علل و اسباب کو احاطہ تحریر میں لانا علیحدہ بحث چاہتا ہے۔ آخر یہ تاریخی چیزیں ہیں اور سیاحت ناموں میں ان کی تفصیل غیر ضروری سی ہے۔ یہاں ان کا خلاصہ اس لئے دیا گیا ہے کہ ان کے بغیر آپ ٹیکسلا کی کھدائی اور کھنڈروں کی اہمیت نیز اس پرانے شہر کی عظمت و شان کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

(د) آثار کی تحقیق اور کھدائی۔ تحقیق آثار کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں۔ ایک دو مورخین سیاحین اس شہر کی جگہ کا اندازہ لگا کر کچھ معلوم کرنا چاہا تھا اور ناکام رہے مگر اس جگہ کے رہنے والوں میں سے بعض لوگوں کو غالباً اس بات کا علم تھا کہ یہاں کسی قدیم زمانے میں نہایت بارونق شہر آباد تھا اس لئے خفیہ خزانے اور تبرکات نکالنے کے لئے (جنہیں وہ نکال کر ان اشیاء سے دلچسپی رکھنے والوں کے ہاتھ بیچتے رہے) بعض لوگوں نے خفیہ کوششیں کیں ان میں سے ایک شخص سقا نوز بھی تھا جو قریب کے گاؤں ڈھیری شاہان کا رہنے والا تھا۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۵ء تک یہ شخص گرد و نواح کے چھوٹے چھوٹے سٹوپوں (بدھ میناروں) میں کھدائی کر کے قدیم چیزیں نکال نکال کر عجائبات قدیمہ کا لین دین کرنے والے شوقین حضرات کے پاس فروخت کرتا رہا ایک دفعہ اسے سونے کا ایک پتر بھی ملا جس پر کوئی تحریر کندہ تھی۔

۱۸۶۳ء میں ایک محقق نے اپنی توجہ ادھر مرکوز کی اس کے سامنے جغرافیائی علامات اور تاریخی حالات تھے۔ اس اثنا میں موضع شاہ پور سے لوگوں کو پتھر کا ایک برتن طاس ملا جس پر لکھا تھا کہ "یہ سٹوپہ ٹیکسلا میں تعمیر کیا گیا ہے" بس پھر کیا تھا محقق کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ قدیم ٹیکسلا اسی جگہ تھا۔ چنانچہ محقق مذکور نے اول ۱۸۶۳ء اور بعد میں ۱۸۷۲ء میں تھوڑی سی کھدائی کرائی اور موہڑہ ملیاراں۔ ہتھیال۔ جنڈیال اور سیری کے گاؤں کے قریب ٹیلوں پر کچھ مندر برآمد ہوئے جو چھوٹے تھے اور کم اہم اس کے بعد کھدائی بند ہو گئی کیونکہ مدنظر خفیہ خزانہ تھا جو ملنا تھا نہ ملا۔

موجودہ کھدائی جس کے نتیجہ کے طور پر بیشمار چیزیں نکلیں وہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک ہر موسم سرما میں ہوتی رہی ہے۔

(س) اب کھدائی کہاں کہاں ہوئی ہے؟

(۱) تین قدیم شہروں میں سے ایک بھڑ، جانب جنوب میدان مرتفع پر نالے سے ۶۰ فٹ بلند رقبہ ۱۰۱۲ × ۷۳۰ گز۔ یہ اس وادی کا سب سے پرانا شہر ہے۔ پرانی اشیا اس کا ثبوت ہیں۔

(۲) دوسرا قدیم شہر سرکپ، ہتھیال پہاڑی کی شاخوں پر، فصیل قریباً سب موجود ہے ۶۰۰۰ گز لمبی۔ فصیل کے باہر ایک بستی ہے جسے آج کل کچا کوٹ یا بابر خانہ کہتے ہیں۔

(۳) تیسرا قدیم شہر سرسکھ، سرکپ کے شمال مشرق میں لنڈی نالے کے پار فصیل دو تین میل۔

(۴) ان کے علاوہ مختلف جگہوں سے چیر توپ (دھرماراج کا سٹوپہ)۔

(۵) " " کنال سٹوپہ و خانقاہ سرکپ کے پاس۔

(۶) " " موہڑہ مرادو چند میل مشرق کو۔

(۷) " " جولیاں

(۸) ۔ ۔ ۔ بادل پور شمالی وادی میں۔
(۹) ، ، لال چک ، ، ،
(۱۰) ، ، جنڈیال دو ٹیلوں پر
(۱۱) ، ، بھڑ توپ ٹیکسلا کی شمالی سرحد کی پہاڑی پر

نمبر ۸ سے نمبر ۱۱ تک یہ سب سٹوپے، مناد اور خانقاہیں جو برآمد ہوئیں مندرجہ بالا تین شہروں کے گرد و نواح میں ہیں۔

نمبر ۱ سے نمبر ۱۱ تک یہ سب جگہیں وادی ٹیکسلا میں شامل تھیں اور سب مل کر ایک ہی بڑا شہر بنتا تھا گو مزنگ اور باغبانپورہ کی طرح نام علٰحدہ علٰحدہ تھے مگر جس طرح یہ مقامات لاہور سے فاصلہ پر ہونے کے باوجود لاہور میں شامل ہیں اسی طرح یہ تمام جگہیں ٹیکسلا میں شامل تھیں جو نام یہاں لکھے ہوئے ہیں یہ عموماً آج کل کے ہیں پرانے تباہ ہوگئے ہیں۔

ان کے علاوہ ٹیکسلا کی وادیوں اور پہاڑیوں میں اور بھی بہت سی قدیم عمارتوں کے کھنڈر پائے جاتے ہیں مگر کھدائی وہاں نہیں ہوئی اس لئے ذکر فضول۔ بعض جگہیں ایسی ہیں کہ وہاں قیمتی اشیاء اور اہم عمارات نکلنے کی زبردست توقع ہے مگر وہاں اب قبرستان ہیں۔ مساجد ہیں جنہیں چھیڑنا ممکن نہیں، باقی کئی جگہ آبادیاں ہیں یعنی چھوٹے چھوٹے گاؤں جنہیں کسی اور جگہ منتقل کرنے کے لئے کافی مصارف کی ضرورت ہے اس لئے وہاں کھدائی نہیں ہوسکتی۔ پھر ان جگہوں میں مساجد و قبور بھی ہونگی اور وہاں خطرناک سوالات کے پیدا ہونے کا بھی خطرہ ہے۔

(ذ) عمارات کے کھنڈر جو کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔

(۱) سٹوپے (بدھ مت کے مینار جو یادگار کے طور پر بنائے جاتے تھے۔ یا اس میں تبرکات دفن کئے جاتے تھے۔)
(۲) مندر (بدھ مت، جین مت، آتش پرستوں کے مثلاً جنڈیال کا مندر
(۳) خانقاہیں (بدھ مت والے بزرگوں کی قیامگاہیں جیسے نصرانی راہبوں کی خانقاہیں ہوتی ہیں۔
(۴) فصیلیں۔ مثلاً سرکپ کی فصیل اور سرسکھ کی فصیل۔
(۵) محلات۔ مثلاً شہر سرکپ کا عظیم الشان محل جس کی طرز تعمیر عراق عرب سے ملتی جلتی ہے۔
(۶) تالاب اور غسلخانے۔
(۷) دروازۂ شہر (سرکپ کے شمال کی طرف برآمد ہوا ہے)
(۸) عام مکانات
(۹) عدالتیں اور دفاتر

سٹوپے یا بعض خاص حالات میں چند دیگر عمارتیں خصوصاً جو ٹیلوں پر ہونے کی وجہ سے مقابلتہً محفوظ رہ گئیں زیادہ بلندی تک برآمد ہوئیں مگر باقی تمام قسم کی عمارات کے صرف بنیادی آثار باقی رہ سکے ہیں اور سطح زمین سے اندازاً گز ڈیڑھ گز بلندی تک۔ باقی حصے مسمار ہو چکے ہیں۔ ایک جگہ ایک کمرے کی چار دیواری نصف بلندی تک اپنی جگہ قائم ہے اور باقی بالائی حصہ کی چار دیواری کے زاویئے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔



جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ کی تباہکاری کا نشان ہے واللہ اعلم بالصواب،

فصیلیں جو برآمد ہوئی ہیں ان کی موٹائی عموماً اٹھارہ فٹ تک ہے اور لمبائی دو تین میل تک بھی۔ سٹوپوں میں سب سے نمایاں اور اہم دھرمارا جیکا سٹوپہ ہے جس کا مقامی نام چیر توپ ہے کیونکہ کسی محقق نے شگاف (پنجابی لفظ چیر) دیکر کھدائی کی تھی۔

(س) ان کھنڈروں میں سے کون کونسی اشیاء برآمد ہوئی ہیں

چھوٹی چیزیں مثلاً زیورات۔ سکّے۔ مٹی کے برتن اور بڑی اشیاء مثلاً بت و تصاویر وغیرہ بالعموم خانقاہوں، مندروں اور سٹوپوں سے برآمد ہوئی ہیں باقی جگہوں سے کم۔ محکمہ آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ سقاؤ قسم کے لوگوں نے آثار ٹیکسلا کو بہت سی قدیم اور قیمتی تاریخی اشیاء سے محروم کر دیا ہے۔ اگر وہ عمارات سے کوئی فائدہ لے سکتے یا اٹھا سکتے تو وہ بھی کم باقی رہتیں۔

اب یہاں ان اشیاء کے نام گنوا دیتا ہوں جو برآمد ہوئیں جن میں سے بہت سی ٹیکسلا کے عجائب خانہ میں پڑی دیکھیں۔ سب اشیاء یہاں نہیں ہیں اس لئے کہ بعض بدھ مت کے تحائف وائسرائے بہادر نے لنکا کے بدھ مت والوں کو تحفتہً دیدیئے ہیں اور سونے چاندی کی قیمتی اشیاء لاہور کے عجائب خانے میں پہونچا دی گئی ہیں۔ اسی طرح بعض خاص بُت بھی لاہور بھیجدیئے گئے ہیں۔

(۱) پتھر کے بت (مجسمے) اور مرکب بت جس میں بدھ کے ساتھ اور بھی لوگوں کے بت ہیں۔ پتھر ایک ہی ہے مگر اس میں بدھ کی زندگی کا کوئی

واقعہ دکھایا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ شاگردوں میں لکچر دیا جا رہا ہے۔ ایک جگہ صرف برکت دی جا رہی ہے۔ یا شاگرد ارد گرد کھڑے نذرانے دے رہے ہیں وغیرہ

(۲) چونے کے بُت، مفرد اور مرکب،

(۳) مٹی کے بُت، " (مثلاً سرکپ کے محل سے برآمد ہوئے)

(۴) مٹی کے برتن، (مثلاً سرکپ کے محل سے برآمد ہوئے)

(۵) لوہے کی اشیاء، (مثلاً زنجیریں۔ پھاوڑے۔ کدال۔ کھلنے بند ہونے والی کرسیاں، تپائیاں، لگامیں۔ کنجیاں۔ درانتیاں۔ تلواریں۔ خنجر۔ ڈھالوں کے پھول۔ تیروں کے پیکان میخیں۔ قبضے وغیرہ

(۶) کانسی کی اشیاء } چھوٹے بت۔ پیالے۔ چراغ۔ ڈبیاں عطردان

(۷) تانبے کی اشیاء } منقش گھنڈی دار سوئیاں (جھریاں) گھنٹیاں انگوٹھیاں۔ کانسی کی ایک مورتی۔ جس میں انگلی ہونٹوں پر رکھی ہے۔

(۸) منکے۔ مالا کے منکے۔ لکڑی، پتھر اور شیشے کے۔

(۹) جواہرات ہر قسم، محل سے برآمد ہوئے۔

(۱۰) سکے۔ سرکپ کے محل سے ایک ہی جگہ مختلف بادشاہان قدیم کے ۱۶ سکے ملے اور کئی جگہوں سے کئی ہزار سکے۔ سرکھ کے برجوں سے اکبر اعظم کے عہد کے ۵۹ پیسے بھی نکلے۔ سکے عموماً ابھرے ہوئے بھی ہیں اور ٹھپے دار بھی۔

(۱۱) مٹی کے سانچے۔ جو سکے ڈھالنے کے کام آتے ہیں (جو سرکپ کے محل سے نکلے کافی دلچسپ ہیں، یہ سانچے محل کے ایک کمرے سے برآمد ہوئے جو محل سے باہر قریب ہی واقع ہے آٹھ سانچے مکمل اور بیس نامکمل یعنی شکستہ ہیں۔ یہ کمرہ گویا ٹکسال گھر ہوگا۔

(۱۲) پختہ مٹی کے سر اور بُت۔ کہتے ہیں یہاں ایک جگہ پرانے زمانے میں زبردست آگ لگی تھی۔ اس سے یہ مٹی کے بت وغیرہ پختہ ہو کر محفوظ ہو گئے ایک مٹی کا سر ۱۱ ½ انچ موٹا ملا (دھرمارا جیکا سٹوپہ سے) جس میں بال تک موجود ہیں (یونانی صنعت) ایک سر ۹ انچ موٹا جس کے بال لٹوں کی شکل میں ہیں اور ایسے نظر آتے ہیں گویا کانسی کے ہیں۔

(۱۳) سونے کی ڈبیاں۔ چاندی کی ڈبیہ میں ایک اور ڈبیہ، پھر اس میں سونے کی ڈبیا اس میں چھوٹی سی ہڈی اور موتی یا پترا جس پر کچھ کندہ ہو۔ ایسی ڈبیاں کئی سٹوپوں سے نکلی ہیں۔ اس میں بدھ کی ہڈی بطور تبرک رکھی جاتی تھی۔

دھرمارا جیکا اسٹوپہ سے جو ڈبیا ملی اس میں ایک سونے کا پترا نکلا جو اگرچہ ٹوٹ چکا ہے مگر اس کی عبارت صاف پڑھی جاتی ہے۔ ترجمہ یہ ہے۔

"ماہ اساڑہ سال ۱۳۶ سنہ ایزر کی پندرہویں
تاریخ کو اوراسکینر پسر لوٹا مریا ساکن بلخ،
حال آباد قصبہ نوچالے مقدس ہستی (یعنی بدھ)
کی ان ہڈیوں کو نہایت خلوص کے ساتھ محفوظ
کیا۔ اوراسکینر نے مقدس ہستی کے تبرکات کو
بودھ ستوا کے مندر واقعہ دھرمارا جیکا سٹوپہ
میں بحفاظت تمام رکھا جو تکسلا ضلع تنوا میں
واقع ہے۔ ان تبرکات کو اس طرح محفوظ رکھنے
سے یہ مقصد پیش نظر ہے کہ اس کار خیر کی
برکت سے بادشاہ اعظم۔ شاہ شاہاں، دیوتا
صفات بادشاہ کشان کو صحت کلی نصیب ہو"

(۱۴) سنگ صابون کی ڈبیاں، ہاتھی دانت کی ڈبیاں، یہ بھی تبرکات رکھنے کے لئے تھیں۔

(۱۵) مختلف جسامت کے ہتھیار، موتی۔

(۱۶) ایسے پترے جن پر نامعلوم ہندسے اور نقوش ہیں۔ جس طرح جادو وغیرہ کے نقوش ہوتے ہیں۔

(۱۷) مٹی کا ایک ڈاڑھی والا سر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ باقی تمام بتوں سے اس کی ساخت علیحدہ ہے۔

(۱۸) آرمی کتبہ۔ سرکپ کے ایک مندر سے جسے دو سروں والے عقاب کا مندر کہنا چاہئے یہ کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ "دو سروں والے عقاب" اس لئے کہ اس مندر کے طاقچوں میں عقابوں کے بت رکھے ہیں اور ایک میں دو سرے والے عقاب کی تصویر۔ جس سے پایا جاتا ہے کہ اہل سیتھیا نے جن کا یہ خاص نشان ہوگیا تھا یہاں اسے رواج دیا اور وہی اسے جرمنی اور روس بھی لے گئے

چنانچہ جرمنی کا نشان ابھی تک دوسرا لا عقاب ہے۔

اس آرامی کتبے کو بہت زیادہ تاریخی اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہ سنگ مرمر پر کندہ ہے جو کسی ہشت پہلو ستون کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ کتبہ کے حروف اور زبان آرامی ہے۔ عبارت کا مفہوم اچھی طرح نہیں معلوم ہو سکا اتنا خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں دیودار اور ہاتھی دانت کے ایک محل کی تعمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۹) مٹی کے چراغ

(۲۰) پانی پینے کے پیالے

(۲۱) لوبان دان

(۲۲) بڑے گھڑے اور مٹکے۔ (بہت سی قیمتی چیزیں بھی مٹکوں میں بھری تھیں) بعض گھڑے لمبے ہیں مثلاً تین چار فٹ تک ان میں تیل اناج وغیرہ رکھے جاتے تھے۔

(۲۳) پختہ مٹی کی مورتیں، کھلونے

(۲۴) پتھر کے پیالے۔ جام

(۲۵) پتھر کی منقش اور سادہ تھالیاں۔

(۲۶) لوہے کے برتن

(۲۷) زیورات۔ زیورات چاندی سونے کے علاوہ تانبے کے بھی ہیں ایک ہار میں بہت سی دھاتوں اور پتھروں مثلاً عقیق، یاقوت، یشب، بلور، سبزہ لاجورد۔ موتی، سیپ اور سونے کے دانے پروئے ہوئے ہیں۔

سونے چاندی کے زیورات کا بیشتر حصہ لاہور کے عجائب خانہ میں پہونچا دیا گیا ہے۔ تاہم ٹیکسلا میں بھی کافی موجود ہے۔ مثلاً انگوٹھیاں، جھمکے کانٹوں کی قسم کا کوئی زیور مگر نمونے بیان نہیں ہو سکتے اصل یا تصویر دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ طلائی ہار۔ چاندی کی باریک کام والی زنجیر جو دور سے ایک رسی معلوم ہوتی ہے۔ اس زنجیر کے باریک کام کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ گلے میں پہننے والی "ڈھولکیاں" جو بطور ہار کے آج کل بھی بعض حصص پنجاب میں دیہاتی عورتیں پہنتی ہیں۔ چاندی سونے کے منقش اور کنگرے والے منکے۔ لونگ کی قسم کا کوئی زیور۔ چاندی سونے کے منکوں کا ہار چاندی کے تار میں پرویا ہوا۔ ایک ہار میں تو ویسے منکوں کی پانچ قطاریں ایک ساتھ وابستہ ہیں۔ سونے کے کنگنوں کی ایک جوڑی، یہ کنگن اندر سے خالی ہیں اور سروں سے منہ بند کئے گئے ہیں۔ سونے کی بالیاں۔ سونے کی ٹھوس منکوں والی "مرکی"۔ سونے کا جھومر، ایک بھدی انگوٹھی پر کچھ کندہ بھی ہے۔ ایک انگوٹھی میں عقیق کا نگینہ بھی ہے۔ ایک میں لاجورد کا نگینہ ہے اور اس کے گرد موتی جڑے ہیں سونے کا ایک تعویذ۔ بُندے۔

(۲۸) چاندی کا سر۔ یہ سر ایک یونانی دیوتا ہے۔ ایک ٹھپے کے ذریعہ سر کی تصویر منقش کی گئی ہے۔

(۲۹) چاندی کا چمچہ۔ اس کے دستے کا سرا بکری کے کھر سے مشابہ ہے (یونانی ساخت) اس قسم کا ایک چمچہ اٹلی کے تباہ شدہ شہر پامپائی میں بھی برآمد ہوا تھا۔

(۳۰) بعض قیمتی پتھروں کے ٹکڑے جن پر تصاویر کندہ ہیں۔

(۳۱) شیشے کے بیضوی نگینے جن پر رنگدار خط بھی کھینچے گئے ہیں۔

(۳۲) بلور اور نقلی فیروزے کے ٹکڑے۔

(۳۳) نیلگوں پتھر کا بنا ہوا چھوٹا اسٹوپہ

(۳۴) سونے۔ یشب۔ موتی۔ اور ہڈی کے منکے۔ لعل۔ بلور۔ یشب سنگ سلیمانی۔ یاقوت رمانی۔ نیلم۔ عقیق۔ فیروزہ۔ سبز جیسوار۔ صدف پکھراج اور ہڈی کے عمدہ عمدہ سوراخدار دانے اور نگینے۔ بعض دانے جانوروں یا پرندوں مثلاً شیر ببر۔ سنگ پشت۔ مینڈک اور راج ہنس کی شکل کے ہیں بعض کی شکل ہلال یا ترشول (صلیب) سے ملتی ہے۔

ایک مٹی کے گھڑے میں سے مونگے۔ لاجورد۔ سنکھ اور کانچ کے اٹھارہ منکے نکلے۔ خوب ہے۔ یہ چیزیں اور مٹی کے گھڑے میں۔

(۳۵) سونے کی سیفٹی پن۔

(۳۶) ایک مندر سے مٹی کی مہریں نکلیں جن پر بدھ مت کا کلمہ منقوش ہے جو "یے دھرما ہیتو پربھوا" سے شروع ہوتا ہے۔

(۳۷) سفید بلور کا ایک شیر کا چھوٹا مجسمہ بھی دیکھا جو نہایت خوبصورت تھا۔

(۳۸) ہاتھی دانت کا بنا ہوا آئینہ کا ایک دستہ

(۳۹) تانبے کا پھول۔

(۴۰) صنوبر کی چھال (بھوج پتر) پر لکھی ہوئی ایک دستاویز مگر آگ سے جلی ہوئی معلوم ہوتی ہے

(۴۱) پتھر کے تراشے ہوئے بہت سے چھوٹے اسٹوپے مثلاً ایک جولیاں سے برآمد ہوا۔

(ش) طرزِ تعمیر۔ عمارت کی بنیادیں اور آثار بالعموم سادہ ہیں اور کم مضبوط سب عمارتیں پتھر کی ہیں جو اچھی طرح تراشا ہوا نہیں البتہ دیواروں کی طرز تعمیر میں ایک خاص قسم کی دلکشی ضرور ہے۔ ادنیٰ و اعلیٰ کے لحاظ سے دیواروں میں چار قسمیں دیکھی گئی ہیں۔

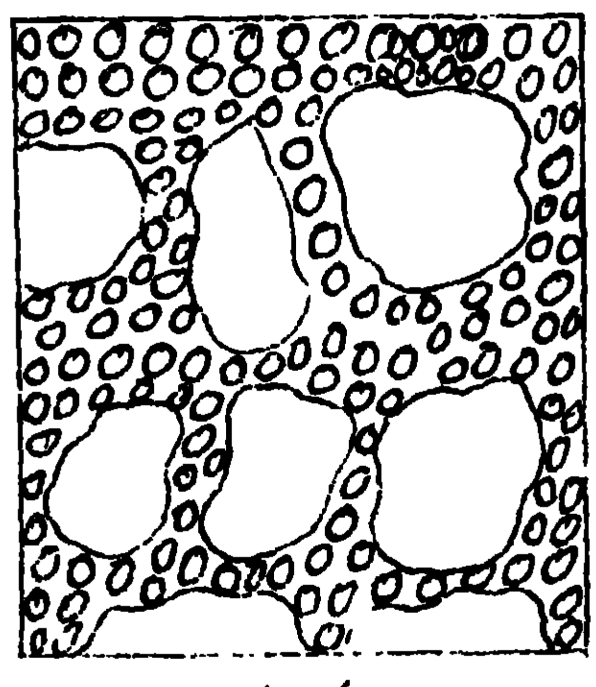
(الف) ایک میں تو موٹے اور چھوٹے پتھر بلا ترتیب چن دیئے گئے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موٹے پتھروں کو منتشر طریقے سے چنا گیا ہے یعنی کوئی سیدھی قطار یا ردے کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ اور موٹی موٹی درزوں میں چھوٹے ناتراشیدہ پتھر رکھ دیئے گئے ہیں۔ موٹے پتھر ایک دوسرے سے ہر حالت میں جدا ہیں۔ یہ طرزِ تعمیر غربا کے مکانوں میں پائی جاتی ہے۔

(ب) اس میں صرف چھوٹے پتھر کچھ تراشے ہوئے ہیں مگر لگے بے ترتیب ہیں

(ج) اس میں بڑے پتھر جسامت میں (ا) اور (ب) کے بڑے پتھروں سے بہت زیادہ ہیں مگر ناتراشیدہ۔ درزوں میں چھوٹے پتھر تراشیدہ ہیں اور بہت حد تک ترتیب وار۔

(د) اس میں اور ج میں فرق صرف یہ ہے کہ موٹے ناتراشیدہ پتھروں کے قطار کے بعد ایک یا دو ردّے "تراشیدہ پتھروں کے اس طرح ہیں جس طرح آج کل ہوتے ہیں۔

گویا طرزِ تعمیر چاروں اقسام میں ایک ہی اصول پر ہے مثلاً شکل ذیل



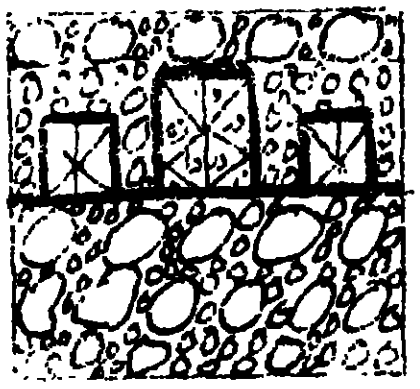
فرق صرف یہ ہے کہ چھوٹے پتھر کسی جگہ تراشیدہ بلا ترتیب ہیں کسی جگہ با ترتیب اور کسی جگہ ناتراشیدہ باقی موٹے پتھر سب اقسام میں ناتراشیدہ ہیں۔ بہرحال اس سادگی میں بظاہر تو کوئی بات اچھی نہیں مگر وہاں جا کر دیکھنے سے عظمت اور ایک خاص ہنر کی بات ضرور معلوم ہوتی ہے۔

بعض دیواروں پر چونے کا پلستر بھی ہے اور اس پر رنگ بھی کیا گیا ہے جس کے نشان موجود ہیں۔

ایک بات جو عموماً سب مکانوں کی بنیادوں اور دیواروں میں دیکھی وہ یہ تھی کہ کمروں کے مابین دروازوں کے نشان نہیں پائے جاتے اور لطف یہ کہ چوک یا گلیوں میں سے کمروں میں داخل ہونے کے لئے دروازے معلوم نہیں ہوتے خیال یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ نیچے کے کمرے بطور تہ خانہ مستعمل ہوتے تھے واللہ اعلم بالصواب،

مکانوں کے نقشے بالعموم اس طرح ہیں کہ ایک چوک یا صحن ہے جس کے ارد گرد کمرے بنائے گئے ہیں بعض مکانوں میں دو دو تین تین صحن بھی ہوتے ہیں۔ محلات کی دیواریں دیکھنے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمرے کچھ ایسے وسیع نہیں۔ غلام گردشیں بکثرت ہیں۔ عام آبادی کی گلیاں وہی بارہ سے پندرہ فٹ تک چوڑی معلوم ہوتی ہیں۔

ایک سیاح کے بیان کے مطابق کمرے اس طرح بنائے جاتے تھے کہ باہر سے یک منزلہ معلوم ہوتے تھے یعنی منزل کے کمرے میں اوپر کے کمرے سے سیڑھیوں کے ذریعہ داخل ہوتے تھے۔ نقشہ ملاحظہ ہو۔



اوپر کی منزل

نیچے کی منزل

(ص) جن جن جگہوں پر کھدائی ہو چکی ہے وہ دور دور پھیلی ہوئی ہیں اور پورے دو دن میں سب کچھ اطمینان سے دیکھا جا سکتا ہے مگر جو شخص صرف پانچ چھ گھنٹے صرف کر سکتا ہے اس کے لئے اور تدبیر تجویز کی گئی ہے اور ہمیں وہی اختیار کرنی پڑی۔ ان جگہوں کی سیر کرنے کے بعد ہم عجائب خانہ میں آئے اور وہاں وہ بت اور دیگر اشیاء دیکھیں جن کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے اور جو ان جگہوں سے برآمد ہوئیں۔ عجائب خانہ کے مہتمم صاحب سے تمام باتیں سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ وہ بہت خلیق مسلمان افسر تھے۔

(ط) عجائب خانہ کی عمارت۔ خود مقام عجائبات میں سے ایک ہے،

میں نے برآمد شدہ چند چیزوں کی تصاویر کے ساتھ ہی عجائب خانہ کی تصویر بھی اپنے مکرم میزبان کی عنایت سے حاصل کرلی ہے جو احباب کے دیکھنے کے لائق ہے۔ عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہے اور اندرونی و بیرونی منظر عموماً دلکش ہے خصوصاً میرے معزز میزبان فطرت صاحب نے عجائب خانہ کے اندر لکڑی کے ایک محرابی دروازے کی طرف توجہ دلائی جو واقعی چوبی صنعت کا بہترین نمونہ تھا۔ عجائب خانہ کے عقب میں خصوصاً اور چاروں طرف عموماً نہایت خوبصورت باغ ہے جس میں عجیب عجیب درخت جمع کئے گئے ہیں اور بعض جدتیں بھی اختیار کی گئی ہیں مثلاً جو باتیں میرے لئے نئی تھیں اور میرا خیال ہے کہ احباب نے بھی سنی نہیں ہونگی وہ

(۱) درخت پھلاہ کی باڑ (دیوار نما) اور

(۲) ایک دیوار پر لوکاٹ کا درخت جس کو بیل کی طرح چڑھایا گیا تھا۔

خصوصاً اول الذکر چیز ایسی مضبوط، خوبصورت اور کارآمد معلوم ہوتی ہے کہ اور کوئی چیز باید و شاید۔ کاش ہمارے زمینداروں کو خدا عقل دے اور قدرت کی ایسی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ ہمارے ہاں اکثر کھیتوں کی باڑ کیکر کی خشک خاردار ٹہنیوں یا خشک جھاڑیوں کی بنی ہوتی ہے جو قیمتی زمین کی کافی جگہ روک لیتی ہے اس میں سانپ جنگلی بلے اور چوہے پناہ لے سکتے ہیں جو کھیتوں میں تباہی لاتے ہیں نیز آگ لگ جانے سے (جو عام وبائے حقہ نوشی کا ادنی کرشمہ ہے) ایسی باڑ آن کی آن میں راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے اس کے برعکس پھلاہ کی ہری بھری فولادی دیوار جس کا ذکر اوپر کیا گیا بہت تھوڑی جگہ روکتی ہے۔ خوبصورت اور مضبوط رہتی ہے۔ آگ لگ نہیں سکتی اگر لگے تو کم سے کم نقصان پہونچا سکتی ہے۔ جگہ صاف اور سامنے رہنے کی وجہ سے اس میں موذی حشرات الارض کو پناہ نہیں مل سکتی جس سے کھیتی بچی رہتی ہے۔ پھر لطف یہ کہ پھلاہ کا درخت یوں بھی طبی حیثیت سے بہت مفید ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر افسوس کہ زمینداروں کی آبائی رسم نہیں اس لئے تجویز بیکار ہے۔

عزیز فیضانی (دارا پوری)

فردوس خیال

از جناب حبیب اشعر صاحب

شمعِ ہستی مری غم کوش ہوئی جاتی ہے
صبح سے پہلے ہی خاموش ہوئی جاتی ہے

فکرِ امروز، فراموش ہوئی جاتی ہے
زندگی محوِ غمِ دوش ہوئی جاتی ہے

تجھکو معلوم بھی ہے اپنے تغافل کا اثر
یاد بھی تیری فراموش ہوئی جاتی ہے

یہ دلِ زار کہ اک لمحہ نہیں تابِ نظر
وہ تجلّی کہ ہم آغوش ہوئی جاتی ہے

تیری تصویر بھی ہمرنگِ تصوّر نکلی
آنکھوں ہی آنکھوں میں روپوش ہوئی جاتی ہے

چھیڑے جاتے ہیں وہ دیوانہ سمجھکر مجھ کو
میری غفلت سببِ ہوش ہوئی جاتی ہے

پھوٹا پڑتا ہے رگ و پے سے ترا کیفِ شباب
آنکھ، جامِ مئے سرجوش ہوئی جاتی ہے

شمع بھی مائلِ گریہ سرِ بالیں کب تک
یہ بھی کچھ دیر میں خاموش ہوئی جاتی ہے

میری ہستی کا بھی انداز عجب ہے، اشعر
میری ہی نظروں سے روپوش ہوئی جاتی ہے

عورت کی قربانی

از جناب عبدالوالی صاحب قریشی آروی

جان ریشان انیسویں صدی کے ان مشہور فرانسیسی افسانہ نگاروں میں تھا جو فطری جذبات اور انسانی احساسات کو علم النفس کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ ذیل کا افسانہ اس کے ایک بہترین و کامیاب افسانہ کا ترجمہ جو "عالمگیر" کیلئے براہ راست کیا گیا ہے۔ مترجم

صبح دس بجے لوسیان فردول کو ہوش آیا اس نے آنکھیں کھول دیں اور حسرت بھری نگاہ کمرے پر ڈالی اور کل کے گذشتہ واقعات یاد کرنے لگا۔

عالم خیال میں اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے والد کی لاش ایک سفید فرش پر رکھی ہوئی ہے۔ کاہن اس کے گرد گھوم رہا ہے اور دعا کے الفاظ بہت جلدی جلدی ادا کر رہا ہے۔

وہ تفکرات کے دریا میں غرق ہو گیا اور اسے محسوس ہوا کہ در و دیوار پر خوفناک خاموشی اور انسانی قلوب میں ارتعاش پیدا کر دینے والی ہیبتناک تنہائی مستولی ہے۔

کپڑے بدلے اور ہوا خوری کرتا ہوا چوک کی جانب روانہ ہوا۔ جوں ہی اس کی نگاہ نیلگوں آسمان کی منور سطح پر پڑی اور کرہ ارضی کو بقعہ نور بنا ہوا دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس دنیا میں تنہا ہے نہ کوئی ہمدرد ہے نہ غمگسار جو اس کا شریک غم ہو اور حزن و ملال کے بحر ناپیدا کنار سے نکال کر مسرت و فرحت کے ساحل پر کھڑا کر دے۔ وہ متحیر و سرگرداں چلا جا رہا تھا۔ اس کا قلب رنج و غم سے لبریز تھا۔ اس پر حسرت و یاس کا مکمل تسلط تھا۔ جب کبھی اس کی نگاہیں کسی دوشیزہ پر پڑتیں جو کسی نوجوان کے ساتھ خراماں خراماں جا رہی ہو، کسی کمزور بوڑھے کو دیکھتا جو کسی جوان کے شانوں پر ٹیک لگائے کھڑا ہو اور کسی ماں کو دیکھتا جو اپنے بچے کو شفقت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہو اور اپنی حالت پر نگاہ ڈالتا تو اس کے غمزدہ دل پر ایک کاری ضرب لگتی اور اس کا سینہ حسرت و یاس کا مسکن بن جاتا۔

تصورات کی گہرائیوں میں مستغرق چلا جا رہا تھا کہ یکایک اپنے محب صادق "فرلیبون" سے ملا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور گفتگو شروع کی۔

فرلیبون کی نگاہ جب لوسیان کے پژمردہ اور مضمحل چہرہ پر پڑی تو اسے نہ دیکھ سکا اس نے لوسیان کو رائے دی کہ وہ قریہ آبلون کچھ دنوں کے لئے چلا جائے۔ وہاں کے پرفضا اور دلکش مناظر، کھیتوں کی سرسبزی و شادابی اس کے دل سے حزن و ملال کو دور کر دیگی اور مسرت و خوشی سے لبریز بنا دیگی جس کو لوسیان نے منظور کر لیا۔

لوسیان بستی کی سیر کرنے کے بعد ایک دلکش اور وسیع نہر کے کنارے چہل قدمی کرنے لگا۔ اس نے یہ خیال کیا تھا کہ پیرس کے شور و شغب سے نجات ملی۔ بستی کی پرسکون زندگی ممکن ہے کہ اس کی زندگی میں تغیر پیدا کر دے اور جو صدمہ باپ کی موت سے پہونچا ہے وہ مسرت و خوشی سے بدل جائے۔ اس نے یہ سمجھا تھا کہ دیہات کے دلکش و دلفریب مناظر اور بستی والوں کے اخلاق و عادات اس کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکدینگے اور ماضی کے واقعات کو دل سے محو کر دینگے اور اس کے قلب میں جوانی کی امنگیں دوبارہ عود کر آئینگی۔

لیکن اس کے حیرت و استعجاب کی حد نہ رہی جب اس نے یہ محسوس کیا کہ دیہاتی زندگی اس کے حالات میں ذرہ برابر انقلاب پیدا نہ کر سکی اس کا قلب اب بھی پہلے کی طرح مسرت و فرحت سے خالی ہے اور رنج و غم کا آج بھی اتنا ہی تسلط ہے جتنا کہ چند ہفتے پہلے تھا۔

وہ نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور نوشتۂ تقدیر پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد نہر کی شوخ لہروں نے اس کے سلسلۂ فکر کو منقطع کیا۔ جیب سے ایک کتاب نکالی اور فریدی موسیہ کے اشعار مترنم آواز سے پڑھنے لگا۔

وہ اشعار خوانی میں منہمک تھا دفعتہً نرم و شیریں آواز دریا کی متموج لہروں کے ساتھ ٹکراتی ہوئی اس کے کانوں تک پہونچی اور کسی کے جوتے کی چاپ نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ نگاہ اٹھائی تو ایک حسین عورت پر نظر پڑی جس کی پیشانی وسیع، آنکھیں رسیلی اور قد متوسط تھا۔ ایک چھوٹی بچی اس کے ساتھ تھی جسے وہ سرزنش کر رہی تھی۔

اس نے خیال کیا کہ اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس کا جاذب نظر حسن رسیلی آنکھیں، نرم و شیریں آواز، یہ کوئی نئی اور انوکھی چیز نہیں ہے۔

عورت وہاں سے آگے بڑھی اور دور ہوتی گئی۔ جب تک وہ نظر آتی رہی لوسیان عاشق مفتوں کی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور جب آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو گھر واپس آیا۔ مضمون لکھنے کا ارادہ کیا لیکن وہ مسحور کن صورت بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتی۔ بالآخر وہ سوچنے لگا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔

دفعتہً اس کے ذہن سے نسیان کا پردہ ہٹا اسے یاد آیا کہ یہ عورت میرے باپ کے دوست کی بیوی ہے جبکہ میں دس سال کا تھا اکثر اس کے یہاں جایا کرتا تھا اور یہ بڑی شفقت و مہربانی سے پیش آتی تھی اکثر سر میں تیل لگا دیا کرتی تھی اور قسم قسم کے حلوے اور مٹھائیاں کھانے کو دیتی تھی۔

دوسرے دن لوسیان وقت سے بہت پہلے نہر کے کنارے آپہونچا اور دیر تک بےچینی کے ساتھ اس کا انتظار کرتا رہا۔ دیر کے بعد یہ حسینہ نظر آئی۔ جرأت کرکے اس کے قریب گیا۔ سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ وہ متحیر ہوگئی۔ ماضی کے واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئے۔ مسکراتے ہوئے لوسیان سے مصافحہ کیا۔ دونوں نہر کے کنارے ٹہلنے لگے اور بچی لوسیان کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

مسز اندری کو سیاہ لباس زیب تن کئے ہوئے دیکھ کر لوسیان نے مضطربانہ لہجہ میں اس کی وجہ پوچھی۔ اس نے اپنے شوہر کی موت کی خبر سنائی اور کہا اب میں اس بچی کی وجہ سے تنہائی کی زندگی بسر کرتی ہوں اور دوسری شادی کا خیال بھی نہیں ہے کیونکہ اب عمر بھی ۳۵ سال کی ہوگئی۔

لوسیان نے مسز اندری کو اپنی ساری داستان سنائی اور تنہائی کی شکایت کرتے ہوئے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جسے اس نے خوشی سے منظور کرلیا۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوکر اپنی قیامگاہوں کی طرف روانہ ہوگئے۔

لوسیان دوسرے دن صبح کے وقت مسز اندری کی قیامگاہ پر پہونچا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور دونوں مختلف مسائل پر گفتگو کرنے لگے حتیٰ کہ ان شعرا و ادبا کا ذکر چھڑ گیا جن کے کلام کو لوسیان برابر پڑھا کرتا تھا۔ مسز اندری دیر تک ان شعرا و ادبا کی سوانح حیات اور ان کے اخلاق کو بیان کرتی رہی۔ اس کے بعد ان کے کلام پر ایسی بصیرت افروز تنقیدیں کیں جو اس کی فطری ذکاوت اور طبعی فطانت کی شاہد تھیں۔

لوسیان اس کی پرمغز گفتگو سن کر متحیر ہوگیا اور اس کی ادبی معلومات پر عش عش کرنے لگا اور محسوس کیا کہ یہاں ادبی معلومات کا بیش بہا خزانہ اس عورت کی بدولت مل سکتا ہے۔ چنانچہ اس سے درخواست کی کہ روزانہ اپنے بیش بہا نکتوں سے اسے بھی مستفید کرتی رہے اور اپنا مخلص و وفادار دوست سمجھے۔

مسز اندری نے درخواست کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے مخلص دوستوں کے حلقہ میں شامل کرلیا۔ روزانہ شام کو لوسیان مسز اندری کی قیامگاہ پر آتا۔ دونوں ایک خوبصورت کمرے میں بیٹھ جاتے۔ نوکر چائے کی پیالی لاتا۔ دونوں پیتے۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد لوسیان اپنا دیوان نکالتا اور بلند و موثر آواز سے پڑھتا اس کی آواز قلوب انسانی میں جذبات اور فضائے آسمانی میں ارتعاش پیدا کردیتی۔ مسز اندری اس کے ہر ہر شعر پر تنقید کرتی۔ فنی معائب و محاسن اس پر واضح کرتی اور اس کی گود ادبی جواہر پاروں سے بھر دیتی۔ اس کی ملاقات لوسیان کی ادبی تشنگی کو بجھاتی۔ اس کا جاذب نظر حسن، اس کی محیر العقول تیزی طبع لوسیان کے دماغ پر اشعار کی بارش کرتی۔ وہ ہمیشہ لوسیان کے تخیل کو لطیف خیال میں نزاکت، الفاظ میں روانی اور سلاست پیدا کرنے کی کوشش کرتی وہ اسے اس بلندی کی طرف لے جا رہی تھی جہاں پہونچکر اس کا ایک ایک شعر آسمان ادب کا ماہ درخشاں بن جاتا۔

دونوں سیر و تفریح کے لئے ایک ساتھ جاتے۔ گھنٹوں نہر کے دلفریب و دلکش مناظر کے مطالعہ میں مصروف رہتے اور بسا اوقات لوسیان اشعار پڑھتا اور مسز اندری گاتی۔

مسز اندری کے جاذب نظر حسن نے لوسیان کے دل میں جگہ کرلی۔ اب زیادہ دیر تک مسز اندری کی جدائی اس پر شاق گزرنے لگی جب وہ اس کی نظر سے

چھپ جاتی تو وہ اضطراب اور بیچینی محسوس کرتا لیکن اب تک اس کی وجہ اسے معلوم نہ تھی۔ ایک رات بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ آخر یہ خلش کیوں ہے۔ دیر تک سوچنے کے بعد اس کی عقل نے رہنمائی کی اور دل کے مضمر راز کا پتہ چلا اسے یقین ہوا کہ یہ مسز اندری سے بڑھتی ہوئی محبت کا نتیجہ ہے۔

صبح سویرے مسز اندری کی قیامگاہ پر جا کر دلی جذبات کا اظہار کیا۔ مسز اندری نے اس بات کو سن کر یہ محسوس کیا کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کر گئی لیکن وہ رنجیدہ نہ ہوئی بلکہ لوسیان کو سمجھایا کہ میں محبت کے قابل نہیں۔ اپنی زندگی، اپنی معصوم بچی کے لئے وقف کر چکی ہوں اور ماسوا اس کے اب بوڑھی ہوگئی عمر ۴۵ سال سے زائد ہوگئی اور تم ابھی بچے ہو۔ زندگی کی کل اٹھارہ بہاریں دیکھی ہیں اس نے قصد کیا کہ لوسیان کو اس خیال سے باز رکھے لیکن لوسیان نے خواہشات سے مغلوب ہو کر رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ مسز اندری کو اس بات پر غصہ آیا اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

دوسرے روز لوسیان نے مسز اندری کے پاس ایک تحریر بھیجی جس میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور اس کی شفقتوں کا طالب ہوا لیکن اس کا کوئی جواب نہ آیا خود اس کی قیامگاہ پر گیا لیکن خادمہ سے یہ معلوم کر کے کہ وہ پیرس چلی گئی ہے اسے سخت حیرت ہوئی۔

وہ پیرس پہونچا۔ ہفتوں، تفریح گاہوں، ادبی مجلسوں میں اُسے تلاش کرتا رہا لیکن پتہ نہ چلا۔

اس کے دوست فریسون اور دیگر احباب کو خبر ملی۔ وہ بوڑھی عورت سے محبت کرنے پر شرم دلاتے اور مذاق بناتے لیکن ان باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالآخر دوستوں نے متفقہ طور پر یہ رائے قائم کی کہ اسے پیرس کے کلبوں اور تفریح گاہوں میں لے چلو۔ بہت ممکن ہے لہو ولعب میں مشغول ہو کر اسے بھول جائے یا یہ سمجھنے لگے کہ وہ اس کے لائق نہ تھی۔ لوسیان جب مسز اندری کی ملاقات سے مایوس ہوگیا تو اپنے دوستوں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے۔ کلبوں میں شریک ہونے لگا اور ناچ اور مے نوشی میں رات کا اکثر حصہ گذارنے لگا۔

ایک صبح جوں ہی پبلک پارک میں داخل ہوا ایک آواز سنائی دی جو فضا میں گونجتی ہوئی اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ ایک بڑے درخت کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہوگیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ مسز اندری پر پڑی جو باغ میں بیٹھی ہوئی کشیدہ کاری میں مشغول تھی اور اس کی بچی شور و غل مچا رہی تھی۔ لوسیان درخت کی آڑ میں دیر تک کھڑا رہا۔ جب مسز اندری پارک سے نکلی تو اس کے پیچھے پیچھے جا کر اس کی قیامگاہ کا پتہ لگایا اس کے بعد ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

"میں اپنی غلطیوں کی معافی کا خواستگار اور تمھاری رحمت کا طالب ہوں۔ میرے قصور کو معاف کر دو اور دوبارہ اپنی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع دو۔ اپنی روحانی قوتوں سے اپنی طرف کھینچ لو کیونکہ میری زندگی بغیر تمھارے اجیرن ہے۔" مسز اندری نے اس درخواست کو اس شرط پر قبول کر لیا کہ اب محبت کا لفظ بھی زبان پر نہ لائیگا۔

دونوں پہلے کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ رات کا بیشتر حصہ ایک ساتھ گزارتے۔ وہ نظم سناتا یہ نثر سناتی۔ وہ پوچھتا اور یہ جواب دیتی۔ بسا اوقات یہ حسینہ دور سے بیٹھی ہوئی گوشہ چشم سے دیکھا کرتی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد درد بھری لمبی سانس لیتی۔

لوسیان اپنے وعدہ کا سچا تھا اس نے کبھی مسز اندری کے سامنے محبت کا اظہار نہیں کیا اور نہ کبھی اپنی طرف سے شک میں ڈالا اور نہ اظہار رنج کیا۔ بلکہ اپنے جذبات کو پوری طاقت سے چھپائے رہا۔ اس کی گرم آہیں اس کے قلب کو اندر ہی اندر پگھلا رہی تھیں۔

مسز اندری سمجھ رہی تھی کہ لوسیان اپنے پر ظلم کر رہا ہے اور محض اسے خوش کرنے کے لئے انسانیت کے جذبے کو مغلوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے کو سلیم الطبع انسان ظاہر کرنے کی سعی لاحاصل کر رہا ہے۔ وہ درحقیقت سچی محبت کرتا ہے اور راہ محبت میں اپنی جوانی اپنا دین و ایمان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہے۔

یہ وہی عورت ہے جو عشق و محبت کے اظہار سے بھی لوسیان کو روکتی تھی لیکن اب لوسیان کے ظاہرا اعراض سے متاثر ہو کر دل کی گہرائیوں میں ایک عجیب و غریب جذبہ محسوس کر رہی ہے کہ اس کا دل لوسیان کی طرف آہستہ آہستہ کھنچا جاتا ہے اور اس کی سختی نرمی سے بدل رہی ہے پہلے لوسیان اس کو خوش کرنے کی کوشش کرتا تھا اب یہ اسے خوش کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ظرافت و لطافت سے لبریز گفتگو کرتی تاکہ قدر و منزلت اس کی نظروں میں بڑھ جائے مسز اندری محسوس کر رہی تھی کہ یہ اس کی آخری محبت ہے زندگی کی آخری امید ہے جوانی کی آخری بہار ہے جسے بڑھاپے کی خزاں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے برباد کر ڈالیگی۔

بڑھاپے کے خوف نے محبت کے بڑھتے ہوئے جذبہ کو مغلوب کرنے کی کوشش کی اور پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کیا لیکن شباب کا فتنہ غالب آگیا اور نوجوان کے عشق نے اس پر فتح پالی۔

لوسیان نے اس کی نظروں سے محبت کے پوشیدہ راز کو معلوم کرلیا اور دوبارہ نکاح کی خواہش ظاہر کی لیکن مسز اندری نے اس جرأت پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ نکاح ہماری زندگی کو تلخ، عیش کو کڑوا کردیگا جب کہ میں پچاس سے تجاوز کرچکی ہوں اور تم نے زندگی کی ابھی پچیس بہاریں دیکھی ہیں لیکن لوسیان اس کے اس دلشکن جواب سے ناامید نہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مادلین ایک دن اس کی ہوکر رہیگی اور یہی وہ تخیل تھا جو اس کے دل کو مسرور اور چہرے کو متبسم کردیتا۔

لوسیان اب قانوناً بالغ ہوگیا تھا اس لئے وہ پیرس گیا تاکہ اپنے ولی سے اپنے موروثی مال کو حاصل کرے۔ ابھی شہر میں پہونچا بھی نہ تھا کہ اسے ایک تحیرکن و مصیبت انگیز خبر ملی۔ وہ یہ کہ بنک فیل ہوگیا جس نے اسے اور اس کے ولی کو مفلس و غریب بنادیا۔ چند ہفتے تک وہ پیرس میں کوشش کرتا رہا کہ کچھ روپیہ مل جائے لیکن ناکام رہا بالآخر قریہ آبلون واپس آیا جب وہ مسز اندری کے پاس گیا تو اس کا چہرہ زرد تھا اس کی آنکھوں میں حلقے پڑگئے تھے اور لاغری اس کے جسم سے کھیل رہی تھی۔ مادلین اس کی صورت سے حقیقت حال کو سمجھ گئی اس نے لوسیان کو تسلی و تشفی دی اور اپنی دولت اس پر بیدریغ صرف کرنے لگی۔

لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ ایک نوجوان اسے اپنی زوجیت میں لیگا۔ نکاح کی خواہش کرنے سے وہ ڈری کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوسیان یہ سمجھے کہ احسان کے بدلے میں یہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتی ہے یہ سوچ کر وہ خاموش رہی اور پوری طرح اس کی مدد کرتی رہی اور خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

اس نے لوسیان کو غربت و مفلسی کے بھنور سے نکالنے میں ایک مسرت محسوس کی اور لوسیان بھی اس کی دریادلی، بے لوث محبت اور اس کے اخلاق حمیدہ سے متاثر ہوگیا۔ محبت اس حد تک بڑھی کہ مادلین کو غیر کی مداخلت ناگوار ہونے لگی۔

لیکن اس وقت تک جو چیز نکاح سے مانع تھی وہ بیٹی کی محبت تھی بیٹی کی محبت یہ چاہتی تھی کہ عزلت کے گوشہ میں بیٹھ کر زندگی کے دن کاٹ دے اور لوسیان کی محبت اس بات کی مقتضی تھی کہ جوانی کی آخری بہاروں سے متلذذ ہو۔ بیحد کشمکش کے بعد لوسیان کی محبت غالب آگئی چنانچہ اس نے بیٹی کو ساتھ لیا اور متوفی شوہر کے یہاں پہونچی۔ بیٹی کو کنبہ والوں کے حوالے کیا اور خود تنہا واپس آئی۔

اب لوسیان اس کے دل کا تنہا مالک تھا جس میں اس کا کوئی شریک نہ تھا۔ وہ اس کے حسن و جمال، علم و عقل سے تنہا متمتع ہونے لگا۔ تھوڑے دنوں بعد لوسیان کو معلوم ہوا کہ مادلین اس کی طرح فقیر ہوگئی ہے۔ سسرال والوں نے اس کا وظیفہ بیٹی کو چھوڑ دینے کی وجہ سے بند کردیا ہے۔

لوسیان اپنے کئے پر نادم ہوا اس نے محسوس کیا کہ اس کی محبت اس عورت کو غربت و افلاس کے گڑھے میں ڈالدیگی لیکن مادلین کو اس کی قطعاً پروا نہ تھی۔ غربت کا تصوّر اس کے قلب میں ارتعاش پیدا نہ کرسکا اور نہ مشکل سے مشکل کام سے اس نے ہمت ہاری اور لوسیان کو ہمیشہ کام کے لئے آمادہ کرتی رہی اور اس میں افسانہ نویسی اور شعر و شاعری کا شوق پیدا کرتی رہی۔

لوسیان اس کی رائے پر عمل کرتے ہوئے پوری جانفشانی سے دیوان مرتب کرنے میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد دیوان مکمل ہوا جس کا نام "پوشیدہ مسرت" رکھا گیا۔

لیکن اسے یہ معلوم کرکے کہ دیوان کی طباعت و اشاعت کی کوئی صورت نہیں ہے سخت صدمہ ہوا اور اسے پہلے کی طرح اب بھی گمنامی کے گوشہ میں رہنا پڑیگا۔ اس کی کوشش اسے کچھ فائدہ نہ پہونچا سکی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور مادلین کے قدموں پر گر کر التجا کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔ مادلین نے اسے تسلی و تشفی دی اور اس کے حزن و ملال کو مسرت و نشاط سے بدل دیا۔ اپنے زیوروں کو فروخت کرکے دیوان کی طباعت کے لئے روپیہ مہیا کیا۔

دیوان طبع ہوگیا اور اس کی اشاعت بھی ہوگئی۔ دونوں اس انتظار میں تھے کہ شاید کوئی شاعر یا ایڈیٹر اس پر قلم اٹھائے لیکن ملک کے کسی ادیب نے اس پر توجہ نہ کی نہ کسی ادبی رسالے میں کوئی تنقید شایع ہوئی معلوم ایسا ہوتا تھا کہ کوئی دیوان شایع ہی نہیں کیا گیا اور نہ لوسیان نے کبھی شعر کہے ہیں۔

چند ماہ بعد ایک صبح پیرس کا ایک رسالہ لوسیان کے نام پہونچا جس کو

پڑھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور آتش غیظ و غضب بھڑک اٹھی کسی ناقد نے نہایت بیرحمی و بیہودگی سے اس کے ہر ہر شعر پر بری طرح جرح و قدح کی تھی اور بری طرح مذاق بنایا تھا۔ بعض اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ لوسیان کی خانگی زندگی اور مادلین کے عشق و محبت کی داستان چھیڑ کر ملک میں بُری طرح بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس تنقید کا عنوان "مسز اندری کا شاعر" قائم کیا گیا تھا۔

لوسیان جب اس مقالے کو پڑھ چکا تو اس کی غیرت و حمیت نے اسے مجبور کیا کہ وہ پیرس جا کر اس کا انتقام لے چنانچہ وہ پیرس پہونچا۔ ناقد سے ملاقات کی اور اس کی اس بیہودہ حرکت پر تنبیہ کرنے لگا۔ گفتگو کرتے کرتے ہاتھا پائی تک نوبت پہونچ گئی اور اچھی خاصی جنگ چھڑ گئی۔ جس میں لوسیان بری طرح زخمی ہوا فریسون کو جب اس کا علم ہوا تو لوسیان کو اپنی قیامگاہ پر لے گیا۔ وہ خود اور اس کی بیوی بڑی توجہ سے تیمارداری کرنے لگے۔ اس اثنا میں لوسیان نے مادلین کو خط لکھا۔ "مجھے سخت افسوس ہے کہ تمھیں غربت و مفلسی میں مبتلا کرنے کے بعد مجھے یہ رسوائی نصیب ہوئی۔ اب تم سے ملاقات کی کوئی امید نہیں ہے بہتر یہ ہے کہ سسرال والوں سے جا ملو" اور نہ اسے اپنی حالت کی اطلاع دی اور نہ اپنی قیامگاہ کا پتہ لکھا۔ مادلین نے اس کی بیحد جستجو و تلاش کی لیکن پتہ نہ چلا۔

لوسیان کو صاحب فراش ہوئے دو ماہ گذر گئے اس کی بیماری روز بروز ترقی کرتی رہی۔ فریسون تیمارداری کرتے کرتے تھک گیا۔ اس نے لوسیان کی بڑھتی ہوئی بیماری اس کی مفلسی اور تنگدستی کو دیکھ کر کہدیا کہ تمھاری اعانت ہماری طاقت سے باہر ہے بہتر یہ ہے کہ تم مادلین کے یہاں واپس چلے جاؤ۔

لوسیان فریسون کی رحمت کا طالب اور مہربانی کا خواہاں ہوا اور یہ کہتے ہوئے کہ مادلین کی طرف مراجعت میرے امکان سے باہر ہے مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مادلین کے مال سے اپنی ضروریات پوری کروں کچھ روپیہ بطور قرض مانگا۔ لیکن اس کے بخیل و بے وفا دوست نے جسے وہ سب سے زیادہ مخلص و وفادار سمجھتا تھا اسے دھوکا دیا اور مادلین کو بذریعہ تار واقعات کی اطلاع دی اور اُسے لکھا کہ جلد از جلد اپنے محبوب دوست کی مالی اعانت کرے لوسیان کو اس تحریک کی اطلاع تک نہ دی وہ اس غرض سے کہ لوسیان کو روپیہ دیگا اور جتلائیگا کہ اپنی جیب خاص سے قرض دیا ہے ؎

بوقت تنگدستی آشنا بیگانہ میگردد

صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ میگردد

فریسون ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ ہزاروں روپیہ روزانہ اس کی آمدنی تھی باوجود اس کے اس نے یہ ذلیل حرکت کی۔ لیکن مادلین، وہ مادلین جو وفا کی دیوی تھی جس کی رگ رگ میں حق شناسی سرایت کئے ہوئے تھی اس نے تار پڑھتے ہی اپنے بقیہ زیورات کو گرو رکھا اور گھر کے قیمتی اسباب فروخت کرکے لوسیان کے لئے تین ہزار فرنک بھیجدیئے۔

لوسیان نے دھوکا کھایا۔ اس نے یہ سمجھا کہ فریسون نے اس کی حالت پر ترس کھا کر اسے یہ دیا ہے اس نے فریسون کا شکریہ ادا کیا اور اس سے اور اس کی بیوی سے رخصت ہو کر مادلین سے جا ملا۔ مادلین اسے دیکھ کر فرط مسرت سے اچھل پڑی اور انتہائی خلوص و محبت سے ملی۔

لوسیان نے قسم کھا کر مادلین کے سامنے یہ کہا کہ میں اب اپنی روزی آپ حاصل کرونگا۔ ایک ادیب کی طرح نہیں بلکہ ایک مزدور کی طرح، ایک ملازم کی طرح، ایک تاجر کی طرح۔ یہ کہہ کر وہ کام کی تلاش میں نکلا۔ اتفاق سے اسی دن کپڑے کے کارخانے میں کلرکی کے عہدہ پر ممتاز ہوگیا۔

کارخانے کے منیجر کو خوش کرنے کے لئے بڑی توجہ اور پوری محنت سے کام کرنے لگا۔ اس کا کمزور جسم روزانہ کی اس قدر سخت محنت برداشت نہ کر سکا۔ اور اسے تپ محرقہ آنے لگا۔ جس نے اسے دوبارہ صاحب فراش بنا دیا مادلین اس وقت غربت و افلاس سے گھری ہوئی تھی۔ سارا زیور بک چکا تھا اس کے پاس اب اتنا بھی نہ تھا کہ جس سے وہ لوسیان کی دوا کر سکے اور نہ کوئی ہمدرد و غمگسار تھا جو شب بیداری میں اس کا شریک ہو سکے۔

مادلین نے یہ سوچکر فریسوں کو ایک خط لکھا جس میں لوسیان کی شدت علالت اور انتہائی مفلسی کی خبر تھی اور علاج کے لئے روپیہ مانگا تھا۔ فریسون کا جواب آیا جس میں مادلین کو بُری طرح ملامت کی تھی اور اسے تہمت لگائی تھی کہ لوسیان کی بدبختی کی وجہ محض وہ ہے اس کے عشق نے اسے تباہ کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ علاج کے لئے سو فرنک تھے۔

مادلین نے اس توہین کی کوئی پرواہ نہ کی بلکہ ڈاکٹر کے بلانے میں انتہائی عجلت سے کام لیا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر جرمنی تھا جو رحمدل حاتم طبع تھا اس کی چشم بینا نے مادلین کی محبت، پریشانی اور دلی جذبات معلوم کر لئے۔ اس نے لوسیان اور مادلین کی ناگفتہ بہ حالت پر ترس کھایا اور بڑی توجہ سے بلا معاوضہ لوسیان کا علاج کرتا رہا حتیٰ کہ اسے مکمل صحت ہوگئی اور جانے کے قبل پانچ ہزار

کھٹک۔ مادلین کو دیتا گیا۔

لوسیان کو جب اس کا علم ہوا تو اس کی غیرت کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں غصہ نے عقل پر پردہ ڈال دیا۔ مادلین کو کبھی سرزنش کرتا کبھی دھمکی دیتا اور کبھی پاگلوں کی طرح بکواس کرتا۔ اسے تہمت لگاتا کہ اس نے اسے دھوکہ دیا بیماری اور کمزوری کو غنیمت سمجھا اور جرمنی ڈاکٹر سے ملتی رہی۔

عورت ڈری۔ اس نے خیال کیا کہ لوسیان کے شک و شبہ کی باد سموم اس کی محبت کے باغ کو جسے خون اور آنسوؤں سے سینچا ہے۔ لمحہ بھر میں جلا کر راکھ کر دیگی۔ اس نے تھوڑی دیر غور کیا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح ڈاکٹر کی عنایات اور مہربانیاں اس پر ظاہر کرے۔ بالآخر اس نے جھوٹ بولنے کی جرأت کی.... ہاں جھوٹ بولی، لیکن محض محبت کے تحفظ کے لئے۔ اس نے لوسیان سے یہ کہدیا کہ اس کے دوست فرسیون نے یہ روپیہ بھیجا تھا اور ایک خط فرسیون کو لکھا۔ واقعات کی اطلاع دی اور اس سے درخواست کی کہ وہ بھی تقاضائے مروت جھوٹ بولے۔

چند دنوں کے بعد لوسیان اپنے کام میں مصروف ہو گیا؛ ور مادلین ادب و فن کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی۔ رات کا اکثر حصہ غزل گوئی، افسانہ نویسی اور مطالعہ کتب میں گذارتی۔ ایک رات جبکہ افکار عالیہ اس کے دماغ میں موجیں مار رہے تھے۔ دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے لئے وجدانی کیفیت پیدا کر رہا تھا وہ لوسیان سے ملی۔ اس پر شاعری اور افسانہ نویسی کی ضرورت ظاہر کی۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹالدیا کہ مجھ میں نہ قوت ہے نہ جرأت۔ میں وہم میں مبتلا تھا جو اپنے کو ماہر افسانہ نویس اور فطری شاعر سمجھتا تھا۔ مادلین اس جواب سے مایوس نہ ہوئی۔ جرأت کرکے دوبارہ یہ کہا: "میں اپنے مخصوص طرز پر لکھونگی لیکن بلکہ تم اپنے پاکیزہ تخیلات اور لطیف جذبات سے میری مدد کرتے رہو کیونکہ تمھاری رائے قیمتی، تمھارے تخیلات اچھوتے ہیں میں جو کچھ بھی تصنیف و تالیف کرتی ہوں وہ خود نہیں کرتی بلکہ حقیقت میں تم کرتے ہو۔"

لوسیان نے مادلین کے اصرار سے مجبور ہو کر اس کی اعانت کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ گھنٹوں بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہتا اور اپنی سوانح حیات بلند کرتا کرتا رہتا۔ مادلین اسے خوش کرنے کے لئے حرف بحرف جو کچھ بیان کرتا رہتا لکھتی رہتی۔ اس کے بعد اسے اپنے نادر تخیلات کے سانچے میں ڈھالتی اور اپنے نازک اور حسین افکار سے اسے مزین کرتی۔

چند دنوں کی محنت کے بعد کتاب مکمل ہوئی اور زیور طبع سے آراستہ ہو کر شایع ہوئی۔ اس کی اشاعت نے پیرس کے ادبی حلقوں میں ہلچل ڈالدی پیرس کا کوئی رسالہ ایسا نہ تھا جس میں اس کتاب کی تعریف نہ کی گئی ہو اور کوئی ادیب ایسا نہ تھا جس نے دل کھول کر داد نہ دی ہو۔

اس کتاب کی بدولت لوسیان پر روپیوں کی بارش ہونے لگی اس کی شہرت کا ڈھنڈورہ پٹ گیا اور آسمان ادب پر مہر درخشاں ہو کر چمکنے لگا۔ ہاں لیکن مادلین نے لوسیان کی شہرت و عزت کو اپنی شہرت و عزت پر ترجیح دی اور اسے گمنامی کے تحت الثریٰ سے نکال کر شہرت کے آسمان پر پہونچا دیا اور کتاب صرف اسی کے نام سے شایع کی۔

مادلین کی کھلی کامیابی نے اس کے قلب کو وسیع، ہمت کو بلند اور تصنیف و تالیف کی جرات پیدا کر دی چنانچہ دوسری کتاب لکھی اور لوسیان ہی کے نام سے شایع کی اس مرتبہ بھی نصرت و کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

لوسیان متعجب ہو گیا اور اسے حیرت ہوئی کہ دیہات کی ایک عورت کس طرح یورپ کے ادبی حلقوں میں ہلچل ڈالدیتی اور ادیبوں کو اپنی مدح سرائی پر مجبور کر دیتی ہے۔

لیکن اس نے اس کی نہ کبھی تعریف کی، نہ اس کا ذکر کیا۔ نہ ادبی مجلسوں میں اس حقیقت کا انکشاف کیا بلکہ اسے گمنامی کے گوشے ہی میں چھوڑ دیا اور خود اس کی کوششوں اور محنتوں سے مستفید ہونے لگا۔ وہ تالیف و تصنیف میں مشغول رہتی اور دولت حاصل کرتی، اور یہ شراب و کباب میں دولت اڑاتا۔ اکثر راتیں حسینان بازاری کے مکانوں اور کلبوں میں بسر کرتا طلوع فجر کے قریب شراب کے نشہ میں مخمور گھر واپس آتا۔

اس طرح سالہا سال گذر گئے۔ اب مادلین پر کبر سنی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سر کے بالوں میں سفیدی دوڑنے لگی۔ حسرت و یاس اس کے قلب پر قبضہ کرنے لگے اس وقت اس نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا کہ محض اس بے جوڑ رشتہ کی وجہ سے اس کی پرخلوص محبت اسے کچھ فائدہ نہ پہونچا سکی؛ ور رنج و غم کے بھنور سے نہ نکال سکی۔

مادلین دل ہی دل میں کڑھا کرتی اور لوسیان رنگ رلیاں مناتا اسے تنہا مکان میں لکھتا ہوا چھوڑ دیتا اور خود حسینان بازاری کے ساتھ شراب و کباب میں رات گذار دیتا۔

ایک دن فریسون کی بیوی کا خط ملا جس میں اسے پیرس کی سیر و تفریح کے لئے دعوت دی تھی۔ چنانچہ وہ پیرس پہونچا۔ مسز فریسون اور اس کی سہیلیوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ انھیں یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ فاضل نوجوان ایک بوڑھی عورت پر عاشق ہے جو اس کی جوانی کو غارت کر رہی ہے اور اس کے عمر کے غنچہ کو اپنی کبر سنی کے بادسموم سے فنا کے گھاٹ اتار دینا چاہتی ہے۔ مسز فریسون اسے پھسلاتی بہلاتی رہی حتیٰ کہ لوسیان اس کی باتوں میں آگیا۔ جب اس نے لوسیان کے دل و دماغ پر پورا قبضہ کر لیا تو اپنی سہیلی بولین سے جو ایک حسین عورت تھی جس کا حسن جاذب نظر، جس کا شباب فتنہ انگیز اور جس کی ہر ہر ادا انسانی قلوب کو موہ لینے والی تھی، تعارف کرایا اور شادی کرنے کے لئے کہا جسے لوسیان نے بولین کے حسن سے مرعوب ہو کر منظور کر لیا۔ اس کے بعد فریسون اور مسز فریسون نے اسے مادلین سے قطع تعلق کر لینے کیلئے کہا۔

لوسیان نے مادلین کے ساتھ بیوفائی کی۔ جب اس نے دیکھا کہ کبر سنی کی وجہ سے کمزوری اس کے جسم میں حلول کر گئی ہے۔ اس کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں اور خود اس کی بدولت کافی عزت و ثروت حاصل کر لی ہے تو دوستوں کی رائے پر اسے چھوڑنے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور اسے ایک خط لکھا جس میں اپنے آخری ارادہ یعنی اس سے قطع تعلق اور بولین کے ساتھ منسلک ہونے کی خبر دی تھی۔

فریسون اس خط کو لے کر پیرس سے روانہ ہوا۔ قریہ آبلون پہونچکر مادلین سے ملا اور لوسیان کا خط اسے دیا۔ مادلین نے لوسیان کے خط کو بڑی خوشی سے لیا اور پڑھنے لگی۔ ابھی ایک سطر بھی پوری اس کی نگاہ سے نہیں گذری تھی کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ قریب تھا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑے لیکن اس نے اپنے کو سنبھالا اور نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ فریسون تمسخرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے اس وقت اس نے ایک دردناک چیخ ماری۔ حسرت و یاس اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے اور آنسوؤں کا ایک دریا اس کی آنکھوں سے رواں تھا اور وہ یہ کہہ رہی تھی۔ "لوسیان میرے لئے سب کچھ ہے۔ وہ میرا دوست بھی ہے شوہر بھی ہے، بیٹا بھی ہے۔ میری آرزوئیں اسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں اسی کی وجہ سے زندہ ہوں وہی میری زندگی کی غایت ہے"۔

لیکن فریسون کے سخت دل پر اس کا ذرا اثر نہیں ہوا جب مادلین نے دیکھا کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح خاموش کھڑا ہے اور تمسخرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو اس کے سارے بدن میں آگ لگ گئی۔ خوفناک لہجہ میں کہنے لگی۔ "بدمعاش ساری کارروائیاں تیری ہیں تو نے اسے مجھ سے چھڑایا میری نگاہوں سے دور ہو جا۔" فریسون کو مکان سے باہر نکالنے کے بعد خود ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی۔

فریسون پیرس واپس آیا۔ اس وقت عداوت و دشمنی کی آگ اس کے سینے میں مشتعل تھی۔ وہ مادلین سے انتقام لینا چاہتا تھا چنانچہ لوسیان کو مادلین کا وہ خط دکھلایا جو اس نے فریسون کو جرمنی ڈاکٹر کے گرانقدر عطیہ کے بارے میں لکھا تھا۔

خط دیکھتے ہی لوسیان کی غیرت نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مادلین کو کافی سرزنش کرے چنانچہ وہ دوستوں سے جدا ہو کر مادلین کے یہاں پہونچا اور اس کی صورت دیکھتے ہی برا بھلا کہنے لگا۔ اور تہمت لگانے لگا کہ اس نے اسے دھوکا دیا حالانکہ وہ جرمنی ڈاکٹر کی معشوقہ تھی۔

مادلین نے اپنی برأت کے لئے اپنی طرف سے ایک جملہ بھی نہیں کہا بلکہ ڈاکٹر کے حسن سلوک، فریسون کے خطوط اور سو فرنک کس طرح بھیجا مفصل طور پر بیان کیا۔ لوسیان اس عورت کی عدیم المثال قربانی دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ باقی زندگی اس کے ساتھ گزار دے گا۔ اور محبت کے حقوق کو پوری توجہ سے ادا کرنے لگا۔

دونوں گذشتہ ایام کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ مادلین نے ایک مسرت محسوس کی جس کے بعد اسے کوئی خوشی نصیب نہ ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ سیر و تفریح کو جایا کرتی۔ لوگ اسے دیکھ کر لعنت ملامت کرتے اور اس کا مذاق بناتے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اسے تکلیف و صدمہ پہونچایا جائے اور اس بلند قلعہ کو جسے اس نے اپنے قلب کے مادے سے تعمیر کیا ہے مسمار کر دیا جائے۔

تھوڑے دنوں کے بعد لہو و لعب میں زیادہ مشغول رہنے کی وجہ سے لوسیان کے اعصاب میں کمزوری کے آثار نمایاں ہوئے اور یہ کمزوری بڑھتی گئی حتیٰ کہ سرسام ہو گیا جس نے اسے دوبارہ صاحب فراش کر دیا۔

اثنائے بیماری میں ناقد ذکی جو ملک میں نارجو کے نام سے مشہور تھے اس کی عیادت کے لئے آئے اور دیر تک بیٹھے ہوئے گفتگو کرتے رہے۔ حتیٰ کہ آخری کتاب کی تعریف کرنے لگے۔ اس وقت لوسیان نے ناقد ذکی سے قریب ہو کر حقیقت کا انکشاف کیا اور کہا کہ یہ میری تالیف نہیں ہے اور نہ میں ان کا مؤلف ہوں بلکہ اس کی مؤلف مادلین ہے جو آج تک مجھ پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہی ہے

لوسیان نے یہ سوچ کر کہ اب میری موت قریب ہے نارجو کے سامنے حقیقت کے رخ سے نقاب اٹھا دیا۔ ناقد نارجو یہ سن کر متحیر ہو گیا اور جانے کا قصد کیا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ ادلین اور اس کے ساتھ مسز فریسیون اور بولین داخل ہوئی۔

حسینہ بولین لوسیان سے محبت کرتی تھی اور اس کی علالت کی خبر پاکر وہ مسز فریسیون کے ساتھ لوسیان کو بچانے کے لئے آئی لیکن اس کی نظر لوسیان کے زرد چہرے پر پڑی تو غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ادلین سے چمٹ گئی اور لعنت ملامت کرنے لگی۔ "او بڈھی، تو نے ہی اسے بیمار کیا ہے تیرے بڑھاپے نے اس کی جوانی کو غارت و برباد کیا۔ تجھے ۳۰ سالہ نوجوان پر ۵۰ سال کی عمر میں عشق کی کمند ڈالتے ہوئے شرم نہ آئی۔"

بولین کے ان جملوں نے ادلین پر رنج و غم کا پہاڑ ڈال دیا اور اسے دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ ایک دردناک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ نارجو اسے ہوش میں لانے کے لئے اس کے قریب گیا۔ مسز فریسیون بھی اس سے قریب ہو گئی اور اس نے اپنے شوہر کو اشارہ کیا جسے وہ سمجھ گیا اور مریض کے پاس آیا اسے گود میں اٹھا کر قریب کے دروازے سے باہر چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ بولین اور اس کی بیوی بھی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد نارجو متنبہ ہوا۔ اسے اس وقت پتہ چلا کس چیز نے ادلین کی روح کو اس کے جسد خاکی سے جدا ہونے پر مجبور رکھا وہ قریب کے کمرہ میں گیا لیکن وہاں کسی کو بھی نہیں پایا۔ وہاں سے دوڑ کر سڑک پر آیا یہاں ان لوگوں کو دیکھا کہ مریض کو گاڑی میں رکھ چکے ہیں۔

گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھ کر ایک خوفناک اور قلوب انسانی میں ارتعاش پیدا کردینے والی آواز سے ڈانٹ کر کہا۔ "اے غارتگرو! تم ہی نے اس کی زندگی برباد کی ہے! تم ہی نے اس کو قتل کیا ہے۔"

سالہا سال گذر گئے۔ لوسیان بولین کے ساتھ ایک عالیشان محل میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک صبح نوکر ڈاک لایا اس میں ایک اخبار بھی تھا جیسے ہی اخبار اٹھا کر ورق الٹا۔ بدن میں لرزہ پیدا کردینے والی ایک خبر پر نظر پڑی جس کا جلی عنوان یہ تھا۔

"ملک کے مشہور شاعر کی رحلت"

چند سطریں پڑھیں اور مخبر کے دستخط دیکھے تو ناقد ذکی نارجو تھے جنھوں نے لوسیان کی تصنیف کا راز عامۃ الناس پر واضح کیا تھا اور لوسیان کے دعوی کی تکذیب میں ایک مستقل کتاب لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔

لوسیان ذلت و رسوائی کے تخیل سے کانپ اٹھا۔ ہوش و حواس قابو سے باہر ہو گئے آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اس وقت اسے محسوس ہوا کہ ادلین عفت و عصمت اور وفا کی دیوی تھی۔

اس نے اپنی تمام عمر لوسیان اور محض لوسیان کے لئے وقف کی اور خود کو اس پر قربان کردیا لیکن افسوس اس نے قدر نہ کی۔

(مترجمہ) عبدالوالی

غزل

از جناب خان جمیل نعمانی رامپوری

وارفتگی میں شغلِ دل و جاں بنا دیا
ہم نے نگاہِ یار کو پیکاں بنا دیا،

میں ایسی سادگی محبت کو کیا کہوں
چاہا جب آپ نے مجھے حیراں بنا دیا،

رنگینیٔ جنوں کی صندیں آؤ دیکھ لو،
دو دن میں جس نے گھر کو بیاباں بنا دیا،

ہاں ہاں مرے جنوں کو سلیقہ بھی یاد ہے
دامن جو پھٹ گیا تو گریباں بنا دیا،

ایک ایک ابتدائے محبت کے عہد کو
افسوس تم نے خوابِ پریشاں بنا دیا،

شرما رہا ہے حوصلۂ دیدِ حسنِ یار،
اس جلوہ گاہِ ناز نے حیراں بنا دیا،

صدقے جمیل اُس نگہِ امتیاز کے
انساں بنا دیا مجھے انساں بنا دیا

نوائے راز

ازجناب ابوالفاضل راز چاندپوری

دلبر ہے کوئی یہاں نہ کوئی دلدار
صہبائے خودی سے ہے زمانہ سرشار
کیوں پائے طلب کو دے رہا ہے تکلیف
غربت میں تلاش اہل دل ہے بیکار

ارباب غرض کی دلنوازی توبہ
وہ حُسن فریب چارہ سازی توبہ
اب کوئی نہیں حریفِ دورِ آخر
توبہ، توبہ، یہ پاکبازی توبہ

ساقی! اب مجھے پینے سے تو پرہیز نہیں ہے
گلشن کی ہوا آج طرب خیز نہیں ہے

آتا ہے پئے سیر وہ گلباز تو ہر روز
اے مرغِ چمن تو ہی سحرخیز نہیں ہے

صد شکر کرم اے نگہِ ساقیٔ سرمست
یہ بادۂ گلرنگ تو کچھ تیز نہیں ہے

میخانۂ الفت ہے کہ فردوس مجسم
اس بزم میں زاہد کو بھی پرہیز نہیں ہے

آتا ہے کوئی اور پلا جاتا ہے مجھکو
وہ بادۂ صافی کہ شر انگیز نہیں ہے

یہ بادۂ شیراز، یہ چشمۂ اسرار
بدذوق کی قسمت کہ طرب خیز نہیں ہے

گلزارِ سخن میں ہے ہر اک گوش برآواز
اے راز مگر تو ہی نوا ریز نہیں ہے

روضۃ الفقہ

ایک علمی و تاریخی دلچسپ مقالہ

ماخوذ سلوان المطاع فی عدوان الاتباع صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۳۵

جب کہ خلیفہ منصور کو خبر پہونچی کہ محمد مہدی نفس ذکیہ نے مدینہ منورہ میں خروج کر کے رباح حاکم مدینہ منورہ و مسلم ابن عقبہ و عباس و غیرہ عہدہ داران، حکومت کو قید کرلیا اور بیت المال لوٹ لیا تو اسی روز یہ اطلاع بھی ملی کہ ابراہیم برادر محمد مہدی بصرہ میں خروج کی تیاری کر رہے ہیں۔ اسی دن سہ پہر کو ابو عون گورنر خراسان کا مراسلہ پہونچا کہ خراسان میں مخفی سازش بہت سرعت سے ترقی کر رہی ہے اور تمام اہل خراسان محمد مہدی کے خروج کا انتظار کر رہے ہیں۔

منصور ابھی اس مراسلہ کا مطالعہ کر رہا تھا کہ حاکم آرمینیا کی طرف سے یہ خبر موصول ہوئی کہ علاقہ حرز کے ترکوں نے علم بغاوت بلند کردیا ہے اور باب الابواب سے سرحد آرمینیا تک مسلمانوں کو قتل و غارت کرتے چلے گئے ہیں۔ ان اخبار سے چند روز پہلے اہواز و واسط و فارس پر باغیوں کے قبضہ کی خبریں وصول ہوچکی تھیں اور صوبہ سندھ و دیبل سے بھی ناخوشگوار اخبار پہونچی تھیں، غرضکہ ان متوحش خبروں نے خلیفہ منصور کو مبہوت کردیا اور اس کا صبر و استقلال جاتا رہا چنانچہ اسی اضطراب میں وہ انبار سے کوفہ میں آیا اور مجلس مشاورت قائم کی تمام ہواخواہان دولت عباسیہ و اعیان مملکت جب جمع ہوئے تو منصور نے کل مراسلت ان کے سامنے ڈالدی۔

وزرائے مملکت جب ان حالات پر مطلع ہوئے تو ان کی عقلیں گم ہوگئیں مگر باوجود اس کے ہر ایک وزیر نے صواب و غیر صواب جو کچھ اس کا تجربہ و رائے تھی پیش کی۔ لیکن ان میں سے کوئی رائے بھی منصور کو پسند نہ آئی۔ مجلس کو برخواست کر کے وہ سیدھا اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا اور اپنے ایک خادم خاص سے کہا کہ تو اپنی شکل تبدیل کر کے چلا جا اور باب الطرق (چوراہہ) پر کچھ دیر ٹھہر تمام راستوں پر نظر ڈالتا رہ اور جو لوگ گذریں ان کو دیکھتا رہ یہاں تک کہ تو جس وقت کسی ایسے معمر یا ادھیڑ شخص کو دیکھے کہ ٹوٹی پھوٹی ہیئت رکھتا، کپڑوں پر پیوند لگے مگر صاف و اجلے کپڑے پہنے ہوئے آہستہ آہستہ سر نیچا کئے چلا جاتا ہے تو اس کے پاس پہونچ اور سلام کر اور چپکے سے کہہ کہ امیر المومنین نے آپ کو بلایا ہے پس اگر وہ جلدی سے اس بات کو قبول کرے تو اس کو میرے پاس لے آ اور اگر وہ توقف و دیر کرے یا معارضہ و تنگ کرے تو اس کو چھوڑ دینا اور اس کے سوا دوسرے شخص کو تلاش کرنا یہاں تک کہ جو شرط میں نے بیان کی ہے اس کے موافق کوئی آدمی مل جائے۔

خادم نے حکم کی تعمیل کی اور ۹ بجے شب کے وقت مطابق وصف و شرط ایک شخص کو لے آیا۔

نووارد نے شاہی ادب و طریقہ کے لائق سلام ادا کیا اور کھڑا رہا۔ منصور نے اس کو قریب ہونے اور بیٹھنے کا حکم دیا اور اس قدر توقف کیا کہ نووارد کا خوف جاتا رہا اور اس کا قلب ساکن ہوگیا۔ پھر منصور اس پر متوجہ ہوا اور کہا کہ کیا آپ خلفا کی مسامرت کرسکتے ہیں۔ نووارد نے کہا کہ ہاں امیر المومنین اگر خدائے برتر نے عقول کو نفوذ سے نہیں روکا تو میں بہت اچھی طرح کرسکتا ہوں۔ منصور نے اس سے کہا کہ اگر آپ عمدہ طور سے مسامرت کرسکتے ہیں تو پہلے ہم کو مسامرت سے خبر دو کہ وہ کیا چیز ہے۔ نووارد نے کہا کہ جو ساکت و صامت خاموش ہو اس کو کسی چیز کی خبر دیں اور جو کسی بات کی خبر دیتا ہو اس کے لئے خاموش رہیں اور صبر سے اس کی بات سنیں اور اہم و لائق امور میں باہم مشورہ کرتے رہیں۔ منصور نے اس سے کہا کہ آپ نے خوب کہا اب میں آپ کا زیادہ امتحان

لینا نہیں چاہتا۔ آپ جو کچھ کہیں ہم آپ کی باتیں خاموشی و صبر سے سنیں گے نووارد نے کہا کہ اے امیرالمومنین مسامرت کی دو ہی قسمیں ہیں۔ تیسری قسم نہیں۔ پہلی قسم تو یہ ہے کہ ایسی بات کی خبر دے جو کہ کسی سنی ہوئی خبر کے موافق ہو۔ دوسری قسم یہ ہے کہ ایسی بات کی خبر دے جو کسی غرض خاص و مطلوب کے مطابق ہو اور میں نے امیرالمومنین کے حضور میں کوئی حدیث و قصہ نہیں سنا ہے کہ میں اس کی مثال پر چلوں اور نہ امیرالمومنین نے کسی نہج پر چلنے کی مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اس راہ پر مائل ہوں اس کے طرز و اسلوب کو لازم پکڑوں۔

منصور نے فرمایا کہ آپ نے ٹھیک کہا، اب میں آپ کو خبر دیتا ہوں کہ ہماری مملکت کے فلاں فلاں ناحیہ میں بغیر کسی عذر و حجت کے ہمارے اخوان و اعیان نے طغیان و سرکشی کی۔ بیعت کو توڑ ڈالا اور تمام مسلم رعیت کو عیب دار کر دیا۔ دوسری طرف اس طاغی جماعت سے خود ہمارے چچا عبداللہ بن علی نے علم بغاوت بلند کر کے ملک شام پر قبضہ کر لیا ہے۔ کیا آپ کو یہ خبریں پہونچی ہیں نووارد نے اثبات میں جواب دیا۔ منصور نے کہا کہ پھر جو تدابیر آپ مناسب جانتے ہوں انہیں بیان کیجئے۔

حکایت نووارد نے کہا کہ اے امیرالمومنین مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ جب عبدالملک بن مروان نے عبداللہ ابن زبیر پر فوج کشی کی تیاری کی اور ایک لشکر جرار لے کر مکہ کی طرف کوچ کیا تو اس نے عمرو بن سعید کو (جو رشتہ میں عبدالملک کا چچا ہوتا تھا اور جس نے عبدالملک کی بیعت کر لی تھی اور اسی وجہ سے عبدالملک بھی اس کی عزت و حرمت کرتا اور صلہ رحم و شفقت کے تمام مراتب بجا لاتا تھا) ساتھ لیا۔ مگر عمرو کی نیت میں فساد تھا طمع خلافت کو ہوشیاری و چالاکی سے چھپائے ہوئے تھا۔ عبدالملک دمشق سے روانہ ہو کر کئی منزلیں مکہ کی طرف چل چکا تو عمرو بن سعید بیمار بنا اور عبدالملک سے دمشق لوٹنے کی اجازت چاہی اگرچہ عبدالملک کو اس کی نیت پر شبہہ ہو چکا تھا مگر تاکید حرمت کی وجہ سے عمرو کو اجازت دیدی۔

عمرو بن سعید نے دمشق میں داخل ہوتے ہی تمامی امرا و اعیان دمشق کو جمع کر کے ایک فصیح و بلیغ خطبہ سنایا جس میں شرح و بسط کے ساتھ خلیفہ عبدالملک کے عیوب، اس کے تشدد و مظالم کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اپنے مستحق خلافت ہونے اور عامہ رعایا سے شفقت و مہربانی عدل و انصاف پر قائم رہنے کا اقرار کیا۔ حاضرین نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ عبدالملک کی بیعت کو فسخ کر کے عمرو بن سعید کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہاں تک کہ دمشق اور اس کے علاقہ پر وہ غالب و مستولی ہو گیا۔ شہر کی فصیلوں کو مضبوط کیا سرحدوں کی پوری پوری ناکہ بندی کی۔ فوج و رعایا کو بہت کچھ عطایا تقسیم کئے یہ خبر عبدالملک کو اس وقت پہونچی کہ وہ ابن زبیر کی طرف نصف منزلوں سے زیادہ راستہ طے کر چکا تھا۔ ساتھ ہی یہ خبریں بھی پہونچیں کہ نعمان والی حمص نے بھی بیعت توڑ دی اور اہل سرحدات بھی بغاوت پر آمادہ ہیں۔ جب یہ وحشتناک اطلاعیں سنیں تو عبدالملک ایک تازیانہ ہاتھ میں لئے ہوئے جس سے وہ اپنے کو مارتا جاتا تھا خیمہ سے نکلا اور وزرائے سلطنت کو جمع کر کے ان سے کہا کہ دارالسلطنت پر عمرو متصرف ہو گیا اور عبداللہ ابن زبیر کی بیعت حجاز و عراق و خراسان پر قائم ہو گئی اور نعمان امیر حمص اور زفر بن حارث امیر قیسرین نے اپنے اپنے ہاتھ اطاعت سے کھینچ لئے۔ مصر والے مقتولین مرج کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

وزرا نے خلیفہ کی تقریر سنی تو ان کی عقلیں کھو گئیں اور جان لیا کہ اب نہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے نہ بھاگنے کا ٹھکانہ۔ سب کے سب سرنگوں ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ عبدالملک نے کہا کہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ مجھے جواب نہیں دیتے حالانکہ تمہاری عقل و تدبر کا یہی وقت ہے۔ اور آج کا دن تمہاری طرف میری حاجت کا ہے۔

ان میں سے رئیس الوزرا نے عرض کیا کہ اس وقت ہمارے پاس کون سی قابلیت ہے جسے امیرالمومنین کے حضور میں پیش کر کے ہم سرخ رو ہوں خدا کی قسم میں دوست رکھتا ہوں کہ حجانہ کے درختوں میں سے کسی درخت کی شاخ پر گرگٹ[1] ہوتا تاکہ یہ فتنے نہ دیکھتا۔

عبدالملک نے جس وقت اپنے افضل وزیر کی یہ تقریر سنی تو جان لیا کہ وزرا رائے دینے سے عاجز ہیں تو ان کو حکم دیا کہ اس مجلس میں سب جمع رہیں

---

[1] گرگٹ کی خاصیت یہ ہے کہ جب سورج طلوع کرتا ہے تو وہ کسی لکڑی یا پتھر پر چڑھ کر اپنی آنکھوں سے سورج کو تاکتا رہتا ہے اور ایک لحظ کیلئے بھی نگاہ کو نہیں ہٹاتا یہاں تک کہ سورج جب فلک اعلیٰ میں مستوی ہوتا ہے اور گرگٹ سورج کو نہیں دیکھ سکتا تو سخت بے چین ہوتا ہے اور اپنی زبان کو تالو سے مارتا ہے یہاں تک کہ سورج ڈھل جاتا ہے تو گرگٹ بھی پھر کر سورج کو تکنے لگتا ہے تاآنکہ سورج غروب ہو جاتا ہے اس وقت گرگٹ اپنا رزق تلاش کرتا ہے۔

اور کوئی کہیں اٹھ کر نہ جائے اور خود گھوڑے پر سوار ہوا اور چیدہ چیدہ سرداروں کو اپنے ساتھ لے کر انھیں ہدایت کی کہ وہ اس قدر فصل سے پیچھے آئیں کہ جب ان کی طرف اشارہ کیا جائے تو وہ اسے سمجھ لیں۔ غرضکہ عبدالملک ایک طرف چلتا رہا یہاں تک کہ ایک وادی میں دیکھا کہ ایک شیخ مسن ضعیف الجسم سماق درخت سے جمع کر رہا ہے۔ عبدالملک نے اسے سلام کیا اور مختصر بات چیت کر کے اسے مانوس کیا۔ پھر پوچھا کہ یا شیخ تم کو کسی لشکر کے اترنے کا کچھ علم ہے شیخ نے کہا کہ ہاں مجھے علم ہے کہ امیرالمومنین فلاں میدان میں فروکش ہیں۔

عبدالملک نے کہا کہ لوگ امیرالمومنین کے بارے میں کچھ کہتے ہیں اور آپ نے بھی اس کی بابت کچھ سنا ہے۔ شیخ نے کہا کہ تم کیوں پوچھتے ہو۔ عبدالملک نے کہا میں آج کل بعض ایسے افکار و مصائب میں مبتلا ہوں جس کی وجہ سے میں نے خلیفہ سے ملنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ خلیفہ کی نظر میں اگر میرے معلومات و تجربات پسند آئیں تو کیا عجب ہے کہ وہ مجھے اپنے مصاحبوں میں داخل کر لے اور کوئی فائدہ مجھے حاصل ہو جائے۔

شیخ نے کہا۔ میں آپ کو ادیب و حسیب دیکھتا ہوں پس جس بات کا آپ قصد کر رہے ہیں کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ اس میں آپ کو نصیحت کروں عبدالملک نے کہا کہ بخدا میں آپ کی ہدایات کا بہ غائت حاجتمند ہوں۔ شیخ نے کہا کہ لائق تر یہ ہے کہ جس بات کی طرف آپ کے نفس نے رغبت کی ہے جہاں تک ممکن ہو اپنے نفس کو آپ روکئے کیونکہ جس شخص کی اطاعت کا آپ نے ارادہ کیا ہے اس کے ملک کا نظم بگڑ گیا ہے۔ اس کے تابعین نے اسے چھوڑ دیا ہے اس کے امور مضطرب و پریشان ہو گئے ہیں اور بادشاہ اپنے اضطراب میں ایسا ہوتا ہے جیسے دریا جوش و طغیانی کے وقت اس حالت میں زیبا نہیں ہے کہ کوئی عاقل اس کے قریب جائے۔

عبدالملک نے کہا کہ اے شیخ اجل تجربات دنیا نے ابھی مجھے اس قابل نہیں کیا کہ جس شے پر میرا نفس مائل ہو میں اس پر غالب آجاؤں اور اس خواہش سے نفس کو روک لوں میں جہاں تک دیکھتا ہوں خلیفہ کی ملازمت کے لئے میرا نفس سخت شائق و آرزومند ہے پس آپ مجھ پر یہ احسان فرمایئے اور ایسی رائے بتلایئے کہ اس وقت خلیفہ پر جو حوادث و مصائب یکبارگی ہجوم کر آئے ہیں ان میں خلیفہ کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اور کس قسم کا برتاؤ اس موقع پر ملک و باغی رعیت سے کرے۔ میری غرض اس دریافت سے یہ ہے کہ میں اس رائے کو خلیفہ کے حضور میں پیش کروں اور ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی نظر میں وقعت حاصل کر سکوں۔ اور شاید میرے تقرب کا یہی سبب ہو۔

شیخ نے کہا کہ بعض اوقات خدائے تعالےٰ کی حکمت مقتضی ہوتی ہے کہ بعض حوادث میں عقلیں نفوذ سے روک دی جاتی ہیں۔ میں گمان کرتا ہوں کہ یہ حوادث جو خلیفہ پر نازل ہوئے ہیں اسی قسم کے ہوں جن میں عقلیں کام نہیں کرتیں نہ صواب کی طرف راستہ پاتی ہیں، مگر باوجود اس کے مجھے یہ بھی برا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سوال کو بغیر جواب کے رد کر دوں پس جس بات کا آپ نے سوال کیا ہے میں اس میں ایک ایسی بات کہتا ہوں جس سے آپ کی رغبت کا حق ادا ہو جائے۔ اگرچہ میں خود اپنے نفس پر اس بات کا اعتماد نہیں کر سکتا کیونکہ حادثہ بہت ہی سخت ہے اور اس میں غلطی کرنا اس سے بھی زیادہ سخت و برا ہے۔

عبدالملک نے کہا کہ آپ تو کہہ ڈالئے۔ خدائے برتر یقیناً آپ کو راہ راست دکھائیگا۔ اور آپ کے سبب سے صواب و بہبودی کی طرف میری رہنمائی کریگا شیخ نے کہا کہ یہ خلیفہ اپنے دشمن ابن زبیر سے لڑنے کے لئے نکلا۔ اللہ تعالےٰ کی مشیت سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جس امر کا قصد اس نے کیا ہے فی الحال خدا اسے نہیں چاہتا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اس نے خلیفہ کو انتہا تک پہونچنے سے پہلے اس کے خود دارالسلطنت و قرب و نواح میں چند حادثے پیدا کر دیئے اور روک دیا۔ ان حوادث کے ہوتے ہوئے اب خلیفہ کا ابن زبیر تک مکہ میں پہونچنا مناسب نہیں ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بالفعل خدا کو منظور نہیں ہے کہ ابن زبیر کی مہم کا فیصلہ ہو، اس لئے میں آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ خلیفہ کے حال کی خبر رکھیں اور جو بات اس سے صادر ہو اس کا انتظار کریں۔ اگر آپ دیکھیں کہ خلیفہ جس مہم کے لئے نکلا ہے اس پر اسے اصرار و ضد ہے اور ابن زبیر ہی کے پیچھے وہ اڑا ہے تو سمجھ لینا کہ اسے ذلت و خواری نصیب ہوگی اور ابن زبیر پر وہ ہرگز منصور نہ ہوگا اور اس صورت میں خلیفہ کی قربت و صحبت سے اجتناب ضروری ہے اور اگر آپ دیکھیں کہ وہ عمرو بن سعید اور دوسرے باغیوں کی طرف پلٹ پڑا تو اس کی سلامتی کی امید رکھنا۔

عبدالملک نے کہا۔ اے شیخ خلیفہ کا رجوع طرف دمشق و حمص وغیرہ کے ایسا ہی ہے جیسا کہ طرف ابن زبیر کے جانا کیونکہ خدا کی مشیت ہی

سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جو رعیت اس کی دمشق و حمص و قنسرین میں ہے اس کے دلوں کو خلیفہ کی اطاعت سے قبض کر لیا ہے اور ان کے ہاتھوں کو دشمنوں کی بیعت کے لئے کھول دیا ہے۔ سو اس کا ابن زبیر کی طرف جانا مثل اس کے رجوع کے ہے طرف عمرو بن سعید وغیرہ کے کیونکہ ان میں ہر ایک مملکت و رعیت پر متصرف ہو گیا ہے۔

شیخ نے کہا کہ عبدالملک جب ابن زبیر کی طرف قصد کریگا تو وہ ظالم کی صورت میں ہوگا کیونکہ ابن زبیر نے نہ تو عبدالملک سے بیعت کی تھی نہ عبدالملک کے باپ مروان کی بیعت میں وہ داخل ہوا تھا جسے اب ابن زبیر نے توڑ دیا اور اس کی مطبوع رعیت کو فاسد کر دیا اور جب وہ عمرو و امیر حمص و قنسرین کا قصد کریگا تو مظلوم کی صورت میں ہوگا کیونکہ عمرو وغیرہ نے اس کی بیعت کو توڑ ڈالا۔ اس کی امانت میں خیانت کی اور اس کی رعیت کو فاسد و عاصی کر دیا۔ بیعت توڑنے و بدعہدی کرنے پر آمادہ کیا اس کے دارالسلطنت پر کود پڑا جو کہ نہ اس کا تھا نہ اس کے باپ کا بلکہ وہ تو عبدالملک اور اس کے باپ کا اس سے پہلے تھا۔ اس لئے یہ سب معتدی یعنی حد سے بڑھنے اور غصب کرنے والے ہیں اور ضرب المثل ہے کہ سمین الغصب مخزول وانی الغدر معزول یعنی غصب کی فربہی کمزوری اور بغاوت کا حاکم معزول ہے۔ چنانچہ آپ کی تسلی خاطر اور ترک و شبہ دور کرنے کے لئے میں ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔

وادی یمامہ کی ایک سوراخ میں ایک گیدڑ رہتا تھا جس کا نام شترہ تھا وہ اس سوراخ کو بہت پسند کرتا تھا اور اس مقام کو ترک نہیں کرنا چاہتا تھا ایک دن غذا کی تلاش میں نکلا۔ جب واپس آیا تو سوراخ میں ایک بھجنگ (سانپ) کو پایا۔ اس کے نکلنے کا انتظار کیا۔ وہ نہ نکلا۔ منت سماجت کی مگر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا آخر گیدڑ نے سمجھ لیا کہ سانپ نے اس کو اپنا وطن ٹھہرا لیا۔ قاعدہ ہے کہ سانپ خود سوراخ نہیں بناتا بلکہ غیر کے سوراخ میں گھس کر غصب کر لیتا ہے اور جس حیوان کا وہ سوراخ ہوتا ہے اسے وہاں سے بھگا دیتا ہے اسی لئے ہندی مثل ہے "کھود کھود مرے اوندرا راج کرے بھجنگ"۔ شترہ نے جب یقین کر لیا کہ سانپ نے سوراخ کو اپنا وطن کر لیا تو وہ اپنے لئے دوسرا ٹھکانہ تلاش کرنے نکلا۔ پھرتے پھرتے آخر ایک سوراخ کو دیکھا کہ گھنے درختوں کا اس پر سایہ ہے۔ صاف پانی کا چشمہ جاری ہے اسے یہ سوراخ بہت پسند آیا دریافت پر معلوم ہوا کہ حرہ نامی ایک گیدڑ کی ملکیت ہے جسے اپنے باپ سے میراث میں ملا ہے شترہ نے اسے پکارا۔ وہ اس کے پاس آیا اور مرحبا کہہ کر اس کو سوراخ کے اندر لے گیا اور خاطر و مدارات کر کے آمد کی وجہ پوچھی۔

شترہ نے تمام قصہ بیان کیا اور سانپ کو دفع کرنے اور اس سے اس ظلم کا بدلہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حرہ نے اس کی مصیبت و تکلیف پر تاسف کیا اور کہا کہ فی الواقع یہ بات ہمت کی ہے کہ دشمن سے انتقام لینے میں قصور نہ کیا جائے۔ مکافات کے طلب میں مرنا عار و ننگ کے جینے سے بہتر ہے۔ پس میری رائے یہ ہے کہ میں تیرے ساتھ تیرے گھر کی طرف چلوں جو کہ تجھ سے غصباً چھین لیا گیا ہے۔ شاید اسے دیکھ کر کوئی تدبیر دشمن کے نکالنے کی ذہن میں آجائے۔ کیونکہ افضل تدبیر وہ ہے جس کی بنیاد غور و فکر پر رکھی جائے۔ غرض کہ شترہ و حرہ دونوں اس سوراخ پر پہونچے اور غور و تامل سے دیکھا اور حرہ نے جو کچھ معلوم کرنا چاہا وہ معلوم کر لیا اور شترہ سے کہا کہ میں نے تیرے مسکن کو دیکھ لیا ہے اور تدبیر بھی ذہن میں آگئی ہے، شترہ نے پوچھا کہ وہ کیا تدبیر ہے۔ حرہ نے کہا زیادہ تر کمزور وہ رائے ہے جو کہ فی البدیہہ ظاہر کر دی جائے۔

حکمت ۔ کہتے ہیں کہ رائے عقل کا آئینہ ہے اگر تو جس شخص کی عقل کی صورت دیکھنا چاہتا ہے تو اس سے مشورہ لے کہتے ہیں کہ بہترین رائے وہ ہے جس کی پرکھ فکر نے خوب کی ہو اور غور و سوچ نے اس کی گرہ کو مضبوط کیا ہو۔

حکمت ۔ رائے عقل کی تلوار ہے اور چونکہ تلواروں میں زیادہ کاٹنے والی وہ تلوار ہوتی ہے جس کی باڑھ کے تیز کرنے میں مبالغہ کیا گیا ہو اور اس کی صیقل اچھی طرح کی گئی ہو اس لئے رایوں میں بھی وہی رائے زیادہ سود مند ہوتی ہے جس کا امتحان کثرت سے کیا گیا ہو اور اس پر غور و تدبیر زیادہ عرصہ تک ہوا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس رائے کو فکر نے چوبیس گھنٹہ بلویا یعنی متھا نہ ہو وہ ادھورا بچہ ہے۔

غرضکہ حرہ نے شترہ سے کہا کہ آج کی شب تو میرے مکان پر میرے ساتھ رہ تاکہ جو تدبیر میں نے سوچی ہے میں رات بھر اس پر نظر و غور کر لوں شترہ نے قبول کر لیا۔ حرہ تو رات بھر اپنی سوچی ہوئی تدبیر پر غور و فکر کرتا رہا۔ اور یا جی شترہ نے حرہ کے گھر کو تاکنا شروع کیا۔ دیکھا کہ گھر فراخ و کشادہ ہے

حس وخاک سے پاک۔ ایک طرف کھانے پینے کا کافی ذخیرہ ہے اور راحت و آرام کا تمام سامان مہیا ہے۔ یہ گھر اس کو دل وجان سے پسند آیا اور اب اس کی حرص ورگ خباثت اس بات پر متحرک ہوئی کہ کسی حیلہ وتدبیر سے اس مامن کو حرہ سے چھین لیا جائے غرضکہ شرہ نے تمام رات حرہ کو اس کے موروثی گھر سے نکال دینے کی ترکیبوں وتجویزوں میں بسر کی۔

حکمت ۔ دانشمند کی شان یہ ہے کہ پہلے آزمائش وتجربہ کر لیتا ہے یعنی کسی شے سے دوستی نہیں کرتا جب تک کہ اسے قابل اعتماد نہ بنا لے حکماء نے کہا ہے کہ جب برائی طبعی ہوتی ہے تو کوئی احسان حتیٰ کہ فدیہ جان بھی اس کے دفعیہ کا مالک نہیں ہوتا۔ بسا اوقات جن محسنوں نے محسنوں کی جان بچائی محسنوں نے قلیل سے قلیل معاوضہ کے لئے محسن کی جان لے لی۔ الغرض صبح ہونے پر حرہ نے شرہ سے کہا کہ میں نے تیرے سوراخ کو دیکھا وہ درختوں اور سبزہ زار سے دور اور ادا اس مقام ہے تو اپنے ضمیر کو اس طرف سے ہٹا لے۔ میں اپنے سوراخ کے قریب ہی تیرے لئے دوسرا گھر بنانے میں اعانت کرونگا۔ یہاں سب اسباب راحت میسر ہیں۔ شرہ کی تو نیت ہی کچھ اور تھی مکاری سے کہنے لگا۔ حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر۔ میرا مکان اگر مجھے نہ ملا تو یقیناً اس کی مفارقت میں میری جان جائیگی۔ حرہ نے اس بیچینی محبت وطن کے لئے شرہ کو عزت کی نظر سے دیکھا اور حب وطن کی تعریف کرتے ہوئے کہ آؤ ہم تم آج لکڑیاں جمع کر کے لائیں اور شب ہوتے ہی ایک شعلہ آگ سے لے کر تمہارے گھر کی طرف چلیں۔ اس قرارداد کے مطابق دونوں نے دو گٹھے لکڑی کے جمع کر کے باندھے اور حرہ کے سوراخ کے سامنے رکھدیئے۔ رات ہونے پر حرہ بستی میں آگ لینے گیا۔ یہاں شرہ نے جو منصوبہ باندھا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہوا۔ یعنی جس وقت حرہ بستی کی طرف روانہ ہوا تو شرہ نے ایک گٹھہ کو دور لے جا کر کسی جگہ چھپا دیا۔ دوسرے گٹھہ کو دروازہ سوراخ پر لا کر خود سوراخ میں گھسا اور پھر گٹھہ سے ایک ایک لکڑی اندر سوراخ میں کھینچکر دروازے کو خوب مضبوطی سے باین خیال بند کر دیا کہ حرہ جب واپس آئیگا اور اندر جانے کے لئے اسے راستہ نہ ملے گا تو زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکے گا کہ مکان کا محاصرہ کر لے مگر کب تک، گھر میں مہینوں کی خوراک موجود ہے۔ مجبور ہو کر آخر کار کوئی اور گھر ڈھونڈھ لیگا اور اس پر فضا مکان پر میرا دائمی قبضہ ہو جائے گا۔ حالانکہ شرہ کی حرص بغاوت وظلم نے اس رائے کے فساد سے اسے غافل رکھا کہ جس فعل کو وہ کر رہا ہے وہ وہی ہے جس کا قصد حرہ نے دشمن یعنی سانپ کے لئے کیا ہے۔

حکماء نے کہا ہے کہ اکثر تدبیریں فاسد پڑتی ہیں اس لئے ہر ایسے وار سے جسے تو دشمن پر کرنا چاہتا ہے اول تو اپنی حفاظت کر اس لئے کہ بہت سے ہلاک ہونے والے ہیں اس تدبیر سے جسے اوروں کے لئے کی۔ اور بہت گرنے والے ہیں کنوئیں میں جن کو دوسروں کے لئے کھودا اور بہت سے لوگ زخمی ہوتے ہیں ان ہتھیاروں سے جنھیں دوسروں کے لئے کھینچا۔ پس شرہ نے تو یہ تدبیر کر کے اطمینان حاصل کیا اب جو نیک نہاد حرہ بستی سے آگ لے کر آیا تو نہ شرہ کو پایا نہ لکڑی کے دونوں گٹھوں کو وہاں دیکھا۔ خیال کیا کہ میری تکلیف کی وجہ سے شرہ خود ہی دونوں بوجھ خود اٹھا کر لے گیا۔ اس خیال کے آتے ہی حرہ شرہ کی امداد کے لئے آگ کا شعلہ وہیں چھوڑ کر چلا مگر پھر اُسے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ہوا آگ بجھا دے اور بستی کی طرف جانا پڑے اس نے آگ کو سوراخ میں رکھ کر تھوڑا گھاس پھوس اس پر ڈال دیا تاکہ آگ روشن رہے اور یہ انتظام کر کے حرہ جلد جلد چل دیا تاکہ شرہ سے جا ملے اور لکڑیاں پہونچانے میں مدد دے۔ یہاں یہ ہوا کہ شعلہ لکڑیوں سے قریب تھا۔ وہ لکڑیوں کو لگ گیا۔ اور بے وقوف غاصب سوراخ میں جل بھن کر رہ گیا اور اس کا مکر اسی پر نازل ہوا۔

جس وقت حرہ کو اپنے دوست کے حال پر اطلاع ہوئی تو اس نے کہا کہ نہ دیکھا میں نے بغاوت کے مانند کوئی ہتھیار کہ جو زیادہ کارگر ہو اپنے اٹھانے والے پر اسی لئے حکماء نے کہا ہے کہ باغی کر بیٹھنے والا ہے موت کو اپنے گھر کی چھری سے

حکمت :- کہا ہے کہ ہر لغزش کھانے والے کے لئے کوئی نہ کوئی رحم کرنے والا ہے مگر باغی کہ اس کے گرنے کی خوشی پر سارے دل متفق ہیں۔ حکماء نے فرمایا ہے کہ بغاوت نہیں دیتی کسی کو کوئی شے مگر یہ کہ اس کی کئی چند اس سے لے لیتی ہے۔

شیخ نے اس قصہ کو بیان کر کے کہا کہ عمرو بن سعید کی مثل مکر و بغاوت میں ایسی ہی ہے جس کا برتاؤ اس نے عبد الملک سے کیا اور اس کے دار السلطنت پر کود پڑا اور اس کے بیوت واموال وتخت خلافت کو غصب کر لیا اور عبد الملک جو ابن زبیر کی طرف چل رہا ہے تو اس کا اس قصد پر اصرار ایسا ہے جس سے عمرو کا پورا پورا غلبہ ہو جائے گا اور تسلط مضبوط ہوگا۔

حالانکہ عبدالملک کی عزت خود عمرو کی عزت تھی اور اس کا ملک عمرو کا ملک تھا پس عمرو نے وہ کام کیا جو شر نے حرہ کے ساتھ کیا تھا۔

عبدالملک نے جب شیخ کی یہ تقریر سُنی اور جو حکمتیں کہ شیخ نے اُس میں بیان کی تھیں تدبر و بصیرت سے ان کو دیکھا تو بہت ہی خوش ہوا اور متوجہ ہو کر شیخ سے کہا کہ خدائے تعالےٰ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ اپنا پتہ و مکان مجھے تبلائیں تاکہ آج کے بعد میں پھر آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔ شیخ نے کہا کہ اس سے آپ کی کیا غرض ہے اور دوبارہ کس لئے آپ ملنا چاہتے ہیں عبدالملک نے کہا کہ مجھے امید ہو گئی ہے کہ آپ کی رائے کے وسیلے سے میں خلیفہ کا تقرب حاصل کر سکونگا۔ اور اس وقت خلیفہ سے جو نفع حاصل ہو میں چاہتا ہوں کہ اس سے آپ کے احسان کی مکافات کروں۔ شیخ نے کہا کہ میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ کبھی کوئی شے بخیل سے قبول نہ کروں۔ عبدالملک نے کہا کہ آپ نے میرا بخل کیونکر معلوم کیا۔ شیخ نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ گھوڑے کے علاوہ بہت سی قیمتی اشیاء آپ کے پاس موجود ہیں اگر آپ مکافات ہی کرنا چاہتے تھے تو کون سا امر مانع تھا کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے عطا سے صلہ دیدیتے عبدالملک نے کہا کہ بخدا مجھ سے غفلت ہوئی۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے کمر سے ایک تلوار نکال کر پیش کی اور کہا کہ اسے آپ قبول فرمائیں اور اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ قیمتی نہیں ہے اس کے قبضے میں جو جواہر جڑے ہوئے ہیں ان کی قیمت دس ہزار دینار ہے۔ شیخ نے کہا کہ آپ تو مجھے اور میرے رب کو چھوڑ دیں، جو نہ بخل کرتا ہے نہ کبھی ذاہل و غافل ہوتا ہے۔ عبدالملک نے جب شیخ کی یہ تقریر سنی تو اس کے فضل و استغنا کو سمجھ گیا اور اس سے کہا کہ میں خود عبدالملک ہوں آپ مجھ پر اعتماد کریں اور اپنی حاجتیں ظاہر کرنے میں کوئی تکلف نہ کریں۔ شیخ نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں بھی عبدالملک ہوں آؤ ہم دونوں اپنی حاجتیں، اسی ذات اعلیٰ کی طرف پہونچائیں جس کے میں اور آپ دونوں بندے ہیں۔

غرضکہ منصور نے جب یہ سب تقریر سنی تو اس نے نووارد کی عقل کو راجح و گراں پایا۔ اس کا نام و نسب پوچھا اس نے سب کچھ بتایا مگر منصور نے اس کو نہ پہچانا تو شرمایا اور کہا کہ جو امیر اپنی رعیت سے تم جیسے آدمی کو نہ پہچانے وہ بیشک عاقل و منظم نہیں ہے۔ نووارد نے کہا کہ اے امیرالمومنین بادشاہ و ملوک و امراء انھیں لوگوں کو جانتے پہچانتے ہیں جو ان کے دروازوں کو گھیرتے اور آس پاس لگے لپٹے رہتے ہیں۔ منصور نے کہا کہ بخدا یہ کوئی خوبی کی بات نہیں ہے اور آپ ہم سے ایسا عذر وسیع نہ کریں جس کے مستحق ہم نہیں ہیں پھر اس نے نووارد کو معجل صلہ دینے کا حکم دیا اور اس سے عہد لیا کہ در دولت پر لازم رہے۔ چنانچہ منصور اس کے ادب و مواعظ کو سنتا اور اس کے مشورول پر عمل کرتا۔ اسی کی صائب رائے سے منصور نے تمام باغی امیروں کے پاس عموماً اور محمد مہدی نفس ذکیہ کے پاس خصوصاً امان نامے بھیجے۔ عفو و درگذر و صلہ رحم کی امید دلائی۔

ترغیب و تحریص سے اکثر والی و حکام راہ راست پر آگئے، جن لوگوں نے ان عنایات کے باوجود ضد و ہٹ کی اور طغیان و سرکشی سے باز نہ آئے ان کی طرف داعی بھیجے گئے جنھوں نے طرفدار رعیت کے اندر پھوٹ ڈالدی۔ پھر جو کچھ ان باغیوں کا انجام اور جس حد تک ابوجعفر منصور کی سلطنت و خلافت کو استحکام ہوا کتب تاریخ میں محفوظ ہے۔

(ماخوذ سلوان المطاع فی عدوان الاتباع صفحہ ۱ تا ۱۵)

نذرِ تبانِ حرم!

ناظم الملک ابو الاقبال حضرت علامہ عیش فیروزپوری

تو مرے دل کی جان ہے پیارے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

نام جس کا ہے کعبۂ مقصود
وہ ترا آستان ہے پیارے

کہے جائینگے مدعا دل کا
مُنہ میں جبتک زبان ہے پیارے

میرے دل سے نہ کھینچ تیر اپنا
ایک کی ایک جان ہے پیارے

آفتِ جاں ہے دن جدائی کا
ایک سال ایک آن ہے پیارے

آج دکھلادے آخری دیدار
آج آنکھوں میں جان ہے پیارے

حسرتوں کا یہ داغ سینے میں
دوستی کا نشان ہے پیارے

اور ہے کون خانۂ دل میں!
یہ ترا ہی مکان ہے پیارے

ہر ادا تیرے حسنِ دلکش کی،
دوست دشمن کی جان ہے پیارے

نزع کے وقت تیرا آجانا،
زندگی کا نشان ہے پیارے

تیری تعریف میں غزل کہنا
عیش کا امتحان ہے پیارے

افسانہ کی تکمیل

از جناب صابر کوسگوی،

میرے یورپ کی واپسی کے بعد مسلسل ایک ہفتہ تک مہمانوں کا تانتا لگا رہا۔ میری کامیابی سے احباب واقارب بیحد مسرور ہوئے۔ کئی دن تک مبارکباد دی جاتی رہی اور میرے والد کی خدمت میں اتنے تحفے پیش کئے گئے کہ اس کا شمار میں یاد نہیں رکھ سکا۔

پائین باغ کے ندی کنارے والا کمرہ میرے سپرد کیا گیا تھا۔ یا یوں کہئے کہ میں نے اسے پسند کیا۔ برسات کی خوشگوار شام تھی۔ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ننھی ننھی بوندیں گر رہی تھیں۔ پانی میں بھیگی ہوئی خنک ہوائیں دماغ کو فرحت بخش رہی تھیں۔ میں کچھ دیر کے بعد مطالعہ سے اکتا کر افسانہ لکھنے کے خیال سے میز کے قریب آبیٹھا اور اس طرح اس کی ابتدا کی۔

"بارش کی دلاویز شام تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ فضاء کی آغوش میں وجد کر رہا تھا۔ شہنشاہ خاور افق کے حجلۂ عروسی میں آرام کی خاطر آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا اور اس کی آخری سنہری کرنیں قریب کے بادلوں کو قرمزی رنگ کا جوڑا پہنا رہی تھیں۔ جمیل وشکیل شیام دریا کے کنارے چٹان پہ اداس بیٹھا ہوا ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں محو ہے اس کی مشتاق نگاہیں قدرت کے اس پرکیف مناظر کے مشاہدہ میں جھکی ہوئی ہیں۔ گاؤں کی شوخ وشنگ لڑکیاں گھروں میں پانی بھر بھر کر لے جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب ہنسی مذاق کرتی ہوئی پانی سے کھیل رہی تھیں۔ لیکن ان سب سے علیحدہ ایک مغموم تنہا لڑکی ندی کے کنارے آتے ہوئے دکھائی دی۔ یہ چمپا گاؤں کے سنار کی لڑکی تھی۔"

یہاں آکر میں رکا۔ میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ کیونکہ قریب سے گانے والی رنگین آواز نے میرے افسانوی خیالات کی بساط الٹ دی میں نے بہتیری کوشش کی کہ افسانہ کا تسلسل قائم رکھوں لیکن ممکن نہ ہو سکا۔ اس عرصہ میں بارش عارضی طور پر ختم ہو چکی تھی اور سورج جھک جھک کر آخری دیدار دکھا رہا تھا کائنات کا ذرہ ذرہ کیف وسرمستی میں غرق تھا۔

یہ خوشگوار مرطوب موسم، ہم افسانہ نویسوں اور شاعروں کے لئے تو روح رواں ہے۔ میں اپنے دوران سفر میں جہاز کی پرسکون رفتار یا بعض وقت اس کا باد تند سے سمندر کی بپھری موجوں میں بیتابانہ مچلنا بحیرۂ قلزم کے سمندری ساحل پر ہری ہری کھیتیاں اور چھوٹے چھوٹے جہازوں کے بیڑے اور اس کے قریب کے ریتیلے میدانوں میں بسنے والے عربوں کے کچے مکانات اور پھر سوئٹزرلینڈ کی ناہموار پہاڑیوں کی برف سے ڈھکی ہوئی دلفریب چوٹیاں۔ پیرس و برلن کے درمیان ناشپاتی کے باغیچے۔ انگور کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے خوشنما مکانات اور انگلینڈ کے ساحلی دلفریب وہوشربا مناظر، طلوع وغروب سورج کے وقت وہ زریں نظارے ــــ آہ! کتنے روح افزا تھے۔ ہم افسانہ نویس ان ہی قدرتی مناظر کے متلاشی وشیدا ہیں۔

میں اپنے افسانے کو مکمل کئے بغیر کمرے سے باہر نکلا اور باغیچہ کا مختصر سا حصہ گذار کر ندی کے کنارے پہونچا۔ بارش کے تھمتے ہی ندی کی روانی تیز ہوگئی تھی۔ اس کی لاتعداد موجیں بیتابی کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھیں اور آخر سے زیادہ افق پر ڈھلکنے والی سورج کی وداعی طلائی کرنوں سے پانی کی رنگت گہری سرخ ہو رہی تھی۔ قدرت کے اس کیف آگیں نظارے نے میرے جذبات کو ابھارا۔ منتشر خیالات اجتماعی شکل میں مجھے واپس ملنے لگے۔ کیف و سرور میں ڈوبا ہوا واپس لوٹا۔ بادل آسمان پر محیط تھے۔ بوندیں پھر گرنے لگیں اور ننھی ننھی بوندیں بہت جلد موسلادھار بارش کی شکل اختیار کر گئیں۔ میں

کمرے میں واپس آکر اپنے افسانہ کو لے بیٹھا۔

"..... وہ گل اندام لڑکی چمپا اپنے کندھے پر پانی کا گھڑا لئے ہوئے آئی ......"

یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ ایک دھماکے کے ساتھ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ایک سیکنڈ بعد میری آنکھوں نے ایک حسین لڑکی کو جو بارش کے حملوں سے بُری طرح مجروح ہوئی تھی، دیکھا، پہلی ہی نظر میں اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر میرا ــــ وہ ٹھٹکی، اس کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں، ساتھ ساتھ دل کی دھڑکن بھی۔

"آرے آپ ....؟" بیساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ میری موجودگی اور اپنی مداخلت کا احساس کیا۔ میں اپنے کمرے میں اس پرکیف نظارے کو دیکھ کر مجسمہ حیرت بنا رہا۔ چند سکنڈ یہی حالت رہی یکایک وہ شاید واپس ہونے کے خیال سے دروازہ کی طرف مڑی۔

"نہیں نہیں، آپ نہ جائیے ورنہ بھیگ جائینگی" میں نے جلدی سے کہا۔ "بیٹھ جائیے یہاں کرسی پر۔" وہ قدرے کانپ رہی تھی شاید سردی سے۔

"بیٹھ جائیے نا۔ سردی کھا رہی ہیں آپ۔" میں نے ایک بار پھر اس سے بولنے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس شرم وحیا کی پتلی نے میری التجا کو نہ ٹھکرایا

پانی لگاتار برستا رہا اور تند ہواؤں کے جھونکوں نے ایک شور مچا رکھا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ لڑکی دریچہ کے پاس والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں ندی کے سین پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن میں اس عرصہ میں بالکل خاموشی سے اس کی کتاب حسن کے مطالعہ میں ہمہ تن محو تھا۔ اس کا دل موہ لینے والا کافر حسن میرے لئے سامان حشر سے کچھ کم نہ تھا۔

"آپ کا مکان یہیں قریب میں ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" اس نے قدرے لجاجت سے کہا۔ "یہیں ہے"۔

"اور محترمہ آپ کا نام؟"

وہ چپ تھی، بارش قدرے تھم چکی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور میرے سوال کا جواب دیئے بغیر "خدا حافظ" کہتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں حیران تھا۔ الہٰی یہ کیا۔ یہ حوروش حسینہ کون تھی۔ میرا آج تک خیال ہے اس نولح میں ایسا کوئی کافر حسن نہیں۔ یقیناً وہ کوئی حور یا پری ہوگی جو میرے خوابوں کی دنیا میں افسانہ کا پلاٹ دینے کے لئے بھیجی گئی ہے۔ ان خیالات میں ڈوبا ہوا میں پھر افسانہ کو لے بیٹھا۔ ہاں تو .....

"وہ ماہرو لڑکی ندی کے کنارے آئی اور اپنے مرمریں ٹخنوں کو عریاں کئے پانی میں اتری۔ نوجوان کی نگاہیں دفعتہً اس طرف آکر ٹھٹکیں۔ وہ اس فردوسی نظارے کو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ چمپا نے شفاف پانی سے اپنا منہ دھویا پانی کی شریر موجیں اس کے سیمیں ٹخنوں کو گستاخانہ چوم رہی تھیں۔ شاید وہ اسے اپنے آغوش میں لینا چاہتی ہیں شیام ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر ہو کر اپنی نشستگاہ سے اٹھا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ چمپا کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ پانی کے کنارے آیا۔ حسین چمپا نے گھڑے میں پانی بھر کر سر پر اٹھا لیا۔ وہ خشکی پر آئی اسکی نگاہوں نے اپنے سامنے پرکیف منظر دیکھا۔ اور دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نظر فریب سین سے چمپا کے معصوم دل میں ایک میٹھی سی ہوک اٹھی اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خمار چھا گیا نوجوان ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا۔ اس جادو بھری نظروں کی وہ تاب نہ لا سکی۔ اس کا بدن تھرا رہا تھا۔ اس کے گھڑے کو تھامے ہوئے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے۔ وہ اس نوجوان اجنبی کی موجودگی کے احساس سے عرق عرق ہو گئی اس نے اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت کو ذرا ڈھیلا کر دیا اور ایک سیکنڈ میں وہ گھڑے کے ٹوٹ جانے سے پانی میں شرابور ہو گئی۔ کسی گہرے خیال نے اس کے دل میں چٹکی لی ــــ ایک بیساختہ چیخ خوف وشرم کی درمیانی حالت میں اس کی زبان سے نکل گئی۔

شیام اس پر لطف سین کو بغور وتعمق دیکھ رہا تھا، اس کی نگاہیں رحم واستعجاب میں ڈوبی ہوئی دادخواہی کی مستدعی ہوئیں اس کے نیم والب قدرے جنبش کر رہے تھے اس کے ڈگمگانے والے قدم نامعلوم حسینہ کی امداد کے لئے اٹھ رہے تھے۔

"ارے تمھیں کیا ہو گیا" شیام نے گھڑے کے شکستہ ٹکڑوں

ٹکڑوں کو اکٹھا کرتے ہوئے کہا۔
"گھبراتی کیوں ہو؟ بتاؤ۔"
"آہ! اب کیا ہوگا"۔ چمپا نے خوف و افسوس کے درمیانی لہجے میں کہا:"اب تو ماں مجھے ضرور پیٹے گی۔ وہ روز نئے گھڑے کہاں سے لائیگی۔"
"گھبراؤ نہیں، میں تمھاری ماں سے چل کر کہہ دوں گا" شیام نے کہا۔"وہ تمھیں کچھ نہ کہیگی"۔
چمپا خاموش تھی وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑے خشک کرنے لگی
"نہیں نہیں آپ نہ آئیے"۔ لڑکی نے آگے بڑھتے ہوئے کسی قدر کشیدہ خاطر ہوکر کہا۔
"ٹھہرو چمپا! کہاں چلی؟ میں تمھیں نیا گھڑا لادونگا۔"
شیام نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
"چھوڑیئے میرا ہاتھ"۔ لڑکی نے خوف و حیا کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ماں میرا بےچینی کے ساتھ انتظار کر رہی ہے مجھے جانے دیجئے"۔ وہ شیام کی مضبوط گرفت سے ہاتھ چھڑا کر چلتی بنی۔
"للّٰہ ٹھہرو!" شیام نے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے بےچینی سے کہا۔"چمپا رحم کرو۔ میری حالت پر رحم کرو میں ہر روز تمھیں ندی کے کنارے دیکھا کرتا۔ لیکن آج ایک نامعلوم جذبہ سے متاثر ہوکر تمھاری نیم نگاہی کا بسمل بن گیا —— بتاؤ کیا تم پھر مجھے اپنا درشن کراؤگی"
لیکن لڑکی کی تغافل نما اداؤں اور اس کے خوف و اضطراب نے شیام کو کسی قدر مایوس بنا دیا۔ وہ تیزی کے ساتھ گذر کر گھنی جھاڑیوں میں غایب ہوگئی اور غریب شیام ایک دراز آہ کے ساتھ بیتابانہ ریت پر گر پڑا۔ ....."
تیزی کے ساتھ میں اپنے افسانے کی تکمیل میں مصروف تھا جذبات کا دریا میرے دل میں بڑے زور و شور سے لہریں لے رہا تھا۔ اور میں نے یہاں تک پہونچ کر اپنے جذبات میں کمی محسوس کی۔ میرے خیالات منتشر ہونے لگے اور میرا رجحان اس حسین طلسمی مجسمہ کی طرف مائل ہوگیا۔ یہاں تک کہ رات کی تاریکی شہر کی فضا پر غالب ہونے لگی۔ میرا دماغ ان متواتر خیالات کی الجھن میں پھنسکر افسانہ کی تکمیل کرنے کے قابل نہ رہا اور پھر مجھے نوکر کے ذریعہ اطلاع ملنے پر کہ والد اپنے مہمانوں کے ساتھ رات کے کھانے کا دسترخوان پر میرا انتظار کر رہے ہیں اس لئے اپنے نامکمل افسانے کو میز کے دراز میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا۔

کھانے کی میز پر سب رشتہ دار جمع تھے۔ میرے چہرے کی اداسی دیکھ کر چچا نے خیریت پوچھی اور میں اپنے عذر لنگ کی آڑ لے کر ان کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ چچا مجھ سے یورپ کی طرز معاشرت کے متعلق رائے زنی کرنے لگے اور میں ان کے جوابات دینے میں ہمہ تن محو تھا۔

ابا نے پکارا "نعیمہ کہاں ہے؟ اسے بھی بلالو"۔

"ہاں ہاں!" چچا نے بھی تائیدی لہجے میں کہا —— اس عرصہ میں ہم سب نے کھانا شروع کر دیا تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ نعیمہ"۔ ابا نے میرے بازو والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے مڑ کر ایک سرسری نگاہ اپنے بازو بیٹھنے والی ہستی پر ڈالی، میری حیرت کا اندازہ کیجئے۔ نعیمہ وہی کافر ادا لڑکی جو شام سے میرا مرکز خیال بنی ہوئی دل میں سما گئی تھی۔ آہ کیا یہ نعیمہ ہے، اُف پانچ سال کے عرصہ میں اتنی زبردست دلفریب تبدیلی، وہ بھولی، سادہ مزاج لڑکی، آج وہی سیماب نواز آنکھوں اور بیقرار دل کے لئے سامان تفریح تھی۔ کتنا حسن ملیح اُس کے اندر پنہاں ہے۔ وہ تمام نسوانی صفات کی مالکہ ہے۔

کھانے کے دوران میں ہم سب خاموش تھے۔ چچا میرے بازو بیٹھے ہوئے میرے کم کھانے کا اندازہ لگا رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے سلیم کو ہندوستانی کھانے پسند نہیں ہیں"۔ چچا نے والد کو مخاطب کیا۔"دیکھئے تو اس نے چاول مطلق نہیں کھائے"

"ہاں میاں اسے تو ولایتی غذائیں زیادہ مرغوب ہیں"۔ والد نے کہا۔

"نہیں میں تو خوب کھا رہا ہوں"۔ میں نے کہا۔

شریر نعیمہ نے میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر بڑا لطیف مذاق کیا اس نے ایک چمچہ چاول اور مچھلی کے کئی ٹکڑے لیکر میری رکابی میں ڈالدیئے۔

"یہ آپ کیا ستم کر رہی ہیں۔ میں لے رہا ہوں نا۔ آپ تکلیف نہ کریں"۔

اس کے جواب میں انہوں نے گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے صرف مسکرا دیا اور میرے خرمن دل پر سیکڑوں بجلیاں گرا دیں۔ نعیمہ نے کے اختتام پر چچا اور والدہ مردانہ میں چلے گئے اور میں اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ اب میرا دل و دماغ مستقبل کے رنگین خوابوں سے معمور نظر آ رہا تھا۔ میرے پُرشوق ارمان جامہ سے نکلنے کے لئے مچل رہے تھے۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد میں اپنے کمرہ میں افسانہ کی تکمیل کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

"غمگین شیام گھاٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے محبت آگیں دلسوز نغمے فضا میں مرتعش ہو کر گم ہو رہے تھے۔ کیف و جستجو میں ڈوبی ہوئی نگاہیں محو نظارہ تھیں اس کے دل پر کل کی لگی ہوئی چوٹ مندمل نہ ہوئی تھی۔ اس نے آج بھی وہ مرہم کا طالب تھا۔ گاؤں کی بڈھی اور جوان لڑکیاں پانی بھر بھر کرنے جا رہی تھیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے راستہ تکا کیا اگر اس کی آنکھیں دھوکہ نہیں دے رہی تھیں تو اس نے دور سے ایک تنہا لڑکی کو آتے دیکھا۔ اس کے ضمیر نے آہستہ سے کہا "وہی ہے" پھر زبان نے کہا "وہی ہے" ندی کی لہریں زور زور سے اٹھ کر چیخ کر کہہ رہی تھیں "وہی ہے" ساری کائنات نے کہا "وہی ہے" پھر شیام نے چلا کر کہا "وہی ہے" چمپا کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا ضرور اس نے کوئی مصمم قصد کر لیا ہے۔ اس کے لانبے سیاہ بال ہوا میں بے پروائی کے ساتھ جنبش کر رہے تھے۔ معصوم ادائیں اس پر سے نثار ہو رہی تھیں چمپا نے شیام کو دیکھا۔ شیام نے چمپا کو۔ ان کی محبت نواز آنکھوں نے ایک دوسرے کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔

"آپ آگئے!" چمپا نے بیباک ہو کر شیام سے سوال کیا۔

"ہاں پیاری! روز کی طرح آج بھی اور ذرا جلدی ہی"

"کل تو آپ نے میرا گھڑا توڑ دیا نا" چمپا مغموم صورت بنا کر بولی اور میں نے ان کو جھوٹ موٹ بہانہ بنا کر منا لیا۔ اس نے

پیا گھڑا الا دیا ہے۔۔۔ اب کبھی نہ توڑنا۔۔۔ بیٹھے۔۔۔۔

"میں آسکتی ہوں؟" ایک شیریں نغمے نے میرے افسانوی خیالات کو منتشر کر کے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"کون؟ نعیمہ! تم۔۔۔ شوق سے، یہ بھی پوچھنے کی بات ہے"

"واہ بلا پوچھے کیسے آئیں"

"کیوں نعیمہ! تم کوئی غیر تو نہیں، آخر ہماری تو۔۔۔۔!

کہتے کہتے رک کیوں گئے؟"

"رفیق حیات ہو گی نا" میں نے جملہ پورا کیا۔

نعیمہ خاموش ہو گئی۔ اس کی حسین و کشادہ پیشانی پر چھوٹے چھوٹے انفعالی قطرات نمایاں ہو گئے۔

"یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟"

"افسانہ! اس کے سوا ہمیں آتا ہی کیا ہے؟"

"پھر سنائیے ہمیں"

"ابھی نہیں، جب ختم ہو جائے"

"یقین جانئے میں آپ کے افسانوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہوں ایک خاص اثر آپ کے جذبات میں نہاں ہے!"

"تم بھی لکھا کرو نعیمہ"

"مگر آپ یہ افسانے کیسے لکھتے ہیں؟"

"بہت سہل ترکیب ہے"

"ہمیں سکھائیں گے آپ؟"

"کچھ معاوضہ ملے گا۔۔۔ اس کا"

"آپ اجرت لیتے ہیں؟"

"کیوں نہیں! ہماری محنت کا آخر صلہ بھی ملے گا یا نہیں"

"کیا صلہ چاہئے آپ کو؟"

"ہم بتائیں!"

"قبول منظور"

"چلو پھر گھاٹ چلیں ندی کے"

"وہاں کیوں، یہیں بیٹھ کے سیکھیں"

"نہیں وہ درسگاہ مخصوص ہے"

ہم دونوں ندی کے کنارے پہونچکر ایک چٹان پر بیٹھ گئے نیچے پانی کی موجیں رقص

"اچھا — دیکھو ادھر میری طرف، تمہیں بتاتا ہوں افسانہ کیسے لکھتے ہیں۔ سنو۔ تم اپنے زریں رومانوی خیالات کے ذریعہ جو متواتر تمہارے دماغ میں ابھر رہے ہیں ان سب کو اکٹھا کرکے دو متضاد حسین مقدس ہستیوں میں حسن و محبت کی سنہری زنجیروں کے ساتھ منسلک کردو اور موثر انداز پیرائے میں جذبات کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے کسی اچھے سے اچھے نتیجے کے نکالنے کی کوشش کرو۔ یہ تمہارے افسانے کی ابتدا ہے۔"

"بس اتنی سی مختصر تعریف افسانے کی —" نعیمہ نے مسکراتے ہوئے مضحکہ انگیز لہجہ میں کہا۔

"ہاں نعیمہ، اب آگے نشو ونما دینا۔ جاذب نظر مناظر کا خاکہ کھینچنا اور پھر اس میں شعریت کا مادہ سرایت کرنا اور اسے اعلیٰ معیار تک پہونچانا۔ یہ تمہاری اپنی لیاقت پر منحصر ہے — کیوں نعیمہ اب تو سمجھ گئی ہونا — افسانہ کا راز — ؟"

"جی — قدرے، آپ کی مہربانی سے۔ کل سے میں بھی افسانے لکھنا شروع کرونگی۔"

"ہاں ہاں، ضرور لکھا کرو، انشا اللہ چند ہی دنوں میں تم مشہور افسانہ نویس بن جاؤ گی۔"

"نہیں نہیں، بلکہ افسانہ نویس کی . . . . . "

"رکو نہیں، کہے جاؤ — افسانہ نویس کی بیوی ہوگی نا؟"

نعیمہ خاموش تھی، اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

— اسی روز شام کو میں نے اپنا افسانہ ان چند جملوں پر ختم کر دیا۔

"اور تم نے جو میرا دل توڑ دیا۔ اس کا بھی تمہیں خیال ہے"

یہ جملہ شیام نے نہ معلوم کیسے ادا کیا۔ چمپا اس جملے کے استعمال سے قدرے محجوب ہوگئی لیکن جلدی ہی اس نے پھرتی کے ساتھ شیام کے جملوں کا جواب دیدیا۔

"اگر تم میرا گھڑا نہ توڑ دیتے تو . . . . "

"تو تم میرا دل بھی نہ توڑتیں۔" شیام نے اس جملے کی تکمیل کی

"آؤ اب دونوں مل کر عہد کریں کہ ایک دوسرے کی چیز کبھی نہ توڑینگے۔"

شیام نے جو چمپا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا اس نے اپنی محبت کے عہد کو زیادہ استوار بنانے کے لئے چمپا کے گلابی رخسار پر مہر محبت ثبت کر دیا۔

رموز محبت کا واقف کار چاند نکلا۔ اپنی رنگین شعاعیں ان دونوں پر نچھاور کرنے کے لئے۔

ناشتے سے پہلے ہی نعیمہ میرے کمرے میں آ دھمکی اور کہنے لگی — کیا آپ افسانہ نہ سنائیں گے؟"

"پہلے تم سناؤ نعیمہ۔"

"نہیں نہیں، پہلے آپ نے سنانے کا وعدہ کیا ہے۔"

مجبوراً مجھے اپنا افسانہ سنانا پڑا۔ نعیمہ بڑے غور سے میرا افسانہ سنتی رہی اور کبھی کبھی درمیان میں ٹوک دیا کرتی تھی۔ مثلاً یہ کہ شیام کیوں ایک اجنبی کی حیثیت سے چمپا کے غمزوں کا خریدار بنا۔ اسے کیا حق تھا کہ چمپا کا دو تین آنے کا نقصان کر دے"

"لیکن نعیمہ اس کا بھی تمہارے پاس کوئی جواب ہے جو برسوں کھینچ میرے جذبات کو ٹھکرایا — میرے سوال کا جواب دیئے بغیر چپکے سے اپنی راہ لی۔"

"یہ آپ اپنی بات بیچ میں کیوں لا رہے ہیں؟"

"واہ اپنی بات کیوں؟ نعیمہ اور چمپا، شیام و سلیم دونوں ایک نہیں تو اور کیا۔ چمپا میری افسانوی دنیا کی محبوبہ ہے اور تم عملی دنیا کی، شیام چمپا کو پا کر خوش ہوگیا اور میں تمہیں — شیام نے محبت کی ابتدا کی اور چمپا نے اسے انتہا تک پہونچایا۔"

میں نے افسانے کا آغاز کیا — اور تم نے اس کی تکمیل کی۔

اُف! کتنا دلفریب ہے ہمارا افسانہ —

اور اس کی تکمیل بھی —

لمعات

از نیر امرتسری

ضعف کے ہاتھوں بصد مشکل لکھا
بارے ہم نے ماجرائے دِل لکھا

کتنی معصومی سے کرتے ہیں گلا
آپنے ظالم لکھا، قاتِل لکھا

شوق میں حرفِ تمنّا کے سوا
اور جو ہم نے لکھا، فاضِل لکھا

دیکھنا ضد! ہو گئے خلوت نشیں
جب سے ان کو رونقِ محفِل لکھا

تھے خفا پہلے کہ عادت تھی مگر
اب گِلا ہے شکوہ باطِل لکھا

آئے تو لیکن عدو کو لیکے ساتھ
حالِ دل جب رحم کے قابِل لکھا

کاتبِ قسمت نے جنّت کے عوض
میرے حق میں کوچۂ قاتِل لکھا

جب زبانی کچھ نہ اُن سے کہہ سکے
خط میں نیر مُدّعائے دِل لکھا

"نیچر اور موت"

مشہور ہندوستانی شاعر من موہن گھوش کی انگریزی نظم کا ترجمہ

مترجمہ ایس محمد آصف بی - اے

(۱)

پرندوں کو ان کے بے فائدہ نہیں دیئے گئے۔ وہ انھیں
پھیلا کر آکاس میں اڑتے ہیں۔
لیکن ہم انسان جو بے بال و پر ہیں ہم کیوں ایک آکاس
اور فردوس کی جستجو کرتے ہیں؟

(۲)

جب ہمارے سروں پر مسافر پرندے پرواز کرتے ہیں
ہم ٹھنڈی سانس لے کر نگاہوں کو زیر جما دیتے ہیں۔
یہ آرزو پیدا ہوتی ہے، کاش ہم بھی اڑ سکتے۔
ہم کیوں بیقرار ہیں؟ ہم کیوں قناعت نہیں کر سکتے؟
آخر ہم کیوں ایک خاک کے گولے پر قید ہیں؟

(۳)

یہ خواہش اور تمنا آنسوؤں میں بھیگ جاتی ہے۔
ہمارے مسرور اوقات بھی اسرار سے معمور ہیں۔
مختصر زندگی کیوں خار کی طرح کھٹکتی ہے؟
یہ کیوں آسیب کی طرح ہمارے افکار سے چمٹتی ہے؟

(۴)

جب ہمارے خیالات ایک اور دنیا کی تلاش میں پرواز کرتے ہیں جو پائدار لازوال
تو یہ زمین اجنبی سی معلوم دینے لگتی ہے۔
اس کی تمام مسرتیں اوہام میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔
اور اس کی دلفریبیاں ہماری تشفی نہیں کر سکتیں۔

(۵)

نہ ٹوٹنے والے رشتے عناں گیر ہوتے ہیں۔
صرف محبت سے بھری ہوئی آنکھوں میں کبھی کبھی
خوشی کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔
صرف ایک دھڑکتے ہوئے دل پر چین اور سکون نصیب ہوتا ہے۔

(۶)

ہماری روحیں کیوں تشنۂ حیات ہیں؟
کون ان کو اس تشنگی پر مجبور کرتا ہے؟
ہاں میں خوب واقف ہوں، یہ نیچر کی آواز ہے۔
جو ہمیں چلا کر کہہ رہی ہے۔ "ان خاکی قیود کے خلاف
جہاد کرنا ایک مقدس جذبہ ہے"۔

(۷)

باغ جو بالکل ویران اور تنہا ہے۔
جس کا ایک پھول بھی خزاں کی دستبرد سے محفوظ نہیں
گلاب کی دوشیزہ پتیوں کی انجمن رخصت ہو چکی ہے۔
درختوں کے زرد پتے ایک ایک کر کے جھڑ چکے ہیں۔
اس ویرانی کو دیکھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔

(۸)

آہ! اس زمین کی تمام بہاریں فانی ہیں۔
بڑھ کا بوڑھا درخت جسے نباتاتی مفکر کہنا چاہیئے۔
یہ مجاہد بھی ایک ہزار سال کی کشمکش کے بعد ٹوٹ کے گر پڑا۔

تو ایک گلاب کے نرم و نازک پھول تو بیکار عناصر کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔

(۹)

ہم انسانوں کی زندگی پھولوں اور پتوں کی زندگی نہیں ہے۔
اگر یہ درست نہیں تو پھر ہماری روحوں میں کشمکش کیوں؟
معمولی معمولی حادثات کس لئے ہمیں خاک و خون میں لوا دیتے ہیں۔

(۱۰)

پرندے۔ پودے اور مکھی کو اس سوزِ حیات کا احساس نہیں۔
وہ مسرت سے جی کر بغیر کسی خواہش کے معدوم ہو جاتے ہیں۔
وہ اپنے چند روزہ قیام میں ہی نیچر کی مرضی کو پورا کر دیتے ہیں۔

(۱۱)

اگر ہماری تعمیر بھی انھیں کے خمیر سے ہوتی۔
تو ہمیں قبر کی تاریکیاں یخ بستہ معلوم نہ دیتیں۔
اور ہم غیر محسوس طور پر اپنی زندگیوں کو بسر کر دیتے۔

(۱۲)

وہ شفیق ماں جس کے بطن سے ہم پیدا ہوئے ہیں۔
وہ اپنے بچوں کی تقدیر سے واقف ہے۔
وہ آرزوئیں جنھیں وہ خود پیدا کرتی ہے۔
وہ انھیں کبھی تشنۂ تکمیل نہ رہنے دیگی۔
وہ ہم پر کبھی ایسا بوجھ نہیں لادتی
جس کے اٹھانے کی ہم طاقت نہ رکھتے ہوں۔

(۱۳)

کیا ہوا جو موت ہمیشہ عقدہ لاینحل ہی رہے۔
کیا ہوا جو اس بحرِ بیکراں کا ساحل نہ ہو
اس کے باوجود ہمارے قلوب یہ گواہی دے رہے ہیں۔
کہ وہ ضرور کوئی رستہ نکال لیگی۔

(۱۴)

مدت تک حسین تتیری کہاں خوابیدہ رہتی ہے؟
عرصہ تک موتی صدف میں کیوں نہاں رہتا ہے؟
نیچر کے ڈھنگ نرالے ہیں
عمیق ہیں، نامعلوم ہیں، پراسرار ہیں۔ (مترجمہ محمد آصف بی۔ اے)

مُلّا نظیری نیشاپوری

از جناب سجاد ہاشمی صاحب جنیوٹوی

جناب مُلّا نظیری نیشاپوری سرتاج شعرائے عجم ہیں۔ آپ کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے جیسے مرزا غالب کا کلام اُردو میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ سخنوری کے لحاظ سے زندہ رہیگا تو آپ کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔ آپ ان شعراء میں سے نہیں ہیں جنھوں نے طبع کی موزونی کی وجہ سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین وآفرین سننے کے لئے اشعار کہے ہوں بلکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شاعری میں ڈوبے ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے فن کمال سے عجمی فصاحت وبلاغت کو روشن کیا۔ اور زبان کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھا۔ شاعری آپ کی زندگی کا ایک خاص جزو تھی۔ گویا فطرت نے آپ کو اسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ آپکا احسان فارسی زبان پر تا قیامت قائم رہے گا اور آپ کے کلام کی دلچسپی اور لطف کبھی کم نہ ہوگا۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کی زندگی کے حالات ایسے مختصر پیرائے میں بیان کروں جن سے ہر خاص و عام مستفید ہو سکیں۔

آپ کا نام محمد حسین تخلص نظیری اور وطن نیشاپور تھا۔ اوائل عمر ہی سے آپ کو شاعری کا بہت شوق تھا اور اسی زمانے میں آپ کی شہرت دور ونزدیک پھیل گئی۔ اہل خراسان نے جب آپ کی شاعری کو پوری طرح تسلیم کر لیا تو پھر آپ کاشان میں گئے۔ یہاں پر فن شاعری کے استادوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا جن میں حاتم، فہمی، شجاع اور رضائی خاص طور پر ملنے ہوئے تھے۔ روزانہ، مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں آپ بھی طبع آزمائی کرتے چنانچہ اس زمانے میں ایک پرانی غزل کا مصرع طرح ہوا جس میں "جائے" کا قافیہ شعرائے زمن نے اس طریق سے باندھا جس کا جواب مشکل تھا۔ مگر آپنے اسی قافیے کو ایسے دلکش اور دلنشین رنگ میں باندھا جسے ہر شخص نے بنگاہ تحسین دیکھا اور تمام شعراء اور انشاء پرداز اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے آپ کی اس ابتدائی غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

مطلع ؎ فلک مزدور ایمائے تو باشد | لوازدہر کرارائے تو باشد
بیت الغزل ؎ نیازارم زخود ہرگز دلے را | کہ می ترسم دروجائے تو باشد
مقطع ؎ نظیری زندگی در دردِ دل جو | کہ دردِ تو مسیحائے تو باشد

اسی زمانہ میں عبدالرحیم خانخاناں کی فیاضیوں اور قدردانیوں کا شہرہ دور ونزدیک پھیل چکا تھا۔ آپ بھی قسمت آزمائی کے لئے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر عازم ہند ہوئے سنہ ۹۹۲ھ میں بمقام آگرہ خانخاناں سے ملے اور ایک قصیدہ پیش کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خانخاناں کے ذریعہ آپ کی رسائی دربار اکبری تک ہوئی پہلے پہل جب آپ دربار میں پہونچے تو حسن اتفاق سے شہنشاہ اکبر کے بیٹے نورالدین جہانگیر کی ولادت کا جشن تھا لیکن باوجود اس کے کہ آپنے اکبر کی تعریف میں بہت سے قصائد لکھے دربار میں کوئی خاص رتبہ حاصل نہوا چنانچہ آپنے مستقل تعلق عبدالرحیم خان خاناں ہی سے رکھا اور احمد آباد گجرات میں آپ سکونت پذیر ہوئے۔ احمد آباد میں چند سال قیام کرکے آپ اکتا گئے اور عازم حج ہوئے۔ بذریعہ قصیدہ خانخاناں سے زادِ راہ طلب کیا خانخاناں نے سفر کا تمام سامان مہیا کر دیا اور سورت کی بندرگاہ سے آپ جہاز پر سوار ہوکر آپ مکہ معظمہ کو راہی ہوئے۔ اگرچہ آپ کو راستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا لیکن پھر بھی آپ حج اور روضہ اقدس کی زیارت سے شرفیاب ہوئے سنہ ۱۰۰۳ء میں نواب محمد عزیز اعظم خاں سے زادِ راہ لیکر واپس گجرات آگئے انہیں دنوں شہزادہ مراد اکبر کے فرمان کے مطابق دکن کی مہم پر جا رہا تھا۔ آپ چلتے پھرتے اس طرف جا نکلے۔ شاہزادہ کے دربار میں آپ جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک قدردان سخن ملاقی ہوا۔ اس نے خوشی کا اظہار کرتے

ہوگئے کہا۔ کیسے اچھے موقع پر آنا ہوا حسن اتفاق سے جشن نوروزی ہے قصیدہ لکھکر پیش کیجئے اور خود ہی جاکر شاہزادے سے تعارف کرایا۔ چنانچہ بذریعہ چوبدار آپ دربار میں طلب کئے گئے۔ دربار میں سجدہ بجالانے کا قاعدہ تھا۔ لیکن دربار کی شان و شوکت اور قرینہ دیکھکر آپ حواس باختہ ہوگئے اور دربار کے تمام آئین و قوانین بھول گئے۔ جب آپ سے بازپرس ہوئی تو آپ نے جواباً عرض کیا کہ میں نے ساری عمر میں ایسی شان و شوکت کا دربار ہرگز نہیں دیکھا اس لئے میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہے۔ چنانچہ ان تمام حالات کا آپ نے اپنے قصیدے میں تذکرہ کیا ہے جس میں سے بعض اشعار موقع کی ضرورت کے مطابق درج کئے جاتے ہیں۔

درآں پیساط کہ برخود مرا شعور نبود　　زدور دیدہ دانا و سلے بمن افتاد

بمن گفت کہ اے زیب بخش مجمع انس　　بیا بیا کہ بوقت آمدی مبارکباد

زبسکہ تیز بہ آں بارگاہ در رفتم　　ادب بپایۂ خود پلئے بر فراز نہاد

زدلفریبی و آئین و فر سلطانی　　بگاہ تہنیتم رسم سجدہ رفت از یاد

لیکن یہ بات باعث تعجب ہے کہ اس سے پیشتر آپ بوساطت عبدالرحیم خان خانخاناں اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کر چکے تھے اور دربار شاہی کے ضوابط و قواعد سے پوری آگاہی رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سال حج و زیارت نبویہ سے شرفیاب ہوکر آئے تھے۔ خدائے حقیقی کے سوا کسی کے آگے سر تسلیم خم کرنا گوارا نہ کیا اور آپ نے اپنے کو اس طرح عتاب شاہی سے بچالیا۔ اور شہزادہ مراد کے دربار تک آپ کو خاص رسائی حاصل ہوگئی۔ آہستہ آہستہ شہزادے کے ساتھ آپ کو دلی محبت ہوگئی، یہاں تک کہ ہمیشہ شہزادے کے ساتھ ہی رہتے تھے اور شاہزادے سے ایک دم بھر بھی جدا ہونا گوارا نہ کرتے چنانچہ شہزادہ کے انتقال پر آپ نے جو مرثیہ لکھا اس کے ہر شعر سے آپ کی دلی محبت کے جذبات اور رنج و الم کے احساسات ٹپکتے ہیں۔

اے بزم تیرہ روشنی ارغواں کجاست　　وے سدزم در ہمہ شہ گیتی ستاں کجاست

شوق سجود و حسرت تعلیم کبر است　　آں ناز صدر و سرکشی آستاں کجاست

برگ و شکوفہ ریخت فراز کجا خودم　　بشکست شاخ برگ مرا آشیاں کجاست

ملائے بمضمون انداز گوئید حال چیست　　صبر سخن شنیدن و تاب بیاں کجاست

آفاق در مصیبت او ممتحن شدہ
ایمان بمرگ باعث الم موذن شدہ

سنہ ۱۰۱۴ھ میں شہنشاہ جلال الدین اکبر نے وفات پائی اور شہنشاہ نورالدین جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ نہایت صاحب ذوق اور قدردان اہل کمال تھا۔ اس کی طبیعت فطرتاً شعر کی طرف مائل تھی اور چونکہ فیضی کا شاگرد تھا اس لئے شاعری کا نکتہ دان اس سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا تھا۔ اس نے جب آپ کی شہرت سنی تو دربار میں طلب کیا۔ فرمان طلبی کے بعد آپ کے تین مہینے تگ و دو میں گذرے کیونکہ ان دنوں نورالدین جہانگیر شکار کو گیا ہوا تھا آخر سنہ ۱۰۱۹ھ میں آپ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوئے اور ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا۔ جس کے صلہ میں بادشاہ نے ایک ہزار روپیہ نقد اور خلعت و اسپ عطا فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آپ تارک الدنیا ہوچکے تھے مگر افسوس کہ آپ فطرتی طور پر کچھ طامع واقع ہوئے تھے ورنہ کیوں تین مہینے جگہ جگہ کی خاک چھاننی پڑتی۔

ایک دفعہ حسب الخواہش ایک عمارت کی تعمیر کی فرمائش میں آپ نے ایک غزل لکھکر پیش کی جس کا مطلع یہ ہے ؎

اے خاک درت صندل سرگشتہ سراں را
باد امژہ جاروب رہت تاجوراں را

جس کے صلے میں بادشاہ نے تین ہزار بیگہ زمین مرحمت فرمائی۔

آپ نے اپنی وفات سے بارہ برس پہلے ترک دنیا کرکے گوشۂ تنہائی اختیار کرلیا تھا لیکن افسوس کہ اس زمانہ میں بھی امراء و رؤسا کی مداحی جاری رہی۔ آخر عمر میں تحصیل علوم دینیہ و عربیہ کا شوق پیدا ہوا۔ سنہ ۱۰۱۸ھ میں جب آپ خانخاناں کے ہمراہ دکن جارہے تھے راستہ میں مندو (ایک شہر کا نام ہے) سے گذر ہوا۔ یہاں آپ شیخ غوثی مندوی سے ملاقی ہوئے اور یہیں رہکر ان سے تحصیل عربیت کی۔ پھر مولانا محمد حسین جوہری سے حدیث تفسیر اور فقہ پڑھی۔ اس کے بعد علوم دینیہ سے فارغ التحصیل ہوکر آپ سنہ ۱۰۲۰ھ میں آخری بار آگرے آئے اور اپنی غزلیات کا دیوان عبدالرحیم خانخاناں کے سپرد کرکے واپس احمد آباد گجرات چلے آئے۔

اسی زمانے میں آپ کا ایک خط گجرات سے مولانا شکیبی کے یہاں آیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"برائے معنی آرائے استادی و سندی شکیبی محتجب مستتر نماند کہ امثال فتوحات دنیوی بیش از بیش

لہٰذا ایں درویش عاقبت اندیش گذاشتہ با عدم
تلفقے کہ ایں شکستہ بال پامال دنیا بودہ، خویش را بداں
متعلق می باید، از صفحۂ ادراک چناں مطالعہ می شود کہ
شاہد مرگ را بدیں آلودگی و روسیاہی در کمال غفلت و
بےعاقبتی دریں نزدیکی در آغوش خواہد کشید .....

اس خط کے پہونچنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی سنہ ۱۰۲۱ء میں آپ نے احمد آباد میں وفات پائی اور آپ سے تین ماہ بعد آپکے عزیز دوست مولانا شکیبی نے بھی راہ عدم اختیار کی۔ آپ کی تاریخ وفات یہ ہے ؏

"علم بکوئے ابد زد پیمبر شعرا" سنہ ۱۰۲۱ء

آپکے عام حالات و اخلاق و عادات نہایت عجیبہ تھے۔ آپنے اگرچہ بہت سے درباروں میں ناصیہ فرسائی کی لیکن آپ کا خاص تعلق عبدالرحیم خانخاناں ہی سے تھا۔ خانخاناں کے دربار کے جتنے شعرا تھے یعنی عرفی، انیسی مولانا شکیبی اور ظہوری سب سے آپ شعر کے بڑے تھے۔

ایک دفعہ آپ نے خانخاناں سے کہا کہ میں نے ایک لاکھ روپے کا ڈھیر لگا ہوا کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کتنا ہوتا ہے۔ خانخاناں نے لاکھ روپے منگوا کر آپکے سامنے ڈھیر لگوا دیا۔ آپ نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا۔ خدا آپ کو سلامت رکھے کہ آپ کی بدولت لاکھ روپے کا ڈھیر تو دیکھنے میں آیا۔ خانخاناں اس بات سے بہت خوش ہوا اور وہ روپوں کا ڈھیر آپکے گھر بھجوا دیا۔

آپ زرگری کے فن میں بہت کمال رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ تجارت بھی کرتے تھے۔ شاعری کے فتوحات علاوہ ہوتے تھے اس لئے آپ ہمیشہ امیرانہ ٹھاٹ سے رہتے تھے اور بڑے بڑے امرا و رؤسا میں شمار ہوتے تھے لیکن باوجود اس کے طبیعت میں آن بان نہ تھی، مداحی اور ثناگستری کا شغل مرتے دم تک اپنے ہاتھ سے نہ دیا۔

لیکن اور شعرا اور انشاپردان دربار کے خلاف آپ مذہب کے بڑے پابند تھے۔ حج، نماز، روزہ، زکوٰۃ بڑی پابندی سے سرانجام دیتے تھے اسی لئے آپ ملا کہلاتے تھے اور دربار اکبری کے من آزاد خیالات کا ہمیشہ چرچا رہتا تھا۔ آپ ان سے بہت جلا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جو کہ آپ نے شہزادہ مراد کی مدح میں کہا ہے اس بات کا نہایت ہی نرالے طریقے سے تذکرہ کیا ہے اور ابوالفضل اور اُس کے باپ کا نام کنایۃً لیا ہے ؎

طبیعت ہمہ ابنائے دہر ملحد شد
دلے ز فطرت تو ہر طرف فتاد الحاد
اگرچہ فضلۂ از فاضلان حاصلِ دہر
بہ طمعِ جاہ و غنا کرد مذہبے ایجاد
پس از حصول مرادات حال آں ناصد
شل چو بلغ بگشتت و حسرتش بنہاد

جن شعرا سے آپکے تمام مرگ معرکے رہے ان میں سے عرفی، تقی اور ظہوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عرفی نے تو آپ کو کبھی خاطر ہی نہ سمجھا۔ چنانچہ آپ نے اس کی وفات کے بعد اپنے ... اسے خوب دل کھول کر گالیاں دی ہیں۔

آمدی کا ... تقی نے سنہ ۱۰۲۰ء میں ...



دیوان اصلاح کے لئے آپکے پاس بھیجے۔ آپ نے دونوں کی ایک ایک غزل کا جواب تو اسی وقت لکھ کر روانہ کیا اور باقی غزلیں سب اکٹھی دیکھیں۔ لیکن اس بات میں بہت مبالغہ ہے کیونکہ آپ اس واقعہ کے ایک سال بعد وفات پا گئے۔ اس لئے اتنی قلیل مدت میں دونوں دیوان کس طرح اصلاح کئے جا سکتے تھے۔

آپ روزمرہ اور محاورات کے استعمال میں بہت مشاق تھے جن سے زباندانی میں بہت مدد ملتی ہے۔ زبان پر بہت قدرت تھی۔ آپ کے کلام میں حسن بیان، خوبی ادا، شوخی طرز اور شستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ آپ کا کلام لطافت اور نزاکت کا مرقع ہے۔ سلاست، نفاست الفاظ، شیرینی و دل نشینی ترکیب، تناسب ترتیب آپکے کلام کے خاص عناصر ہیں۔

آپکے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن ہوتی ہیں اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ آپکے الفاظ ملائم سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے۔ آپ کا کلام اس بارے میں جواب رکھتا۔

میں یہاں چند شعر مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں جن سے آپکے کلام کی خوبی اور آپکے انداز خاص کا اندازہ ہو جائیگا۔

شرم از میاں برخاستہ، مہر از دہاں برداشتہ
گفتار بے ترسش ببیں، رفتار بیباکش نگر
از کوئے معشوق آمدہ، شوریدگاں دستعاش
از مبدا آہوئے رسد، شیراں بفتراکش نگر

فکرِ طوبیٰ و جناں در رہِ عشق خطا ست
آنکہ در شرع مباح است حرام ست اینجا

درس ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے،
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را،

اسی طرح آپ کے کلام کی ایسی اور بھی کئی مثالیں ہیں جن کی تفصیل یہاں کچھ زیادہ موزوں نہیں، (سجاد ہاشمی)

غزل

از جناب قاضی محمد رمضان صاحب تبسّم قریشی

خیالِ وضعداری جذبۂ دیدار کیا جانے
جو مستوں پر گزرتی ہے اُسے ہشیار کیا جانے

جوابِ تلخ کیا، سر بھی قلم کر دے تو کیا حاصل
جو تیرا ہو چکا ہو تلخیٔ انکار کیا جانے

بیابانِ جنوں میں دادِ وحشت دے رہا ہو گا
ترا دیوانہ پاسِ جُبّہ و دستار کیا جانے

شکستِ آرزو کی گود میں پل کر جواں ہو گی
تمنّا کو مری نامحرمِ اسرار کیا جانے

خلش تیرِ نظر کی کس قدر سرشارِ لذّت ہے
کوئی پوچھے مرے دل سے نگاہِ یار کیا جانے

نہ پوچھو کچھ کہ کیا عالم ہے دل کی بیقراری کا
گزرتی ہے جو دل پر وہ لبِ گفتار کیا جانے

شرابِ جستجو پی کر چلا تھا اپنا دل لیکن
یہ مسحورِ تماشا گرمیٔ رفتار کیا جانے

کسی مجبور اور برباد دل کے سوزِ پنہاں کو
کوئی ہمدرد کیا سمجھے، کوئی غمخوار کیا جانے

نسیمِ صبحدم کی دوستی کا فیض ہے۔ ورنہ
تبسّم حسن زارِ شعر کے اسرار کیا جانے

دیوانہ!

نقاشِ جذبات حضرت ظفر واسطی،

وہ سامنے میڈیکل کالج ہے۔ سنگِ مرمر کی سفید سفید عمارت۔۔۔ کتنی خوبصورت ہے۔۔۔ کتنی دلکش ہے۔۔۔ اس کے اندر ایک کمرے میں میرے دل کی ملکہ آرام کر رہی ہے۔ نہیں بلکہ کرسی پر بیٹھی ڈاکٹری کی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ یہ شاید اس کی تعلیم کا آخری سال ہے۔ اسے سب مرضوں کا علاج آگیا ہے؟ اب وہ اپنے فن میں طاق ہو کر نکلے گی۔ کچھ دنوں میں مہارت تامہ مل جائیگی لیکن مجھے کیا۔۔۔ میرا علاج تو وہ کرتی نہیں، اسے تو یہ بھی خبر نہیں کہ کوئی مریض اپنی زندگی سے آزردہ مارا مارا پھر رہا ہے۔ کوئی اپنے مسیحا سے اپنے دل کا حال کہنے کے لئے ہر وقت کالج کا طواف کرتا رہتا ہے لیکن بدقسمتی کہ باریابی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ڈاکٹر ہو کر مریضوں سے اتنی بے پروا ہے کیا ڈاکٹری اس لئے پڑھی ہے کہ بیماروں کا حال تک نہ سنے۔ مرض کھونا تو رہا ایک طرف۔

گیارہ بج گئے ہیں۔۔۔ سڑکیں میرے دل کی طرح سنسان ہو گئی ہیں اور ویران۔ میں اکیلا کھڑا ہوں، نہیں اکیلا تو نہیں، میرے ساتھ اس کا تصور بھی ہے۔۔۔ میرے ساتھ اس کا خیال بھی ہے جسے کبھی۔۔۔ میرا خیال نہیں آیا۔ ستارے مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ ان نادانوں کو کیا خبر کہ جب کسی انسان کے دل پر بن جاتی ہے تو اس پر کیا گذرتی ہے ؟ چاند البتہ ہمدردی کرتا ہے۔ شاید یہ بھی مصیبت زدہ ہے۔ اس کا رنگ بھی زرد ہے، اس کے سینے میں بھی داغ ہے۔ یہ بھی تمام رات میری طرح کسی کی تلاش میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔۔۔ لیکن ہے یہ بھی ناکام ہی۔ جبھی تو یہ اتنی ہمدردی کرتا ہے۔ جب وہ کسی ضرورت سے کمرے سے باہر نکلتی ہے تو اس کی چاندنی۔۔۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور سہانی چاندنی جا کر اس کے قدموں میں گر پڑتی ہے اور عرض کرتی ہے۔ حضور ڈاکٹر صاحب ایک بدنصیب بیمار باہر سڑک پر کھڑا سسک رہا ہے۔ اگر حضور۔۔۔ لیکن وہ ظالم اس کی بات تک نہیں سنتی۔ اسے ٹھکرا دیتی ہے اور پاؤں میں روندتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔۔۔ چاند یہ منظر دیکھ کر مجھے اور زیادہ رحم آلود نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔

اُف محبت کیسی بُری بلا ہے یہ انسان سے اس کا سکھ چین آرام اور خوشی چھین لیتی ہے۔۔۔ اور یہ سب نعمتیں چھین کر دیتی کیا ہے؟۔۔۔ درد، بیقراری، بےچینی اور غم۔۔۔ لیکن کیا حسینوں کو بھی محبت ہوتی ہے؟۔۔۔ اگر ہوتی ہے تو کیا محبت ان سے بھی ایسا ہی برتاؤ کرتی ہے۔ کیا انھیں بھی راتوں کو نیند نہیں آتی۔۔۔؟ کیا وہ بھی بے قرار رہتے ہیں؟ کیا ان کے دل میں بھی ہر وقت درد اٹھتا رہتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں،۔۔۔ اگر انھیں محبت ہوا کرتی تو یہ اتنے سنگدل نہ ہوتے۔

ہاں!۔۔۔ تو گیارہ بجے ہیں۔ ہوا میں ناقابل برداشت خنکی اور تیزی آگئی ہے، میں یہاں کیوں پھر رہا ہوں؟۔۔۔ میں اس وقت یہاں آیا ہی کیوں تھا؟۔۔۔ کیا جو کچھ لوگ کہتے ہیں وہ سچ ہے۔؟ کیا میرے ہوش و حواس دراصل درست نہیں ہے؟۔۔۔ کیا میں حقیقت میں پاگل ہو گیا ہوں؟۔۔۔ نہیں، کون کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں؟۔۔۔ ہرگز نہیں، مجھے ہر ایک بات کا ہوش ہے۔ اگر ہوش نہ ہوتا تو میں یہ کیسے دیکھ سکتا کہ وہ سامنے میڈیکل کالج ہے۔۔۔ سنگِ مرمر کی سفید سفید عمارت۔۔۔ کتنی دلکش ہے، کتنی خوبصورت، کیا جو پاگل ہو جاتے ہیں انھیں اردگرد کی چیزیں نظر آتی ہیں؟ اور کیا انھیں سارے واقعات یاد رہتے ہیں۔۔۔؟ مجھے تو سب باتیں یاد ہیں۔۔۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب میں نے اسے پہلی

مرعوب ہوگیا تھا ـــــ اُس کے آنے سے دفتر میں اُجالا سا ہوگیا تھا۔ اس کے پرتو حُسن سے ہر ایک چیز ضوفشاں ہوگئی تھی ـــــ اور جب اس نے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی تو میرے دل کی ساری کائنات کانپ اٹھی تھی ـــــ ہاں میرا سارا جسم کانپ اٹھا تھا۔ پھر وہ چلی گئی ـــــ اور اس کے جانے کے بعد بڑی دیر تک مجھ پر ایک سکتہ کی سی کیفیت طاری رہی

پھر ـــــ میں ہر روز اس کی راہ دیکھتا رہا ـــــ لیکن وہ نہ آئی ـــــ گو یقین تھا کہ ایک بار وہ ضرور آئیگی ـــــ اسی طرح تین چار مرتبہ دیکھنے کے بعد ـــــ میرا دل ـــــ میری روح ـــــ میری زندگی، اس پر فریفتہ ہوگئی۔

چاند کتنی تیزی سے اپنی منزل ختم کر رہا ہے ـــــ یہ اس ملک میں اپنے محبوب کی تلاش کر چکا۔ اب دوسرے ملکوں میں ڈھونڈنے جا رہا ہے ـــــ اُسے آج تک اس کا محبوب نہیں ملا۔ میں اس سے خوش نصیب ہوں، میں نے اپنے محبوب کو دیکھا تو ہے ـــــ مجھے یہ تو معلوم ہے کہ وہ اس عمارت کے اندر موجود ہے۔ لیکن نہیں، میں غلطی کر رہا ہوں ـــــ چاند مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ یہ اُسے ہر روز دیکھتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے اب بھی دیکھ رہا ہو۔

ہاں تو مجھے سب باتیں یاد ہیں ـــــ تین چار مرتبہ دیکھنے کے بعد میرا دل، میری روح، میری زندگی اس پر فریفتہ ہوگئی ـــــ پھر وہ کئی مہینے نظر نہ آئی۔ میں ہر روز اُس کی راہ دیکھتا رہا۔ میں نے کتنی دعائیں مانگیں ـــــ کتنی منتیں مانیں، کتنے دن برباد کئے۔ اور کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹیں کہ بس میرا ہی دل جانتا ہے لیکن اُس کی زیارت نصیب نہ ہوئی آخر تنگ آکر ایک خط لکھا ـــــ خط کا مضمون مجھے اب تک یاد ہے ـــــ میں نے لکھا تھا کہ آپ مجھے نہیں جانتیں اور میں آپ کو جانتا ہوں، لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے ـــــ بڑے آدمیوں کو ساری دنیا جانتی ہے اور بڑے آدمی ساری دنیا کو نہیں جانتے ـــــ مثال کے طور پر خواجہ حسن نظامی کو لیجئے ـــــ انھیں ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ لیکن وہ ہندوستان کے بچے بچے کو نہیں جانتے۔

اس نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے ایک اور خط لکھا۔ اس نے اس کا بھی جواب نہیں دیا ـــــ شاید وہ مجھے اپنے جواب کے قابل نہیں سمجھتی ـــــ لیکن میں نے اس سے یہ کب کہا تھا کہ آپ مجھے اپنے قابل سمجھئے۔ میں نے تو یہ لکھا تھا کہ "میں نے آپ کو تین چار مرتبہ دیکھا ہے اور ہر مرتبہ میرے دل میں آپ کی پہلے سے زیادہ قدر و منزلت پیدا ہوگئی اور اب میرے دل میں آپ کی بے انتہا عزت" موجود ہے ـــــ پھر کیا یہ ضروری ہے کہ کسی دیوی کی پرستش کرنے کے لئے پرستار کو بھی اسی مرتبہ کا ہونا چاہئے۔؟

یہ سامنے سایہ سے کیسے نظر آنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو تین آدمی میری طرف آرہے ہیں۔ کیا یہ بھی اُسی کی جستجو میں ہیں ـــــ؟ کیا یہ بھی اس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔؟

دو دفعہ میری قسمت جاگی، لیکن صرف دو ہی لمحوں کے لئے ـــــ ایک روز میں نے اسے دیکھا۔ کوئی بارہ بجے کے قریب، اس کی ایک جھلک

سہیلی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں شاید تھیٹے تار گھر سے نوروز کی مبارکباد کا تار دے کر آ رہی تھیں ——— اس نے ہلکے فیروزی رنگ کی ساری پہن رکھی تھی ——— اسے دیکھ کر مجھ پر کیا گذری؟ یہ میں بیان نہیں کر سکتا ———

ایک دفعہ پھر دیکھا، شام کو پونے چھ بجے، اس مرتبہ اس کی ایک ہم مذہب سہیلی اس کے ہمراہ تھی ——— اس نے سفید ساری پہن رکھی تھی اور اس پر ایک لمبا کوٹ خاکی رنگ کا۔ وہ کچھ بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم کچھ کچھ ڈگمگا رہے تھے۔ جی میں آیا کہ پوچھوں ——— "نصیب دشمناں کچھ تکلیف ہے؟" مگر رعب نے اجازت نہ دی۔

یہ کمبخت مجھے پاگل سمجھنے لگے ہیں۔ ان کے دل میں یہ بات سما گئی ہے کہ عشق نے میرے ہوش و حواس معطل کر دیئے۔ کاش یہ سمجھ سکتے کہ جسے یہ پاگل سمجھ رہے ہیں وہ پاگل نہیں ہے وہ انہیں کی طرح ہوشیار ہے۔ یہ اسے پاگل سمجھتے ہیں، وہ انہیں پاگل سمجھتا ہے۔

اچھا! اے میڈیکل کالج! اے میرے محبوب کے مسکن! رخصت اس وقت تک کے لئے رخصت جب تک کہ یہ میرے "بہی خواہ" یہ مجھے پاگل سمجھنے والے سو نہ جائیں۔

ظفر واسطی

مثلث بر غزل غالب

از جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی ٹریبل ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) ایڈووکیٹ

بشر کی کیا حقیقت ہے، وہ رہتا یا فنا ہوتا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوئی جب بیہوشی طاری سبکدوشی کی لذت کیا
ہوا جب غم سے یوں بیحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

خدا بخشے رسا اس کا خیال آ تک ستاتا ہے
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

تسلّی دہندہ

ایک دفعہ مشہور فلسفی سطو سائل نے ایک غمزدہ عورت کو جو غمگین ہونے میں حق بجانب بھی تھی کہا۔ "مادام، انگلستان کی ملکہ یعنی ہنری چہارم کی لڑکی بھی تمہاری ہی طرح سوختہ بخت تھی۔ اس کو جلا وطن کر دیا گیا تھا، بحری سفر میں اسے اپنی زندگی کا خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ بیچاری نے اپنے شاہی خاوند کو اپنی آنکھوں کے سامنے تختہ دار پر دم توڑتے دیکھا تھا۔"

"مجھے اس سے ہمدردی ہے" ——— یہ کہہ کر غمزدہ عورت پھر اپنی بدنصیبی پر اشک شوئی کرنے لگی۔

"مگر" سطو سائل نے کہا۔ "میری سٹوارٹ کے انجام پر غور کرو، وہ ایک مغنی کے دام الفت میں گرفتار تھی، وہ سارنگی بجانے میں ماہر تھا میری کے خاوند نے اس مغنی کو اس کی نظروں کے سامنے ہلاک کر دیا۔ اس کے عوض اس کی اچھی سہیلی اور رشتہ دار ملکہ الزبتھ نے جو اپنے آپ کو کنواری کہلاتی تھی اس کے سر کو کلو بریدی کے چبوترے پر جو سیاہ کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا کٹوا دیا۔ سر قلم ہونے سے قبل اسے اٹھارہ سال کے طویل عرصہ تک جیل کی چار دیواری میں نظر بند رہنا پڑا۔"

"یہ ظلم کی انتہا تھی" ——— اس عورت نے جواب دیا۔ اور ساتھ ہی پھر اپنے غموں میں ڈوب گئی۔

"شاید تم نے نیپلز کی حسین جوآن کے متعلق کچھ نہیں سنا جس کا قید کرنے کے بعد گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔" فلسفی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

غمزدہ عورت نے جواب دیا۔ "مجھے وہ واقعی اچھی طرح یاد نہیں ہے۔"

"تو مجھے پھر اس ملکہ کا قصہ ضرور بیان کرنا چاہیے جسے جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے۔ طعام کے بعد تخت سے اتار دیا گیا تھا ——— اور جس نے اپنی زندگی کے آخری سانس ایک صحرائی جزیرے میں پورے کئے تھے۔"

"مجھے اس کی داستان اچھی طرح معلوم ہے۔"

"خیر تو پھر میں ایک اور شہزادی کی المناک داستان بیان کرتا ہوں

جسے میں فلسفے کی تعلیم دیا کرتا تھا، جیسا کہ اور خوبصورت شہزادیوں کا [illegible] اس کا بھی ایک عاشق تھا۔ شہزادی کا باپ اس نوجوان کو [illegible] دیکھتا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ شہزادی [illegible] باپ کو متنفر دیکھ کر ایک روز اس نے دست پناہ اٹھایا اور اس [illegible] کا سر پھوڑ ڈالا۔ گو وہ زخم بڑی مشکل کے بعد بھر آئے مگر ضرب کے نشانات [illegible] موجود ہیں ——— لڑکی اپنے عاشق اور باپ کو باہم دست و گریباں دیکھ کر خوف کے مارے کھڑکی سے کود پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب [illegible] یہ اور بات ہے کہ دیگر چند وجوہ کی بنا پر اب بھی ایک شکیل نوجوان اس کے [illegible] کے دام میں گرفتار ہے ——— عاشق کو موت کی سزا کا حکم ملا اس لئے کہ اس نے ایک عظیم الشان شاہزادے کا سر پھوڑ ڈالا تھا تم اس قابل رحم حالت کا خود اندازہ لگا سکتی ہو جو شہزادی پر طاری ہوئی ہوگی جب اس نے اپنے چاہنے والے کو پھانسی کے تختے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ عرصہ ہوا میں نے اس سے ملاقات کی تھی جب وہ جیل میں تھی ——— ہر وقت اپنے دکھ [illegible] اس کے ورد زبان رہتے تھے۔"

"مگر تم مجھے اپنے غموں کا خیال کرنے کیوں نہیں دیتے ———؟" غمزدہ عورت نے فلسفی سے دریافت کیا۔

"اس لئے کہ تمہیں ان کا خیال ہرگز نہیں کرنا چاہئے اور جب اس [illegible] بلند مرتبت عورتیں حد درجہ واژگوں بخت واقع ہوئی ہیں [illegible] کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہیکوبا کا خیال کرو، نیوبی کی طرف دیکھو۔"

"آہ! اگر میں ان کے عہد میں زندہ ہوتی اور تم ان [illegible] کا حال سنا سنا کر تسلی دینے کی سعی کرتے تو خدا را یہ تو بتاؤ [illegible] کہ ایک لفظ پر بھی کان دھرتیں ———؟" تم ان [illegible]

[illegible]

[illegible]

اس شخص کے نام [illegible]

(ترجمہ) (غالب)

اُمیدِ موہوم!

[illegible] فضاؤں میں جب میں اپنے دل کی دنیا میں ویرانی اور تنہائی سی محسوس کرتی ہوں تو اے میرے محبوب! [illegible] ایک ایسی چیز ہے جو اس ویران خانۂ دل کی خستہ و پریشان حالت کو از سر نو استوار و آباد کرتی ہے۔

جب میرے دل کو شباب کی امنگیں گُدگُدا کر غمگین و اداس چھوڑ جاتی ہیں۔ جب طوفانِ عزم اُمڈ کر خود مجھے تباہ کرنے کو ہوتا ہے۔ تو [illegible] خیال ہی اس محشرِ جذبات پر سکون پاشی کر کے میٹھی لوریوں سے اسے آرام و چین کی نیند سلا دیتی ہے۔

پیارے! جان سے پیارے!! تجھے کیا بتاؤں کہ دُنیائے معلومات کیسے کیسے دلچسپ نظارے پیش کرتی ہے لیکن تجھ سا حسین [illegible] ـــــ مجھے تو تو ہی سب سے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ میرا معیارِ حُسن یہی بن چکا ہے۔ خوش نصیب ہے [illegible] میں نے تیرے حسنِ معصوم کو دیکھا۔ اس میں بھلا اور کوئی چیز کہاں جچتی ہے۔

ان دور دراز اور غیر آباد علاقوں میں جب میں اداس سی ہو جاتی ہوں ـــــ جب فطرت کی ہر ایک چیز کو سرگوشی کرتے دیکھ [illegible] ایک ٹیس سی لگاتی ہے ـــــ جب میری مایوسیاں مجھے خون کے آنسو رُلاتی ہیں ـــــ جب تیرے اور اپنے [illegible] قرب و دوری کا احساس کر کے حیران رہ جاتی ہوں ـــــ جب، جب پرواز کر کے تجھے جا ملنے کو جی چاہتا ہے ـــــ [illegible] اپنی مجبوریوں کو محسوس کرتے ہوئے دل مسوس کر رہ جاتی ہوں، تو اس وقت اے میرے محبوب! [illegible] امید مجھے تسکین صبر کرتی ہے۔

حیات میگھانوی

جناب کوی راج وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت جی شرما وید امرت دھارا و شوگری کی تیار کردہ خاص ادویات جن سے لاکھوں مرد اور عورت فائدہ اٹھا چکے ہیں!

ماہ مارچ کے اندر جو خط ڈاک میں ڈالے جاویں گے اُن کو نصف قیمت پر ملینگی!

اس اشتہار میں قیمتیں پوری درج کی گئی ہیں!

نامردوں کو مرد بنانے والی اکسیریں و طلاء

اکسیر ملے مردوں کی تمام کمزوریوں کو دور کرکے پھر سے نئی زندگی بخشتی ہے کمزور کو دلیر بناتی ہے قیمت ۴۸ گولی چار روپے ۲۴ گولی عہ نمونہ ۸ر

اکسیر ۴۲ الف جریان کی بے نظیر دوائی ہے۔ چند دنوں میں ہمیشہ کے واسطے آرام آجاتا ہے قیمت دو روپیہ نمونہ ۸ر

اکسیر ۵ قوی ادویات کی سرتاج ہے۔ دنیا میں اس کے برابر مقوی دوائی نہیں مل سکتی چند دنوں کے اندر وہ طاقت دکھاتی ہے جو پہلے کبھی نہ دیکھی ہو قیمت ۳۲ گولی چودہ روپے ۸ گولی چار روپے للعہ

اکسیر ۱۲ سرعت کے مریضوں کے واسطے امساک کی بے نظیر دوائی ہے کیونکہ دوسری ادویات کی طرح طاقت کم نہیں کرتی۔ قیمت ۴۰ گولی تین روپے، ۲۰ گولی ایک روپے۔

اشوگری (رجسٹرڈ) ضعف کے ساتھ پیشاب کی زیادتی ہے یا پیشاب میں شکر آتی ہے تب اس ثانی اکسیر کا استعمال کریں جو ایک ہی دو لوں فوائد رکھتی ہے قیمت چار روپے نمونہ ایک روپیہ۔

طلاء ۱ اکسیر ۵ کے ساتھ اگر امیر لوگ اس کو بھی استعمال کریں تو کہنا ہی کیا ہے قیمت پانچ روپے۔ نمونہ ایک روپیہ چار آنے

طلاء ۱۲۔ یوں تو طلاؤں کے سیکڑوں اشتہار نکلتے رہتے ہیں اور خوش کرنے کے واسطے من مانی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ اس طلاء کے برابر تمام نقائص دور کرنے والا دنیا میں نہیں ہے قیمت چھ روپے نصف تین روپے

عورتوں و بچوں کے واسطے چند مجرب ادویات

میٹھا پھل (رجسٹرڈ) ایک عجیب دوائی ہے حمل کے دو ماہ بعد تیسرے ماہ کے شروع میں ایک دن یہ دوائی دودھ کے ساتھ کھلائی جاتی ہے۔ بس لڑکا ہی پیدا ہوتا ہے اگر لڑکی پیدا ہوگی تو قیمت واپس کردی جائیگی قیمت دس روپے

من رنجن ہسٹیریا مرض کی مجرب دوائی ہے قیمت ۴۸ گولی للعہ نمونہ ۱۶ گولی عہ

دوائی بندش خون جب خون علاوہ حیض کے جاری ہو تو تین دن کے اندر بند ہو جاتا ہے قیمت خوراک ۹ دن دو روپے خوراک تین دن ۱۲ر

بانجھ پن: بیتالی خوابی حیض کے واسطے خواہ کسی وجہ سے ہو اکسیر ہے طاقت بخشتی ہے قیمت دو روپے نمونہ ۸ر

سوفنی عورتوں کے سفید پانی جانے (لیکوریا) سیلان رطوبت کی اکسیر دوائی قیمت دو روپے نمونہ ۱۲ر

گود بھری جن کے اولاد نہیں ہوتی ان کے تین یا چار ماہ کے اندر گود ہری بھری ہو جاتی ہے قیمت پانچ روپے

پھول پھلو سوکھا سسان کی دوائی ہے۔ بچہ جب سوکھ جاتا ہے یہ دوائی کمر پر ملا جاتا ہے۔ باریک باریک کیڑے نکلتے ہیں اور بچہ تروتازہ ہو جاتا ہے قیمت ایک روپے

بال سکھ بچوں کے امراض۔ بدہضمی قبض۔ کھانسی وغیرہ کے واسطے مفید ہے قیمت ایک روپیہ نمونہ ۴ر

امراض خبیثہ کا قلع قمع

دوائی آتشک ۱۳ آتشک ہر قسم ہر دو مادہ کو ۱۴ دن میں آرام ہوجاتا ہے قیمت چار روپے نصف دو روپے

مرکب سا سا شت پرانا آتشک جب خون خراب کر دے یہ دوائی خون صاف کرکے جسم کو کندن کی طرح بنا دیتی ہے قیمت دو روپے نمونہ چھ آنے ۶ر

چناک (رجسٹرڈ) بڑے تجربوں کے بعد ہمارا خود تجویز کردہ نسخہ اکسیر ناک ہے جو کہ تردد کی حالت کو بے نظیر ہے، سوزش ہو جلن ہو پیپ ہو دونوں ملے ہوئے ہوں سب کو مفید ہے قیمت ۴۰ گولی چار روپے نمونہ ۱۵ گولی ایک روپیہ

چند دیگر ادویات

دوائی بواسیر ۴۳ خونی و بادی ہر قسم کی بواسیر کیلئے بے نظیر ہے سالوں کی بیماری دنوں میں دور ہوتی ہے قیمت دو روپے نمونہ ۴ر

کرکول (رجسٹرڈ) ہاضمہ کی بے نظیر دوائی ہے ہاضمہ کو تیز کرتی ہے معدہ و آنتوں کی تمام تکالیف کو دور کرتی ہے۔ قیمت ۶۰ گولی دو روپیہ ۳۰ گولی ایک روپیہ نمونہ ۴ر

دوائی تلی ۱۷ تاپ تلی کے واسطے بے نظیر ہے ہاضمہ تیز کرتی ہے قیمت عہ نمونہ ۴ر

دت ورتجن (رجسٹرڈ) جلاب کے واسطے یہ دوائی بے نظیر ہے جتنے جلاب لینے ہوں اسی سے اچھی طرح آجاتے ہیں قیمت ایک روپیہ نمونہ ۲ر

آرام بان جن کو قبض دائمی رہتی ہے وہ ان گولیوں کو کھایا کریں آہستہ آہستہ بیماری دور ہو جائیگی قیمت ۳۲ گولی ایک روپیہ ۶ گولی ۸ر

سنگ توڑ پتھری کنکر گردہ یا مثانہ کو بلا تکلیف براستہ پیشاب خارج کرتی ہے قیمت دو روپے نصف ایک روپیہ

بلا دور ان گولیوں سے افیون کی عادت چھوٹ جاتی ہے سیکڑوں چھوڑ چکے ہیں قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

اکھ ٹھنڈ۔ روزانہ استعمال کیلئے یہ سرمہ بہت اعلیٰ ہے قیمت فی تولہ ۸ر نمونہ ۱ر

اکھ روشن (رجسٹرڈ) آنکھوں کے تمام امراض دھند جالا پڑبال، خارش وغیرہ کو اکسیر ہے قیمت فی تولہ ۱۲ر نمونہ ۱ر

کرن تیل کان کے امراض اور درد پیپ۔ زخم شائیں شائیں کی سماعت کے لئے بہت اعلیٰ تیل ہے قیمت ایک روپیہ نمونہ ۴ر

نسوار (رجسٹرڈ) نسوار لینے سے بلا چھینک آنے کے درد سر آدھا سیسی۔ دانت درد کان درد نزلہ زکام وغیرہ دور ہوتے ہیں قیمت ایک روپیہ نمونہ ۴ر

عرق بخار ہر قسم کے بخار ایک شیشی تین دن کھانے سے دور ہو جاتے ہیں قیمت ۸ر

چیت موہنی چہرہ کے بدنما داغ کیل چھائیاں وغیرہ دور ہو کر چہرہ صاف ہوتا ہے اور جھریاں نہیں پڑتیں قیمت ایک روپیہ نمونہ ۴ر

بال اڑانے کی بے نظیر دوائی اس دوائی کو پانی میں گھول کر لگانے سے ایک منٹ کے اندر اندر سخت سے سخت اور نرم سے نرم جگہ کے بال صفائی کمال طرح سے دور ہوتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ۶ر نمونہ ۱ر

باغ پھول تیل سر کی خشکی سر درد کو دور کرتا ہے۔ دماغ تر و تازہ رکھتا ہے قیمت فی شیشی ۱۲ر

گولی پان ایک گولی منہ میں رکھنے سے پان کا مزہ بھی آئیگا اور فائدہ بھی ہوگا قیمت ۶۰ گولی ایک روپیہ ۳۰ گولی ۸ر

امرت دھارا اور اس کے پانچ مرکبات بھی نصف قیمت پر ملیں گے۔ یہاں پوری قیمتیں درج کی گئی ہیں!

امرت دھارا کسی تعریف کی محتاج نہیں ہر کوئی جانتا ہے ہر گھر میں رہنی چاہیئے یہ عقلمند سب جانتے ہیں کہ نقالوں پر روپیہ خرچ کرنا وقت پر دھوکہ کھانا ہے اس واسطے بہتر ہے کہ ماہ مارچ کے اندر امرت دھارا اور اس کے مرکبات رعایتی قیمت پر حاصل کریں خط ڈاک میں مارچ کے اندر ڈال دینا چاہیئے جواب ادویات نہ منگوانا چاہیں وہ روپیہ جمع کرا سکتے ہیں اور بعد کو جب چاہیں رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں!!

امرت دھارا (رجسٹرڈ)
تقریباً کل امراض جسمانی کا علاج لاکھوں استعمال کرتے ہیں دنیا میں بے نظیر ایجاد ہے قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے عہ نصف ایک روپیہ چار آنے نمونہ ۸ر

امرت دھارا "مرہم" (رجسٹرڈ)
یہ تمام جلدی امراض کے واسطے بے نظیر ہے تمام قسم کے پھوڑے پھنسیاں اس مرہم سے دور ہوتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ایک روپیہ عہ

امرت دھارا "لوزنجز" یعنی میٹھی ٹکیہ
ولایت سے پیپرمنٹ کی ٹکیاں آتی ہیں ان کے ذریعے بچے اور نازک مزاج بھی امرت دھارا خوشی سے کھا سکتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ایک سو ٹکیہ چار آنے ۴ر

امرت دھارا "صابن" (رجسٹرڈ)
یہ صابن تمام جلدی امراض وغیرہ کو دور کرتا ہے ڈس انفکٹنٹ (جرم کش) اول درجہ کا ہے قیمت فی بکس تین ٹکیہ چودہ آنے ۱۴ر

امرت دھارا "بام" (رجسٹرڈ)
درد وں پر ملنے کے واسطے نہایت ہی مفید مرکب ہے قیمت فی ڈبیہ ایک روپیہ عہ

امرت دھارا "لوشن" (رجسٹرڈ)
اس کے غرارے دانت اور گلے کے امراض کے واسطے بہت ہی مفید ہیں قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ

خط و کتابت اور تار کا پتہ: امرت دھارا نمبر ۱۶ لاہور المشتہر مینجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

مختصر فہرست کتب
عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور

حامیانِ اردو علم و ادب کا اوّلین اور ضروری فرض!
آپ ہمیشہ عالمگیر بکڈپو سے کتابیں طلب فرمائیں

شادی ہماری یا آپ کی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور ظرافت نگار حضرت ملا رموزی کی شادی کے دلچسپ حالات خود ملا صاحب نے قلم ظرافت رقم سے لکھے ہوئے خیال فرمائیے کتنی دلچسپ کتاب ہوگی ہمارا خیال ہے کہ اصلی شادی میں وہ رومانیت نہیں ہے جو اس کتاب میں پائی جاتی ہے بس پڑھئے اور ہنسئے اور پھر پڑھئے، حیرت انگیز کتاب ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات قیمت ۱۲؍

صبح لطافت ضیاء الملک ملا رموزی کے چیدہ اور بہترین ظرافتیہ مضامین کا گرانقدر مجموعہ۔ کتاب کا ہر صفحہ زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپے۔

نوٹ:۔ شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر ناظرین عالمگیر کو تین روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک میں ملیں گی ؎

لیلےٰ کے خطوط ہندوستان کے مشہور فلسفی ادیب قاضی عبد الغفار کی وہ ہنگامہ پرور اور زندہ جاوید تصنیف جس کا پہلا ایڈیشن ایک قلیل عرصہ میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا لیلیٰ کے خطوط کے ہر خط ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ میں ایک تڑپ موجود ہے، ایسی تڑپ جس کا صحیح اندازہ آپ کو کتاب ملاحظہ فرمانے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ قیمت صرف ناظرین عالمگیر سے ہی اس کی قیمت دو روپے چار آنے کے بجائے صرف ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک لی جائیگی

مجنوں کی ڈائری مشہور فلسفی قاضی عبد الغفار کی مایۂ ناز تصنیف اردو ادب کی بہترین کتاب ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک ؎

محبوبۂ قیرواں علامہ جرجی زیدان کا دوسرا بلند پایہ تاریخی ناول ہے عالمگیر بکڈپو نے بصرف کثیر شائع کیا ہے قیمت ۱۲؍

روزنامچے ادبیات۔ نفسیات اور مطائبات کا شاندار مجموعہ دور حاضرہ کی بہترین تصنیف، بیحد دلچسپ کتاب، چند روزنامچوں کے عنوان ملاحظہ ہوں۔ بادشاہ کا روزنامچہ، فقیر کا روزنامچہ، ایکٹرس کا روزنامچہ، ممبر اسمبلی کا روزنامچہ، حجام کا روزنامچہ، شاعر کا روزنامچہ، حکیم کا روزنامچہ۔ قوال کا روزنامچہ، دوشیزہ کا روزنامچہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ

سیب کا درخت شہرۂ آفاق ادیب قاضی عبد الغفار کا ایک بیحد دلچسپ اور فلسفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا طویل

گل سرخ ترا ۔۔۔ ہوا انگریزی کے نوبل پرائز یافتہ ادیب گالزوردی کے افسانہ کا ترجمہ ہے قیمت ۱۲؍

بحرِ تبسم از شوکت تھانوی۔ قیمت دو روپے ؎ ۱۲؍

موجِ تبسم از شوکت تھانوی۔ قیمت دو روپے ؎ ۱۲؍

سیلابِ تبسم از شوکت تھانوی۔ قیمت دو روپے ؎ ۱۲؍

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر مصنفہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ۔ اس مختصر رسالہ میں علامہ شبلی مرحوم نے ان تمام اعتراضات کے مدلل و مسکت جوابات تاریخ و حقائق کی روشنی میں دیئے ہیں جو عالمگیر پر لگائے جاتے ہیں۔ قیمت چار آنے ۴؍

کتاب التقدیر علامہ ابن القیم کی مشہور و شہرۂ آفاق کتاب۔ کتاب التقدیر کا عربی سے اردو ترجمہ، تقدیر کیا چیز ہے؟ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ تقدیر کس طرح بنتی ہے؟ اور کن حالات میں بگڑتی ہے۔؟ حجم پونے آٹھ سو صفحات سائز بڑا۔ اس کتاب کی اصل قیمت پونے چار روپے ہے۔ ناظرین عالمگیر سے صرف ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک ؎

فہرست کتب

بہارستان

نو خرید یجئے — ضرور خریدیئے

ظفر الملۃ حضرت مولانا ظفر علیخاں مدیر "زمیندار" کی سابقہ و تازہ تمام منظومات کا مجموعہ جو پیکر انسانی میں خون حیات پیدا کر دیتی ہیں۔ جلد از جلد طلب فرمایئے۔ بہترین کاغذ، عمدہ و نفیس کتابت و طباعت حجم ۸۲۸ صفحات قیمت صرف چار روپے للعہ۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہے!

خالدہ خانم مؤلفہ حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر و پروپرائٹر رسالہ عالمگیر خالدہ ادیب خانم کی سوانح حیات اور اس شہرۂ آفاق ومایہ ناز ادیبہ کے چند دلچسپ مضامین کا ترجمہ قیمت صرف ۸ر

سوانحعمری غازی محمود شوکت پاشا صدر اعظم، مدبر باتدبیر حامی دستور بطل قسطنطنیہ جاں نثار ملک و ملت غازی محمود شوکت پاشا کی سوانحعمری قیمت صرف ۸ر

درِ شہوار مصنفہ مصور غم علامہ راشد الخیری مرحوم، مولانا مرحوم کا نام ہی اس کتاب کی دلچسپی کا ضامن ہے، ہماری تعریف و توصیف فضول ہے، قیمت صرف دس آنے ۱۰ر

ماہ پرویں جناب میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی، وکیل ایبٹ آباد کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ قیمت ۱۲ر

پرواز خیال چار مختصر ڈرامے قیمت صرف پانچ آنے ۵ر

انقلاب ایران جسمیں شاہان ایران کی قسمتوں کے عروج و زوال کے نقشے ایران کی قدیم تہذیب و شائستگی، اسکی مذہبی، اخلاقی اور سیاسی حالتوں کے نمونے قرون اسلام کی برگزیدہ مسلمانوں کے پرجوش کارنامے اور اسلام کی شاندار خدمات قیمت عہ

کھرپا بہادر مشہور مزاح نگار حضرت مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرز تحریر کا تازہ ترین شاہکار نہایت ہی پرمذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مزاحیہ طرز بیان میں کیسا کیسا کمال نظم کے جھگڑا تیکھر دل میں عشق و محبت، سوز و گداز کے کرشمے اور زوفناک شرمناک سازشوں کے ہوش ربا قہقہے خیز سین کھائے ہیں۔ یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی و روانی میں چغتائی صاحب کے نام اور لوہے بڑا ہوا ہے، کھرپا بہادر کو پڑھکر آپ شیکسپئر کے مزاحیہ ڈرامے بھول جائینگے بہترین لکھائی چھپائی۔ فوٹو ملاک کا رنگین سرورق قیمت عہ محصول ۴

خطوط کی سنگم ظریفی مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی جناب نے والی نئی کتاب چغتائی صاحب کے مخصوص اور انوکھے طرز تحریر کی دلچسپ تصویر بالکل نئی کتاب قیمت ۱۲ر

مہدی سرزمین مصر کی ایک نہایت پرلطف داستان، اندرمان کی جنگ مصری اور برطانوی سیاسیات، برطانوی اقتدار اور مصریوں کی حب الوطنی اور بیچارگی، حسن و عشق کی شوخیاں اور رنگینیوں کا ایک نہایت دلکش اور مشہور جاسوسی مصنف ایم اسلم کا شاہکار قیمت تین روپے

شاہد رعنا جن حضرات نے مشہور و معروف ادیب جناب قاری سرفراز حسین کی تصانیف کا بغور مطالعہ ہے وہ جانتے ہونگے کہ موصوف اپنی طرز تحریر میں یکتا گذرے ہیں یہ کتاب مرحوم کی زندہ جاوید تصنیف ہے جس میں ایک طوائف اپنی آپ بیتی اس مؤثر انداز سے بیان کرتی ہے کہ طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے، متعدد تصاویر قیمت عہ

آئینہ حسن حضرت رسا ہمدانی گیاوی مرحوم ایم۔ اے گرلڈ میڈلسٹ بی۔ ایل ایڈووکیٹ گیا کی غزلوں۔ نظموں وغیرہ کا مجموعہ حضرت رسا کا نام دنیائے شاعری میں محتاج تعارف نہیں قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: **عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور**

نقش از رنگ ابوالخیال حضرت جلال الدین اکبر کی غزلوں نظموں اور رباعیات کا مجموعہ جس پر ہندوستان کے تقریباً تمام مشہور شعراء و ادباء نے تقریظیں لکھی ہیں، مثلاً خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، شورش ملیح آبادی، پنڈت برجموہن کیفی دہلوی وغیرہ وغیرہ قیمت عہ

پنکھڑیاں ہندوستان کے مشہور و معروف ادیبوں کے لکھے ہوئے چند بے نظیر مضامین کا مجموعہ قیمت ۱۰ر

عجیب مشہور زمانہ ادیب قاضی عبدالغفار مصنف "لیلےٰ کے خطوط" کی ایک نہایت دلچسپ تصنیف قیمت صرف ایک روپیہ عہ

ترکان احرار مولوی محمد عبدالمجید صاحب متیقی کی شہرۂ آفاق تصنیف کا پانچواں ایڈیشن۔ اس کتاب کی خوبیوں اور دلچسپیوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چار مرتبہ یہ کتاب چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکی اب پانچویں دفعہ چھپی ہے۔ کتاب میں ترکان احرار کی بہت سی تصویریں بھی شامل ہیں جو اس کی خوبیوں کو چار چاند لگا رہی ہیں قیمت صرف عہ

ستر رمضان جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال مصر کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ از مولانا حسرت لکھنوی جس میں حضرت علی علیہ السلام اور بنی امیہ و خوارج کی جنگ خوارج کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قتل کا مشورہ کرنا اور شہادت حضرت علی کے مفصل حالات تاریخی حوالوں سے نقل کئے گئے ہیں اور حسن و عشق کی داستان بھی واقعات کے ساتھ ساتھ جاری ہے الغرض تاریخ بھی ہے اور ایک دلچسپ افسانہ بھی، قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

یوسف و ناہید مولانا حسرت لکھنوی کا ایک بے نظیر تاریخی ناول اور اس قدر دلچسپ کہ بغیر ختم کئے ہاتھ سے نہیں چھوڑا جا سکتا تاریخی واقعات حسن و عشق کے دلچسپ قصہ کے ساتھ ساتھ قیمت ایک روپیہ عہ

جنسی امراض اور ان کا علاج مصنفہ کرنل بھولا ناتھ آئی ایم ایس ریٹائرڈ سی آئی ای۔ یہ کتاب دور حاضرہ کی بہترین کتاب ہے، اور عورتوں کے لئے بھی ہے جسم ۸۰۴ صفحات قیمت صرف تین روپے (سے)

مخزن نعمت جس میں ہر قسم کے عمدہ لذیذ کھانے پکانے اور مربے علاوہ اچار، چٹنیاں، مٹھائیاں، مفرح شربت تیار کرنے کی مفصل اور آسان ترکیبیں درج کی گئی ہیں قیمت ایک روپیہ عہ

دوشیزہ (بالتصویر) عورت اور مرد کے تعلقات پر سب سے اچھی، صحیح، مستند اور مفید کتاب مصنف نے یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے لکھی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب ملک میں بے حد مقبول ہوئی اور اب تیسری بار یہ کتاب چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہے ہندوستان میں جنسی (سیکشول سائنس) کی کتابوں کے عامیانہ اور گندے مذاق نے ملک کا مذاق بگاڑ دیا ہے لیکن یہ کتاب اس پائے کی ہے کہ بہر صاحب علم و ذوق نے اس کی تعریف اور اس کے پڑھنے کی سفارش کی ہے، حجم ۵۰۲ صفحے سائز بڑا بلاک کی پچاس تصویریں قیمت صرف عہ

مصری افسانے سید مصطفےٰ لطفی المنفلوطی المصری کے عربی افسانوں کا مجموعہ مترجمہ سید سجاد میرٹھی قیمت صرف ۸ر

سرگزشت اسیر ڈاکٹر ہیوگو کی مشہور زندہ جاوید تصنیف The Last days of The Condemned کا اردو ترجمہ یعنی سزائے موت کے معاشرتی اسباب، از سعادت حسن منٹو قیمت صرف ایک روپیہ عہ

الوان تصور بلبل ہند شریمتی مسز سروجنی نائیڈو کی دلچسپ و رنگین گیتوں کا اردو ترجمہ از مسٹر ظفر قریشی بی۔ اے دہلوی، بہترین کتابت و طباعت ٹائیٹل اعلیٰ مجلد قیمت عہ

تذکرہ محسن یعنی مختصر حالات نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں بہادر منیر نواز جنگ سابق معتمد سیاسیات و خزانہ مملکت آصفیہ آنریری سیکرٹری ایم۔ اے او کالج علی گڈھ، مولانا مرحوم کے جو احسانات ملک و قوم پر ہیں اس کا بدلہ یہی ہے کہ ہم انکی تالیف پڑھیں اور انکے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں، اس کتاب میں مولینا مرحوم کی بہترین تصویریں شامل ہیں قیمت

آرائش جمال بالتصویر اردو زبان میں زنانہ سنگار کے متعلق پہلی کتاب جو ایک معزز خاتون نے لکھی ہے ابھی اس قسم کی دوسری کتاب موجود نہیں تھی۔ جو بہنیں شوق کے ہاتھوں میں دی جائے گی کتاب کی خوبیاں پڑھنے سے واضح ہونگی۔ متعدد بلاک کی تصاویر حجم ۲۷۲ صفحات قیمت عہ مجلد عہ

محاورات النسواں بیگمات دہلی کی شیریں زبان اور روزمرہ کے محاورے یہ کتاب بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر مشکل سے مشکل الفاظ کی تشریح کر کے بالکل آسان طریقہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ہر پڑھے لکھے گھر میں ہونا ضروری ہے قیمت صرف ۶ر

ملنے کا پتہ : عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور



گراموفون ریکارڈوں کی کتنی عمر ہوتی ہے

[illegible] سو مرتبہ بجنے کے بعد گراموفون ریکارڈ گھس جاتے ہیں اور ان کی عمر ختم ہو جاتی ہے لیکن سائنس دانوں نے حال ہی میں ایک [illegible]
[illegible] گھسی کو ختم کر دیتا ہے جس کے باعث ریکارڈوں کی گھسی ہوئی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں آواز تیز ہو جاتی ہے اور وہ دلکش نغمے [illegible]
[illegible] باعث ماند پڑ گئے ہوں پھر عود کر آتے ہیں۔ اور اتنی ہی تیزی سے سنائی دینے لگتے ہیں جتنے نئی حالت میں سامعہ نواز ہوتے [illegible]

نئے ریکارڈ اور پرانے ریکارڈ

یہ مصالحہ نئے ریکارڈ اور پرانے ریکارڈ دونوں پر یکساں کارآمد ثابت ہوا ہے [illegible]
لکیریں چونکہ گہری ہو جاتی ہیں اس لئے ان کی عمر بڑھ جاتی ہے اور وہ بجائے [illegible]
[illegible] سکتے ہیں اور پرانے ریکارڈوں پر لگانے سے ان میں نئی زندگی آ جاتی ہے، گھر گھراہٹ بالکل مٹ جاتی ہے اور آواز بالکل نئی ہو جاتی ہے [illegible]
[illegible] سائنس دانوں کو بعض اجزاء کے کیمیاوی اثرات کا تجربہ کرتے ہوئے اتفاق سے معلوم ہوا ہے۔ اگر آپ کے پاس نئے یا پرانے ریکارڈ ہوں تو ان [illegible] زیڈ لگائیے
ایک شیشی زیڈ کی قیمت دو روپے ہے جس سے چالیس ریکارڈ درست ہوتے ہیں۔ محصولڈاک گیارہ آنے، کل [illegible]

"ZED"

زیڈ منگانے کا پتہ: **میسرز گرین فیلڈز (انڈیا) پنڈری، سی، پی**

محبوب عاشق کے قدموں پر

ہدیہ میں عظیم الشان رعایت

[illegible] عمل ہر مذہب والا عامل بن سکتا ہے مسلمانوں کیلئے مناسب نہیں عمل علوی صرف مسلمانوں کیلئے مخصوص ہے کامل بیس سال کا تجربہ کبھی سرِ خطا نہیں گئے جب تلاش
[illegible] ہزاروں روپے برباد کئے اب میں خدا کو حاضر ناظر جان کر بسکم و کاست قلیل ہدیہ پر ان کا اعلان کرتا ہوں تاکہ سب امیر و غریب فائدہ اٹھا سکیں جن بھائیوں کو میری گذارش پر اعتبار
[illegible] ایک حلف نامہ سامنے ہی اس اقرار کا۔ وانہ کریں گے کہ اپنی ذات کے سوا دوسرے کو نہ بتائیں گے طلب فرمائیں، اس عمل کے پڑھنے میں صرف پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں اس کا عمل
[illegible] رہتا ہے دوسرے سال کیلئے پھر پندرہ منٹ صرف کر کے پڑھنا پڑتا ہے اس طرح اس سے تمام عمر کام لیا جا سکتا ہے ہدیہ [illegible] عمل ۲ یہ ایک آیت قرآنی [illegible]
[illegible] اسباب پر ۱۱۔ ۱۱ مرتبہ پڑھی جاتی ہے سات دن میں انشاء اللہ مطلوب آپکے قدموں پر سرنگوں ہوگا ہدیہ صرف [illegible] عمل برائے ترقی روزگار یہ عمل ترقی تجارت ترقی ملازمت
[illegible] ہر قسم کی ترقی کیلئے عجیب و غریب ہے، ہفتہ میں صرف چہار شنبہ کو پڑھا جاتا ہے پڑھنے میں صرف آدھ گھنٹہ صرف ہوتے ہیں اسکی برکت سے روزی روزگار میں اس قدر ترقی
[illegible] اللہ کا کرشمہ نظر آتا ہے [illegible] نذرانہ ہے [illegible] میں دس آدمی پڑھنے کی اجازت لے سکتے ہیں۔ عمل عداوت ۴ یہ عمل دو شخصوں کے درمیان عداوت ڈالنے کیلئے مجرب ہے
[illegible] ضرورت کیلئے طلب کیا جائے ورنہ گنہگار ہوں گے، ہدیہ [illegible] عمل ۵ یہ عمل دشمن کی تباہی و بربادی کیلئے بہترین ہے جائز ضرورت کیلئے طلب کیا جائے ہدیہ [illegible] ان تمام
[illegible] کسی مخالف سے خطرہ نہ اپنے مکان سے باہر جانے کی ضرورت عمل بذریعہ وی، پی طلب کریں یا منی آرڈر ارسال کریں عمل بذریعہ رجسٹری روانہ کئے جائیں گے۔

فضل شاہ عامل کوچہ چیلان گلی اہمان دہلی

27(3,4,6

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۷

فہرست مضامین ماہ اگست ۱۹۳۷ء!

نمبر ۱۸

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

لاہور کے ایک معزز ہمعصر نے جولائی ۱۹۳۷ء کی تازہ اشاعت میں **عالمگیر** کی قابل رشک کامیابی۔ پابندی اوقات اور اس کے ساتھ ہی میری نیک نیتی کی نہایت شاندار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں اس ریویو کو تمام وکمال **عالمگیر** کی زیر نظر اشاعت میں حرف بحرف نقل کردوں۔ لیکن اس مخلصانہ تبصرہ کے الفاظ سے جو غالباً معاصر عزیز کی نیک نیتی اور دل کے عمیق ترین جذبات محبت واخلاص کے آئینہ دار ہیں، **عالمگیر** کی یا بالفاظ دیگر میری خود ستائی کا پہلو نکلتا ہے، اس لئے میں نے اس ریویو کو شریک اشاعت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ میں معاصر ممدوح کی اس نوازش معاصرانہ کا شکرگذار اور ممنون احسان ہوں۔

یہ کسی خوف تردید کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ میں نے **عالمگیر** کو کامیاب بنانے کیلئے اپنی تمام کوششوں کو نذر عالمگیر کردیا ہے لیکن یہ کوششیں اور ان کامیاب کوششوں کے اسباب بھی تو منجانب اللہ ہی منصہ شہود پر آئے تھے۔ اس لئے میں اسے محض اللہ تعالےٰ کا فضل وکرم ہی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ یہی سمجھتا رہونگا۔

عالمگیر کو کامیاب بنانے میں **عالمگیر** کے ناظرین کرام نے میرے ساتھ جو اشتراک عمل کیا ہے، درحقیقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد یہ بھی **عالمگیر** کی سرفرازی کا ایک قابل قدر سبب ہے اور اس کے لئے میں محبان **عالمگیر** کی خدمت میں ہدیہ سپاس پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

میں نے گذشتہ تیرہ سال کی مدت میں **عالمگیر** کے سلسلہ میں دنیا کے نشیب وفراز کا ایسا تجربہ جسے تلخ تجربہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا حاصل کیا ہے کہ اب اس کا اعادہ بھی ان صفحات پر مناسب نہیں۔

مجھے اس حقیقت کا نہایت فراخدلی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہئے کہ موجودہ کساد بازاری اور اقتصادی بدحالی کے باوجود **عالمگیر** موجودہ حالات کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کر رہا ہے اور مشکلات کی کمی کے اعتبار سے گذشتہ تیرہ سال سے یہ سال بہت ہی بہتر ہے اور مجھے یقین ہے کہ بفضلہ تعالیٰ ماضی کے مقابلے میں اس کا مستقبل زیادہ سے زیادہ روشن اور شاندار ہوگا۔

خیّام - کتنا پیارا اور دلکش نام ہے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا،
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

خیّام وہی خیام جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے خیام! جس کی پیدائش ایشیاء کے لئے اگرچہ باعث صد افتخار ہے لیکن وہ اپنی گوناگوں قابلیتوں خداداد فضیلتوں اور قابل رشک ادبی وعلمی محاسن کی بناء پر یوروپ کے قلب ودماغ پر بھی اس طرح چھا گیا کہ گویا یوروپ خیام کے فلسفہ اور اس کی مسلم الثبوت قابلیت کو ایشیاء سے زیادہ سمجھتا ہے۔ آج اس کی زندۂ جاوید رباعیات کے لاتعداد ایڈیشن یوروپ شایع کرکے خیام پرستی کا ثبوت دے چکا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یوروپ خیام کی رباعیات کے ایسے قیمتی ایڈیشن شایع کرچکا اور کر رہا ہے کہ ایشیاء بلکہ بالفاظ صحیح تر ہندوستان کا مفلس ذہن ودماغ اس کا تصور بھی برداشت نہیں کرسکتا اور آج غالباً سارے یوروپ میں آپ کو کوئی ایسا شخص نہیں ملیگا جو خیام کو نہ جانتا ہو اور اس کے شہرہ آفاق ادبی محاسن کا دل مداح نہ ہو۔

ہاں اسی **زندہ جاوید خیّام** کے نام سے دفتر **عالمگیر** سے عنقریب انشاء اللہ العزیز ایک معرکہ آراء اور ہنگامہ پرور **باتصویر ہفت روزہ اخبار** جاری ہونے والا ہے۔ اس کا ڈکلریشن منظور ہو چکا ہے۔ اگست میں اس کے انتظامات مکمل ہو جائیں گے اور ستمبر میں اس کا پہلا پرچہ شایع ہو جائیگا۔

جو حضرات مجھے جانتے ہیں، میرے اعلانات کی صحت کو سمجھتے ہیں میں ان سب کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ خیام کے بارے میں جو اعلانات میری جانب سے اشاعت پذیر ہونگے، ان کی صحت کا میں ذمہ دار ہوں اور اور خدا نے چاہا تو ان سب اعلانات کا حرف بحرف درست ہونا لازمی اور یقینی ہے۔

ہندوستان سے اس وقت اور بھی متعدد ہفت روزہ اخبار جاری ہیں لیکن سنئیے! میں خیام کو کس شکل و صورت میں شائع کرنا چاہتا ہوں؟ میری آرزو ہے کہ میں مضامین کے تنوع، تصاویر کی جاذبیت اور دیگر اخباری خصوصیات کے اعتبار سے خیام کو ایک معیاری پرچہ بنا دوں اور اس کی صحافتی عظمت اتنی بلند ہو کہ وہ ہندوستان کے لئے باعث فخر ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پوری کوشش کرونگا کہ خیام اپنے جاذب نظر محاسن اور دلفریب خصوصیات کی بنا پر ہندوستان کا پہلا بلند پایہ اخبار ہو۔ اس کے مضامین میں اتنا تنوع ہوگا کہ ہر شخص اپنے مذاق کی تسکین کا سامان اس میں موجود پائیگا۔

خیام کا انتظامی عملہ اور ایڈیٹوریل سٹاف عالمگیر سے بالکل مختلف ہوگا۔ جس کا انتظام ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے۔ مالکانہ حقوق کی بنا پر عالمگیر پریس، عالمگیر بکڈپو اور رسالہ عالمگیر کی طرح میں خیام کا بھی نگران رہونگا!

خیام کے لئے جدید اور علیحدہ انتظامات کی غرض سے میں ایک کثیر و خطیر رقم محفوظ کر رہا ہوں۔ انتظامی اور اداراتی حیثیت سے عالمگیر اور خیام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہونگے اور بظاہر ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

عالمگیر کے ناظرین کرام کے مخلصانہ اشتراک عمل سے مجھے خیام کے سلسلہ میں قابل قدر مدد مل سکتی ہے۔ اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ خیام کی خریداری قبول فرمائیں اور مجھے عالمگیر کے تمام محبان کرام سے یہ پوری توقع ہے کہ وہ بخوشی میری اس گذارش پر ہمدردانہ توجہ فرما کر خیام کو میری توقعات کے مطابق کامیاب بنانے کے مواقع بہم پہنچائیں گے۔

عالمگیر کی آئندہ اشاعت میں سائز، ضخامت اور دیگر خصوصیات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہوگا۔

عالمگیر خاص نمبر ۳۸ء خیام کے اعلانات کے ساتھ ہی یہ بھی ملاحظہ فرما لیجئے کہ میں آئندہ سے عالمگیر کو اور زیادہ باطرز اور دلاویز بنانے کیلئے زیادہ سرگرمی اور محنت کو بروئے کار لانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ عالمگیر کے خاص نمبر ۳۸ء کو ہر حیثیت سے قابل رشک شکل و صورت میں شائع کرنے کیلئے میں اپنی تمام امکانی کوششیں کو صرف کر رہا ہوں۔ آپ یقین کیجئے کہ آپ کے عالمگیر کے خاص نمبر کیلئے ایسی بہترین تصاویر اور گرانقدر مضامین بہم پہنچائے جا رہے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہونگے انشاء اللہ تعالٰی۔

(حافظ) محمد عالم عفی عنہ

شہنشاہ اکبر کا نظام حکومت!

از جناب عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی۔ کام!

مرکزی نظام حکومت

شہنشاہ اکبر نے اپنے نظام حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ مرکزی اور صوبائی۔

مرکز میں شہنشاہ جملہ دستور اساسی کا امیر سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کو غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ لیکن بالعموم اس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ قرآنی شریعت سے باہر نہ جائے اور اپنے وزرائے سلطنت سے کاموں میں مشورہ لیا کرے۔

شہنشاہ کے بعد دیوان یا وزیر سب سے بڑا با اختیار حاکم تھا جو نہ صرف باقی تمام افسروں کا حاکم اعلیٰ متصور ہوتا تھا۔ بلکہ اُس کو ان کے تمام کاموں پر نظر ثانی کرنے کا بھی اختیار حاصل تھا۔

جس طرح آج کل وائسرائے اور گورنروں کے ایگزیکٹو ممبر ہوتے ہیں جن سے وہ ملک کے انتظامی امور کے متعلق مشورہ لیتے ہیں۔ اسی طرح اکبر کے پاس ایک مجلس معتمدین تھی۔ جس میں میر عامل، میر مطبخ، میر بخشی، قاضی القضاۃ، صدر الصدور، محتسب، میر آتش۔ داروغہ ڈاک چوکی، داروغہ ٹکسال وغیرہ افسران شامل تھے۔

میر عامل۔ حکومت کے مالی کاموں کا ذمہ دار تھا اور لگان و معاملہ زمین وغیرہ سے متعلق تمام انتظامات اسی کے ماتحت تھے۔

میر مطبخ۔ شاہی باورچی خانہ اور مودی خانہ کا افسر اعلیٰ تھا اور اس کے ماتحت بادشاہ کے تمام ذاتی ملازم و نوکر چاکر ہوتے تھے۔ اس کا کام نہ صرف کھانے کا انتظام کرنا تھا۔ بلکہ وہ باورچی خانہ کے متعلق تمام اخراجات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جنگوں اور سفروں پر بھی شہنشاہ کے ہمراہ جاتا تھا۔ اور سیر کے دوران میں شامیانوں اور رسد وغیرہ کا انتظام کرتا تھا۔

میر بخشی۔ ایک طرح سے فوج کا افسر تھا اور ساتھ ہی محاسب بھی اس کو نہ صرف افسروں کی تنخواہوں کے بلوں کی پڑتال کرنا پڑتی تھی بلکہ وہ فوج کی جملہ طاقت اور تعداد وغیرہ کا حساب بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔ منصبداروں کی فہرست تیار کرتا۔ اور سپاہیوں کی بھرتی بجا لاتا تھا۔

قاضی القضاۃ۔ محکمہ قضا کا افسر تھا۔ اور دیوانی و فوجداری تمام مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔

صدر الصدور۔ خیرات و زکوٰۃ کی تقسیم و تعین کرتا اور اس سلسلے میں جو مقدمات اور جھگڑے پیدا ہوتے تھے ان کا فیصلہ کرتا۔

محتسب۔ مذہبی احکامات کی تعمیل کرواتا اور دیکھتا تھا کہ لوگ اخلاقی قواعد پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔

میر آتش۔ توپ خانہ کا داروغہ تھا اور اسی کا انتظام و اہتمام اس کے سپرد تھا۔

داروغہ ڈاک چوکی۔ خفیہ اخبار پہونچانے کا ذمہ دار تھا۔

داروغہ ٹکسال۔ کے ماتحت دار الضرب تھا۔ جس میں سکے ڈھالے جاتے تھے۔

صوبائی نظام

تمام سلطنت قریباً پچیس یا بعض کے الفاظ میں اٹھارہ صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی صوبے آگے "سرکار" اور "پرگنوں" میں منقسم تھے لیکن "سرکار" محض مالی حلقے معلوم ہوتے ہیں۔ سیاسی نہیں تھے۔

سپہ سالار صوبائی افسروں کو اُس وقت کی سرکاری زبان میں

"سپہ سالار" کہتے تھے اور ان کو دیوانی اور فوجی دونوں اختیارات حاصل تھے۔

سپہ سالار اپنے کاموں کے لئے براہ راست بادشاہ کے سامنے جواب دہ تھا۔ اس کو اپنا دربار منعقد کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن وہ شاہ کی طرح جھروکے میں نہیں بیٹھ سکتا تھا اور نہ اس کی اجازت کے بغیر وہ جنگ یا صلح کا اعلان کر سکتا تھا۔

چونکہ وہ اپنے صوبہ کا فوجی افسر اعلیٰ بھی تھا اس لئے فوج کے انتظام و انصرام اور اس کے ساز و سامان کا بھی ذمہ دار تھا۔

اس کو صدر کے مذہبی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہ تھی اس کو دیوانی اختیارات بھی حاصل تھے۔ لیکن بادشاہ کی اجازت کے بغیر وہ کسی کو پھانسی وغیرہ کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ حالات سے باخبر رہنے کیلئے اس نے بہت سے مخبر یا سی۔ آئی۔ ڈی شہروں میں چھوڑے ہوئے تھے۔

صوبہ دار یا سپہ سالار کو امداد دینے کے لئے مندرجہ ذیل افسر تھے: دیوان صدر۔ عامل۔ بخشی۔ پٹ دار۔ فوجدار۔ کوتوال۔ وقائع نویس قانونگو پٹواری۔

دیوان ۔ دیوان سپہ سالار کا ایک طرح کا حریف تھا کیونکہ اس کو موخر الذکر کی حرکات و سکنات پر نگہبانی کے لئے ہی مقرر کیا جاتا تھا۔ چونکہ اس کو صوبائی نظام حکومت میں سپہ سالار کے برابر درجہ دیا جاتا تھا اس لئے وہ سپہ سالار کے اختیارات پر ایک طرح سے تحدید کر سکتا تھا اور سپہ سالار ایک "ناقابل ضبط طاقت" نہ بن سکتا تھا۔ دیوان مالی معاملات کے مقدمات بھی فیصل کر سکتا تھا۔

صدر ۔ صدر بھی مرکزی حکومت کی طرف سے متعین کیا جاتا تھا اور بالعموم عالم و فاضل اور نیک و پارسا شخص ہوتا۔ صوبہ میں شریعت کے فیصلے نافذ کرتا اور اپنی مرضی سے کسی کو زمین وقف کر سکتا تھا۔ قاضی اور میر عادل اس کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔

عامل ۔ عامل کے متعدد فرائض تھے اس کو تمام اراضیات اور لگان وغیرہ کے متعلق معاملات کی تشخیص کرنا پڑتی تھی۔ وہ امن و امان کے قیام اور چوروں ڈاکوؤں سے تحفظ اور ان کو سزا دینے کے لئے بھی افسران صوبہ کی امداد کرتا تھا۔

علاوہ ازیں اسے لوگوں کی اقتصادی حالت، جاگیروں اور بازار کے بھاؤ وغیرہ کے متعلق بھی ایک ماہوار رپورٹ صوبیدار کے گوش گذار کرنا پڑتی تھی۔ پھر اسے سارے صوبہ میں دورہ کرنا پڑتا تھا تاکہ وہ مندرجہ بالا حالات اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرے۔ اسے زمینداروں وغیرہ سے ایک پائی بھی بطور رشوت لینی منظور نہ تھی۔

بخشی ۔ بخشی کی وہی حیثیت تھی جو عامل کی تھی۔ اور درحقیقت اسے مؤخر الذکر کے اختیارات پر ایک حد بندی کے طور پر ہی مقرر کیا جاتا تھا۔ وہ قانونگو کے کام کی پڑتال کرتا تھا اور خود اسے محاسب اور ہوشیار منشی کا کام کرنا پڑتا تھا۔ اسے فصل کے بعد مالی گوشوارے تیار کرنے پڑتے تھے اور دربار میں ایک سالانہ رپورٹ پیش کرنی ہوتی تھی۔

پٹ دار ۔ پٹ دار کا کام یہ تھا کہ وہ کاشتکاروں سے روپیہ وصول کرے اور خزانہ عامرہ کی حفاظت کرے۔ وہ رسیدیں بھی جاری کرتا تھا اور اسے بہی کھاتے کا حساب رکھنا پڑتا تھا تاکہ غلطی نہ ہو۔

فوجدار ۔ فوجدار صوبائی لشکر کا سالار جیش تھا اور صوبہ میں قیام امن اور انتظامی امور کی انجام دہی کیلئے وہ صوبیدار کی معاونت کرتا تھا۔

ہر صوبہ میں متعدد فوجدار تھے جو ایک ایک پرگنے کے افسر اعلیٰ تھے۔

فوجداروں کے تقرر اور برخاستگی کا اختیار صوبیدار کے پاس تھا۔

کوتوال ۔ کوتوال ہر شہر میں پولیس کا افسر تھا۔ جس کو مجسٹریٹ کے اختیارات بھی تفویض کئے گئے تھے۔ وہ اپنے شہر میں قیام امن کا ذمہ دار تھا۔

واقعہ نویس ۔ واقعہ نویس وہ افسر تھا جس کے ذریعہ مرکزی حکومت صوبائی حکومت کے ساتھ تعلق رکھتی تھی اور اپنے احکامات کا نفاذ کرواتی تھی۔ یہ افسر شہنشاہ کے کان اور آنکھوں کا کام بھی کرتا تھا۔

قانون گو ۔ قانون گو پرگنہ کا افسر تھا اور دیہی رسوم اور حقوق کا نمائندہ بھی تھا۔

مقدم ۔ ہر پرگنہ مختلف دیہاتوں میں منقسم تھا اور ہر دیہات کا افسر مقدم یا پٹواری سمجھا جاتا تھا۔ وہ لگان اور معاملہ زمین کا حساب بھی رکھتا۔ اور دیہات میں قیام امن کا بھی ذمہ دار تھا۔

احکام بنام کارکنان

اکبر نے اپنے ممالک محروسہ کے کارکنان اور صوبائی حکومتوں کے حکام کے نام کئی احکام جاری کئے جس میں اس نے لوگوں کے ساتھ ان کو انصاف اور عدل سے برتاؤ کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ وہ احکام درج ذیل ہیں۔

• رعایا کے حالات سے باخبر رہو۔ خلوت پسند نہ ہو۔ کیونکہ اس سے اکثر امور کی خبر نہ ہوگی۔ بزرگان قوم سے باعزت پیش آؤ۔ شب بیداری کرو

صبح وشام و دوپہر آدھی رات کو خدا کی طرف متوجہ ہو۔ کتب اخلاق کا مطالعہ کرو۔ مسکین اور گوشہ نشین لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرو تاکہ اُن کی ضروریات بند نہ ہوں۔ اہل اللہ نیک طینت۔ صاحبدل کی خدمت میں حاضر رہو اور طالب دعا ہو۔ مجرموں کے گناہوں پر بڑا غور کیا کرو کہ کون قابل سزا ہے اور کون قابل چشم پوشی۔ مجرموں کا بڑا خیال رکھو۔ جو کچھ کرو۔ خود دریافت کرکے کرو اور دادخواہوں کی درخواست خود سنو۔ ماتحت حاکموں پر سب کام مت چھوڑو۔ رعایا کو دلداری سے رکھو۔ زراعت کی فراوانی اور تعادی اور دیہات کی آبادی کے متعلق بہت کوشش کرو۔ نذرانہ نہ لو۔ قدیمی خاندانوں کی پرورش کا خیال رکھو۔ سپاہی کی ضرورت اور لوازمات سے غافل نہ ہو۔ خود سپاہیانہ ورزشیں کرتے رہو۔ ہمیشہ شکار ہی میں نہ رہو۔ سورج کے نکلنے کے وقت اور آدھی رات کے وقت نوبت بجا کرے۔ جب آفتاب ایک برج سے دوسرے برج میں ہو تو توپیں اور بندوقیں سر کی جائیں۔ تاکہ سب باخبر ہو کر شکر الٰہی بجالائیں کوتوال کو چاہئے کہ ہر شہر اور قصبہ گاؤں اور محلے کے کل گھر والے لکھ لے۔ ہر محلہ میں میر محلہ ہو۔ جاسوس بھی چھوڑے رکھو تاکہ ہر جگہ کا حال دن رات پہونچاتے رہیں چور آئے۔ آگ لگ جائے یا کوئی مصیبت آپڑے تو ہمسایہ فوراً امداد کرے۔ جو لاوارث مرجائے یا کہیں چلا جائے تو اس کے مال سے اگر سرکاری قرضہ ہو تو پہلے وصول کرلو اور بقیہ وارثوں کو دیدو۔ وارث نہ ہو تو امین کے سپرد کردو۔ اور دربار میں اس کی رپورٹ ارسال کرو۔ جب قلعدار آئے تو اس کو دیا جائے۔ شراب بنانے اور فروخت کرنے والے سب مجرم ہیں۔ ان کو سخت سزا دی جائے ہندوستان کا بردہ کہیں اور نہ جانے پائے۔ نرخ اشیاء بادشاہی قیمت پر رہے۔ بے اطلاع کوئی شادی نہ کرے۔ اگر عورت مرد سے بارہ برس بڑی ہو تو مرد اس سے تعلق نہ کرے۔ لڑکا سولہ اور لڑکی چودہ برس سے قبل نہ بیاہی جائے چچا اور ماموں کی بیٹی سے شادی نہ ہو۔ جو شخص جس دین کو چاہے اختیار کرے کوئی روک نہ ہو۔ مندر۔ شوالہ۔ مسجد۔ جو مرضی چاہے بنائے"۔

منصب داری

جب اکبر تخت پر بیٹھا۔ تو فوج کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ چنانچہ اس نے فوج کو منصبداری طریق پر منظم کیا۔

فوج کے کئی دستے بنائے گئے اور مختلف سپاہیوں پر مشتمل مختلف دستے منصب داروں کے ماتحت رکھے گئے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ حکومت کے ملازم ہیں اور جب ضرورت پڑیگی ان کو حکومت کی فوجی یا کسی اور طریق سے امداد کرنا ہوگی۔

یہ منصب داری بیس سے لیکر سات ہزار تک تھی۔ اس کے علاوہ دس ہزاری کا ایک خاص منصب بھی تھا۔ ہر منصبدار اپنے عہدوں کے مطابق کچھ گھوڑے کچھ ہاتھی۔ کچھ باربرداری کے جانور اور گاڑیاں رکھنے پر مجبور تھا۔

منصبداروں کا تقرر۔ برخواستگی اور تعطل وغیرہ بادشاہ کے ہاتھ میں تھا۔ منصبداری ایک وراثتی عہدہ تھا یعنی باپ کے بعد بیٹا سرانجام دیا کرتا تھا منصبداروں کے علاوہ بعض اور سپاہی بھی ہوتے تھے جن کو دخیل اور احدی کہا جاتا تھا۔ اول الذکر سپاہیوں کا ایک مقررہ دستہ ہوتا تھا جو منصبداروں کے سپرد کردیا جاتا۔ لیکن اخراجات کی کفیل حکومت ہوتی۔ اور موخرالذکر وہ دستہ تھا جو بادشاہ خود بھرتی کرتا اور اپنی ذاتی محافظت کیلئے رکھتا تھا۔

منصبداری کی کئی خرابیاں بھی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ جب منصبداروں کو مع اپنی فوج نمائش وغیرہ کے لئے دارالسلطنت میں حاضر ہونا پڑتا تھا تو وہ وقتی طور پر گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ اکٹھے کرلیتے تھے اور جب حاضری ختم ہوجاتی تھی تو پھر ان کا کہیں نام ونشان نہ ملتا تھا۔ لیکن اس کا قلع قمع یوں کیا گیا کہ گھوڑوں وغیرہ پر نشان داغ دیئے جاتے ہیں اور ان کی عمدگی کا امتحان ہوتا تھا۔

شاہی فوج میں پیدل سوار۔ گھوڑا سوار۔ ہاتھی سوار۔ توپخانہ۔ اور بحری فوج سب کچھ شامل تھے۔ اگرچہ جس طرح سمتھ کا خیال ہے یہ فوج اتنی کمزور نہ تھی۔ لیکن اتنی مضبوط بھی نہیں تھی۔ اکثر جنگوں میں دو دو چیش سالار مقرر کردیئے جاتے تھے۔ جس کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا تھا۔ بالآخر اورنگ زیب کے زمانہ میں یہ فوج بالکل گرگئی۔

بندوبست اراضی

اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کے ذریعہ ہندوستان کا نظام اراضی اور طریقہ بندوبست وغیرہ کی بھی اصلاح کی۔

جب ٹوڈرمل دیوان اشرف بنادیا گیا تو اس نے نظام اراضی کی تین طرح اصلاح کی۔

(۱) زمین کو صحیح طور پر ماپنے کا طریق تجویز کیا۔

(۲) زمین کی اقسام متعین کیں۔

(۳) لگان یا معاملہ زمین کی تعیین کی۔

قبل ازیں رسوں کے ذریعہ سے زمین ماپی جاتی تھی جس میں نقص یہ تھا کہ نمی اور گرمی کی وجہ سے رسہ پھیل اور سکڑ جاتا تھا۔ ٹوڈرمل نے بانسوں کی جریب جن کو لوہے کے حلقوں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس مقصد کیلئے مروج کی۔

زمین کو چار اقسام میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) پولج۔ جو ہر سال کاشت کی جاتی تھی اور اس میں باری باری غلے بوئے جاتے تھے۔

(۲) پڑاوتی۔ جس کو ہر فصل کے بعد ایک سال کیلئے فارغ چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ زرخیزی دوبارہ عود کر آئے۔

(۳) چچر۔ جس کو تین یا چار سال کیلئے فارغ چھوڑ دیا جاتا تھا۔

(۴) بنجر۔ جس کو پانچ سال سے زاید عرصے کیلئے فارغ چھوڑا جاتا تھا۔

پہلی دو اقسام کے پیداوار کے لحاظ سے پھر تین درجے تھے اعلیٰ۔ درمیانی اور خراب۔ معاملہ لگاتے وقت ان تینوں کی اوسط نکال لی جاتی تھی اور جو کل پیداوار ثابت ہوتی تھی اس میں سے ۱/۳ حصہ حکومت کیلئے لیا جاتا تھا۔

باقی دو اقسام کی زمینوں پر معاملہ ارتقائی صورت میں ہر سال پیداوار کے لحاظ سے بڑھا دیا جاتا تھا۔ یہ زمینداروں کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تھا کہ وہ معاملہ زمین خواہ نقدی کی صورت میں ادا کریں یا پیداوار کی صورت میں۔ نقدی کی رقم معین کرنے کیلئے گذشتہ انیس ۱۹ برسوں کی قیمتوں پر انحصار رکھا گیا تھا۔

لگان کے مندرجہ ذیل طریق مروج تھے۔

۱۔ ضابطی۔ جس کی رو سے ہر قطعہ زمین سے ایک مقررہ رقم بطور معاملہ زمین نقد وصول کی جاتی تھی اور یہ رقم فصل کے لحاظ سے مقرر ہوتی تھی۔

۲۔ غلہ بخشا۔ یہ غلہ تقسیم کرنے کا ایک پرانا طریق تھا۔

۳۔ ناسک۔ جس میں کاشتکاروں اور حکومت کے درمیان کوئی وسیلہ نہ تھا بلکہ کاشتکار براہ راست اپنا معاملہ حکومت کو ادا کرتے تھے۔

معاملہ زمین ٹھیکہ وغیرہ پر وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ براہ راست گورنمنٹ کے اپنے کارندے وصول کرتے تھے۔ عامل بڑا افسر تھا۔ اور اس کے ماتحت بخشی۔ پٹ دار۔ قانونگو۔ پٹواری اور مقدم وغیرہ افسران تھا۔ ناواجب وصولی پر سختی سے کارروائی کی جاتی تھی۔ قحط وغیرہ کے زمانے میں زمینداروں کی امداد کی جاتی تھی۔

شبلی۔ بی کام

نوحہ حیات!

ماخوذ از گولڈن ٹریژری،

حیات! خدا جانے تو کیا ہے؟ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ ایک دن میں اور تو جدا ہونگے... کب؟ کیسے؟ اور کہاں پر تجھ سے ملاقات ہوگی؟ ایک راز ہے جو میرے علم میں نہیں..... اے حیات! مدت دراز تک میں اور تو ہمنوا رہے۔ ہر رنج و راحت میں تو میری شریک اور غمگسار تھی مگر آہ! جب دو دوست جن کے درمیان رشتہ محبت و اعتماد قائم ہوچکا ہو ان کی جدائی! اُف اس کے خیال سے دل لرز اٹھتا ہے اور قلب کانپنے لگتا ہے۔ آہ! ایسی داستان جدائی جس میں وصال کا پہلو ہی نظر نہ آتا ہو نہ معلوم کتنے نازک اور معصوم دلوں کو ٹھیس لگے گی اور ان سے فضائے عالم میں ہیجان پیدا کر دینے والی پُرسوز سرد آہیں نکلیں گی اُف! اُن مخمور و نرگسی آنکھوں سے جن کے ایک اشارے میں نہ جانے کتنے مسرت کے عالم پیدا ہوجاتے ہیں۔ آہ! ظالم جدائی تیری بدولت سیل اشک غم رواں ہوکر سوگوار دلوں میں غم کے نشتر چبھوئیگا.......

بس۔ اے حیات۔ بس۔ جا۔ اور خاموشی سے جا۔ جب جی چاہے جا۔ مگر دیرینہ ہمنشینی کی خاطر اتنا ضرور کر کہ دوامی الوداع مت کہہ بلکہ عالم بالا میں روح افزا ملاقات کی امید بھی ہو۔

حافظ معین الدین خاں بی۔ اے

پیا کی یاد

مصورِ قلم جناب ماسٹر باسط صاحب بسوانی

آئی پیا کی یاد
سکھی۔ پھر آئی پیا کی یاد
برہا کی ماری میں بیاکل ہوں کیسے کٹے برسات
دن کاٹوں میں تڑپ تڑپ کر رو رو کاٹوں رات
رو رو کاٹوں رات، کس سے کروں میں بات
کس سے کروں فریاد
سکھی پھر آئی پیا کی یاد

آئی پیا کی یاد
سکھی۔ پھر آئی پیا کی یاد
ڈال پہ بیٹھا بولے پپیہا بن میں بولے مور
امبوا پہ بیٹھی کوئلیا کوکے رہ رہ مچاوے شور
رہ رہ مچاوے شور جیرا دھڑکے مور
کس سے کروں فریاد۔ سکھی پھر آئی پیا کی یاد

آئی پیا کی یاد
سکھی۔ پھر آئی پیا کی یاد
اُمنڈ گھمنڈ کر بادل آئیں ناؤ پڑی منجدھار
من کی نیّا پریم کا ساگر کیسے ہو بیڑا پار
کیسے ہو بیڑا پار کون ہے کھیون ہار
کس سے کروں فریاد
سکھی۔ پھر آئی پیا کی یاد

آئی پیا کی یاد
سکھی پھر آئی پیا کی یاد
باسطؔ پی پردیس سدھارے میں تڑپوں دن رین
کیسے اُن کے درشن پاؤں ترسیں مورے نین
ترسیں مورے نین ہردے ناہیں چین
کس سے کروں فریاد۔ سکھی پھر آئی پیا کی یاد

جاندار تاج

از جناب مرزا عزیز صاحب فیضانی دارالپوری

ناصر شاہ ایک چھوٹی سی سلطنت کا ہردلعزیز تاجدار ہے۔ سلطنت کی وسعت ہندوستان کی کسی چھوٹی سی ریاست کے برابر ہوگی۔ عام طور پر رعیت اس کے سلوک سے خوش ہے اور بہت حد تک اطمینان سے زندگی گذار رہی ہے۔ مگر جہاں گل ہیں وہاں خار بھی ہیں۔ ایسا تو کوئی نہیں جو ہر عیب سے پاک ہو۔ ناصر شاہ میں اگر کوئی ایسی بات ہے جو کسی وقت اس کی خوبیوں پر بھی پردہ ڈال دے تو وہ یہ ہے کہ وہ خون کا بیحد پرستار ہے یعنی نسبی اثر کا ضرورت سے زیادہ قائل و معتقد ہے۔ کسی پہلے زمانہ میں شاید اس کی یہ بات پسند کر لی جاتی مگر اس زمانہ میں تو اس کا یہ اصول و مسلک تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں عموماً اور دوسرے ممالک سے واپس آئے ہوئے نوجوانوں کے دلوں میں خصوصاً کانٹوں کی طرح چبھتا رہتا ہے۔

بہر حال ناصر شاہ مجبور ہے کہ وزارت و نظامت کے اعلیٰ عہدوں پر اپنے اصول خاندان پرستی کی بنا پر صرف شاہی خاندان کے افراد کو ہی مقرر کرے خواہ وہ عیاش، آرام طلب اور جاہل ہی کیوں نہ ہوں۔ ناصر شاہ خود تو منصف مزاج اور رحمدل ہے مگر اس کے رشتہ دار جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں یا ظلم کرتے ہیں یا فرائض کی ادائگی میں کوتاہی کرتے ہیں نتیجہ پھر ظلم۔ جب ناصر شاہ ٹوکتا ہے تو اصلاح کی بجائے وہ اپنے آپ کو شاہی خاندان کا فرد سمجھتے ہوئے بُرا مانتے ہیں بلکہ ان کی بعض باتوں سے تو بغاوت کی بو آنے لگتی ہے۔

حاصل یہ کہ ناصر شاہ سے نہ رعایا ہی اس معاملہ میں خوش ہے نہ رشتہ دار۔ رعایا تو مذہباً بھی خاندان پرستی کو بُرا سمجھتی تھی اور چاہتی تھی کہ ان کا بادشاہ بھی بُرا سمجھے۔

۲

ایک دن ناصر شاہ اس قسم کی پریشانیوں سے گھبرا کر محلسرا میں آیا وہاں اس کی ملکہ اور شہزادی عزت بیگم دونوں بیٹھی تھیں۔ بادشاہ کی اور کوئی اولاد نہیں اس لئے وہ بیٹی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزت بیگم نہایت اعلیٰ دماغ رکھتی تھی۔ ذہن رسا۔ فکر عالی اور پختگی رائے کی دولت سے مالا مال تھی مگر ایک بات اس میں ایسی تھی جسے ہر عاقل معیوب قرار دے۔ اور وہ یہ کہ ضرورت سے زیادہ آرام طلب تھی اور ناز و نعمت کی دلدادہ۔ جوان ہوگئی تھی مگر ابھی تک کافی دن چڑھے جاگنے کی عادت کا شکار تھی جونہی کسی ماما نے جگا دیا بس اس کی سختی آگئی۔

عزت بیگم آج ابھی جاگ رہی تھی کہ ناصر شاہ گھر میں آگیا اور ملکہ سے کہا "شہزادی ابھی ابھی جاگی ہے؟ سبحان اللہ۔ خدا جانے اس کو سلطنت کا کام سنبھالنا پڑا تو آخر وہ تخت ہوگا جو بظاہر تو مخمل کی گدی نظر آتا ہے مگر صحیح معنوں میں کانٹوں کی سیج ہوتا ہے۔ بیٹی سوئی ہی رہیگی تو کام حکومت کا کون کریگا۔ اور اس کی یہ آرام طلبی . . . . . . اگر خدانخواستہ کوئی جفاکشی کا کام کرنا پڑیگا تو؟"

عزت بیگم ۔ ابا جان سلامت! اسی لئے تو میں ہفتہ میں دو مرتبہ جو کی روٹی کھاتی ہوں اور جمعہ کے دن روزہ رکھتی ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال سفر میں ہر تیسری منزل کے بعد میں پیدل چلتی تھی تو وہ بھی اس لئے تھا کہ عادی ہو جاؤں۔

ناصر شاہ یہ سنکر خوش ہوگیا اور اس کا ملال جاتا رہا۔

۳

محلسرا میں شاہی خاندان کے افراد سے کوئی خاص پردہ نہیں تھا۔ عزت بیگم اپنے چچیرے اور خالہ زاد بھائیوں سے ملتی جلتی تھی۔ گو آنکھیں نیچی

کیے ہوئے تاہم کمزوجان ہوگئی تھی اور فطرتاً مجبور تھی کہ کم از کم دل ہی دل میں کسی کا انتخاب کرلے مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ تھی اخلاق جمیلہ کی مالک اور قریباً ان تمام عادات سے متنفر جن کا شاہی خاندان کے افراد عموماً شکار ہوا کرتے ہیں۔

یوں تو شاہی خاندان میں چار نوجوان کنوارے تھے مگر دو کو تو عزت بیگم کی علمی، و مدبرانہ حیثیت کے مقابلے میں اس بات کی جرأت ہی نہیں ہوئی کہ وہ اس سے شادی کا خیال بھی دل میں لاسکتے البتہ دو چچیرے بھائی تھے ہاشم اور طاہر جنہیں اپنی اپنی جگہ اس مجسمۂ حسن صورت اور پیکر حسن سیرت سے عشق کا دعویٰ تھا۔

عزت بیگم کے لئے مشکل یہ تھی کہ ہاشم ہو یا طاہر، دونوں صحیح تدبر سے کورے تھے اور علم و عقل میں خام۔ اگر یہ چیزیں برداشت بھی کرلیجاتیں تو یہ چیز ناقابل برداشت تھی کہ دونوں شرابی تھے لیکن بہرحال اگر دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو ہاشم بہتر تھا کیونکہ وہ جذبہ محبت سے سرشار تھا۔ طاہر مغرور تھا اور خشک مزاج۔

غرض عزت بیگم کو سخت دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ ناصر شاہ کے جذبۂ خاندان پرستی کی وجہ سے تو وہ مجبور تھی کہ انہی میں سے کسی کا نام لے اور دل سے یہ چاہتی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ وہ موجودہ جمہوری خیالات سے بھی واقف تھی اور اس کی یہی مجبوریاں جن کا ذکر ہوچکا ہے اُسے خاندان پرستی سے ہٹا کر دوسرے راستے پر لیجارہی تھیں۔ وہ کبھی کبھی سہیلیوں سے بلکہ اپنی والدہ سے بھی اس خیال کا اظہار کردیتی تھی کہ خاندان کی قید نہیں ہونی چاہیئے مگر اس کی یہ باتیں محض نادانی پر مبنی سمجھی جاتی تھیں اور کوئی شخص ان پر توجہ نہ کرتا تھا۔

۴

ناصر شاہ کو ان تمام باتوں کا ملکہ کی معرفت علم ہوچکا تھا وہ تو یہی چاہتا تھا کہ عزت کی شادی ہاشم ہی سے ہو۔ ہاں ہاشم سے شرابنوشی ترک کرائی جائے اس نے کوشش کی بھی مگر کامیابی نہ ہوئی۔

آہستہ آہستہ عزت بیگم کی منگنی کے چرچے شروع ہوگئے اور جب بادشاہ کے کانوں تک یہ خبریں بھی پہنچیں تو وہ سخت پریشان ہوا کہ شہزادی دونوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں کرتی۔ وہ ملکہ سے مشورہ کرنے کے لئے گھر میں آیا

جس کمرے میں ملکہ آرام کررہی تھی اور جہاں بادشاہ بھی آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں عزت بیگم سہیلیوں سے گفتگو کررہی تھی۔ درمیانی دروازے پر پردہ لٹکتا تھا اور آواز آرہی تھی عزت بیگم یا اس کی کسی سہیلی کو معلوم نہ تھا کہ ساتھ کے کمرے میں ملکہ اور بادشاہ خاموش بیٹھے سن رہے ہیں۔

عزت بیگم کی باتوں کا خلاصہ تھا کہ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں۔ کئی گھرانے ایسے بھی ہیں جہاں اعلیٰ، شریفانہ اور سیاسی تربیت بھی ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ شاہی خاندان کے افراد کو مواقع زیادہ ملتے ہیں مگر حقیقتہً اور افسوس یہ ہے کہ شہزادے ان مواقع کا فائدہ اتنا بھی نہیں اٹھاتے جتنا غریب اور غیر متمدن خاندان کے نونہال کبھی کبھی حکومت کے خواب دیکھ کر کچھ نہ کچھ سمجھ لیتے ہیں یا بادشاہوں کے فسانے پڑھ کر مدبر بن جاتے ہیں۔ میں نے بہت شرم سے کام لیا مگر آج تنگ آکر "مردانہ وار" اس بات کا اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ شاہی خاندان کے کسی نالائق فرد سے ایک غریب و غیر متمدن خاندان کا لائق شخص یقیناً بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ہاشم و طاہر اپنی عادت پر ڈٹے رہے تو میں ان سے کہیں زیادہ ایک معمولی سپاہی کو بہتر سمجھونگی جو خدا کا مطیع، ملک کا وفادار اور اخلاق حسنہ کا پتلا ہو۔ خواہ وہ غریب ہو۔ بدصورت ہو اور جاہل ہو میری سہیلیاں ضرور اس بات کو صحیح تسلیم کرینگی کہ مجھے اپنا سردار بنانے کیلئے کسی انسان کو تلاش کرنا چاہیئے۔

دوسرے کمرے میں بادشاہ یہ سب کچھ سن کر طیش میں بھی آیا اور غمزدہ بھی ہوگیا۔ ملکہ سے مشورہ کیا اور یہی قرار پایا کہ جہاں تک ہوسکے شادی جلد کردی جائے۔

ملکہ ۔ مگر کس سے؟

بادشاہ ۔ ہاشم سے اور کس سے۔ دونوں میں سے تم کہتی ہو نا کہ عزت بیگم اس کو پسند کرتی ہے۔

ملکہ ۔ بجا۔ مگر صحیح معنوں میں تو وہ پسند دونوں کو نہیں کرتی۔

بادشاہ ۔ اچھا اگر دونوں کو چھوڑ کر رعیت میں سے کسی کا انتخاب کیا جائے تو بہت بڑی ذلت ہے پھر فتنہ کھڑا ہوگا۔

ملکہ ۔ کس کی طرف سے؟

بادشاہ ۔ ہاشم و طاہر کی طرف سے۔

ملکہ ۔ یہ فتنہ تو اس وقت بھی ہوگا جب دونوں میں سے ایک کا انتخاب

کیا جائیگا۔ یقیناً دوسرا بغاوت پر آمادہ ہوجائیگا۔ بادشاہ اس بات کا جواب دیئے بغیر مغموم صورت بناتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔

۵

بادشاہ نے ہاشم کو خلوت میں بلاکر سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ میں فیصلہ کرچکا ہوں کہ تمہیں داماد بناکر تخت کا وارث بنادوں عزت بیگم تمہاری شراب نوشی پر اعتراض کرتی ہے۔ چیز بھی بری ہے کیوں نہ چھوڑ دو۔

ہاشم۔ بادشاہ سلامت! یہ میرے حاسدوں کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں۔ بھلا میں زہد و اتقا کی فضا میں پلا ہوا اور یہ بری عادت ——— آپ تحقیق کرلیں۔

بادشاہ۔ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ تم اس عادت کا شکار نہیں مگر بدنہیں ہو بدنام تو ہو۔ کیوں ایسی تدبیر نہ کرو کہ کسی کو یقین آجائے۔

ہاشم۔ بہتر، میں صفائی کی شہادت کے طور پر معزز خواتین کو عزت بیگم کے پاس بھجواتا ہوں۔

بادشاہ۔ ایسا ہی کرو۔ مگر دیکھو مجھے خدشہ ہی نہیں یقین ہے کہ طاہر اس شادی پر خوش نہ ہوگا اور وہ کہیں . . . . "

ہاشم۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، اس نے مجھے کہدیا ہے کہ وہ بالکل ناخوش نہ ہوگا۔

۶

کچھ تو ہاشم ہی نے طاہر کو خیر خواہ سمجھ کر اس نے سب باتیں بتادی تھیں اور کچھ دوسرے ذرائع سے بھی اسے معلوم ہوگیا تھا کہ عزت بیگم خاندان پرستی کی مخالف ہے۔ وہ ہوشیار اور چالاک تو تھا ہی۔ ہاشم کی سادگی اور ہر شخص سے محبت کرنے کے جذبے سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ادہر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطنت میں بھی چند تعلیم یافتہ لوگ ایسے موجود ہیں جو خاندان پرستی کے خلاف ہیں۔ چنانچہ اس کے ذہن میں ہاشم کو نیچا گراکر خود عزت بیگم کے دل میں جگہ لینے کی ایک تجویز آگئی۔

منگنی کی تجاویز سنتے ہی اس نے اپنے دو تین خاص دوستوں کی معرفت قریباً ایک درجن ایسے آدمیوں کو خلوت میں جمع کرلیا جو خاندان پرستی کے مخالف تھے۔ طاہر نے ایک اچھی خاصی جمہوریت نواز تقریر کی۔ اور صاف لفظوں میں وعدہ کیا کہ اگر وہ ولیعہد بننے میں کامیاب ہوگیا تو وہ ذات پات کی تمیز اڑا دیگا۔ رعیت میں سے لائق طلبہ کی سیاسی تربیت کریگا اور انھیں عہدے دلائیگا۔ چنانچہ اہل مجلس نے بھی امداد کے وعدے کئے اور گھروں میں جاکر خفیہ طور پر سازش کی بنیادیں رکھدی گئیں۔

ادہر شاہی مخبروں نے یہ خبریں ناصر شاہ کو پہونچائیں۔ بادشاہ آگ بگولا ہوگیا اور طاہر کو بلا بھیجا مگر طاہر کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ بادشاہ کو سازش کا ابتدائی علم ہوگیا ہے اس لئے وہ سرحد کے قریب ایک گمنام گاؤں میں جہاں اس کے حامیوں کی مرکزی انجمن کا دفتر قائم ہوگیا تھا بھاگ کر چلا گیا اور روپوش ہوگیا۔

۷

اب ملک کی حالت یہ ہے کہ طاہر کی سازش روز بروز اندر ہی اندر پھیل رہی ہے۔ کہیں کہیں جلسے بھی ہونے لگے ہیں اور سرکاری آدمی لوگوں کو گرفتار کررہے ہیں ادہر بادشاہ جلد از جلد یہ چاہتا ہے کہ عزت بیگم کی شادی ہاشم سے کردی جائے تاکہ سازش کا مقابلہ پوری توجہ سے کیا جاسکے جب تک شادی کا مرحلہ طے نہ ہولے وہ اور کسی طرف قدم ہی نہیں اٹھا سکتا۔ کیونکہ ہاشم ادہر توجہ کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ اس کی ساری فہم تو اس بات پر صرف ہورہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ عزت بیگم کو شراب نہ پینے کا یقین دلادے۔ بادشاہ نے اسے ایک دفعہ اس گاؤں پر فوجکشی کرنے کا بھی حکم دیا جس میں طاہر نے آہستہ آہستہ ایک اچھی خاصی باغیوں کی جنگی جماعت بھی قائم کرلی تھی۔ مگر ہاشم نے جو حریص و آرام طلب ہونے کے علاوہ بزدل بھی تھا یونہی باتوں میں ٹال دیا۔

ہاشم نے جو معزز خواتین کا ایک وفد عزت بیگم کے پاس بھیجا اس نے شہزادی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہاشم میخوار نہیں۔ شہزادی نے مسکراکر جواب دیا کہ بھائی تو وہ میرا ہے اور اس کے متعلق علم آپ ظاہر کررہی ہیں حالانکہ علم مجھے زیادہ ہونا چاہئے۔ غرض وفد بے نیل مرام واپس لوٹ آیا۔

ایک دن شہزادی کی خدمت میں تین خواتین کا ایک اور وفد آیا۔ جس نے شہزادہ طاہر (باغی) کا پیغام سنایا اور کہا کہ تمہاری طرح وہ بھی خاندان پرستی کا مخالف ہے۔ ملک میں اس کی سازش کا جال پھیل چکا ہے

[illegible] یقیناً وہی کامیاب ہوگا۔ پس اس وقت سے پہلے کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا جس سے بعد میں پشیمانی ہو اور دیکھو ہم سب [illegible] اور قاصدوں کو کسی قسم کا نقصان پہونچانا کسی دستور میں جائز نہیں ہوا۔

۸

عزت بیگم اب عجیب کشمکش میں ہے۔ یہ تو نہیں کہ اسے ہاشم کی پاکبازی کا یقین آگیا تھا نہ یہی تھا کہ وہ طاہر کی جمہوریت نوازی کو نیک نیتی پر مبنی سمجھ گئی تھی۔ ہاں اس کے سامنے اگر مشکل تھی تو وہ یہ کہ خود بادشاہ ہاشم سے اس کی شادی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اگر وہ مان لیتی ہے تو اصول کے خلاف ہے نہیں مانتی تو باپ کا قہر نازل ہوتا ہے۔ بہرحال وہ اسی کشمکش میں تھی اودہر محلسرا میں بادشاہ کا حکم موصول ہوا کہ ہاشم اور عزت بیگم کی شادی کی بہت جلد تیاری کی جائے۔ کل نکاح ہوگا اور اس کے بعد شاہی مراسم ادا کئے جائینگے ہفتہ کے بعد بغاوت کو فرو کرنے کے لئے باقاعدہ مہم بھیجی جائیگی اور شہزادہ طاہر کو وہ عبرتناک سزا دی جائیگی جسے رہتی دنیا تک بے مثل تصور کیا جائیگا۔

عزت بیگم کو علیحدہ پیام پہونچا کہ اگر انکار کروگی تو قتل کردی جاؤ گی اس پر شہزادی بہت پریشان ہوئی۔ بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہوکر دعا کی کہ وہ قادر مطلق اسے اس دوگونہ مصیبت سے نجات دے کہ ملنے تو مصیبت ہے نہ مانے تو آفت۔

آخر اسے مصلحت سوجھی۔ بادشاہ کے پاس پیغام بھیجا کہ اس فتنہ وفساد کی فضا میں جشن شادی کچھ مناسب نہیں آخر یہ کیا ہی افسوسناک نظارہ ہوگا کہ آج تو ملک میں جشن ہو رہا ہے اور کل قتلگاہ کا منظر درپیش ہے آج لوگ خوان نعمت پر بیٹھے ہیں کل خاک وخون میں ان کے لاشے تڑپتے ہونگے مجھے کوئی انکار نہیں اور نہ مجال انکار ہے مگر اتنا عرض کرنے کی جرات کرتی ہوں کہ بغاوت کو فرو کرنے کے بعد جشن شادی کا انتظام فرمائیے کہ ایک نہیں دو جشن جمع ہو جائینگے تو یوں بھی نیک فال ہے کیونکہ شادی بھی دراصل دو شخصوں کے ملاپ کا نام ہے۔"

بہرحال عزت بیگم کی یہ ترکیب کامیاب ہوگئی اور بادشاہ کو یہ تجویز پسند آگئی۔ وہ مطمئن ہوگیا اور بغاوت فرو کرنے والی مہم کو کوچ کا حکم دے دیا۔

۹

اُدہر جاسوسوں نے شاہی فوج کے کوچ کی خبر شہزادہ طاہر کو پہنچا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس کی جماعت نے کھلم کھلا علم بغاوت بلند کردیا۔ پہلے جہاں خفیہ تیاریاں ہو رہی تھیں وہاں اب علانیہ سب کچھ ہونے لگا۔ ایک اچھا خاصا لشکر دونوں ہی میں ادھر ادھر سے نکل کر جمع ہوگیا اور دارالخلافہ کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔

کسی درمیانی مقام پر دونوں فوجیں بھڑ گئیں اور ہنگامہ کارزار گرم ہوگیا۔ اُدھر سے آوازیں آتی تھیں "خاندان سلطنت کو توڑ ڈالو اور حکومت کے عہدوں پر خود قبضہ کرلو۔" ادہر سے نعرے بلند ہوتے تھے۔ بادشاہ سلامت زندہ رہے۔ بادشاہ کا خاندان زندہ و سلامت رہے۔ غرض خوب لڑائی ہوتی رہی۔

شہزادی بظاہر پریشان تھی مگر اس کا دل مطمئن تھا۔ وہ یقیناً چاہتی تھی کہ اس لڑائی میں ہاشم و طاہر دونوں کا کام تمام ہو جائے۔ کیونکہ اس کی مصیبت کا اصلی حل یہی تھا کہ اس کے اصول کی راہ میں سے یہ دونوں پتھر ہٹ جائیں اور وہ اپنے حسن سیرت و اخلاق کی ٹکر کا کوئی آدمی تلاش کرنے کے لئے آزاد ہو جائے۔

شہزادی انہی خیالات میں محو بیٹھی تھی کہ شہزادہ ہاشم کے قتل کی خبر آئی گو اس کے مقصد کا پچاس فیصدی حصہ تو اس طرح پورا ہوگیا تھا مگر یہ خیال کرکے وہ بے اختیار کلیجہ تھام کے رہ گئی کہ آخر طاہر سے وہ اچھا تھا۔ اور اگر باقی نصف حصہ مقصد کا پورا نہ ہوا تو پھر؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ طاہر غلبہ ہی پلہ بھیر تو قیامت ہوگی۔

وہ اسی خیال میں غرق رہی یہاں تک کہ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اگر بادشاہ نے شکست تسلیم کرکے طاہر سے اس کی شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کردی تو اس سے یہی بہتر ہے کہ ابھی کسی اور طرف منہ کرلیا جائے کیونکہ طاہر جیسے خبیث سے شادی کرکے اپنی زندگی اور خصوصاً سیرت کو برباد کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ شاہی تخت کو ٹھکرا کر غربت کی زندگی اختیار کرلی جائے چنانچہ شہزادی نے تہیہ کرلیا کہ باغیوں کے دارالخلافہ کے قریب آنے سے پہلے ہی کہیں روپوش ہو جائیگی۔

۱۰

دوسرے ہی دن محلسرا میں قیامت بپا ہوگئی۔ دارالخلافہ میں

مقدر پھوٹ گیا۔ بادشاہ کو شہزادہ طاہر کے کسی آدمی نے محل ہی میں موقع پاکر قتل کر دیا۔ اب شہزادی کے لئے بھاگ جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا یا وہ طاہر کے قبضہ میں آکر زندگی برباد کرلیتی۔

طاہر کی فوج نے بھی جب بادشاہ کے قتل کی خبر سنی تو خوشی کے شادیانے بجائے۔ طاہر تو اس لئے خوش تھا کہ اس کے خیال میں اب عزت بیگم سے شادی کرنے کے لئے راستہ صاف ہو گیا تھا اور یہی اس کا مقصد تھا جس کے لئے اس نے عوام الناس کو عہدوں کے وعدے دیکر اور ناصر شاہ کے اصول خاندان پرستی کو ترک کرنے کا چکمہ دے کر دھوکا دے رکھا تھا۔ باغی اس لئے پھولے نہ سماتے تھے کہ اب انھیں ایسا بادشاہ ملے گا جو رعایا میں سے بھی لائق آدمیوں کو خدمت میں لیا کریگا۔ گو انھیں اصلیت معلوم نہ تھی کہ انھیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ بغاوت کی بھی انتہا یہیں تک تھی کہ ملک تو چاہتا تھا کہ حکومت کے عہدوں میں اس کے لائق آدمیوں کو لیا جائے مگر یہ نہیں چاہتا تھا کہ حکومت ہی اس خاندان میں نہ رہے۔

بہرحال بادشاہ کے قتل کی خبر نے جہاں ایک طرف طاہر اور اس کی فوج کا دل بڑھا دیا تھا وہاں اس نے ہاشم کے قتل کے واقعہ سے مل کر شاہی فوج کو بالکل ہی بزدل بنا دیا تھا چنانچہ اس نے مقابلہ چھوڑ دیا اور طاہر کی فوج کمال سرعت سے دارالخلافہ کی طرف بڑھنا شروع ہوئی یہاں تک کہ چند ہی دن کا سفر باقی رہ گیا تو شہزادی نے اپنی ماں (ملکہ) کو ساتھ لیکر بھاگنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

۱۱

ماں بیٹی نے ایک جاں نثار خادم کو ساتھ لیکر رات کے پچھلے حصہ میں گھر سے نکل کر سرحد عبور کرنے کا انتظام کیا ہوا تھا اور تجویز یہ تھی کہ ضروریات زندگی کے لئے کچھ سونا ساتھ لے چلینگے۔ مگر یہ تو آخر تدبیر تھی اور وہ بھی کس وقت ملکہ و شہزادی مگر اب بیکس و بے بس بیوہ اور یتیم لڑکی کی تدبیر اور ہونا وہ تھا جو تقدیر میں لکھا تھا۔ آدھی رات سے قبل ہی دارالخلافہ کے ایک فوجی دستہ نے محلسرا کا محاصرہ کرلیا۔ ملکہ اور شہزادی بڑی مشکل سے ایک روشن دان کو توڑ کر خادم کی مدد سے باہر نکلیں اور قبل ازیں کہ باغی کمروں میں داخل ہوتے یہ دونوں موقع پاکر کافی دور نکل چکی تھیں خادم نے شہر سے باہر ایک مقام پر تین بادرفتار گھوڑوں کا بندوبست کر رکھا تھا۔ تینوں سوار ہوئے اور ایک ایسی راہ سے سب سے قریب کی سرحد کا رخ کیا جو غیر معروف تھی اور ایک جنگل میں سے ہو کر گذرتی تھی۔

جنگل کا سفر تھا تو صرف پانچ میل کا مگر پچاس میل سے کہیں زیادہ ثابت ہوا جنگلی جانوروں کا ڈر۔ درختوں کی ٹہنیوں سے الجھنا۔ رستہ گم کرنے کا خوف۔ غرض کیا مصیبت نہ تھی اور ان کے لئے جو ناز و نعمت میں پلی تھیں۔

ایک ندی میں سے بھی گذرنا پڑا یوں تو وہ پایاب ہی تھی مگر ایک جگہ دلدل میں سے گذرنا پڑا۔ گھوڑوں کے پاؤں دھنستے جاتے تھے۔ سبب ہوا اس جگہ گھوڑوں سے اتر کر چلنا پڑا۔

ایک مقام پر شیروں کا سامنا ہو گیا۔ وہاں گھوڑوں کو چھوڑ کر درختوں پر چڑھنا پڑا۔ جب خطرہ ہٹ گیا تو دیکھا کہ صبح کاذب ہے اور جنگل بھی تھوڑا ہی باقی ہے۔ چنانچہ درختوں سے اتر کر پیدل چلے۔ بھاگم بھاگ جنگل سے نکلے اور ایک شاہراہ پر ہو لئے جس پر تجارت کے اونٹ اور یکے گاڑیاں چلا کرتی تھیں۔

یہاں جنگل میں کسی مقام پر شور و غل ہوا ملکہ نے سمجھا کہ باغی آپہونچے تھوڑی دیر بعد ایک یکہ پیچھے سے آتا ہوا دکھائی دیا جس پر صرف دو آدمی تھے۔ یہ تینوں ٹھہر گئے اور جب یکہ قریب آیا تو یکہ والے نے بھی پوچھا۔ "کدھر جاؤگے؟" "سرحد پار" خادم نے کہا۔ کرایہ کے پیسے ٹھہرائے گئے اور تینوں سوار ہو گئے۔ سرحد یہاں سے اب صرف ایک میل ہی تھی اس لئے تینوں کو اطمینان سا ہو گیا۔

۱۲

خدا خدا کر کے سرحد کو عبور کر لیا گیا مگر قبل اس کے کہ دوسری سلطنت کے شہر میں پہنچتے جو یہاں سے صرف ایک ہی میل دور تھا اور جہاں خادم نے ملکہ اور شاہزادی کی پناہ کا انتظام کر رکھا تھا باغیوں کے ایک گروہ نے جو چار سواروں پر مشتمل تھا اور ملکہ اور شاہزادی کے تعاقب میں اور کئی ویسے گروہوں کی طرح اس شاہراہ پر ہو لیا تھا یکہ کو آلیا۔

بس پھر کیا تھا۔ یکہ کا محاصرہ کر کے اسے روک لیا گیا اور تینوں سے کہا گیا کہ "وہ ہتھیار ہرگز نہ اٹھائیں بلکہ چپ چاپ گرفتار ہو جائیں ورنہ قتل کر دیئے جائینگے"۔

"مگر جب تک میری جان باقی ہے ایسا نہیں ہوگا۔" خادم نے للکار کر کہا۔

باغی سوار نے ہنس کر کہا۔ "اچھا غلام اور ایسی گستاخی کی جرأت سامنے آؤ بیٹا اور اس گدھے کی طرح مزا چکھو جس نے شیر کی کھال پہن کر اصلی شیروں کا مقابلہ کرنا چاہا تھا"

اس کے بعد سب باتیں زبانِ تیغ نے کیں اور یکہ کی باقی ایک سواری (جو کوئی تاجر تھا) اور یکہ والے کے نیچے اترنے سے پہلے ہی خادم چار میں سے ایک کو موت کے گھاٹ اتار کر اور دوسرے کو سخت زخمی کرکے خود مردانہ وار حق وفاداری ادا کر چکا تھا۔ باقی دو سے ملکہ اور شہزادی خود نبٹ رہی تھیں مگر آخرکار عورت ذات تھیں اور ناآزمودہ کار۔ خادم کے قتل ہونے پر تاجر تلوار لیکر اترا اور یہ کہکر کہ

"نابکارو۔ عورتوں سے لڑتے ہو، شرم ہے تو ڈوب مرو" دوسری طرف سے حملہ آور ہوا اور آن کی آن میں دونوں بقیۃ السیف باغیوں کو خاک و خون میں ملا دیا۔

اب اتنا بھی موقع نہ تھا کہ مسرت کا اظہار کیا جاتا۔ خادم کی موت پر غم و الم کے آنسو گرائے جاتے یا تاجر کا شکریہ ادا کیا جاتا۔ یکہ میں چاروں شخص سوار ہوئے اور بھاگ نکلے کیونکہ دور جنگل سے ایک اور گروہ غل مچاتا ہوا آتا دکھائی دے رہا تھا۔

۱۳

تاجر نے تجویز پیش کی کہ اب آگے جانا اور اسی شاہراہ پر سخت غلطی ہے اس لئے یہیں اتر کر سامنے کے گاؤں میں چند دن گذارنے چاہئیں تاکہ دشمن کو پتہ نہ چلے۔ میرا گھر بھی یہیں ہے۔

یہی تجویز پسند کی گئی اور تاجر ملکہ اور شاہزادی کو اپنے ہمراہ گھر لے گیا۔ وہاں صرف اس کی بوڑھی ماں تھی جس نے ان دونوں کا بڑی خوشی سے استقبال کیا۔ تاجر نوجوان تھا۔ خوبصورت۔ نیک سیرت۔ دلیر، گو اس کی تاجرانہ حیثیت معمولی تھی مگر دل غنی رکھتا تھا۔ انسانی ہمدردی کا تو مجسمہ تھا اس لئے ملکہ اور شاہزادی کی اس بے بسی کی حالت میں اس نے جان کو خطرے میں ڈالکر امداد کی۔

اب اس گھر میں ملکہ اور شاہزادی کو رہتے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہوگیا تھا کسی اور جگہ جانے کی تجویز باقی نہ رہی کیونکہ پناہ کا انتظام تو خادم کو معلوم تھا جو بیچارہ حق نمک سے ادا ہو چکا تھا۔

اب شہزادی عزت بیگم، تاجر جس کا نام حسن تھا اس کی کیرکٹر کا بغور مطالعہ کرنے میں مصروف ہوگئی۔ وہ اس کے خیالات، مذاق کی چھوٹی چھوٹی باتوں، بہادرانہ اوصاف اور خصوصاً خدا پرستی، ایثار، خلوص جذبے میں اس قدر دلچسپی لینے لگی تھی کہ اسے بادشاہ کا قتل، ملک کا انقلاب اور اپنی و نیز ملکہ کی مصیبت غرض سب کچھ بھول چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسا انسان اس کے تصور و ذہن میں تھا وہ اسے حسن میں بوجہ احسن نظر آرہا ہے۔ حسن بھی شہزادی کی دلچسپیوں سے ناواقف نہ تھا اسے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی ضرور زیرک ہے اور اعلیٰ خیالات کی مالک اور یہ بھی کہ وہ حسن کا خاص لحاظ سے مطالعہ کر رہی ہے۔

شہزادی کو جب ہر طرح سے اطمینان ہوگیا کہ حسن صحیح معنوں میں ایک شریف انسان ہے تو اس نے اس کو اس لحاظ سے بھی دیکھنا شروع کیا کہ وہ اس کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ ممکن ہے وہ دل میں فیصلہ ہی کر چکی ہو مگر ابھی اسے ملکہ سے مشورہ کرنا اور اس کی اجازت لینا ضروری تھا۔ نیز وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہی آگ حسن کے دل میں بھی سلگ رہی ہے۔ یا نہیں۔

۱۴

ایک دن عزت نے اپنی والدہ سے کہدینے کی جرأت کی ملکہ نے اسے جلدبازی پر محمول کیا اور کہا۔ "اتنی کیا جلدی ہے آدمی تو یہ نہایت شریف ہے۔ مگر خدا جانے سلطنت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اگر تم نے یہیں اپنے آپ کو پابند کر لیا اور ادھر تمہارے لئے کوئی اچھا موقع نکل آیا تو کیا کروگی؟ بات کسی حد تک معقول تھی گو عزت بیگم کے اصول کے خلاف تھی مگر وہ مصلحتاً چپ ہو رہی۔

چند دن کے بعد سلطنت کی خبریں ہر جگہ پھیل گئیں ملکہ کو بھی معلوم ہوگیا کہ طاہر تخت نشین ہو چکا ہے اب تازہ خبر یہ آئی کہ اس نے ایک رئیس زادی سے شادی بھی کر لی ہے یہ سن کر ملکہ تو کامل طور پر مایوس ہوگئی مگر ملول بھی ہوئی مگر شہزادی مطمئن بھی ہوئی اور خوش بھی کہ ظاہر نے اس کا پیچھا چھوڑا۔ اب وہ بیخوف تھی اور آزاد۔ چنانچہ اس نے چند ہی دنوں میں ملکہ کو رضامند کرکے حسن کی طرف رخ کیا اور یہ تو وہ فیصلہ کر ہی چکی تھی کہ حسن انسان ہے اور اس کی انسانی خوبیاں اس معیار پر پوری

اتری ہیں جو ادیب کے ذہن میں قسمت سے تھا اس لئے اب اس نے وہ تمام
طریقے شرم و حیا کے ماتحت رکھ کر استعمال کئے جو خاموشی کی زبان میں
محبت کا پیغام دیا کرتے ہیں۔

حسن نے بھی ظاہری کانوں سے نہیں بلکہ دل کے کانوں سے وہ
پیغام سُنا اور اسی زبان سے قبول بھی کیا جو پیغام کے لئے استعمال کی گئی
تھی۔ حسن کی ماں کو جب معلوم ہوا تو وہ بیحد خوش ہوئی کیونکہ وہ پہلے ہی
اپنی اس مہمان لڑکی کے اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے اسے کبھی فرشتہ اور کبھی
حور کہا کرتی تھی۔ غرض طاہر کی شادی کا اعلان سننے کے چند ہی دن بعد حسن
کا نکاح بھی ہوگیا اور سب خوشی خوشی رہنے لگے۔

۱۵

طاہر یوں تو چند ہی دنوں میں بساط حکومت کو الٹنے اور خود تخت
حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ مگر کاٹھ کی ہنڈیا آخر کب تک سہار سکتی ہے
چند دن گذرنے پائے تھے کہ سارا پول کھل گیا۔ وزارت کی تفویض اور
بڑے بڑے عہدوں کی تقسیم پر اس کی ساتھی فوج اس سے ناراض ہوگئی
کیونکہ اسے معلوم ہوگیا کہ یہ سارا فریب تھا کہ رعیت کا کہنا مانا جائیگا حالانکہ
خاندان پرستی کا پرنالہ پھر بھی وہیں بہ رہا ہے۔

چنانچہ ابھی باغی فوج پورے طور پر منتشر نہ ہونے پائی تھی کہ پھر اپنے
آقا ہی کے خلاف جمع ہونی شروع ہوئی۔ اب تو انہوں نے نئے بادشاہ کو
اتنا موقع بھی نہ دیا کہ وہ پہلے اپنے حامیوں کو علیحدہ کر کے انہیں باغیوں کے
خلاف صف آرا کر سکے۔ اور پھر جب کہ وہ تھے بھی دار الخلافہ کے قرب و جوار
میں چنانچہ دو ہفتہ تک تو طاہر کہیں چھپا رہا آخر بری طرح مارا گیا اور حکومت کا
تختہ ایک ہی مہینہ میں دوسری بار پھر الٹا۔

اب تخت کے امیدوار کی تلاش شروع ہوئی کیونکہ رعیت یہ تو چاہتی
ہی تھی کہ خاندان شاہی کے کسی فرد کے علاوہ کوئی اور تخت کا وارث قرار پائے
بڑے بڑے فوجی سرداروں نے علما، وکلا، اور بزرگوں کو جمع کر کے کانفرنس
منعقد کی جس میں قرار پایا کہ شہزادی عزت بیگم کی تلاش کی جائے تخت
کی وارث ملکی رواج کے مطابق وہی ہے اور ہے بھی رحمدل، نیک سیرت
اور انصاف پسند بلکہ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خاندان پرستی کے خلاف بھی ہے
چنانچہ ہر طرف آدمی دوڑائے گئے ہمسایہ سلطنتوں کے نام چٹھیاں بھیجی گئیں۔

۱۶

ہوتے ہوتے یہ خبر بلکہ ڈھنڈورا حسن تاجر کے گھر بھی جا پہونچا۔ ملکہ
اور شہزادی کی حالت اب عجیب تھی کہ خوش بھی ہوئی اور متحیر بھی۔ بڑی
سوچ بچار کے بعد ماں بیٹی نے یہی فیصلہ کیا کہ اپنے آپ کو ظاہر کر دینا چاہئے
کیونکہ چند آدمیوں نے نہیں بلکہ ملک کے مدبرین اور ذمہ دار لوگوں نے
بذریعہ اجلاس اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ شہزادی کو تخت پیش کیا
جائے مگر اب کوئی مشکل تھی تو وہی جس کی طرف قبل از نکاح ملکہ نے
اشارہ کر دیا تھا۔ یعنی حسن کا معاملہ۔ اور تو کوئی بات نہ تھی۔ شہزادی کے
نزدیک حسن اب بھی وہی حسن تھا جو پہلے تھا۔ لیکن رعیت نے اگر
اسے پسند نہ کیا تو پھر کیا ہوگا۔

اب بہرحال وہ وقت آچکا تھا کہ سب سے پہلے عزت بیگم اپنے خاوند
کے سامنے راز فاش کرے اس کے بعد جو ہو سو ہو چنانچہ اس نے سب کچھ
بتا دیا اور پھر کہا۔ "اس بات کا آپ وہم و گمان بھی نہ کریں کہ میں تخت و
تاج کو آپ سے بہتر سمجھتی ہوں مگر اب کہ میں آپ کی ہوں یہ ضروری تھا کہ
آپ کو سب کچھ بتا دوں تاکہ آئندہ جو کچھ کیا جائے وہ آپ کی رائے سے
کیا جائے؟"

حسن سنتے ہی آنسو بہانے لگا اور ساری باتیں سن کر گویا ہوا۔ "آہ!
میں یہ سمجھتا تھا کہ میں خوش قسمت ہوں کہ ایسی عورت سے میری زندگی وابستہ
ہوئی جس کی وجہ سے میں زندگی ہی میں جنت میں داخل ہوگیا ہوں مگر اب
معلوم ہوتا ہے یہ سیج خدانخواستہ کانٹوں کی ہے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ
مجھ ایسا غریب تاجر ایک شہزادی نہیں بلکہ ایک تاجدار شہزادی کا خاوند
کہلا کر سلامتی سے زندہ رہ سکے جبکہ پہلے ہی دو انقلاب صرف رقابت ہی کا
نتیجہ تھے۔ اور اگر سلامت بھی رہوں تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں ایک
غلام کی حیثیت میں زندگی بسر کروں۔ میں تاجدار شہزادیوں کے اس طرح کے
خاوندوں کی حیثیت سمجھتا ہوں۔ میں ہرگز برداشت نہ کر سکونگا"

عزت بیگم :- میرے آقا! میں کہہ چکی ہوں کہ آپ یہ بات وہم
و گمان میں بھی نہ لائیں۔ اگر آپ اجازت دیں اور خدا کے فضل و کرم سے
مجھے تاج و تخت مل جائیں تو وہی تاج و تخت میں آپ کے قدموں پر
رکھدونگی۔ کیونکہ میرے بادشاہ آپ ہیں۔

حسن ۔ نہیں نہیں، جان من یہ ممکن ہی نہیں۔

عزت ۔ کس لحاظ سے سرتاج ۔ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں یا ملک والوں پر ؟

حسن ۔ ملک والوں پر ۔ تم سے میں ہرگز بدظن نہیں ۔

عزت ۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ آپ مجھ سے بدظن نہیں ۔ میں اس کو اپنی خالص محبت کا ثمرہ سمجھتی ہوں ۔ مگر آقا تسلی رکھئے ۔ یا تو میں آپکے سر پر تاج رکھنے میں کامیاب ہو جاؤنگی یا اپنے سرتاج کو لیکر تاج و تخت کو چھوڑ دونگی ۔ کیونکہ یقیناً ایک جاندار تاج بے جان تاج سے بہر حال بہتر ہے ۔ یہ آخری فقرہ کچھ ایسے انداز میں زبان سے نکلا کہ دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور خاموشی کہہ رہی تھی کہ یہ تسلیم ہے ۔

۱۷

حسب فیصلہ دار الخلافہ میں عارضی وزیر اعظم کے پاس قاصد بھیجا گیا اور اطلاع دی گئی کہ شہزادی اور ملکہ صحیح و سلامت فلاں گاؤں میں موجود ہیں ۔ وہ آنے کے لئے تیار بھی ہیں مگر شہزادی نے چونکہ نکاح کر لیا ہے اس لئے وہ اپنے خاوند کو بھی ہمراہ لائینگی ۔

چند ہی روز بعد معزز اراکین کا ایک وفد فوج کے ایک دستے کے ساتھ آیا ۔ ادھر سے حسن اپنی بیوی ۔ ساس اور والدہ کو ساتھ لئے ہوئے اپنے ملک کی سرحد کو عبور کر چکا تھا اور ناصر شاہ کی حدود میں داخل ہو کر ایک گاؤں میں مقیم تھا ۔ وفد کو اطلاع بھیجی گئی اور وہ اس نئی قیام گاہ میں شہزادی کی بارگاہ میں حاضر ہوا ۔

چند رسمی باتوں کے بعد وفد سب کو دار الخلافہ میں لے گیا اور وہاں تخت نشینی کے متعلق گفتگو شروع ہوئی ۔ جس کی ضرورت نہ تھی مگر حسن کا معاملہ بیچ میں آ پڑا تھا ۔ شہزادی نے وزیر اعظم کو بلا بھیجا اور اس کے سامنے اپنے بھاگنے ۔ مصائب جھیلنے ۔ باغیوں کے ایک گروہ سے خادم اور حسن تاجر کی مدد سے بچنے ۔ پھر حسن تاجر ہی کے گھر میں پناہ گزیں ہونے حسن کو اپنے اصول اور ٹھہرائے ہوئے معیار کے مطابق پانے ۔ طاہر کی تخت نشینی سے مایوس ہو کر اور اس کی شادی سے مطمئن ہو کر حسن سے نکاح کر لینے کا سب واقعہ پیش کر دیا ۔ پھر وہ گفتگو بھی سنا دی جو اس کے اور حسن کے درمیان حسن کے گھر میں آخری مرتبہ ہوئی تھی ۔ اس کے بعد وزیر اعظم سے پوچھا ۔ کیا یہ مناسب بلکہ ضروری نہیں کہ ایسے نیک سیرت انسان کو جو بہادر بھی ہے اور جس نے مجھے بچایا اور پھر لطف یہ کہ میرا سرتاج بھی ہے اور آقائے محبوب، آپ بھی اپنا سردار تسلیم کر لیں ؟"

وزیر اعظم ۔ مگر شہزادی والا جاہ ! لوگ اعتراض کرینگے کہ وہ معمولی حیثیت کا آدمی ہے ۔

شہزادی ۔ جو شخص ملک کی شہزادی کا محبوب آقا ہو کیا وہ معمولی حیثیت کا انسان ہوگا ؟

وزیر اعظم ۔ کم از کم میں تو قائل ہو گیا ہوں مگر لوگ آپکا اقتدار سمجھتے ہیں

شہزادی ۔ سبحان اللہ لوگ مجھے بادشاہ ماننے کیلئے تیار ہیں اور اس کو نہیں مانتے جو میرا بادشاہ ہے پھر اس میں استحقاق کی کون سی بات ہے ۔ یہ تو وہی خاندان پرستی ہے جس کے خلاف ابھی کل بغاوت ہو چکی ہے ۔ ہاں اگر ضد کی گئی اور میرے ہی سر پر تاج رکھا گیا تو میں پھر اسی دم اپنے شوہر کے سر پر وہی تاج رکھکر اس کے حق میں دست بردار ہو جاؤں گی یہ تو ملکی رواج کے خلاف نہ ہوگا ۔

وزیر اعظم نے سر جھکا لیا اور گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ شہزادی کہنے لگی بولئے جلد کسی نتیجہ پر پہونچئے ۔ اگر کم از کم آپ قائل ہیں اور آدمی بھی نہایت اعلیٰ سیرت کا مالک ہے تو جلد بتائیے کہ آپ اس معاملہ میں میری کس حد تک امداد کرنے کیلئے تیار ہیں ۔ فیصلہ کرنے سے پہلے یہ بھی سن لیجئے کہ میں ایسے بہادر مرد کی بیٹی ہوں جو قول پر جان دیتا تھا مجھے بھی یہ چیز ورثہ میں ملی ہے میں یہ فیصلہ کر کے اس کا اعلان کر چکی ہوں کہ میں اپنے محبوب شوہر کے سر پر تاج نہ رکھ سکی تو اسے ساتھ لیکر پھر اسی گاؤں میں غریبانہ زندگی بسر کرنے کیلئے خوشی سے چلی جاؤنگی ۔"

وزیر اعظم ۔ بس بس شہزادی والا جاہ ! میں جان گیا ۔ میں امداد کرونگا اور میرا خیال ہے کہ لوگوں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔ آپ کل تک مجھے موقع دیں کہ میں ارباب حل و عقد کی مجلس سے یہ تجویز منظور کرا لوں ۔

شہزادی ۔ بہتر ۔ خدا حافظ !

دوسرے ہی دن اجلاس منعقد ہوا اور حسن تاجر کے حق میں فیصلہ ہو گیا ۔

(مرزا عزیز فیضانی)

مفلس کی دُنیا

بہترین نظم

از جناب خانصاحب حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر اکبر آبادی

میں بتاتا ہوں جہانِ زندگی کیا چیز ہے
آرزو کیا، رنج کیا ہے اور خوشی کیا چیز ہے

انبساطِ قلب میں ہوتی ہے کیا شے جلوہ گر
حسرتِ ناکام میں کیا چیز آتی ہے نظر

یہ جہانِ رنگ و بو آئینۂ تصویر ہے
کائناتِ آرزو اک حلقۂ زنجیر ہے

ایک جانب غنچہ و گل ہیں تبسّم در کنار
دوسری جانب ہے شبنم زندگی کی سوگوار

اِس طرف ہیں نرگسِ شہلا کی آنکھیں اشکبار
اُس طرف ہے لالۂ گلشن کا سینہ داغدار

عالمِ نیرنگ کی گہرائیوں پر کر نظر
چشمِ مفلس سے بساطِ دہر کا نظارہ کر

اس کا ذوقِ آرزو کیا، اس کا شوقِ دید کیا
زندگی اس کی محرّم ہے سراپا، عید کیا؟

کوئی شے اس کو نظر آتی ہی جب ہنستی ہوئی
چٹکیاں لیتا ہے اس کے دل میں دردِ زندگی

صبح ہوتی ہے تو اس کو شام آجاتی ہے یاد
شام ہوتی ہے تو شب کٹتی ہے اس کی نامُراد

دن کا چین اور رات کا آرام کچھ حاصل نہیں
اس کے سینے میں کوئی پتھّر ہے شاید دل نہیں

چشمِ ماہر سے حقیقت کا تماشا دیکھنا!
دیکھنے والو ذرا مفلس کی دُنیا دیکھنا!

اردو شاعری اور تخلص

از جناب شور صاحب ہاشمی (م۔ ی)

نظم میں تو یوں بھی نثر سے زیادہ دلکشی ہوتی ہے اور وہ بھی اردو کی نظمیں جن کی لطافتیں ہی حقیقتہً اس زبان کی ترقی اور ارتقار کا واحد راز ہیں۔ ان کا اقتضا تھا کہ اس زبان میں نسبتاً منظومات زیادہ ہوں۔ جس حد تک دنیا کی اور ادبیات کا تعلق ہے اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ عالم کی کوئی تاریخ ادب اس امر کا ثبوت نہیں بہم پہونچا سکتی کہ اتنی قلیل مدت میں کسی زبان کی صنف شاعری کو اتنا نمایاں فروغ حاصل ہوا جتنا کہ اردو شاعری کو۔ جس سرعت کے ساتھ اس نے ارتقائی منازل طے کی ہیں —— وہ واقعی حیرت انگیز ہیں۔

شاہجہانی عصر میں جس طفل نے کس مپرسی کے عالم میں آنکھیں کھولی تھیں آج اس کی رنگینیاں سامنے عالم ہے۔ ہے مجمع العقول نظر آرہی ہیں۔ زمانے نے تسلیم کرلیا کہ اس میں فطری جوہر پوشیدہ تھا جسے کسی مناسب نظر کی ضرورت تھی۔ ارباب علم و فن نے اسے ہاتھوں ہاتھ اٹھایا۔ شاہی گہواروں نے اپنا زریں دامن پھیلایا۔ محراب و منبر نے اس کا استقبال کیا۔ بتکدہ نے اپنی آنکھیں بچھائیں۔ اور میخانوں کی تو دیرینہ تمنائیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں کہ میرا پرستار حقیقی مل گیا۔ ہندوستان کے ذرّے ذرّے نے دُعا کی۔

"خدا اس نونہال کو پروان چڑھائے"۔

اس میں کس قیامت کی دلکشی مضمر تھی جو اتنی جلدی جاذب قلب و ذوق بن گئی۔ جس نے دیکھا وہ اسی کا ہو رہا۔ چھ ہزار میل سے اجنبی اقوام کے چند افراد آئے۔ اس کی صورت سے غیر مانوس لب و لہجہ سے ناآشنا، انداز دلکشی سے بیگانہ لیکن کوئی اس کی فطری کشش کو کیا کرتا جس کی ایک ادنیٰ ادا بھی مسحور کرلینے کے لئے کافی تھی چنانچہ اس کی رنگینیوں نے اپنا وہ گہرا نقش چھوڑا، جوان کے انداز بیان میں اب بھی جھلکتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس نے جنس لطیف کے ذوق کو بھی صلائے عام دیئے بغیر نہ چھوڑا۔ مثلاً

جان فانسٹم شایق ؎

جورِ رقیب و منتِ درباں و طنزِ غیر　　کیا کیا جفائیں ہم نے سہیں تیرے واسطے

بجنیں جانسٹن فلاطون۔ ڈاکٹر تھے ؎

جوشِ گل سے کم نہیں کچھ بلبلوں کا بھی ہجوم　　ٹہنی ٹہنی پر نظر آتی ہے جائے عندلیب

الیگزنڈر ہارڈٹ صاحب۔ فرانسیسی تھے ؎

ہے زلف حلقہ زن خط دلبر کے آس پاس　　یا اژدہا ہے فوجِ سکندر کے آس پاس

مس بلیک خفی ؎

اے خفی اپنے اشک بے تاثیر　　مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

یہ چند اشعار تو قارئین کرام کے روبرو محض اس کی دلکشی اور مقبولیت عام کے ثبوت میں پیش کئے گئے درآنحالیکہ نفس مضمون سے کوئی خاص تعلق نہیں بہرکیف ناظموں کی کثرت تعداد انھیں اسباب و علل پر مبنی ہے اور بعض ادیوں سے بالکل مختلف اس کی ابتدا بھی نظموں سے ہوئی ہے۔ اب یہ مسئلہ چنداں محتاج توضیح نہیں رہا کہ دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں نثر کا ذخیرہ نظم سے کئی گنا زیادہ ہے لیکن اردو کی فطرت اس کے مخالف کیوں ہے؟

امتداد زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ تمدن۔ معاشرت اور ادب میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ ہر قرن اپنے عصر کی چیزوں کو بلحاظ نوعیت ایک نئے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ ادبیات کا بھی ہر شعبہ ذوق عوام کے ماتحت متاثر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں اردو شاعری کی رنگین اور روح نواز قبا کے دامان و جیب بھی تار تار ہوتے رہے خیالی معشوق ؏

مصوّر نقش کیا کھینچے کمر بگڑی دہن بگڑا

کی حد سے گذر کر پھر غزل شاعری کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور آج اس شعر کی

نازک خیالی کے ہمنوا مشکل سے ملیں گے۔ ع

ذہن ہے نقطۂ موہوم اس کا، کمر باریک ہے تارِ نظر سے

خیالات شرمندۂ تقلید نہ رہے۔ افکار تتبع کی بندشوں سے آزاد ہو چلے۔ مغربی انداز شاعری نے ان مرقعوں میں دیدہ زیب گلکاریاں کر دیں۔ واقعہ نگاری اور نیچرل شاعری ہر تخیل کا مرکز بن گئی۔ دلکشی، مافوق الفطرت، بدائع میں نہیں رہی۔ جدید طرز نگارش نے جدت پسند طبیعتوں میں تجدید کی روح پھونک دی۔ ہر نتیجہ میں اختراع کا شائبہ نمایاں ہے۔ تغزل کا بھی معیار فرسودہ نہیں رہا۔ سادگی ہی انتہائے دلکشی کا معیار قرار دی گئی۔ اور جیسے جیسے تدریج اس کی دلکشی اور لطافت ہر دل و دماغ پر مرتسم ہوتی جا رہی ہے۔ اس سحر کے پرستاروں کی جماعت بھی روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں یہ زبان کتنی وسیع ہو جائیگی۔ جس سرعت کے ساتھ یہ ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے واقعی بڑی حد تک تشفی بخش ہے۔

آج اس کی تعلیم کچھ ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ یورپ اور جاپان میں بھی ہو رہی ہے۔ بیرونی ممالک نے تسلیم کر لیا ہے کہ اب اردو کی بھی حیثیت ایک مستقل زبان کی ہے اور ہندوستان کی اسی زبان میں جامع اور عام ہونے کی اہلیت ہے۔ یہ ہمارے علمی انہماک اور ادبی خدمات کے لئے ایک ایسا روح نواز مژدہ ہے جس سے ہماری کاوشوں کی ہر رگ و پے میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مستقبل میں موجودہ مشاہیر ادب کی ہستیاں معدوم ہونگی لیکن دور حاضر کی ژولیدہ تاریخ ان کے اقدام کو مبارکباد دیگی کہ "اے دلدادگان علم تم چلے گئے لیکن تمہاری ناقابل محو یاد۔ تمہارے ناقابل فراموش کارنامے آج بھی سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ عالم کے دلوں میں چٹکیاں لے رہے ہیں" غالب و ذوق، میر و مومن کی ہستیاں نہیں رہیں لیکن ادبی تاریخ کے زریں صفحات اب بھی انھیں سر آنکھوں پر لئے ہوئے ہیں۔

دور حاضر میں بھی جتنے ارباب علم زبان اردو کی خدمت کر رہے ہیں جن کی کوششیں اسے عالمتاب بنا رہی ہیں ان میں کثیر جماعت انھی کی ہے جنھیں صنف شاعری مرغوب ہے۔ اس سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جماعت میں چند ایسے مایہ صد ناز حضرات بھی ہیں جن کی فطرت ہی میں ذوق شعری کا عنصر غالب ہے اور چند ایسے بھی ہیں جنھیں زمانہ کی پیہم ناکامیوں نے شاعر بنا دیا ہے لیکن زیادہ تعداد ان کورانہ تقلید کرنے والوں کی ہے جو نہ تو زمانہ ساز شاعر ہیں اور نہ فطرتاً لطیف حسیات کے حامل۔ جن کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں گذرا ہے جس میں قدرت انسان کے لئے شاعری کی خصوصیات بہم پہونچاتی ہے اور یہی وہ جماعت ہے جو صحیح اور معیاری ذوق کے فقدان کی وجہ سے ادب کے رنگین دامن کو گلستاں بکنار بنانے کے فریب میں بدنما دھبوں سے آلودہ کر رہی ہے۔ اس ضمن میں کیوں کا سوال اس لئے نہیں پیدا ہوتا کہ بلحاظ نوعیت ہر شخص کی فطرت جداگانہ ہوا کرتی ہے۔ قدرت ہر دل کو اعلیٰ قوت تمیز نہیں عطا کرتی۔ بہت لوگ تو صرف اس لئے غزل کہتے ہیں کہ اس میں ایک کشش ہوتی ہے اور ان کے حسیات کے لئے رنگینی کا سامان ہوتا ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ کیفیات کی کون سی دکھتی ہوئی رگ اس سے متاثر ہونے کی حقیقتاً مستحق ہے۔ رباب ہستی کا وہ کون سا تار ہے جو اس سے چھڑ جانے کے بعد ساری کائنات کو اپنے پر کیف نغمہ سے معمور کر دیگا۔

ایک کثیر تعداد ایسے حضرات کی ہے جو ایک شعر کی لطیف کیفیات کو محسوس ہی نہیں کر سکتی۔ چونکہ میرے خیال میں شعر سمجھنے کی چیز نہیں بلکہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اس کا تعلق جذبات کے لطیف ترین حسیات سے ہے۔ ہر اس شے میں شعریت کی ایک مکمل داستان ہے جسے انسان ایک بار دیکھے اور پھر دیکھنے کی آرزو کرے۔ جسے ایک بار محسوس کرے اور احساسات کو ایک مستقل خلش کی آماجگاہ بنا لے لیکن یہ نظر ہر وہ آنکھ پیدا نہیں کر سکتی جو مشاعروں پر سطحی پڑتی ہو، ہر وہ احساس نہیں محسوس کر سکتا جو ایک شعر کو سُنے اور واہ کہدے لیکن نہ بتا سکے کہ واہ کرنے پر کیوں مجبور ہو گیا یہی وہ شاعر ہیں جو "شاعر" بننے کی سعی لاحاصل میں "متشاعر" بن کر رہ جاتے ہیں اور ایک عالم آج اس ناگزیر مصیبت میں مبتلا ہے۔ ہر شخص مرزا صاحب کے اس مصرع کا مجسم ثبوت نظر آتا ہے ع

طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود

غالب و ذوق ایک مدت ہوئی کہ گذر گئے لیکن آج اگر دیکھئے تو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہستیاں ایسی ملینگی جو انھیں کی چادر میں اپنے حقیقی خط و خال چھپائے منظر عام پر سراپا فریب بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ دور حاضر میں مشاعرہ ساز شعراء کے قسم کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو اپنے لئے اسی تخلص کا انتخاب کرنا چاہتی ہے جو یا تو متقدمین میں گذر چکا ہے۔ یا موجودہ دور میں شاعری کی حیثیت سے ایک خاص شہرت کا حامل ہے

ممکن ہے کہ کوئی اسے محدود زبان کی وجہ بتائے لیکن ظاہر ہے کہ نہ تو یہ تسلیم کئے جانے کے لائق ہے اور نہ میں تسلیم کر سکتا ہوں۔ اس میں اکثر زبردست دھوکا ہو جاتا ہے۔ ایک مدت تک ایک شخص فریب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس دور میں جبکہ آئے دن متقدمین کے غیر مطبوعہ کلام شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ریسرچ میں اکثر ایسی چیزیں دستیاب ہوئی ہیں جنھیں اب تک منصۂ شہود پر نہیں لایا گیا۔ انھیں اپنا بنا لینا کس قدر آسان ہے اور ادبیات میں تو اکثر اوقات اس سے زیادہ سنگین اخلاقی جرم کا ارتکاب بے باکانہ کیا کرتے ہیں۔ اکثروں کو تو صرف شہرت مد نظر ہوتی ہے اور بعض اس معصوم گناہ کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

ایک غزل زبان زد عام ہونے کے بعد بغیر تحقیق کس طرح معلوم ہو سکتی ہے کہ آیا نشاںؔ دہلوی کی ہے یا نشاںؔ لکھنوی یا نشاںؔ بہاری کی۔ چونکہ غزل میں تو صرف لفظ نشاںؔ ہے اس سے نہ تو دہلوی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ لکھنوی و بہاری کا۔ لہذا دو ہی صورتیں اس عقدۂ لاینحل کے لئے بروئے کار لائی جا سکتی ہیں۔ اولاً یہ کہ مقطع میں تخلص کے ساتھ امتیاز کے لئے ہاشمی و قریشی یا لکھنوی و عظیم آبادی نظم کئے جائیں اور ثانیاً یہ کہ ارباب علم اپنی نظروں میں اتنی وسعت پیدا کریں یا استعداد میں اس حد تک ذوق تنقید کی خصوصیت پیدا کریں جس سے ہر شاعر کے کلام پر اتنا عبور حاصل ہو کہ آسانی سے امتیاز قائم کیا جا سکے لیکن ظاہر ہے کہ بادی النظر میں نہ تو ہر شخص محقق ہی بن سکتا ہے اور نہ ذوق تنقید ہی پیدا کرنا سہل ہے

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد یہ کہدینا
تخلص داغؔ ہے ہم عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

آپ یہ کہینگے کہ یہ شعر داغؔ دہلوی کا ہے میں یہ کہونگا کہ نہیں داغؔ قریشی کا۔ ایک تیسرے صاحب کہینگے کہ داغؔ صدیقی عظیم آبادی کا۔ چونکہ ان کے کلام کا بھی انداز بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ کچھ اسی قسم کی شوخی و برجستگی ان کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ اب آپ ثبوت بہم پہنچانے کے لئے دیوان داغؔ کی ورق گردانی کریں۔ میں کلیات داغ کی اور وہ مجموعۂ داغ کی لیکن ظاہر ہے کہ

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اگر کچھ دنوں اور یہی عالم رہا تو اس عالم رنگ و بو کا حشر معلوم ہر فرد نہ تو تحقیق و تفتیش کے بار کا متحمل ہو سکتا ہے اور نہ آسانی سے صحیح نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے۔ مورخوں کو تاریخ مرتب کرتے وقت اکثر بڑی دقتیں پیش آتی ہیں اور ہم تخلص ہونے کی وجہ سے دھوکا ہو جانا بعید از امکان نہیں۔ جس طرح متقدمین کے متعلق اکثر ہم لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس دور کے گذر جانے کے بعد مستقبل میں موجودہ شعرا کے متعلق دھوکا ہونیکا احتمال ہے۔ گذشتہ دور میں تو خیر چند ہی افراد ایسے تھے۔ اس دور میں تو فراوانی کا یہ عالم ہے کہ اکثر ایک ایک تخلص کے دس دس بارہ بارہ شاعر ہیں جنھیں کوئی نمایاں خصوصیت حاصل نہیں اور صرف اس نظریہ کے ماتحت کہ ان کے افسانے۔ مضامین یا غزلیں پرچوں میں شائع ہو جائیں وہ مشہور شعراء کے تخلص اپنا لیتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں لاہور ہی کے کسی پرچہ میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی کا ایک مقالہ "دیوان خواجہ معین الدین اجمیری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ذیل میں اس کا اقتباس درج کرتا ہوں جو اس مضمون کے سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہیں۔

"انوری کا قصہ مشہور ہے کہ ایک روز بلخ کے بازار سے گذرتے ہوئے کسی مقام پر اس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ بھیڑ چیر کر اندر گیا تو دیکھتا ہے کہ خود انوری کے اشعار ایک شخص مجمع میں سنا رہا ہے شاعر نے بڑھکر اس سے پوچھا کہ یہ اشعار کس کے ہیں؟ اس نے جواب دیا انوری کے۔ دوبارہ سوال کیا انوری کو جانتے بھی ہو؟ اس نے جواب دیا چہ خوش میں خود انوری ہوں۔ انوری نے ہنسکر کہا شعر دزد سنتے آئے ہیں لیکن شاعر دزد آج ہی دیکھا۔"

اب میں اجمالاً ان ہم تخلص شعرا کی فہرست دیتا ہوں۔ بہت ایسے بھی ہیں جنھیں بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

عزیز

عزیز احمد عزیزؔ ؎

وہ مجھ سے شب وصل ہائے کہتے ہیں، بتاؤ مل گیا کیا تم کو پیار کرکے مجھے

مرزا ہادی عزیزؔ لکھنوی ؎

کچھ اس میں مصلحت ذوق زندگی بھی تھی عزیزؔ وعدہ کا اس کے جو اعتبار کیا

عبدالعزیز عزیزؔ بہاری ؎

مولانا نصر اللہ عزیز ؎

میری متاعِ صبر و سکوں جس نے چھین لی ساکن یہیں وہ فتنۂ پرفن ہے آج کل

عزیز صدیقی رامپوری ؎

جی چکا میں دل کی بیتابی کے ہاتھوں جی چکا ؛ ہو چکی تسکینِ قلبِ ناتواں تیرے بغیر

عزیز کوبجی ؎

جمیل

جمیل مظہری ؎

یہ مہرِ تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

جمیل نعمانی ؎

جمیل آؤ چلو دیوانہ بن لو تمہیں کیا فائدہ رسمِ جہاں سے

جمیل موتیہاروی ؎

میرے صیاد قفس چھوڑ کے اب جاؤں کہاں آشیاں جب سے جلا کوئی ٹھکانہ نہ رہا

طالب

طالب باغپتی ؎

پھر ان کی نگاہوں میں کیفیت صہبا ہے تقویٰ کا خدا حافظ توبہ مری توبہ ہے

طالب بنارسی ؎

طالب عظیم آبادی ؎

کل تک جو میرے زخمِ جگر پر تھے اشکبار پہونچے ہیں آج وہ بھی نمکداں لئے ہوئے

طالب الہ آبادی ؎

کیف و مستی جو نہ ہو بادۂ سرجوش نہیں قیدی ہوش جو ہو جائے وہ مدہوش نہیں

اختر

اختر شیرانی ؎

ان کی صحبت کا تصور اور ہم زندگی، دھوکا تھی کچھ دن کے لئے

اختر شاہ ؎

آنکھ کے ڈورے تھے پلکوں میں دکھایا لطف اور برچھیوں میں حسن کا علم نظر آنے لگا

پروفیسر سید عبدالماجد اختر ؎

بن گئیں راہیں نکلنے کی جو سینہ چھد گیا
حسرتیں مرہونِ منت ہائے پیکاں ہو گئیں

اختر اورینوی ؎

تم نے پھر چھیڑ دیا پرسشِ مرہم کر کے میں نے تو دل کے نشاں تک کو مٹا رکھا تھا

قاضی صادق علی خاں اختر مصنف "مثنوی سراپا سوز"

اختر نگینوی ؎

اب دشمنوں کی جاں کا آزار مٹ گیا افسوس صدمۂ دل اغیار مٹ گیا

اختر قادری ؎

اشکِ خونبار مرے بحرِ بلاماں ہو نگے قطرے بڑھ بڑھ کے یہ کہتے ہیں کہ طوفاں ہو نگے

آرزو

آرزو لکھنوی ؎

ایک تسلسل خیال جو کہیں ختم ہی نہیں میری کتابِ شوق میں فصل نہ ہے نہ باب ہے

سید شریف حسین آرزو ،

مختار الدین آرزو ،

آرزو جلیلی ؎

منظر

منظر لکھنوی ؎

اہل محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

منظر دسنوی ؎

منظر صدیقی اکبر آبادی ؎

مرے نصیب کو ہم دوشِ کہکشاں کر دے خیال میں جو کلی ہے اسے عیاں کر دے

ظفر

ظفر شاہ ،

ظفر ہاشمی ؎

دیدۂ شوق کی رسوائی کا عالم مت پوچھ ذرے ذرے کی زباں پر ہے کہانی میری

ظفر تاباں ، ظفر واسطی ،

ظفر علیخاں ، ایڈیٹر زمیندار

وہ نافرجام بیڑا ڈوبنے سے بچ نہیں سکتا
خدا کا ساتھ چھوٹا جس کے خود بیں ناخداؤں سے

اثر

اثر صہبائی ؎

آثر لکھنوی ؎

شاعری اصل میں کیفیت وجدانی ہے　　تو سمجھتا ہے فقط لذّتِ نفسانی ہے

آثر دہلوی ؎

کہیں معلوم ہے نہ گھاٹ اس کا　　نظر آیا کہیں نہ پاٹ اُس کا

شفق

شفق عمادپوری ؎

مرا نام ننگ وجود ہے تو شفق ہے ذکر نمود کیا
میں طلسم ہستی و نیستی کا فریب نقش و نگار ہوں

شفق ٹونکی ؎

خندہ زن ہے آسمانوں پر مرا اوجِ وقار
عظمت و رفعت میں ہم ہیں سطوت پروردگار

شفق ضیائی ؎

کیا پوچھتے ہو حال قفس میں اسیر کا　　اک حسرتوں کی قبر ہے بال و پر میں ہے

ان کے علاوہ بہت ایسے بھی حضرات ہیں جن کے اشعار طوالت کے خیال سے نہیں دیئے جاتے مثلاً اکبر الہ آبادی، جلال الدین اکبر، اعظم کریوی، اعظم لکھنوی، نیّر مارہروی۔ نیّر امرتسری۔ آزاد انصاری، فضل حق آزاد عظیم آبادی۔ پروفیسر عابد علی عابد۔ طالب علی عابد، عابد تھانوی۔ عابد شاہجہانپوری۔ محشر رامپوری، محشر لکھنوی۔ محشر زاپوری محشر عابدی، محشر بخاری۔ شمیم نعمانی، شمیم جمیلی، شمیم رضوی۔ دیوانہ لاری۔ دیوانہ بریلوی۔ دیوانہ گورکھپوری۔ دیوانہ مصطفےٰ آبادی وغیرہ وغیرہ

نوٹ:۔ بعض حضرات کے شعر ترتیب مضمون کے وقت نہ مل سکے اس لئے ان کے تخلص کے سامنے جگہ خالی ہے۔

شور ہاشمی،

غزل

از جناب فخرالزماں خاں صاحب شیروانی (علیگ)

اشک سے نمناک آنکھیں کیوں مری جاں کیجئے　　مسکرا کر نزع کی مشکل کو آساں کیجئے!
کچھ مداراتِ جنونِ فتنہ ساماں کیجئے　　آج پھر چاک گریباں تا بداماں کیجئے!
مرنے والے کو پریشاں کیوں مری جاں کیجئے　　کیوں مرے مرنے پہ زلفوں کو پریشاں کیجئے!
ناخدا کو چھوڑیئے رکھئے خدا کا آسرا،　　اور کشتی کو سپردِ موجِ طوفاں کیجئے!
جان دیدیجئے خدا کی راہ میں مثلِ حسینؑ،　　سر کٹا کر حشر تک جینے کا ساماں کیجئے!
قید رکھنا ہم سے وحشی کا کوئی آساں نہیں　　اور کچھ اونچی ذرا دیوارِ زنداں کیجئے!
سخت جانی کا مری کیا ڈر یہ خود کھنچ جائیگا　　نوکِ خنجر آپ نزدیکِ رگِ جاں کیجئے!
وہ تبسم اُنکا وہ مستی بھری اُن کی نگاہ!　　صاف کہتی ہیں کہ پیدا ذوقِ عصیاں کیجئے!

زندگی کا کچھ بھروسہ فخر دنیا میں نہیں
دین کی خاطر کوئی کارِ نمایاں کیجئے!

سب سے اچھا چاند ہمارا

بچوں کیلئے

۱

پچھلی رات کی خاموشی ہے — ساری دنیا سوئی پڑی ہے
اک سناٹا ہے سڑکوں پر — باغ میں کوئل بول رہی ہے
چلتی ہیں چپ چاپ ہوائیں — دھیما ندی کا پانی ہے
آنکھیں جھپکی ہیں تاروں کی — چاند سے چاندی برس رہی ہے
اُجلا، نکھرا، پیارا پیارا
سب سے اچھا چاند ہمارا

۲

کرنیں پھیلیں ہلکی ہلکی — بڑھی روشنی دھیمی دھیمی
نکلی سندرتا کی دیوی — روپ سنہری جوت روپہلی
جمنا کے مدھم دھارے پر — جیسے کوئی سنہری تھالی
چاروں سمت اُجالا پھیلا — مُنہ سے بول اٹھی ہر نگری
سُندر صورت شیام دُلارا
سب سے اچھا چاند ہمارا

۳

دنیا بھر سُنسانی ہوئی سی — تاروں کو نیند آئی ہوئی سی
لالٹین کی لو بے رونق — آگ پہ زردی چھائی ہوئی سی
کھیتوں میں پگڈنڈی چمکی — لہرائی، بل کھائی ہوئی سی
اندھیاری پیڑوں کے نیچے — بیٹھی ہے شرمائی ہوئی سی
تاروں کی آنکھوں کا تارا
سب سے اچھا چاند ہمارا

۴

جھوم رہی ہے کیا متوالی — پتّی پتّی، ڈالی ڈالی
سپنے میں یوں دیکھ رہا ہے — اپنی پھلواری کو، مالی
کھیت میں پانی پہنچ رہا ہے — چُپکے چُپکے، نالی نالی
چاند نے بہکایا کرنوں کو — پھر مالی کی ہنسی اُڑا لی
آنکھ کھلی ہر پھول پکارا
سب سے اچھا چاند ہمارا

طالب باغپتی

پشیمان جفا

ایک بیحد دلچسپ اور نصیحت آمیز ڈراما

از جناب غلام شبّر صاحب بی۔ ایس سی غازیپوری

افراد۔

شاکر:۔ ایک رئیس بعد میں ڈاکٹر افضل،
منیر:۔ شاکر کا دوست۔
ظہیر:۔ مطلبی یار۔
طاہر:۔ شاکر کا نوکر۔
فاطمہ:۔ شاکر کی بیوی۔
زرینہ:۔ شاکر کی بیٹی۔ بعد میں کنیز فاطمہ۔
ظفر:۔ منیر کا لڑکا۔
خالد:۔ زمیندار

۔۔۔۔ ۱ ۔۔۔۔

(شاکر شراب پینا چاہتا ہے۔ اس کی بیوی آکر ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

فاطمہ۔ میرے سرتاج یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

شاکر۔ دنیا اور اس کی تمام کلفتوں کو بھول جانے کی ترکیب۔

فاطمہ۔ آپ تو مسلمان ہیں۔

شاکر۔ کیا اس میں بھی شک ہے؟

فاطمہ۔ عیسائیوں سے آپ ملتے ہیں گرجا میں آپ جاتے ہیں۔ سینما آپ دیکھتے ہیں۔ فوٹو آپ کھینچتے ہیں۔ تصویریں آپ اکٹھا کرتے ہیں اور اس پر بھی دعویٰ ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔

شاکر۔ ان باتوں سے ایمان میں خلل ہی کیا پڑتا ہے؟

فاطمہ۔ خلل! اس کو تو وہی سمجھا سکتا ہے جو عالم ہو یا وہ سمجھ سکتا ہے جو عقل رکھتا ہو۔ میں ایک عورت ہوں اس لئے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ بُرے کام ہیں اور ان کا کرنا گناہ ہے۔

شاکر۔ بُرے کام ہیں اور ان کا کرنا گناہ ہے۔ کیوں؟

فاطمہ۔ ہاں! اور یہ سب ناجائز بھی ہیں۔

شاکر۔ جائز اور ناجائز بنا لینا تو تمہارے عالموں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے برائی اور بھلائی تو اب صرف اعتباری چیزیں رہ گئی ہیں۔ تمہارے عالم جسے چاہیں بُرا بنا دیں اور جسے چاہیں بھلا کر دکھائیں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ برائی کس کو کہتے ہیں؟

فاطمہ۔ ہر وہ کام جو لوگوں سے چھپا کر کیا جائے بُرا ہے۔

شاکر۔ لیکن جھوٹ جو دن دہاڑے بولا جا سکتا ہے۔

فاطمہ۔ وہ تو برائیوں کی جڑ ہے۔

شاکر۔ تو جاؤ پہلے ساری قوم کو جھوٹ بولنے سے روکو۔ پھر مجھے نصیحت کرنا سینما دیکھنا گناہ ہے۔ فوٹو کھینچنا یا رکھنا بھی گناہ ہے۔ مگر جھوٹ، غیبت بہتان جنھوں نے آج نہ معلوم کتنے گھروں میں آگ لگا دی۔ کتنوں کو مفلس و نادار بنا دیا۔ کتنی عورتوں کو گمراہ کر دیا۔ کتنے بچوں کی مٹی پلید کر دی مگر کوئی ان سے نہیں روکتا۔ کوئی قوم کے افراد کو ان سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ تمہارے وکیل صاحبان ہمیشہ بھائی کو بھائی سے لڑانے کی فکر میں رہا کرتے ہیں۔ جھوٹے مسودے گڑھا کرتے ہیں۔ کچہریوں میں جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ جھوٹے بیان

حلق دیئے جاتے ہیں۔ کیوں؟ صرف ایک دو وقت کی پوری مٹھائی کی لالچ میں اور سفرخرچ وصول کرنے کی نیت سے۔ آئے تیسرے درجہ میں۔ کرایہ وصول کیا ڈیوڑھے کا۔ چلے پیدل۔ کرایہ لیا تانگے کا۔ کیا یہ سب گناہ نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

فاطمہ۔ مجھے دنیا سے کیا سروکار، مجھے تو آپ کی زندگی بہتر بنانی مقصود ہے۔

شاکر۔ چپ رہو۔ جب تمام عالم برائی میں مبتلا ہے تو ایک میرے اچھا ہو جانے سے کیا ہوگا؟ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں آدھا پاگل اور آدھا شرابی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن شاید تم کو نہیں معلوم کہ میں تم لوگوں کی مکاریوں کو خوب جانتا ہوں اور تم لوگوں کی باتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ جو گناہ نہیں اُسے تم گناہ بتاتے ہو۔ اس لئے کہ تم کو اس سے کچھ فائدہ نہیں میں نے کتنوں کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ "دروغ مصلحت آمیز بہ زراستی فتنہ انگیز"۔ کیسے اچھے منصف اور کیسا عجیب فیصلہ۔ خدا تو جھوٹ کو برا بتلائے اور تم اسے اچھا بتلاتے ہو۔ سود جس کو خدا نے حرام بتایا ہے تم جائز رکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اصل میں کمی ہو جائے تو ہو جائے مگر سود میں ایک حبہ کم نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے تمھارے اچھے اور بُرے بتلانے والوں کا حال۔ (پھر شراب پینا چاہتا ہے)

فاطمہ۔ میں آپ کو کبھی اسے پینے نہ دونگی۔ جس گھر میں رحمت کے فرشتے آتے ہوں اس میں اس ناپاک چیز کا استعمال نہیں ہو سکتا۔

شاکر۔ اگر اپنی بہتری چاہتی ہو تو یہاں سے چلی جاؤ۔

فاطمہ۔ میں نے اب تک سب کچھ برداشت کیا مگر مجھ سے آپکی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

شاکر۔ اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتی ہو تو اپنی آنکھیں پھوڑ لو۔

فاطمہ۔ آنکھیں پھوڑ لوں؟

شاکر۔ ہاں ——،

فاطمہ۔ یہ وہی آنکھیں ہیں جن کو دیکھنے کیلئے آپ بیقرار رہا کرتے تھے جنہیں آپ بوسہ دیا کرتے تھے مگر آج ان کے لئے یہ حکم.....،

شاکر۔ اب یہ اسی قابل ہیں۔

فاطمہ۔ اور ہونا بھی چاہئیے ان آنکھوں نے کبھی کسی کی بُرائی پر نظر نہ ڈالی تھی کبھی کسی کو گناہ کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس لئے یہ قابل قدر تھیں۔ مگر آج جو منظر یہ دیکھ رہی ہیں اس کے دیکھنے کے بعد ان کو بند ہی ہو جانا چاہئیے۔

شاکر۔ اچھا تو تم اب یہاں سے چلی جاؤ۔

فاطمہ۔ میں نہیں جاؤنگی۔ آج مجھے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا ہے۔

شاکر۔ تم نے ہمیشہ مجھے میرے ارادوں سے روکا۔ ہمیشہ میرے راستہ میں ایک دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔

فاطمہ۔ اور آج میں ایک آہنی دیوار بن کر آپ کو شراب پینے سے بھی روکونگی اب تک آپ جو کچھ کرتے رہے اتنا بُرا نہ تھا مگر آج آپ حد سے گزرے جا رہے ہیں اور حد سے گزرنا اچھا نہیں۔

شاکر۔ فاطمہ تم میری بیوی ہو، اور بیوی کا درجہ ......

فاطمہ۔ کیوں کیا ہوا رک کیوں گئے؟ جملہ تو پورا کیا ہوتا؟

شاکر۔ لونڈی کے برابر ہوتا ہے۔

فاطمہ۔ تو میں اپنے کو مالک کب بتاتی ہوں۔ آپ میرے آقا۔

شاکر۔ پھر تم کو مجھ پر حکم چلانے کا کوئی اختیار نہیں۔

فاطمہ۔ میں آپ پر...... نہیں اس کا نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ آپ میرے آقا! میں آپ کی لونڈی۔ مگر کیا اپنے آقا کو اس راہ سے روکنا جو خطرہ سے خالی نہیں ایک لونڈی کا فرض نہیں ہے۔ ہے اور ضرور ہے اور آج میں نے اس فرض کو انجام دینے پر کمر باندھی ہے۔

شاکر۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں،

فاطمہ۔ نہ سہی!

شاکر۔ ہر کام کرنے سے پہلے انسان اس کا انجام سوچ لیتا ہے۔

فاطمہ۔ میں اپنا انجام سوچ چکی ہوں مگر آپکو اپنے انجام کی پرواہ تک نہیں۔

شاکر۔ اچھا دیکھوں تم کیسے روکتی ہو۔

(شاکر شراب پینا چاہتا ہے۔ فاطمہ روکتی ہے۔ وہ اسے زمین پر گرا دیتا ہے)

شاکر۔ دیکھا ضد کا نتیجہ۔ اب انجام بھی دیکھو۔ مُنیر۔ مُنیر!

مُنیر۔ (آکر) کہئے کیا ارشاد ہے؟

شاکر۔ اسے لیجاؤ اور لیجا کر کہیں شہر کے باہر کسی غار میں پھینکدو۔

(مُنیر چپ کھڑا رہتا ہے)

شاکر۔ کیوں خاموش کیوں ہو۔ کیا سوچ رہے ہو۔

مُنیر۔ خدا نے یہ ہاتھ مردوں سے لڑنے کو دیئے ہیں عورتوں پر ظلم ڈھانے کو نہیں

شاکر۔ بنعل کہیں کا ہٹ جا میرے سامنے سے میں اسے خود لیجاتا ہوں۔

—— ۲ ——

(فاطمہ چلی جا رہی ہے۔ اتنے میں طاہر آتا ہے۔)

طاہر۔ بانو، بانو،

فاطمہ۔ کون طاہر۔ تم کیسے؟

طاہر۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟

فاطمہ۔ جہاں قسمت لے جا رہی ہے۔

طاہر۔ آخر کچھ ارادہ؟

فاطمہ۔ سوچتی ہوں کہ دریا کی طرف چلی جاؤں اور .....

طاہر۔ مسلمان ہو کر ایسا ارادہ کیوں؟

فاطمہ۔ تم یہ کیا کہہ رہے ہو طاہر! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں خودکشی کرونگی نہیں میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ میرا ایمان اتنا کمزور نہیں کہ ایک ہی جھٹکے میں پاش پاش ہو جائے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ خودکشی گناہ ہی نہیں بلکہ بزدلی ہے۔

طاہر۔ تو پھر آپ مجھے بھی ساتھ لے چلئے۔

فاطمہ۔ آخر تم میرے ساتھ کیوں چلنا چاہتے ہو؟

طاہر۔ بانو! کہیں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انسان سے۔

فاطمہ۔ تم بھول رہے ہو طاہر ؎

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

طاہر۔ آپ درست فرماتی ہیں لیکن .....

فاطمہ۔ تم ایک وفادار ملازم ہو؟

طاہر۔ ہاں ــــ!

فاطمہ۔ تم کو اپنے آقا سے محبت ہے؟

طاہر۔ ضرور!

فاطمہ۔ تم ان کے بہی خواہ ہو؟

طاہر۔ بیشک ــــ!

فاطمہ۔ تو لوٹ جاؤ اور جا کر ان کی خبر لو۔ کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ تمہاری ہمدردی کے مستحق ہیں

طاہر۔ ان کی حالت پر تو جتنا آنسو بہایا جائے وہ کم ہے۔ کیسا آدمی تھا اور ان کی آن میں کیسا بن گیا۔

فاطمہ۔ آنسو بہانے سے تو کام نہیں چلے گا ہمارا فرض تو ان کو راہ راست پر لانا ہے۔

طاہر۔ یہی فکر تو مجھے بھی دامنگیر ہے مگر یہ کوئی آسان کام تو ہے نہیں کہ فوراً ہی ہو جائے۔ پڑھا لکھا جن ہے۔ جلد نہ اترے گا۔ لیکن کوشش ہمارا فرض ہے۔

فاطمہ۔ تو پھر میرے ساتھ چل کر تم ان کے لئے کیا کر سکتے ہو؟

طاہر۔ بہت کچھ۔

فاطمہ۔ وہ کیسے؟

طاہر۔ آپ میرے آقا کی امانت ہیں اس لئے آپ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔ دنیا میں طرح طرح کے لوگ ہیں اس لئے آپ کا تنہا پھرنا مناسب نہیں۔ آپ میرے یہاں چلئے اور ....

فاطمہ۔ اگر اس کی خبر تمہارے آقا کو ہو گئی تو .....

طاہر۔ تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرینگے کہ مجھے بھی نکال دینگے۔

فاطمہ۔ اس وقت پھر تم کیا کرو گے؟

طاہر۔ میں محنت و مزدوری کر کے جو کچھ بھی حاصل کرونگا اسے لا کر آپ کی خدمت میں پیش کرونگا۔ جہاں تک ہو سکے گا آپکو کسی قسم کی تکلیف اٹھانے نہ دونگا۔ ایک نوکر کے لئے اس کا آقا باپ کے برابر ہوتا ہے اور آقا کی بیوی ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اگر آپ سمجھیں تو میں بھی آپ کی اولاد سے کم نہیں۔

فاطمہ۔ اولاد کا نام لے کر تم نے میرے دل میں ایک اور آگ بھڑکا دی اولاد کی محبت ماں کے دل سے پوچھو۔ اولاد کی جدائی کا صدمہ ..... یہی وہ چیز ہے جس سے عورت مجبور رہتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ میری بچی اس وقت کہاں ہوگی اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ بس اللہ ہی جانتا ہے۔ طاہر، طاہر کیا میں پھر جاؤں اور اس سنگدل سے اپنی اولاد بھیک مانگوں ــ؟

طاہر۔ صبر، بانو، صبر سے کام لیجئے۔ اس وقت آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں، اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ زرینہ کی خبر لیگا۔ اور اگر خدا نے چاہا تو میں بہت جلد اسے آپ کے پاس لاؤنگا۔

فاطمہ۔ کیا تم میری بچی سے مجھے ملا دو گے؟

طاہر۔ اگر خدا کا فضل شامل حال رہا۔ مگر اس وقت یہاں سے چلئے اور جلد چلئے۔

فاطمہ۔ چلو ظاہر! خدا جس حال میں رکھے اس کا شکر ہے۔

—— ۳ ——

(فاطمہ کے کمرے میں)

منیر۔ (دل میں) جب زرینہ اسکول سے واپس آئیگی تو میں اسے کیا جواب دونگا جب وہ اپنی امی کو یاد کرکے روئیگی تو میں فاطمہ کو کہاں سے لاؤنگا اگر سچ بتا دیتا ہوں تو اس کا ننھا سا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اگر جھوٹ بولتا ہوں تو ایمان جاتا ہے۔ کیا کروں میرے اللہ! اب میں کیا کروں۔ چھ سال کی بچی اور ماں کی جدائی۔

زرینہ۔ امی، امی، میں پڑھ کر آگئی۔

(یہ کہتے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ مگر فاطمہ کو نہ پاکر اداس ہو جاتی ہے)

منیر۔ آ ۔ زرینہ۔ او بیٹا،

زرینہ۔ میرے اچھے چچا، امی کہاں ہیں؟

منیر۔ (وہی سوال جس کا مجھے اندیشہ تھا) (زور سے) کہیں باہر گئی ہیں۔

زرینہ۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کب تک آئینگی؟

منیر۔ اس کے بارے میں تو انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔

زرینہ۔ (رونے کے لہجہ میں) ان کو بھی آج ہی باہر جانا تھا۔

منیر۔ کتاب رکھدو۔ منہ دھوؤ، کچھ ناشتہ کرو۔

(کتاب رکھدیتی ہے۔ منہ دھوکر کچھ کھانے بیٹھ جاتی ہے مگر آنسو نکل پڑتے ہیں)

منیر۔ کیوں کیا بات ہے؟ روتی کیوں ہو؟

زرینہ۔ آج اسکول میں ......

منیر۔ (قریب آکر) اسکول میں کیا ہوا؟

زرینہ۔ نہیں، نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نہیں کہونگی۔ شاید ابا سن لیں تو اس وقت ..... (ادھر ادھر دیکھ کر) وہ امی پر خفا ہونگے۔

منیر۔ ڈرو نہیں بیٹا۔ تمھارے ابا .....

زرینہ۔ ہاں وہ کہاں ہیں۔

منیر۔ یہاں سے بہت دور۔ جہاں تمھارا خیال بھی نہیں پہونچ سکتا۔ جس کا تم کو وہم و گمان تک نہیں ہوسکتا۔

زرینہ۔ اور امی ــــ؟

منیر۔ انھوں نے مجھے یہاں تم کو تسلی دینے کے لئے مقرر کیا ہے۔ زرینہ سچ بتاؤ۔ تم کیوں رو رہی ہو؟

زرینہ۔ ابا یہاں موجود تو نہیں؟

منیر۔ نہیں بیٹا وہ یہاں نہیں ہیں۔

زرینہ۔ میری حساب کی کاپی ختم ہوگئی تھی۔ کل میں نے امی سے پیسے مانگے کہ اسے خریدلوں۔ مگر ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ابا کو تو نہ معلوم کیا ہوگیا ہے۔ وہ دن کا دن، رات کی رات نہ معلوم کہاں رہتے ہیں مجھے کبھی پوچھتے تک نہیں۔ اکثر بازار سے چاکلیٹ لایا کرتے تھے۔ وہ بھی نہیں لاتے۔ میری کاپی نہ آسکی۔ میں سوال نہ کرسکی اس لئے آج اسکول میں استانی جی نے مجھے دو تین طمانچے مارے اور درجہ سے نکال دیا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ میرا کس قدر نقصان ہوا۔

منیر۔ (زرینہ کو گود میں لیکر) استاد اور استانیاں اپنا دن کیوں بھول جاتے ہیں۔ اتنے قصائی کیوں ہو جاتے ہیں۔ انھیں اپنی قابلیت پر اتنا ناز کیوں ہو جاتا ہے۔ یہ بیچارے بچوں پر اتنی سختیاں کیوں برتتے ہیں۔ کیا سہولت سے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ کیا محبت سے پڑھایا نہیں جا سکتا۔ کیا بچوں پر ظلم ڈھانے میں ان کی شان ہے اور ادب جاننے ہی سے ان کی عزت ہوسکتی ہے۔ ارے غافلو کہیں سختی سے بھی کسی نے کسی کے دل میں جگہ پائی ہے۔ کم از کم ان معصوموں پر تو ترس کھاؤ۔

زرینہ۔ کیا اب آج اس مکان میں میرا کوئی بھی ہمدرد نہیں، امی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔

منیر۔ ابھی میں موجود ہوں، بیٹا ایک بات کہوں، مانوگی؟

زرینہ۔ کیوں نہیں؟

منیر۔ آج سے میرے گھر پر رہا کرو۔ یہاں آنے کی ضرورت نہیں جب تمھاری امی آجائینگی تو چلی آنا۔ بولو منظور ہے۔

زرینہ۔ لیکن کیا ابا اس کو برا نہ مانینگے؟

منیر۔ اگر ان کو ان سب باتوں کی پروا ہوتی تو آج یہ رونا ہی کاہے کا ہوتا۔ ان کو تو نہ معلوم کیا ہوگیا ہے۔

زرینہ۔ اچھا چلئے! میں آپ کے یہاں چلنے کے لئے تیار ہوں، لیکن ہائے ماسٹر صاحب کیسے آئینگے؟

منیر۔ میں اس کو اپنے گھر پر بلا لونگا، تم اطمینان رکھو۔

زرینہ۔ ہاں! میرے پڑھنے کا نقصان نہیں ہونا چاہئے۔

منیر۔ بالکل نہیں، اچھا آؤ اب چلیں۔

(شاکر داخل ہوتا ہے)

شاکر۔ کیوں منیر!

منیر۔ ہاں! کیا کہنا چاہتے ہو؟

شاکر۔ کیوں او دغا باز کتے اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ جب فاطمہ کو نکال دینے کو کہا تھا تو تیرے پاس ہاتھ نہیں تھے مگر آج اس لڑکی کو بھگانے کیلئے تیرے پاس سب کچھ ہے۔ فاطمہ کو کیوں لے جاتا اس سے تجھے فائدہ ہی کیا تھا۔ مگر یہ۔ اس سے تیری بہت امیدیں وابستہ ہیں یہ بڑی ہو کر تیری کمائی کا ذریعہ بنے گی۔ کیوں؟

منیر۔ شاکر تم ہوش میں ہو یا نہیں؟

شاکر۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔

منیر۔ لیکن ایک شریف کے بارے میں ایسا جملہ استعمال کرنا اور خود اپنی ہی اولاد کے لئے اتنا برا مستقبل سوچنا اس بات کی دلیل ہے کہ تم ہوش میں نہیں ہو۔

شاکر۔ لیکن حقیقت کا اظہار کر دینا اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ میں تم جیسے کمینوں کی حرکتوں کو سمجھنے کے قابل ہوں اور......

منیر۔ شاکر اپنی زبان بند کرو ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں۔ فاطمہ کو تم نے گھر سے نکال دیا اور میں کھڑا دیکھتا رہا۔ مگر اب تم نے ذرا بھی دست درازی کی تو اچھا نہ ہوگا۔

شاکر۔ (کوٹ اتار کر) تو کیا تو مجھ سے لڑنا چاہتا ہے۔

منیر۔ میں تم جیسے آدمیوں سے بات کرنا بھی اپنی ذلت سمجھتا ہوں۔

شاکر۔ (ہنسکر) ڈر گیا۔ بزدل کہیں کا۔

منیر۔ ڈرنا اسے چاہئے جو پردوں میں چھپ کر اور رات کی تاریکی میں گناہ کرتا ہے اور بزدل ہے جو عورت پر ستم ڈہاتا ہے۔

شاکر۔ اچھا تو ظہیر!

ظہیر۔ جناب عالی!

شاکر۔ ہمارے ان رستم زماں سے اس لڑکی کو چھین لو اور ان کو بتا دو کہ ان کا غرور بیجا ہے۔

منیر۔ غرور تم جیسے کج فہم اور کج رفتار کیا کرتے ہیں میں اس سے کوسوں دور ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کبریائی صرف خدا کی شان ہے۔

شاکر۔ ظہیر، کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ لڑکی چھین کیوں نہیں لیتے۔

زرینہ۔ (سہم کر) چچا خدا کے لئے مجھے ان ظالموں سے بچاؤ۔

منیر۔ ڈرو نہیں بیٹا۔ جبتک منیر کے دم میں دم ہے کوئی تمھارا ایک بال بھی بیکا نہ کر سکتا ہے (ظہیر سے) ظہیر اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو سمجھ لو کہ خیر نہیں یا تم نہیں یا میں نہیں۔

ظہیر۔ (شاکر سے) حضور جانے بھی دیجئے۔ اس لڑکی سے نجات مل جائے تو اچھا ہی ہے۔ کیونکہ ہے تو فاطمہ کی ہی لڑکی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ سانپ کا بچہ سانپ ہوتا ہے۔

شاکر۔ ہاں تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔

ظہیر۔ جی ہاں! جی ہاں! جی ہاں۔ میں تو ہمیشہ اپنی صائب رائے دینے کیلئے تیار رہا ہوں اور آئندہ بھی رہونگا۔

منیر۔ تم اور صائب رائے۔ ناممکن ہے۔ نیکی اور بدی کبھی اکٹھا نہیں رہ سکتی۔

ظہیر۔ ابے جا۔ ورنہ اگر حضور کا ذرا بھی اشارہ پاؤں تو ابھی کچا چبا جاؤں۔

منیر۔ حیرت ہے کہ شیطان بھی اکثر انسان سے ایک بڑا گناہ کرانے کے لئے اس سے تھوڑی سی نیکی بھی کرا لیتا ہے۔ آؤ زرینہ!

(لے کر چلا جاتا ہے)

ظہیر۔ آپ نے دیکھا؟

شاکر۔ کیا؟

ظہیر۔ اجی واہ آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ آپ نے غور کیا۔ میں نے ذرا سے تیور بدلے اور وہ دُم دبا کر بھاگا۔ بھلا اس کی مجال کیا کہ میرے سامنے ٹک سکے۔

شاکر۔ خیر ان باتوں کا تذکرہ پھر کرنا اس وقت یہ بتاؤ کہ روپے کا انتظام ہوا یا نہیں

ظہیر۔ اجی وہ سب کی صبح ہی ہو جائیگا لیکن آپ ذرا آرام تو کریں۔

شاکر۔ اچھا کل تک روپیہ ضرور وصول ہو جانا چاہئے۔

ظہیر۔ اجی صبح تو ہونے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کے سامنے روپیوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے یا نہیں۔ لیکن......

شاکر۔ لیکن کیا؟

ظہیر۔ وہی دستاویز والی بات۔

شاکر۔ کل دستخط کردونگا۔

ظہیر۔ ہاں۔ جہاں تک جلد ہو سکے۔ کیونکہ اگر جائداد آپکے نام رہی تو اندیشہ ہے کہ فاطمہ اپنے مہر کا دعویٰ کرکے اس پر قبضہ کرلے اور جب آپ اسے میرے نام لکھدینگے تو پھر اس کا ڈر باقی نہ رہے گا۔

شاکر۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا تو کل ہی یہ کام ہو جانا چاہیئے۔

ظہیر۔ ضرور ---- (آہستہ سے) اب پالسہ پڑا ہے۔

۴

(کسانوں کی ایک میٹنگ)

خالد۔ آپ لوگوں نے جو آج غریب خانہ پر آنے کی تکلیف گوارہ فرمائی ہے اس کا شکریہ۔ مگر آپ لوگوں کو اس بات کی تشویش ضرور ہوگی کہ آخر میں نے بلایا کیوں ہے۔ میں آپ لوگوں کو زیادہ دیر تک حیران یا پریشان کرنا نہیں چاہتا اس لیئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کو صرف اس بات کی تکلیف دی ہے کہ آپ لوگ اہم مسئلے پر غور کریں جسے میں آج ایک مدت سے حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر اب تک کامیاب نہ ہو سکا وہ یہ کہ شاکر کو ہوا کیا ہے اور وہ کیونکر پھر انسان بن سکتا ہے۔ ان کے نوکروں اور مصاحبوں کے جس قدر بھی مظالم ہم پر ہو رہے ہیں وہ تو ایک طرف مگر اس واقعہ نے تو دل پاش پاش کردیا ہے۔ اُف! ایسی نیک طینت۔ کیسی باعصمت اور باعزت عورت اور اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بانو یوں گھر سے نکال دی جائیں اور ہم کھڑے تماشہ دیکھیں۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ تم جوان ہو انسان ہو مگر کیا ڈوب مرنے کی بات نہیں کہ تمھارے ہوتے ہوئے ایک عورت سے ایسا سلوک کیا جائے اور تم خاموش بیٹھے رہو۔ وہ بھی کون عورت؟ وہ عورت جس نے تمھاری بھلائی۔ تمھاری بہبودی کیلئے کیا کچھ نہیں کیا بولو تم کس کا ساتھ دوگے۔ نیکی کا یا بدی کا بھلائی کا یا برائی کا۔ انسان کا یا شیطان کا؟

سب۔ ہم خاتون کا ساتھ دینگے۔

خالد۔ تو بس فیصلہ ہو چکا۔ آج سے تم پر چاہے کتنی ہی سختیاں کی جائیں مگر تم شاکر یا اس کے آدمیوں کو ایک حبہ بھی نہ دو بلکہ تمام رقم اپنے پاس جمع کرو سرکاری مالگذاری داخل کرنے کے بعد جس قدر بھی تم بچا سکو اُسے لیجاکر بانو کے سامنے پیش کردو۔ سمجھے؟

سب۔ جی ہاں۔

طاہر۔ (بھیس بدلے ہوئے) لیکن سردار مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

خالد۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

طاہر۔ آپ لوگوں نے جو کچھ فیصلہ کیا ہے۔ اس کی مخالفت کرنا میں نہیں چاہتا لیکن ساتھ ہی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک درست ہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ آیا اس سے شاکر راہ راست پر آجائیگا یا نہیں۔ یا غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہیگی۔ میری ناقص سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سب اس کے دوستوں کا کیا دھرا ہے؟ ان میں جو کچھ خرابیاں ہیں وہ سب ان کے دوستوں اور مکار دوستوں کے دم سے ہیں وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں ان کی رائے سے۔

خالد۔ خیر اگر یہ مان لیا جائے پھر بھی میں کیا تمام عالم یہ کہیگا کہ اس میں بھی ان کا ہی قصور ہے۔ کیا دوستی کرتے وقت ان کی آنکھیں بند تھیں کیا ان کے ہوش بجا نہ تھے کہ وہ کھوٹے اور کھرے کو پرکھتے۔ انھوں نے بروں کا ساتھ پکڑا اور اس نتیجہ کو پہونچے مگر افسوس کہ اب بھی وہ غافل ہیں دولت لٹ گئی۔ عزت جاتی رہی اقتدار کھو بیٹھے اور اس حرکت سے تو شرافت پر بھی بٹہ لگا دیا۔ باقی رہا علاقہ وہ بھی قرض خواہوں کی نظر ہوا چاہتا ہے۔

طاہر۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ (بیٹھ جاتا ہے)

خالد۔ (سب لوگوں سے) اچھا تو اب آپ لوگ جا سکتے ہیں مگر اس بات کا خیال رہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بھول نہ جائے بلکہ اس پر آج ہی سے عمل ہونا ضروری ہے۔

سب۔ بہت خوب (سب اٹھکر چلے جاتے ہیں مگر طاہر رہ جاتا ہے)

طاہر۔ (آگے بڑھکر) پیر بزرگ شاید آپنے اس غلام کو پہچانا نہیں، (فرضی لباس اتار دیتا ہے)

خالد۔ (گھبرا کر) کون طاہر؟

طاہر۔ جی ہاں۔

خالد۔ تم یہاں کیسے۔ کیا بھید لینے آئے تھے؟

طاہر۔ نہیں بلکہ راز کو فاش کرنے۔

خالد۔ تو جلد کہو۔

طاہر۔ وہی جو پہلے کہہ چکا ہوں۔

خالد۔ یعنی؟

طاہر۔ یعنی یہ کہ شاکر کو راہ راست پر لانا ہی بانو کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی ہوگی۔ انھیں روپیوں کی ضرورت نہیں۔

خالد۔ ہماری بھی تو دلی خواہش یہی ہے۔

طاہر۔ تو پھر اسے عمل میں کیوں نہیں لاتے؟ میں نے اپنی تمام زندگی آقا کے ساتھ بسر کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ کیا ہیں مگر ان خوشامدی لوگوں نے ان کو کیسا بنا رکھا ہے۔ میں تو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ آقا اور میں خادم۔ آپ لوگ چاہیں تو کامیاب ہو سکتے ہیں۔

خالد۔ وہ کیسے؟

طاہر۔ کسی طرح ان دوست نما دشمنوں سے ان کا پیچھا چھڑائیے۔

خالد۔ اچھا اب اسی کی کوشش کی جائیگی لیکن یہ تو بتاؤ بانو ہیں کہاں؟

طاہر۔ میرے یہاں۔

خالد۔ اور خرچ کیونکر چلتا ہے۔

طاہر۔ بانو نے اسکول میں نوکری کر لی ہے۔ سردست اُردو فارسی کی تعلیم دے رہی ہیں مگر ارادہ ہے کہ دو ایک انگریزی کی ڈگریاں بھی حاصل کرلیں اسی لئے تو انھوں نے اپنا تبادلہ بھی کرا لیا ہے اور ممکن ہے کہ ہفتہ عشرہ میں یہاں سے چلی جائیں۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں؟

خالد۔ اگر تمھاری رائے ہو۔

طاہر۔ اس کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

خالد۔ (تھوڑی دیر سوچکر) میں تو ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

طاہر۔ تو آپ مکان پر تشریف لے چلیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

۵

(شاکر سگریٹ پی رہا ہے اور ایک کتاب دیکھ رہا ہے طاہر کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

شاکر۔ کون ـــ؟

طاہر۔ میں ہوں۔

شاکر۔ کیسے آئے؟

طاہر۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

شاکر۔ میں تمھاری ایک بات بھی سننا نہیں چاہتا۔

طاہر۔ آخر وجہ؟

شاکر۔ یہی کہ تم نمک حرام ہو۔

طاہر۔ میری کس حرکت کی بنا پر یہ خطاب عطا کیا گیا ہے۔

شاکر۔ مجھ سے پوچھتے ہو؟

طاہر۔ تو اور کس سے پوچھوں۔ نمک حرام تو آپ نے بنایا ہے۔

شاکر۔ (غصہ میں) جب تم کو معلوم تھا کہ میں نے خود فاطمہ کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے تو پھر تم نے اسے اپنے یہاں جگہ کیوں دی؟

طاہر۔ انسانیت کا تقاضا۔

شاکر۔ کہاں کے آپ اور کہاں کی آپ کی انسانیت۔ طاہر تم کو معلوم ہے کہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟

طاہر۔ اپنے اس آقا سے جو نیکی کا راستہ چھوڑ کر بدی کی راہوں میں بھٹکا پھر رہا ہے

شاکر۔ میرے اچھے واعظ، میں آپ سے پند یا نصیحت حاصل کرنا نہیں چاہتا میں تو اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔

طاہر۔ تو میں بھی آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ بانو کو تلاش کر کے میں خود ہی اپنے یہاں لے گیا اور لے کیوں نہ جاتا وہ میری ......

شاکر۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کی ......

طاہر۔ وہ میری ماں کے برابر ہیں۔

شاکر۔ اور میں کہ جس نے تجھے مثل اپنی اولاد کے پالا اب تیرا کوئی نہیں کیوں؟

طاہر۔ آپ بھی میرے لئے بہت کچھ ہیں۔

شاکر۔ تو پھر تم نے میری مرضی کے خلاف اس کو کیوں جگہ دی۔ کیا تم کو میرا ڈر نہ تھا

طاہر۔ آپ سے زیادہ مجھے خدا کا خوف ہے۔

شاکر۔ کیا تم میرے غیظ و غضب سے واقف نہیں۔

طاہر۔ آپ سے زیادہ میں اللہ کے غصہ سے ڈرتا ہوں۔

شاکر۔ چپ رہ گستاخ، زبان لڑاتا چلا جاتا ہے۔

طاہر۔ حق بات کہنے میں میں کبھی خاموش نہیں رہ سکتا۔ چاہے آپ میری زبان ہی کیوں نہ کھینچ لیں۔

شاکر۔ گھبراؤ نہیں۔ وہ دن عنقریب آنے والا ہے کہ تم دربدر بھیک مانگو گے تمہیں پیڑ کا سایہ تک نصیب نہ ہوگا۔ اس وقت مجھے یاد کرنا۔ آج سے مجھے آپ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی یہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے تشریف لے جایئے۔

طاہر۔ جیسی آپ کی مرضی (چلا جاتا ہے)

شاکر۔ میری عقل نہیں کام کرتی کہ آخر ان سبھوں کو ہوا کیا ہے۔ سنا گیا ہے کہ فاطمہ نے اسکول میں ملازمت کر لی ہے۔ زرینہ منیر کے پاس ہے اور سب کے سب مجھ ہی کو گمراہ بتاتے ہیں۔ سب نے سازش کر لی ہے ضرور سب کے سب ملے ہوئے ہیں۔ اچھا میں بھی ان لوگوں کو وہ مزا چکھاتا ہوں کہ یہ بھی یاد کرینگے......

ظہیر۔ (گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے) آقا غضب ہو گیا۔

شاکر۔ کیا ہوا ظہیر!

ظہیر۔ قرض خواہوں نے قرقی کا وارنٹ جاری کرا دیا ہے۔ علاقہ پر قبضہ ہو چکا ہے اور امین صاحب کوٹھی نیلام کرنے آئے ہیں۔

شاکر۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ تم نے اپنے ہی دوست کے ساتھ ایسی دغا کی (یہ کہہ کر ایک چور دروازے سے نکل کر بھاگ جاتا ہے)

۶

(فاطمہ بیٹھی کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہی ہے خالد داخل ہوتا ہے)

خالد۔ بانو ــــ؟

فاطمہ۔ کون ــــ خالد؟

خالد۔ جی ہاں۔

فاطمہ۔ آؤ بیٹھو۔ کیسے آئے ہو۔ خیریت تو ہے۔ آخر تم خاموش کیوں ہو؟

خالد۔ اب مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔

فاطمہ۔ تو پھر آنے کی وجہ؟

خالد۔ اسے بتانا اب مناسب نہیں ہے۔ آپ کو دیکھکر میری دنیا بدل گئی ہے میرے خیالات تبدیل ہو گئے بلکہ میں خود بدل گیا اتنی مصیبت اٹھانے کے بعد بھی آپ اتنا خوش و خرم ہیں گویا آپ کو تکلیف ہی نہیں۔

فاطمہ۔ (مسکرا کر) واقعی مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔ خدا جس حال میں بھی رکھے خوش ہوں۔ اگر کچھ فکر ہے تو شاکر کی لیکن اس پر رنج نہیں کرتی بلکہ انہیں سنوارنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر افسوس کہ اب تک کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ یہ بھی میرا ایک امتحان ہے اور انشاءاللہ تعالےٰ میں ایک دن ضرور کامیاب ہونگی۔

خالد۔ آمین۔

فاطمہ۔ بیٹھو، کھڑے کیوں ہو؟ (خالد بیٹھ جاتا ہے)

فاطمہ۔ تم نے طاہر کو دیکھا ہے؟

خالد۔ جی ہاں! وہ ابھی ابھی زرینہ کی تلاش میں کہیں جا رہے تھے۔

فاطمہ۔ آج تین ماہ کا زمانہ گذر گیا مگر میری بچی کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ طاہر روز جاتا ہے مگر شام کو ناکام لوٹتا ہے۔ معلوم نہیں ان ظالموں نے اسے کیا کیا۔ جی میں آتا ہے کہ ایک بار خود جاؤں لیکن طاہر نہ جانے کیوں روکتا ہے۔ میں پھر بھی عورت ہوں۔ بچی کی مفارقت مجھے اب شاید جینے نہ دیگی اور........

خالد۔ (بات کاٹکر) بانو آج ہم لوگوں نے ایک جلسہ کیا تھا اس میں یہ طے پایا ہے کہ ہم لوگ سرکاری مالگذاری ادا کرنے کے بعد جو کچھ رقم بچا سکیں وہ آپ کے حوالے کر دیں۔

فاطمہ۔ اول تو مجھے روپیوں کی ضرورت نہیں دوسرے جس چیز پر میرا حق ہی نہیں اُسے لینا میں گناہ سمجھتی ہوں۔ وہ شاکر کی امانت ہے تم لوگ اس میں خیانت نہ کرو جس کی چیز ہے اسی کے سپرد کر دو۔

خالد۔ لیکن وہ تو اس سے بیجا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بچہ کو ماں کو پیارا ہوتا ہے مگر ماں اسے کھلا ہوا چاقو کبھی نہیں دیگی چاہے وہ کتنا ہی روئے پیٹے۔

فاطمہ۔ لیکن سمجھ میں آجانے کے بعد وہی ماں اپنے بچے کے ہاتھ میں شمشیر دیدیتی ہے

خالد۔ اس کا مطلب میں نہیں سمجھا۔

فاطمہ۔ یہی کہ اگر تم کو ان سے محبت ہے اور ان کی بگڑتی ہوئی حالت تم سے دیکھی نہیں جاتی تو انہیں سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کرو اور انہیں بتادو کہ یہ آگ ہے اور یہ پانی۔ یہ سانپ ہے یہ عصا۔

(طاہر داخل ہوتا ہے)

خالد۔ بہت خوب۔

فاطمہ۔ (آگے بڑھکر) کہو کوئی نئی خبر؟

طاہر۔ آقا نے آج مجھے بھی نکال باہر کیا۔ اس کی تو مجھے اتنی فکر نہیں لیکن

اگر خیال ہے تو ان کا۔ اب تو سب کے سب مل کر ان کی تمام دولت آن کی آن میں اڑا دینگے اور عجب نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو چکے ہوں

خالد۔ تمھیں یہ کیسے معلوم ؟

طاہر۔ سنا جاتا ہے کہ آقا کو شراب پلا کر ظہیر نے ان کی تمام جائداد اپنے نام لکھوالی ہے۔ علاقہ قرض خواہوں کے قبضہ میں آچکا ہے اور کوٹھی نیلام ہونے والی ہے اب شاید ہمارا اس گھر میں رہنا بھی دشوار ہو جائے۔

فاطمہ۔ تو کیا دنیا میں کہیں اور جگہ نہیں ؟

طاہر۔ مجھے کیا میں تو پیڑ کے نیچے بھی بسر کر سکتا ہوں مگر آپ ....

اس وقت تو مجھے اپنے سے زیادہ شاکر کی فکر ہے چلو طاہر انھیں ڈھونڈ لائیں

(سب جاتے ہیں)

(زرینہ منیر کے گھر میں پرورش پا رہی ہے مگر اب اس کا نام کنیز فاطمہ ہے۔ ظفر کتاب پڑھ رہا ہے۔ کنیز فاطمہ آکر اس کی آنکھیں بند کر لیتی ہے)

ظفر۔ (حیرت سے) کون ہے ؟

کنیز۔ (آواز بدل کر) پہچان لو۔

ظفر۔ (مسکرا کر) میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں !

کنیز۔ مگر عقل تو رکھتے ہو۔

ظفر۔ تو بس سمجھ لو کہ میں نے تم کو پہچان لیا۔

کنیز۔ تو پھر بتلاتے کیوں نہیں ؟

ظفر۔ تو کیا تم جاننا چاہتی ہو؟

کنیز۔ ہاں۔ ہاں !

ظفر۔ ایک چھوٹی سی لڑکی ہے جو ابھی حال ہی میں نہ معلوم کہاں سے اس گھر میں آدھمکی ہے اکثر اوقات مجھے یونہی تنگ کیا کرتی ہے۔ میرے پڑھنے میں مخل ہوتی ہے اور .... وغیرہ .... وغیرہ .... وغیرہ ....

کنیز۔ (ہنس کر) بس بس اتنی تعریف کافی ہے (قریب بیٹھ کر) ظفر تم کو معلوم ہے کہ میں اب دس سال کی ہو چکی ہوں اور اس گھر میں مجھے رہتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں پھر تم نے مجھے چھوٹی سی لڑکی کیوں کہا۔

ظفر۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ اب آپ بڑی ہو چکی ہیں (دور ہٹ کر) میری محترم بانو فرمائیے کیا حکم ہے؟

کنیز۔ (تیور بدل کر) مودب ہو جاؤ۔ اچھا اب بیٹھ سکتے ہو۔

(ظفر بیٹھ جاتا ہے۔ کنیز اس کے پاس آتی ہے)

کنیز۔ خادمہ حاضر ہے۔ فرمائیے کیا خدمت کروں ؟

ظفر۔ آپ اور میری خدمت !

کنیز۔ ہاں ہاں، اب میری باری ہے۔

ظفر۔ تو ایک بار میری آنکھیں پھر بند کر دو۔ یقین جانو جب اپنی نازک انگلیوں سے تم میری آنکھیں بند کر لیتی ہو تو یہی جی چاہتا ہے کہ پھر یہ ہاتھ کبھی نہ ہٹے اور یہ آنکھیں اس دنیا کی عیاریاں اور مکاریاں دیکھنے کیلئے کبھی نہ کھلیں۔

کنیز۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو ؟

ظفر۔ اگر میرا یہ کہنا .... (آنسو نکل آتے ہیں۔

کنیز۔ تم رو رہے ہو ؟ کیا بات ہے ؟ کیا چچا نے کچھ کہا ہے۔ مجھ سے خفا ہو ظفر تمھیں میری قسم سچ بتاؤ۔

ظفر۔ کنیز یہ بتاؤ کہ اگر تم مجھ سے الگ کر دی گئیں تو تم مجھے اسی طرح یاد کرو گی یا بھول جاؤ گی ؟

کنیز۔ تمھارا مطلب ؟

ظفر۔ مجھے اس کے جواب کی ضرورت ہے ؟

کنیز۔ میں اور تم کو بھول جاؤں بھلا یہ ممکن ہے؟

ظفر۔ تمھیں شاید خبر نہیں کہ زمانے کے ساتھ دنیا کی ہر چیز بدل جاتی ہے جو بات پہلے تھی وہ اب نہیں اور جو آج ہے وہ کل نہ ہوگی۔

کنیز۔ میں تمھارا مطلب نہ سمجھ سکی۔

ظفر۔ اور نہ سمجھنا ہی بہتر ہے۔

کنیز۔ کیوں — ؟

ظفر۔ اس لئے کہ اب تم اس گھر میں چند گھنٹوں کی اور مہمان ہو۔ والد صاحب اب تمھیں بورڈنگ میں روانہ کر رہے ہیں۔ کل وہ کہہ رہے تھے کہ اب ہم بڑے ہو چکے۔ ہمارا ایک ساتھ رہنا مناسب نہیں۔ دنیا کی شرم، دنیا والوں کا خیال۔ زمانہ کی روش اور زمانہ کی رفتار کا تقاضا ہے کہ وہ اب تم کو وہیں روانہ کر دیں۔ مگر اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں ....

کنیز۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو کیا چچا آج ہی مجھے روانہ کر دینگے ؟

ظفر۔ ہاں، دس بجتے بجتے تم بورڈنگ پہونچ جاؤگی۔
کنیز۔ اور اس کے بعد.....
ظفر۔ میں تم سے کبھی نہ مل سکونگا۔
کنیز۔ کیا اتوار کو بھی نہ آؤگے؟
ظفر۔ نہیں!
کنیز۔ تم خود نہیں آنا چاہتے یا آنے کی اجازت نہیں؟
ظفر۔ اس کا جواب میں ٹھیک ٹھیک نہیں دے سکتا۔
کنیز۔ میری خاطر سے بھی نہیں۔
ظفر۔ نہیں۔کنیز...نہیں۔تمھیں کیا معلوم کہ آج میرے دل میں کیا ہورہا ہے اور شاید میں خود بھی اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں اور یہ صرف عمر کا تقاضا ہے تم جارہی ہو جاؤ۔مگر آج تک میں نے جو تکلیفیں دی ہیں انھیں معاف کرتی جاؤ اور یہ وعدہ کرو کہ کبھی کبھی مجھے یاد کروگی۔میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔
کنیز۔ میں اپنے محسن کو بھول جاؤں یہ کیسے ممکن ہے۔تم نے مجھے اپنے گھر بلکہ اپنے دل میں جگہ دی۔مجھے ہر طرح کا آرام پہونچایا۔کبھی کسی قسم کی ایذا نہ پہونچائی۔نہ بات سے نہ اپنی کسی حرکت سے۔تم ہمیشہ مجھے عزیز رہے، اور تمام عمر عزیز رہوگے لیکن یہ بتاؤ کہ......
منیر۔ (باہر سے) ظفر، ظفر،
ظفر۔ (گھبرا کر) والد آگئے۔
(کنیز کتاب دیکھنے لگتی ہے اتنے میں منیر داخل ہوتا ہے)
منیر۔ فاطمہ! بس کرو بیٹا تم چار بجے رات سے پڑھ رہی ہو اس کے علاوہ ابھی سب سامان درست کرنا ہے۔میرا خیال ہے کہ اب تم بورڈنگ ہی میں رہو آج کل جو استانی وہاں رہتی ہیں ان کی بہت تعریف سننے میں آئی ہے اور وہ ہر لڑکی کے ساتھ مادرانہ شفقت اور محبت سے پیش آتی ہیں میرا جی چاہتا تھا کہ میں خود ان سے مل کر تمھارے لئے کہدیتا۔مگر اب تم خود سمجھدار ہوگئی ہو ان سے کہہ سن لینا۔
کنیز۔ مگر چچا۔ظفر کو مجھ سے ملنے کیلئے کبھی کبھی بھیجدیا کرنا۔
منیر۔ ہاں ہاں پہلے جاؤ گے کیا ہرج ہے میں خود تمھاری خبر لایا کرونگا۔تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمھیں علٰحدہ کررہا ہوں۔میری غرض صرف تمھاری تعلیم سے ہے۔میں چاہتا ہوں کہ تمھارا وقت بیکار کھیل کود میں صرف نہ ہو اور تم جلد بی۔اے پاس ہوجاؤ۔اچھا اب جلدی کرو۔ظفر تم سب سامان تیار کرو۔میں نوکر سے گاڑی لانے کو کہتا ہوں۔ (چلا جاتا ہے)
(کنیز اور ظفر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

— ۸ —

(نو سال کے بعد زرینہ جس کا نام کنیز فاطمہ ہے۔آج بی۔اے کی طالب علم ہے۔شاکر جسے لوگ ڈاکٹر افضل کے نام سے پکارتے ہیں شہر کا مشہور ڈاکٹر ہے جس کی غریبوں پر خاص نظر عنایت ہے فاطمہ اسی بورڈنگ کی نگراں ہے جس میں کنیز کا قیام ہے۔
کنیز کچھ لکھ رہی ہے۔فاطمہ داخل ہوتی ہے۔)
کنیز۔ آیئے (کھڑی ہوکر) تشریف رکھئے۔
(فاطمہ بیٹھ جاتی ہے اور کنیز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیتی ہے)
فاطمہ۔ میرے آنے سے آپ کا نقصان تو نہیں ہوا؟
کنیز۔ بالکل نہیں۔بھلا میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ بورڈنگ کی نگراں صاحبہ میرے کمرے میں تشریف رکھیں۔
فاطمہ۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپنے بہت ہی عجیب طبیعت پائی ہے اور...
کنیز۔ اور کیا؟
فاطمہ۔ یہ تو آپ خود ہی سمجھ گئی ہونگی۔
کنیز۔ (ہنسکر) خیر لیکن آج تو آپ کچھ گھبرائی سی معلوم ہورہی ہیں معاملہ کیا ہے؟
فاطمہ۔ مجھے ایک راز دریافت کرنا ہے۔
کنیز۔ کس سے — ؟
فاطمہ۔ آپ سے — !
کنیز۔ مجھ سے — !
فاطمہ۔ جی ہاں۔آپ ہی سے سچ بتلایئے کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟
کنیز۔ فاطمہ — !
فاطمہ۔ اجی نہیں — !
کنیز۔ اچھا تو کنیز فاطمہ — !
فاطمہ۔ یہ تو آپ کا درجہ کا نام ہے۔گھر پر لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟
کنیز۔ کوئی کنیز کہتا ہے اور کوئی فاطمہ۔جس کا جو جی چاہتا ہے کہتا ہے لیکن آپ کو اس کی تشویش کیوں ہے۔اگر میرا نام آپ ہی کا نام ہے تو اس میں برائی کیا ہے اور اب تو یہ بدل بھی نہیں سکتا کیونکہ دو مرتبہ لیڈر میں

چھپ چکاہے ورنہ میں اسے ضرور تبدیل کرلیتی اس لئے کہ میں دیکھتی ہوں کہ جب سے آپ آئی ہیں برابر میرے اور میرے نام کے پیچھے پڑی ہیں

فاطمہ۔ آپ میرا مطلب نہ سمجھ سکیں مجھے کچھ شبہ ہوتاہے کہ آپ کی صورت بالکل اس لڑکی سے ملتی ہے جس کو میں نے آج سے تیرہ سال پہلے دیکھا تھا، جبکہ وہ صرف چھ سال کی تھی۔ وہ مجھے بہت عزیز تھی میری بیٹی ......

کنیز۔ ہو سکتا ہے۔ کیا دنیا میں ایک ہی شکل کے دو آدمی نہیں ہوتے۔

فاطمہ۔ اسی لئے تو میرا جی چاہتاہے کہ آپکو اسی طرح اپنی بیٹی بنا لوں۔

کنیز۔ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں آپ مجھے بیٹی بنالیں۔

فاطمہ۔ واقعی آپ بہت بذلہ سنج ہیں اسی لئے تو مجھے اور بھی اچھی لگتی ہیں۔

کنیز۔ یہ آپ کی عزت افزائی ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔

(ظفر دوڑا ہوا آتا ہے)

کنیز۔ ظفر! خیریت تو ہے۔ اس طرح گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

ظفر۔ ابھی کہتا ہوں۔ مگر اماں صاحبہ کہاں ہیں؟

فاطمہ۔ کہئے؟

ظفر۔ والد صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے، انھوں نے کنیز فاطمہ کو بلایا ہے آپ انھیں اجازت دیدیں۔

فاطمہ۔ چلئے میں خود بھی چلونگی۔

ظفر۔ تو آپ لوگ گھر چلیں۔ میں ڈاکٹر افضل کو لیکر ابھی آتا ہوں۔

کنیز۔ چلئے۔ جلد چلئے۔ میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جارہا ہے۔

فاطمہ۔ گھبراؤ نہیں۔

۹

(منیر بستر پر پڑا ہے۔ فاطمہ اور کنیز فاطمہ داخل ہوتی ہیں)

کنیز۔ (قریب آکر) چچا۔

منیر۔ (آنکھیں کھول کر) تم آگئیں۔

کنیز۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

منیر۔ طبیعت کا کیا حال پوچھتی ہو۔ یہ تو میری صورت سے ظاہر ہے۔ اب میں صرف چند لمحہ کا اور مہمان ہوں مگر مرنے سے پہلے ایک راز ہے جسے میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں میرے قریب آؤ (فاطمہ کی طرف دیکھکر) یہ کون ہیں؟

کنیز۔ یہ .... ؟

منیر۔ کون! بہن فاطمہ؟

فاطمہ۔ منیر ۔۔۔ ؟

منیر۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ آج تم بھی آگئیں جیسے مجھے تمھاری سخت ضرورت تھی۔ بہن اپنی زرینہ کو پہچانتی ہو؟

فاطمہ۔ وہ کہاں ہے؟

منیر۔ تمھارے سامنے۔

فاطمہ۔ زرینہ۔ زرینہ (سینے سے لگا لیتی ہے) میں نے جب آپ پہلی بار دیکھا۔ اسی وقت پہچان لیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

منیر۔ لیکن شاکر ۔۔۔ ؟

فاطمہ۔ ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ نہ معلوم کہاں ۔ ۔ ۔

(ظفر اور ڈاکٹر افضل داخل ہوتے ہیں)

ظفر۔ آئیے، اندر آئیے!

(ڈاکٹر افضل کبھی فاطمہ کو دیکھتے ہیں کبھی منیر کو)

ڈاکٹر۔ کون! فاطمہ! ۔ منیر، تم لوگ اور یہاں کیسے؟

فاطمہ۔ میرے مالک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منیر۔ شاکر میرے قریب آؤ (شاکر قریب آتا ہے) کیا تم ڈاکٹر افضل نہیں؟

شاکر۔ نہیں دنیا کی شرم نے مجبور کیا کہ میں اپنا نام تبدیل کر دوں اور اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی نیت سے میں نے یہ پیشہ اختیار کیا کہ مخلوق خدا کی خدمت کروں اور شاید اسی حیلہ سے تم لوگوں کا پتہ پاؤں۔ خدا نے آج اسے پورا بھی کیا تو تم اس حال میں ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اس زندگی کے راز کو بھی خوب سمجھ لیا ہے۔ یہ زندگی جسے لوگ پر اسرار زندگی کہتے ہیں صرف چار چیزوں کا مجموعہ ہے۔ امارت، غربت۔ رنج و راحت مگر محبت و غیرت وہ چیزیں ہیں جو ان سب پر حاوی ہیں۔ آپس میں اگر میل و محبت ہے تو مصیبت کی گھڑیاں بھی نہایت خوشی اور مسرت میں بسر ہو سکتی ہیں۔ اگر انسان میں غیرت ہے تو غریب ہوتے ہوئے بھی اپنی مفلسی و ناداری کا اظہار کبھی کسی کے سامنے نہ کریگا۔ بلکہ خود اپنی محنت و مشقت سے جس قدر بھی آرام اٹھا سکے گا اٹھائے گا۔ بلکہ دوسروں کو بھی راحت پہونچانے کی کوشش کریگا۔ امیر کا دل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس میں ہمدردی کی بو نہیں۔ اگر وہ دوسروں کو تکلیف دیکر اور اپنا پہونچا کر خود عیش کا طالب ہے تو وہ غریب سے بھی بدتر ہے اس لئے کہ "تونگری بدل است نہ بمال"۔ منیر اب بھی وقت ہے بتاؤ تمھیں کیا تکلیف ہے۔ ہم لوگ اس کی فکر کریں۔

منیر۔ اب یہ سب بے سود ہے۔ بار دل ٹوٹ چکی ہے۔ صرف آگ لگنے کی دیر ہے دوا یا دعا اب کچھ کارگر نہ ہوگی۔ اس لئے کہ موت کا علاج لقمان کے پاس تک نہ تھا ۔ ۔ ۔ اس تھوڑے سے وقت کو بیکار صرف نہ کرو۔ تمھاری کوئی کوشش کارگر نہ ہوگی۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اسے غور سے سنو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شاکر۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

منیر۔ آج تک میں نے تمھاری لڑکی کی نگہداشت کی اور اسے بخیر و خوبی تم تک پہونچا بھی دیا مگر یہ سے جلد ہم سے بعد یہ ظفر بے مونس و یار ہو جائیگا۔ اس لئے میں تم کو سونپتا ہوں بچپن سے یہ دونوں ساتھ رہے ہیں میں نے بہت کوشش کی کہ ان میں کسی قسم کا لگاؤ نہ ہو مگر میری کوئی تدبیر بھی کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ محبت بڑھتی ہی گئی مجبور ہو کر میں نے زرینہ کو الگ بھی کر دیا پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں اس لئے اب یہ الگ نہیں رہ سکتے ہماری آخری تمنا ہے کہ یہ دونوں تمھارے ۔ ۔

شاکر۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں جیسے یہ میری لڑکی ویسے ہی یہ میرا لڑکا۔

منیر۔ بس شاکر۔ مجھے اتنا ہی درکار تھا۔ زرینہ، ظفر آؤ میرے قریب آؤ تاکہ میں تم لوگوں کو ایک بار اور دیکھ لوں۔

(دونوں قریب آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ منیر دونوں کو دیکھتا ہے۔ پھر ایک درد سا ہوتا ہے اور اس دار فانی کو خیرباد کہتا ہے زرینہ اور ظفر رونے لگتے ہیں۔ شاکر دونوں کو اٹھا لیتا ہے اور دونوں کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے)

شاکر۔ بیٹا! صبر کرو۔ مرضی خدا میں کوئی چارہ نہیں۔ اگر آج منیر نہیں تو میں تم لوگوں کا نگہبان ہوں۔ دنیا میں کوئی ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا۔ (پردہ گر جاتا ہے۔)

غلام شبر بی۔ ایس۔ سی

ساقی سے خطاب

از جناب طفیل احمد خان صاحب سلطانپوری

یہ بہاریں یہ گھٹائیں یہ جوانی ساقی !   یہ عنادل کے چہکنے کی روانی ساقی !
کیف و مستی میں ہے ڈوبی ہوئی ساری دنیا   تیری نظریں بھی کریں بادہ فشانی ساقی !

تیرے ساغر سے وہ بادہ کا چھلکنا ساقی !   مست آنکھوں میں تبسّم کا مچلنا ساقی !
دیدے اک جام کہ اب مست کئے دیتا ہے   تیرے رُخ پر تری زلفوں کا بہکنا ساقی !

دیکھ اٹھی ہے اُفق سے وہ طرب خیز گھٹا   بادہ بردوش ہے مخمور ہے ہر موج ہوا
پھول ارمان کے مدت سے ہیں پیاسے ساقی   اپنی مخمور نگاہوں سے تو پیاس ان کی بجھا

ابر سرشار سے پیغام طرب آتا ہے   آسماں کیف میں ڈوبا نظر آتا ہے
معجزہ ہے تری دوشیزہ لبی کا ساقی   آج ہر لفظ ترا کیف بہ لب آتا ہے

فوٹوگرافی اور سینما

جناب مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے

فوٹوگرافی کی ایجاد سے قبل تصویر ہاتھ سے بنائی جاتی تھی۔ مو قلم سے رنگ بھر کر اس میں دلکشی و رعنائی پیدا کرتے تھے۔ نقاشی کے فن کو مختلف ممالک میں حد کمال تک پہونچا دیا گیا تھا۔ چین کی مصوری و نقاشی آج تک ضرب المثل ہے۔ ایران نے بھی مایہ ناز نقاش پیدا کئے۔ مصر و ہند میں بھی باکمال اہل فن ظاہر ہوئے۔ مغربی ممالک نے بھی اس فن لطیف میں نام پیدا کیا۔ لیکن ہاتھ سے مصوری یا نقاشی کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ صرف ارباب ہنر ہی اصل کے مطابق تصویر بنا سکتے ہیں۔ پھر ایک تصویر کے بنانے میں کافی زمانہ درکار ہوتا تھا اور مصور یا نقاش کو بڑے سکون اور مستقل مزاجی سے کام کرنا پڑتا تھا لیکن کیمرے کے ہوتے ہوئے یہ سب دشواریاں از خود حل ہو جاتی ہیں نہ تو زیادہ وقت لگتا ہے اور نہ کسی بڑی تعلیم کی ضرورت ہے؟

کیمرہ لیکر اس میں پلیٹ یا فلم چڑھا لیا۔ اور جس چیز کی تصویر لینی ہوئی اس کے سامنے کیمرہ لگا دیا۔ بعض دفعہ فوکس کرنے میں تھوڑی بہت دیر لگ جاتی ہے مگر وہ بھی کوئی ایسا زیادہ لمبا کام نہیں۔ کیمرے کو آگے پیچھے ہٹانے سے بآسانی درست ہو جاتا ہے۔ جن کیمروں سے اسنیپ شاٹ لیا جاتا ہے ان میں کیمرے کو ہٹانے کی جگہ لینس کو ادھر اُدھر حرکت دی جاتی ہے۔ ایسے چھوٹے کیمروں میں یہ جھگڑا نہیں ہوتا۔ اس پر مسافت کے نشان بنے ہوتے ہیں۔ جو چیزیں دیئے ہوئے فاصلے سے زیادہ دوری پر ہیں از خود سب فوکس کے اندر آجاتی ہیں۔

اگر کیمرے میں شیشہ کی پلیٹ استعمال کی جاتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کو سیاہ سلائیڈ میں بند کر کے کیمرے میں رکھا جائے۔ تاکہ روشنی اُس کو خراب نہ کر دے۔ سلولائڈ کے فلم کے ساتھ سلائڈ کی بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ روشنی سے بچانے کے لئے اس کے گرد خود ایک سیاہ کاغذ لپٹا ہوتا ہے

تصویر لینے میں جتنا وقت صرف کیا جاتا ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔ اگر دن کافی روشن ہے تو وقت کم لگے گا اگر روشنی کم ہے تو وقت زیادہ دینا پڑے گا۔ اسی طرح شام کو دوپہر سے زیادہ وقت لگانا چاہئے۔ اگر روشنی بہت زیادہ چکدار ہو تو اسے کم کرنے کے لئے لینس پر کواڑی چڑھانی ہوگی تاکہ بہت چھوٹے سے سوراخ میں سے روشنی اندر جائے۔ کیمرے میں پلیٹ یا فلم باقاعدہ لگا لینے اور فوکس ٹھیک ہو جانے کے بعد بس صرف اتنا کام رہ جاتا ہے کہ کھٹکا دبا دیا جائے۔ کھٹکا دبایا اور تصویر آگئی۔

اگر اس وقت پلیٹ یا فلم کو دیکھو تو اس پر کوئی تصویر نظر نہ آئیگی بلکہ اگر اسے غلطی سے روشنی میں لے آؤ تو وہ ضائع ہو جائیگی۔ اس کو تاریک کمرے میں لیجا کر بعض کیمیاوی ترکیب سے تیار کئے مصالحوں سے دھویا جاتا ہے تب اس پر تصویر کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ جبتک دھونے کے تمام مدارج پورے نہ ہو جائیں پلیٹ یا فلم پر تصویر قائم نہیں ہوتی۔ اگر ادھوری دھلی ہوئی تصویر کو روشنی میں نکال لاؤ تو بھی خراب ہو جائیگی۔ پلیٹ یا فلم پر جو تصویر آتی ہے اسے نگیٹو کہتے ہیں۔ اس میں سیاہ چیز سفید۔ اور سفید شے سیاہ معلوم ہوتی ہے۔ جب اسے تصویر کے کاغذ پر چھاپتے ہیں تو ہر چیز جیسی در اصل تھی ویسی چھپنے کے بعد اس کاغذ پر نظر آنے لگتی ہے۔ موجودہ فوٹوگرافی کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔ اب ذرا یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انسانی دماغ ایجاد کے اس مرتبے تک کیونکر پہونچا۔

جرمنی میں ایک علم الکیمیا کا ماہر رہتا تھا جس کا نام تھا "جان اسکلٹنز" ۱۔ ۱۷۲۷ء میں ایک دن اس نے شیشہ کے برتن میں کھریا اور نائٹرک ایسڈ ملا کر اُسے روشنی میں رکھا جس جگہ روشنی پڑی وہاں سے وہ مسالہ سیاہ ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اُس نے ایک موٹے کاغذ میں حروف بھی کاٹے اور ان حروف

کے ٹکڑوں کو اس پر رکھدیا۔ چونکہ روشنی صرف ان کٹے ہوئے مقامات سے مسالہ پر پہنچتی تھی اس لئے صرف اتنی جگہ ہی سیاہ ہوئی اور اس طرح مسالہ پر ان حروف کے نقوش مرتسم ہوگئے۔ کچھ دن بعد اسکلٹنر انے پھر اس تجربہ کو دہرانا چاہا۔ اور کھریا میں نائٹرک ایسڈ ملاکر مسالہ تیار کیا لیکن اس ... تجربہ ناکام رہا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ پہلے تجربہ کے موقع پر جو نائٹرک ایسڈ اس نے استعمال کیا تھا وہ پہلے چاندی کو حل کرنے میں استعمال کیا جاچکا تھا۔ چنانچہ اس نے اول چاندی تھوڑی سی ایسڈ میں حل کی پھر اسے کھریا میں ملاکر مسالہ بنایا۔ اب جو آزمایا تو پہلے سے بھی بہتر نتیجہ نکلا۔

سنہ ۱۷۶۳ء میں انگلستان کے ایک ڈاکٹر ولیم لوئیس نے ان تجربات کی تجدید کی اور ان کو صحیح پایا۔ اس زمانہ کے نقاش ایک قسم کا کیمرا مناظر کی تصویریں بنانے میں استعمال کیا کرتے تھے۔ اس کیمرے کا کام صرف اس قدر تھا کہ وہ لینس کی مدد سے پردہ پر سامنے کا پورا منظر پیش کردیتا اور نقاش اسے دیکھ کر اپنی تصویر تیار کرلیتا تھا۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں ٹامس ویجوڈ اور سر ہمفری ڈیوی نے چاہا کہ جو منظر وہ لینس پیش کرتا ہے اسے محفوظ کرلیا جائے۔ انھوں نے کاغذ کو مسالہ میں بھگو کر لینس کے سامنے رکھا تو اس پر نقوش آگئے لیکن ان کو اس امر میں کامیابی نہ ہوئی کہ ان نقوش کو مستقل طور پر باقی رکھ سکیں۔

فرانس میں ایک شخص تھا جوزف۔ نی اپیس۔ اس نے سلور اور نائٹرک ایسڈ کو چھوڑ کر ان سے بہتر ایک شے بٹومن پر تجربہ کیا اور کامیاب پایا۔ اس نے ایک تصویر لیکر اس کی پشت پر روغن ملا تو وہ شفاف ہوگئی۔ پھر اسے ایک دھات کی پلیٹ پر رکھ کر جس پر بٹومن لگا ہوا تھا دھوپ میں رکھ دیا۔ جب وہ تصویر اس پلیٹ پر آگئی تو اسے لیونڈر کے تیل سے دھو دیا جس سے وہ دیرپا بن گئی۔ اس طرح اس فرانسیسی نے ۱۸۲۶ء میں جو تصویر چھاپی وہ دنیا کی سب سے پہلی فوٹو کی تصویر کہی جاسکتی ہے۔ اس طریقہ میں تصویر کو دس گھنٹہ دھوپ میں رکھنا پڑتا تھا۔ تب کہیں وہ پلیٹ پر مرتسم ہوتی تھی اس لئے نی اپیس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی انسان کا فوٹو اتار سکے۔

اسی زمانہ میں ایک دوسرا فرانسیسی لوئی ڈاگوئر بھی ایسے ہی تجربات کررہا تھا۔ اس نے جب سنا کہ نی اپیس بھی اسی فکر میں ہے تو اس سے ملا اور دونوں ایک دوسرے کے شریک بن گئے۔ یہ شرکت حیرتناک ضرور ہے اس لئے کہ دونوں کے کام کا طریقہ جداگانہ تھا۔ نی اپیس بٹومن استعمال کرتا تھا اور ڈاگوئر سلور اور آیوڈین سے تیار کیا ہوا ایک مرکب مسالہ کام میں لاتا تھا۔ مگر ڈاگوئر نے اس عہد ... تک احترام کیا کہ شریک کے مرجانے کے بعد اس کے بیٹے کو شریک بنالیا۔

ڈاگوئر نے ایک دن پلیٹ مسالہ لگاکر کیمرے میں جمائی اور اسے دھوپ میں رکھدیا تاکہ سامنے کا منظر روشنی کی مدد سے اس پر مرتسم ہوجائے۔ مگر تھوڑی دیر بعد سورج بادلوں میں چھپ گیا جس کے معنی یہ تھے کہ اس کی ساری محنت اکارت گئی اور دوسرے دن پھر نیا مسالہ لگاکر پلیٹ تیار کرنی پڑیگی۔ مجبوراً اس نے پلیٹ نکال کر الماری میں رکھدی۔ مگر یہ دیکھ کر اگلے دن اس کی حیرت و مسرت کی کوئی حد نہ رہی کہ پلیٹ پر پورے منظر کی تصویر اتر آئی ہے اس وقت اسے اس غیر متوقع کامیابی کا سبب نہ معلوم ہوسکا۔ لیکن غور کرنے پر اس نے قیاس کیا کہ الماری میں ایک برتن میں پارہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے اجزاء جب پلیٹ تک پہنچے تو پوشیدہ تاثرات کو انھوں نے پلیٹ پر روشن کرکے تصویر بنادیا۔ اس قیاس کو یقین بنالینا دشوار نہ تھا۔ اگلے دن اس نے پلیٹ کو تھوڑی دیر دھوپ میں رکھ کر اٹھالیا۔ اس وقت اس پر سامنے کے منظر کا نشان بھی نہ تھا۔ لیکن جب اسے پارہ کی بھاپ پہنچائی گئی تو پورا سین تصویر میں کھنچا ہوا نظر آنے لگا۔

ڈاگوئر نے اپنے تجربات کو مکمل اور متیقن کرلینے کے بعد اپنے انکشاف کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سب کے لئے یہ ایک حیرتناک شے تھی۔ سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ۱۸۳۹ء میں فرانس اور انگلستان میں اس کے کارخانے قائم ہوگئے۔ انھیں دنوں انگلستان کا ایک شخص ولیم ہنری فاکس ٹیلبات بھی اسی قسم کے تجربات کررہا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس نے بھی ڈاگوئر ہی کے مانند نتائج استخراج کرکے تصویریں بنائی تھیں۔

دھات کی پلیٹ سے قدم آگے بڑھاکر فاکس ٹیلبات نے اول گیلے کاغذ پر اور پھر مسالے لگے ہوئے خشک کاغذ پر تجربے کئے اور ان کو کامیاب پایا۔ پھر کاغذ ترک کرکے شیشہ کی پلیٹیں بنائی گئیں۔ اول ان کو بھی تر حالت میں استعمال کرتے تھے۔ شیشہ کی خشک پلیٹ ۱۸۷۰ء سے کام میں لائی گئی انھیں تجارب کے دوران میں لینس میں بھی اصلاحات ہوتی رہیں اور ایسے عمدہ لینس بنالئے گئے جن سے آدمی کی تصویر بآسانی کھینچ سکے۔ اس کے بعد سلولائڈ کا فلم بنا۔ جو شیشہ کی پلیٹ سے اس لئے بہتر تھا کہ اس میں ٹوٹنے

کا حظرہ بھی نہ تھا۔ وہ ہلکا بھی تھا اور کئی کئی فلم ایک دفعہ میں کیمرے میں لپیٹ دیئے جاتے تھے۔ ایک تصویر لینے کے بعد ان کو گھمانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ بار بار پلیٹ بدلنے کا کام بچ جاتا تھا۔ پھر سینما کے فلم ایجاد ہوئے۔ سلولائڈ کے چھوٹے فلموں کا ایک لمبا سلسلہ ہوتا ہے جسے کیمرے کے اندر لپیٹ دیا جاتا ہے اور کیمرہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ تصویریں اتارنی شروع کر دیتا ہے ان میں سے ہر ایک صرف ایک خاص حرکت کی تصویر ہوتی ہے لیکن انھیں کو جب مشین میں چڑھا کر پردے پر دکھاتے ہیں تو وہ متحرک نظر آنے لگتی ہیں۔

سب سے پہلے آیڈیسن نے امریکہ میں ۱۸۹۳ء میں متحرک فلم ایجاد کیا۔ اور اس کے بعد ۱۸۹۵ء میں ولیم فریز گرین نے انگلستان میں سلولائڈ کا متحرک فلم چلایا۔ ایڈیسن نے بولتے ہوئے فلم بھی بنائے تھے جس میں اس نے اپنے گراموفون کے ریکارڈوں سے مدد لی تھی۔ سینما کے فلموں کو عمومیت حاصل کئے ہوئے پچیس سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا۔ اس قلیل عرصہ میں سینما نے جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ دنیا بھر میں جس قدر کمپنیاں قائم ہیں ان میں تقریباً پچاسی کروڑ پونڈ سرمایہ لگا ہوا ہے صرف انگلستان میں ایک سال میں سینما دیکھنے والوں کی تعداد ۹۶ کروڑ سے زیادہ ہوتی ہے اور ٹکٹوں کی آمدنی کا اندازہ چار کروڑ پونڈ سے زاید کیا گیا ہے۔ دنیا بھر کے فلموں کا ۶۵ فیصدی حصہ ہالی ووڈ (امریکہ) سے بن کر آتا ہے اور ۵ے فیصدی کے قریب روپیہ بھی وہیں پہونچتا ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ۱۵۳۷۸۔ اور انگلستان میں ۴۷۱۲ بائیسکوپ قائم ہیں۔ انگلستان میں متکلم فلم سب سے پہلے ۱۹۲۴ء کی نمائش میں ڈاکٹر لی فارسٹ نے دکھایا تھا۔ اس کے بعد امریکہ کا تیار کیا ہوا متکلم فلم ۲۷ ستمبر ۱۹۲۸ء کو لندن کے ایک سینما میں عوام کے سامنے پہلی بار پیش ہوا۔

ہندوستان میں چالیس سے زائد فلم کمپنیاں قائم ہیں۔ ان کے تیار کئے ہوئے کھیلوں کی پوری تعداد معلوم کرنی تو دشوار ہے البتہ اپریل ۱۹۳۳ء سے مارچ ۱۹۳۴ء تک کے زمانے میں ان کمپنیوں نے ۱۲۱ تماشے بنا کر پیش کئے تھے۔ اسی طرح جنوری ۱۹۳۵ء سے اکتوبر ۱۹۳۵ء تک کے عرصہ میں ۲۳۶ کھیل بنائے گئے۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فلم سازی کی وبا کس قدر سخت متعدی ہے اور کیسی عجلت و سرعت سے پھیل رہی ہے۔

اب عام طور پر اس طرف توجہ کی جا رہی ہے کہ سینما کو تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ یورپ کے ملکوں میں تو تعلیمی افادے کی غرض سے اسکولوں میں سینما قائم کئے جاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ تعلیمی فلم دکھلائے جائیں اور طلبہ کو فائدہ پہونچے۔ ہندوستان میں کچھ دن قبل جو فلم بنائے جاتے تھے وہ عموماً مخرب اخلاق ہوتے تھے۔ البتہ کچھ کھیل اب ایسے بننے لگے ہیں کہ ان سے کسی فائدہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

ہو رہا ہے عرض کرنی وقت جادہ سازی کے ساتھ
بس کی جو عمر نوازی کی ہو
حسن و عشق جاری نہیں حریف و راحت
اب بو کیا پیار نازی تو یہ

گلزارِ خلیل!

از حضرت خلیل بیگوسرائی

گُل نہیں، سبزہ نہیں، خوشبو نہیں چادر نہیں
خاکِ تربت کے سوا کچھ خاکِ تربت پر نہیں

دردِ دل پر کیا پسیجے دل بتِ بیداد کا
جونک لگ جائے جو پتھر میں تو وہ پتھر نہیں

مانعِ گردش حیا ہے ان کی چشمِ مست کو
مے تو ہے ساغر میں لیکن دور میں ساغر نہیں

مارتے ہیں کس طرح لیتے ہیں کیونکر جان وہ
تیر چٹکی میں نہیں ہے، ہاتھ میں خنجر نہیں

طور کے جلوے کا اب تک بھی نمایاں ہے اثر
جو نہ ہو آتش بدل ایسا کوئی پتھر نہیں

آج دیکھیں کس طرح کرتے ہیں آپ انکار قتل
آپ کا خنجر نہیں ہے یا ہمارا سر نہیں

کیوں بنے تصویر آئینے میں صورت دیکھ کر
تم تو کہتے تھے کبھی میرا کوئی ہمسر نہیں

کٹ رہی ہیں گردنیں سب کی خرامِ ناز پر
ہرج ہی پھر کیا جو دستِ یار میں خنجر نہیں

پرتوِ خورشیدِ رحمت نے دکھایا یہ اثر
دامنِ تر کا گماں اب دامنِ تر پر نہیں

لے گئے شیشے میں بھر بھر کر فرشتے عرش پر
ایک قطرہ بھی لہو کا خاکِ مقتل پر نہیں

کس طرح برسات اب کے سال گزریگی خلیل
مے نہیں، ساقی نہیں، شیشہ نہیں ساغر نہیں

سحر-جادو

ایک بہترین علمی مضمون

جناب حکیم خورشید حسن صاحب خورشید

عصر موجودہ اور دور حاضرہ میں ہماری نیم ترقی یافتہ دنیا میں جادو کی، بھی ایسی ہی نسبت باقی رہ گئی ہے جیسے کہ کوئی جانور یا کوئی قوم اپنی ہستی کو گم کرنے کے ساتھ ساتھ سلسلۂ تاریخ کی کوئی کڑی بالکل ہی گم کر دیتی ہے مگر کسی چیز کے نایاب یا گم ہو جانے سے یہ امر مستلزم نہیں ہے کہ ہماری دنیا میں اس کا کبھی وجود ہی نہیں تھا۔

ہمارے عالم میں بہت سی چیزیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اقوام و امم سابقہ کا آج کہیں بھی وجود نہیں پایا جاتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ خود فرماتے ہیں کہ۔ الم تر کیف فعل ربك بعادٍ ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلها فی البلاد - آج ہمارے زمانہ میں قوم عاد کی بڑے بڑے ستونوں والی عمارتوں کا کہیں بھی وجود نہیں پایا جاتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا میں قوم عاد پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

دنیا میں جہاں اسلام نے رشد و ہدایت کی نشر و اشاعت کی۔ اور انسان کے اخلاق رذیلہ کو مٹانے کی سعی پیہم سے کام لیا وہاں اس نے جادو جیسے مسائل کو بھی ہمیشہ زیر بحث رکھا اور اس قسم کے امور سے اس کو اجتناب رکھنے کی ہدایت کی اور بتایا گیا کہ یہ امور مخلوق کو خالق سے جدا کرنے کے ساتھ ابنائے جنس کیلئے بھی وجہ ضرر بنجاتے ہیں، اسلئے ان امور میں مبتلا ہونے سے انسان یا تو کافر بنجاتا ہے یا فاسق ہو جاتا ہے۔

اہل اسلام کی اس جد و جہد نے جادو کو بھی اسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جس طرح بعض دوسری برائیوں کو مٹا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں آج جادو کا شمار بھی انہیں اشیاء میں ہونے لگا ہے جنکو وہمی یا قیاسی تصور کیا جاتا ہے، ہمارے دور کے بعض حضرات کا یہ بھی شمار ہے کہ جو امور اُن کو اپنی عقل سے بالاتر نظر آتے ہیں وہ فوراً ہی بلا پس و پیش اُن کے منکر ہو جاتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی ناکارہ دلائل اور خامکارانہ بحث و تمحیث میں جادو کا انکار بھی تہذیب جدید کے لوازمات میں سے شمار کر بیٹھے ہیں۔

جادو کے وجود پر بے شمار دلائل اور مشاہدات موجود ہیں۔ جادو بھی قدرت کی صنعتوں میں سے ایک صنعت ہے۔ مذہبی کتب اور صحف سماوی میں اس کا کثرت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانوں میں قرآن کریم نے سحر کے وجود پر بھی کافی سے زیادہ روشنی ڈالی ہے، ہاروت و ماروت کے ساتھ بھی اس علم کو نسبت دی ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت آصف بن برخیا جو حضرت سلیمان کے ساتھیوں میں سے ایسے علم سے واقف تھے جو سحر کا قائم مقام سمجھا جا سکتا ہے۔

سحر کے معنی یہ لفظ بالکسر ہے اور اپنے ماخذ کے لطیف و دقیق ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس کے معنی میں یہ بھی داخل ہے کہ سبب کو پوشیدہ رکھکر مسبب کو ظاہر کیا جائے۔ محتاج بنانا، مشغول رکھنا، فریفتہ کرنا بھی اس کے معنی میں داخل ہے چونکہ تکلم و بیان کی بعض اقسام اپنے اندر نوادرات رکھتی ہیں۔ اس واسطے کہا گیا ہے۔ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا۔ چنانچہ شعر و موسیقی بھی اسی کی اقسام میں داخل ہیں۔

سحر کی تخلیق سحر کی تخلیق بھی منجملہ انہیں امور کے ہے جہاں قدرت کی منشا کا معلوم دشوار تر ہو جاتا ہے۔ قدرت کے نوادرات کو عجائبات اسقدر کثیر ہیں کہ ان پر فرداً فرداً اظہار خیال کرنا از قبیل محالات، بلکہ ناممکنات سے ہے۔ سمندر، پہاڑ، جنات اور اُن کے متعلقات نجوم و کواکب اور اُن کے اثرات۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن پر سیر حاصل بحث کرنی دشوار ہی نہیں بلکہ عقل انسانی کو اعتراف عجز کرنا پڑتا ہے۔

قصہ مختصر سحر کی تخلیق بھی قدرت ہی کی مرہون منت ہے۔ بعض ضرور تو

کے ماتحت اس کو انبیا علیہ السلام پر پیش کیا گیا تھا۔ فرشتوں کے ذریعہ بھی اس کی نشر و اشاعت کی گئی۔ جنات و شیاطین نے بھی اس کو حاصل کیا۔ حکماء نے بھی ارواح، ارادہ، افعال، الفاظ و ادویہ کے ذریعہ اس سلسلہ میں بہت کچھ ایجاد کیا اور بڑی بڑی ترقیاں حاصل کیں۔

تقسیم سحر کی دو بڑی بڑی قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک سحر حلال دوسری سحر مردود۔ سحر حلال کی حیثیت دعا کی اعلیٰ یا ادنیٰ صنف کی مرادف ہے اور اس میں مخلوق کو اپنے خالق کی خوشامد یا تسبیح کرنی پڑتی ہے۔ قدرت نے اپنے نظام کو درست رکھنے کے لیے خود ہی کچھ قوانین ایسے مرتب کر دیئے ہیں جن کے پورا کرنے سے انسان کو سحر حلال کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور نظام قدرت میں بھی کوئی خرابی لاحق نہیں ہوتی۔

سحر مردود بھی سحر حلال کے مانند ہوتا ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ اس میں جنات شیاطین اور ارواح خبیثہ کی خوشامد اور اُن سے طلب استعانت کیجاتی ہے۔ ان تمام اعمال کو دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ہی کو اپنی تعریف اور خوشامد پسند آتی ہے لیکن خالق نے بتا دیا ہے کہ اس کا تکبر جائز ہے اسلئے اس کا خوشامد پسند ہونا بھی جائز ہے مگر مخلوق چونکہ اپنی چند جہتوں میں ناقص ہوتی ہے اسلئے اس کی خوشامد کرنی اور اس کا خوشامد پسند ہونا، دونوں امور نا جائز ہیں اور ان دونوں باتوں پر خالق مواخذہ طلب کرنے کا عادی ہے۔ اسواسطے خدا پرستوں کو بتا دیا گیا ہے کہ سحر مردود کے عامل پر کفر عائد ہو جاتا ہے کیونکہ بعض خبیثوں کی تعریف انہیں الفاظ کے ساتھ کیجاتی ہے جو خالق کی شان کے شایان ہوتے ہیں۔

تفصیل جیسا کہ ہم پیشتر بتا چکے ہیں کہ ارواح، ارادہ، افعال، ادویہ، الفاظ یہ سب ایسے ہیں جن سے سحر میں امداد لیجاتی ہے اس لئے اُن کے ماتحت سحر کی اقسام بھی بہت ہو جاتی ہیں۔

ہمارے خالق نے اپنی مخلوق میں سے انسان کو بھی ایسے صفات کے ساتھ مخلوق کیا ہے کہ وہ عالم صغیر ہونے کے باوجود عالم کبیر کی صفات رکھتا ہے جیسا کہ ایک صوفی نے لکھا ہے کہ۔

بھیکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گدڑی بیچ لال
گانٹھ کھول آوت نہیں اس بدھ ہوئے کنگال

یعنی اے بھیکا کوئی شخص ہماری دنیا میں مفلس اور بھوکا نہیں ہے سب کی گدڑی میں لال موجود ہوتا ہے مگر جن کو گرہ کھولنی آتی ہے وہ گرہ کھولکر اس لال کو نکال لیتے ہیں اور جو گرہ کھولنی نہیں جانتے ہیں وہ اس لال کے منافع اور مشاہدہ سے محروم رہتے ہیں۔

جب سحر ارواح کے ذریعہ کیا جاتا ہے تو اس میں بھی سحر حلال اور سحر مردود کی دونوں اقسام شامل ہو جاتی ہیں۔ ارواح طیبہ ملائکہ و موکلات سے اعانت طلب کرنے میں ایسے اصول اختیار کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی ہے کہ مخلوق کو خالق کا انکار کرنا پڑے، مگر شیاطین اس کے بغیر کسی طرح بھی راضی نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسے الفاظ کو استعمال کرنا جنکے معنی عامل نہ جانتا ہو منع ہے۔

ارادہ کے ماتحت سحر کی جس قدر اقسام آتی ہیں اُن کی تفصیل بیحد دشوار ہے مسمریزم اور تصوف کے بہت سے اعمال، ہزاروں قسم کے تعویذ گنڈے اور بہت سی قسم کے نیرنگ و طلسم اسی کے ماتحت آتے ہیں۔ ان میں کفر کا التزام بظاہر تو بہت کم ہے مگر احتیاط لازمی اور ضروری ہے۔

افعال و ادویہ کے متعلق بہت سی صنعتیں بھی ایسی ہیں جو جادو کی حیثیت رکھتی ہیں اور قدرت نے پہلے ہی سے اپنے نظام میں اُن کی تاثیرات کے نفاذ کی راہیں بنا رکھی ہیں۔ مثلاً مقناطیس اور کہربا۔ مقناطیسیت اور کہربائیت سے وہ افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ بعض اقسام کے سحر بھی اُن کی برابری نہیں کر سکتے مثلاً علم البرق کے ذریعہ آج کل جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہے اس کی تفصیل یہاں چنداں ضروری نہیں کیونکہ ہمارے معاصرین خود ہی تمام حالات سے بخوبی واقف ہیں۔

قرآن کریم میں نصیحت کے طور پر اشارہ کیا ہے کہ۔ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ۔ اے گروہ جن و انس اگر تم میں یہ استطاعت ہو سکتی ہے تو ہو کہ تم آسمانوں کی قطاروں اور زمین کے طبقات میں گھس جاؤ لیکن تم اللہ کی قدرت اور سلطنت میں نہیں گھس سکتے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب کسی ساحر کا کسی ولی اللہ یا نبی اللہ سے مقابلہ ہوتا ہے تو سحر کی قوت ٹوٹ جاتی ہے۔ جیسے کہ حضرت موسےٰ کے زمانہ میں وقوع پذیر ہوا تھا اور اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ پاک قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ ۘ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ جو اللہ کے سوا دوسروں کو سرپرست بنا لیتے ہیں اُن کی

مثال ایسی ہے جیسے کوئی لکڑی کو دوست بنالے کیونکہ لکڑی کا گھر بہت ہی کمزور ہوتا ہے کاش کہ تم اس امر سے واقف ہوتے۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ جو تمام نوادرات و عجائبات کے مقابلہ میں ہمیشہ انکار کا عادی رہا ہے، مثلاً وہ طبقہ انبیاء کے معجزات، جنات کی پیدائش، جادو کے وجود وغیرہ سے ہمیشہ انکار کرتا رہا ہے ان کیلئے وجود سحر پر سورۃ الشعراء کی آیات محکمات کافی ہیں۔

آیات کا ترجمہ یہ ہے۔ جب حضرت موسیٰ نے عصا کو اژدہا بناکر دکھایا تو جادوگروں نے کہا کہ یہ ہمکو ہمارے شہروں سے جادو کے زور نکالنا چاہتا ہے لہذا ملک میں اشتہار دو اور آدمی بھیجدو تاکہ ایک مقررہ دن بڑے بڑے جادوگر مجتمع ہوجائیں۔

یعنی یاتوک بکل سحار علیم ہ فجمع السحرۃ لمیقات یوم معلوم۔ قصہ کوتاہ جب تمام شہروں کے جادوگر مجتمع ہوگئے اور حضرت موسیٰ سے کہا گیا کہ اگر ہمارے جادوگر غالب رہے تو تجھے اُن کی پیروی کرنی پڑے گی حضرت موسیٰ نے اقرار کرلیا اور ان سے کہا کہ دکھاؤ تم کیا جادو دکھاتے ہو۔ انھوں نے رسیاں اور ڈنڈے وغیرہ ڈالے تاکہ سانپ بن جائیں وہ سانپ بن گئے، پھر حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا وہ اژدہا بنکر جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا یہ دیکھکر۔ فالقی السحرۃ سجدین قالوا امنا برب العلمین رب موسیٰ وھارون ۔ یعنی سجدہ میں گر گئے جادوگر اور کہا انھوں نے کہ ہم ایمان لائے رب العلمین پر جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے اس مقام پر بہت سی ایسی آیات بینات ہیں جن میں سحر کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے لہذا سحر کا انکار کرنے والے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان آیات پر پوری طرح غور و خوض کریں۔ اسی طرح گوسالہ پرستی کے سلسلہ میں حضرت جبریل علیہ السلام کی خاک قدم سے کام لیکر بنی اسرائیل نے گوسالہ کے بُت کو زندہ کرکے اُسکی پرستش شروع کردی تھی اور وہ گوسالہ بھی دنیا کے عجائبات میں سے ایک تھا۔

سامری، ہامان وغیرہ بھی فرعون کے جادوگروں میں سے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا وسیلہ آج تک بھی جنات وغیرہ پر اثر اندازی کیلئے کار آمد ہے

قرآن کریم میں جادو کا تذکرہ سورہ بقر میں بھی کیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہاروت و ماروت کا تذکرہ ہے۔ واتبعوا ما تتلوا الشیطین علی ملک سلیمن ۔ اور انھوں نے ایسی چیز کا اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں۔ وما کفر سلیمن ولکن الشیطین کفروا یعلمون الناس السحر۔ اور حضرت سلیمان نے کفر نہیں کیا مگر شیاطین کفر کیا کرتے تھے اور آدمیوں کو جادو سکھایا کرتے تھے

اسی طرح ملک بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتے تھے اور وہ لوگوں کو کفر سے آگاہ کرنے کے بعد اچھی طرح اقرار وغیرہ لیکر جادو کی تعلیم دیا کرتے تھے اور اس جادو کی ایک قسم منجملہ دوسری قسموں کے یہ بھی تھی کہ اسی کے ذریعہ میاں بیوی میں بھی بغض اور عداوت پیدا ہوجاتی تھی، مگر اس کے علاوہ وہ فرشتے دوسری اقسام کا جادو بھی سکھاتے تھے لیکن یہ سب کچھ معاملہ ایمان والوں کے امتحان کیلئے اللہ ہی پاک کی طرف سے تھا۔ چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اپنی تفسیر بیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں۔ نقل تفسیر بیان القرآن۔ ایک زمانہ میں جس کی تعین کی پوری تحقیق مجھ کو نہیں، دنیا میں خصوص بابل میں جادو کا زیادہ چرچا ہوگیا تھا اور اس کے آثار عجیبہ دیکھکر جہلا کو انکی حقیقت اور معجزات انبیاء علیہ السلام کی حقیقت میں غلط و اشتباہ ہونے لگا اور بعضے ساحروں کو مقدس و متبوع سمجھنے لگے اور بعض اس کو نیک عمل سمجھکر سیکھ کر اس پر عمل کرنے لگے، جیسے کہ یہ تمام امور مسمریزم کے مقدمہ میں واقع ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بابل میں دو فرشتے ہاروت اور ماروت اس کام کیلئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور شعبدوں سے مطلع کریں تاکہ اشتباہ رفع ہوجائے اور سحر پر عمل کرنے سے اور ساحروں کی اتباع کرنے سے اجتناب کرسکیں، اور جس طرح انبیاء کی نبوت کو معجزات و دلائل سے ثابت کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کردیئے گئے تاکہ ان کے ارشاد کی اطاعت ممکن ہو اور یہ کام حضرت انبیاء علیہ السلام سے اسواسطے نہیں لیا گیا کہ اول تو خود ان کا ساحر ہی سے فرق کرنا مقصود تھا۔ اس حیثیت سے گویا وہ ایک فریق تھے سو حکم علاوہ فریقین کے کوئی ثالث ہونا مناسب تھا۔ دوسرے اس کام کی تکمیل بدوں نقل و حکایت اُن اقوال و افعال سحریہ کے عادۃً ہو نہ سکتی اور ہرچند کہ نقل کفر، کفر نہ باشد عقلاً و نقلاً مسلم ہے مگر تاہم انبیاء ان حضرات کا مظہر ہدایت ہونا کسی قدر اس کام لینے سے انکاری صورت میں تھا۔ لہذا فرشتے تجویز کئے گئے کیونکہ کارخانہ تکوین میں جو کہ مشتمل ہے، خیر و شر سب پر ایسے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعہ عالم کے اعتبار سے تو لوجہ تربیت مصالح عامہ خیر ہوں لیکن فی ذاتہ بوجہ لزوم مفسدہ خاص شر ہوں، جیسے کسی ظالم کا نشوو نما دینا یا کسی موذی جانور کا تربیت کرنا کہ تکویناً محمود ہے اور تشریعاً مذموم بخلاف

انبیاء علیہ السلام کے کان سے خاص تشریعات کا کام لیا جاتا ہے جو خصوصاً و عموماً خیر ہی خیر ہیں اور ہر چند کہ یہ فعل و حکایت غرض مذکور سے ایک تشریعی کام تھا لیکن تاہم بوجہ احتمال قریب اس امر کے کہ اس میں عمل بالسحر کا تسبب نہ ہو جائے جیسا کہ واقع میں ہوا۔ ان حضرات کو سبب بواسطہ بننا بھی پسند نہیں کیا گیا، البتہ کلیات شرعیہ سے حضرات انبیاء علیہ السلام سے بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی چنانچہ وہ قواعد کلیہ بعد تفسیر آیت کے سحر کی علت و حرمت کے بیان میں احقر بھی نقل کرے گا۔ تفصیل جزئیات بوجہ احتمال فتنہ کے ان کے ذریعہ سے نہیں کی گئی۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے انبیاء علیہ السلام نے یہ بتا دیا کہ رشوت لینی حرام ہے۔

الغرض فرشتوں نے بابل میں آکر اپنا کام شروع کر دیا۔ سحر کے اصول و فروع ظاہر کئے اور لوگوں کو بد اعمالی سے بچنے کی تلقین کی اور کلمات کفریہ کو بتا دیا تاکہ ناواقفیت کے باعث لوگ نادانستہ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ فرشتوں نے یہ بھی بتا دیا کہ اعمال کفریہ پر نیک نیتی کے ساتھ آگاہی حاصل کرنا یعنی صرف کفر سے بچنے کیلئے نہ کہ کفر میں مبتلا ہونے کے واسطے۔ الغرض جب وہ

کسی شخص سے اچھی طرح عہد و پیمان لے لیتے تھے تب اسکو اعمال سحر کی تلقین کرتے تھے اب عہد پر قائم رہنا یا نہ رہنا ان لوگوں کا کام تھا جو یہ تعلیم حاصل کرتے تھے چنانچہ بعض لوگ اپنے عہد پر قائم رہتے تھے اور بعض عہد شکنی کر بیٹھتے تھے اسلئے یہ بھی ایک امتحان ہوا فقط طوالت کے باعث تفسیر آیات کو چھوڑتے ہوئے ہم صرف بیان القرآن کے چند فوائد بھی بیان نقل کئے دیتے ہیں تاکہ مضمون سمجھنے میں، اور زیادہ آسانی رہے۔

ف ۱ - بیوقوف لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سحر کی نسبت کرتے ہیں یہودی ہیں لہذا آیات میں حضرت سلیمان کی براءت کر دی گئی۔

ف ۲ - ان آیتوں کا مقصد یہود کی تقبیح ہے کیونکہ ان میں سحر کا چرچا بہت تھا۔ ان آیتوں کے متعلق ایک لمبا چوڑا قصہ زہرہ اور مشتری کا بھی مشہور ہے بعض نے اسکو غلط سمجھا ہے بعض نے صحیح مگر اس مقام کی آیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ف ۳ - سحر جبکہ الفاظ کفریہ پر مشتمل ہو کفر ہے اور جب الفاظ مباحہ کے ساتھ ہو کفر نہیں لیکن غرض ناجائز کے حصول کے سلسلہ میں ہر طرح فسق اور معصیت ہے۔

البتہ ہر تصرف عجیب پر سحر کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے خواہ وہ تعویذ گنڈا کیوں نہ ہو۔ فقط اب جادو کے سلسلہ میں ہم ایک مزید معلومات پیش کرنی چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ قدرت نے انسان کے جسم میں بھی دو قسم کی روحیں پیدا کی ہیں ایک تو وہ ہے جس کے ذریعہ یہ حالت خواب بھی زندہ رہتا ہے۔ دوسری وہ جو نیند کی حالت میں اس کے جسم سے نکل کر جدا ہو جاتی ہے لیکن اس کی علیحدگی، ایسی ہوتی ہے جیسی شمع کی روشنی جو دور تک پہنچ جانے کے باوجود شمع کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ اسی طرح نفس کی بھی چند اقسام کی گئی ہیں۔ مثلاً نفس امارہ نفس مطمئنہ اور روح کو بھی چند مختلف ناموں کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً امر رب اور روح رحمانی الغرض جادو کا بہت بڑا ذخیرہ انہیں الفاظ میں پوشیدہ ہے جو اہل فہم ہیں وہ سمجھ لیں گے، نااہلوں کو سمجھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر آپ یہ سنتے ہیں کہ ارواح دو قسم کی ہوتی ہیں ایک لطیف دوسری کثیف لطیف کو کوئی قابو میں نہیں کر سکتا۔ کثیف خود اس فکر میں رہتی ہے کہ اس کا کسی طرح سے اسی عالم کے ساتھ تعلق باقی رہے۔ اسلئے وہ قابو میں آجاتی ہے اور تجربہ کاروں کو معلوم ہے کہ روح کثیف جلد یا بدیر اپنے درجات کو پورا کر کے بالآخر فنا ہو جاتی ہے

مگر روح لطیف فنا نہیں ہوتی ہے۔ جار [illegible] سے روح کثیف کے ساتھ رہتا ہے اور ہمزاد بھی اسی کا دوسرا نام ہے۔ نئی میتوں کی قبر پر جا کر بعض اعمال کے ذریعہ ان کی روح کثیف پر قبضہ کر لیا جاتا ہے لیکن اس میں بھی چند جداگانہ مشکل پیش آتی ہیں اور تمام کثیف روحوں کا معاملہ بھی یکساں نہیں، اُن کی صورتیں اور افعال بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ جو لوگ ارواح کثیفہ کو ارواح لطیفہ کے ساتھ مخلوط کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔

ارواح کثیفہ ارواح لطیفہ کے لباس کی حیثیت رکھتی ہیں جو میلا بھی ہو جاتا ہے اور پوشیدہ بھی۔ جب ارواح لطیفہ اس عالم سے رخصت ہوتی ہیں تو یہ میلا لباس اسی مقام پر چھوڑ جاتی ہیں جو کچھ عرصہ بعد فنا ہو جاتا ہے اور مشاہدہ و تجربہ میں رات دن ایسی مثالیں آتی رہتی ہیں جن کو واقف کار لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً کسی مکان میں آسیب کا ہونا، کسی جگہ کا منحوس ہونا، کسی جگہ ضرر پہنچنا اور ضرر کی مختلف صورتوں کا وجود وغیرہ وغیرہ۔

جادوگروں نے تسلیم کیا ہے کہ جو روح بہت ہی کم بوجھل ہوگی وہ بھی، چالیس روز سے پیشتر فنا نہیں ہوتی ہے لیکن بعض ایسی روحیں بھی ہیں جو صدیوں تک قائم رہتی ہیں۔ جہاں گنہگار لوگوں کو دبایا یا جلایا جاتا ہے وہاں اُن کی روحیں یا ہمزاد، دودی یا سایہ کے مانند ایک جسم اختیار ہوئے نظر آتے ہیں اسلئے عام طور پر جادوگر کو چالیس روز کے بعد تجدید عمل کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ اکثر روحیں چالیس روز کے بعد فنا ہو جاتی ہیں۔ ارواح خبیثہ کو قابو میں کرنے کیلئے اپنی خبیث روح کو بھی زیادہ قوی بنانیکی ضرورت لاحق ہوتی ہے جس کے لئے غسل و طہارت اور صاف لباس کو ترک کرنا پڑتا ہے، خدا کا نام بھول کر بھی زبان سے نہ نکلے ورنہ از سر نو پھر محنت کرنی پڑے گی پیشاب پاخانہ، سور شراب وغیرہ کو اور بعض دوسرے مرداروں کو استعمال کیا جائے گا تاکہ نیک روحیں اپنی حفاظت اور نگہبانی کو ہٹا لیں۔ حصول نجاست کی بہت شکلیں کلی کرنے تک کی ممانعت ہے۔ دانتوں میں سے گوشت کا ریشہ تک نہیں نکال سکتا۔ صبح کو اُٹھکر تھوکنے کی ممانعت ہے لعاب دہن کو نگل جانے کا حکم ہے۔ غرض اللہ کی نافرمانی اور حصول نجاست کی کوشش میں چالیس ہی دن کے اندر اسکو بعض ارواح خبیثہ کا نظارہ ہونے لگیگا۔ ایسی صورت میں اس کو کسی مرگھٹ کے قریب قیام کرنے کی ضرورت ہے اور تخلیہ بھی لازم ہے نیز ارواح خبیثہ کا انتظار اور خیال بھی کرنا پڑتا ہے۔

ارواح کثیفہ کا انجذاب لطیف اور پاک اجسام کی طرف نہیں ہوتا ہے جو آدمی پاک و صاف رہتے ہیں اُن کو بھوت اور چڑیل بھی نظر نہیں آتی ہے اسلئے جبتک اپنے جسم اور جسم کے ماحول لباس وغیرہ بحد درجہ کثیف نہیں کر لیا جاتا اسوقت تک ارواح خبیثہ اس کی طرف منجذب نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن گندگی وغیرہ میں کمال حاصل ہو جانے کے بعد ارواح خبیثہ خود بخود اس کی طرف موانست کا قدم بڑھاتی ہیں یعنی۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ ارواح خبیثہ کی بھی خصلتیں جداگانہ ہوتی ہیں، اور اُن کو جسم خاکی سے جدا ہونے کے بعد بھی، اس کی زندگی کی بند صفات و افعال کے ساتھ لگاؤ رہتا ہے۔ مثلاً چوری ڈاکہ قتل و غارت، شراب خوری، زنا اور اسی کے مانند بعض دوسرے امور ہیں۔ جس قسم کی روحیں قابو میں آتی ہیں جادوگر سے اسی قسم کے افعال سرزد ہوتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعض جادوگر بے سبب بھی لوگوں کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ ڈائن بچوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ جسمانی روح کی کثافت بڑھتی رہے اور ارواح خبیثہ کو زیادہ موانست کا موقع ملتا رہے خدا اور بندہ میں جس قدر دوری ہوتی چلی جائے گی اسی قدر ارواح خبیثہ کو زیادہ راحت نصیب ہوگی۔ اور وہ گندے بخارات جو انتہائے گندگی کی حالت میں جسم سے اٹھیں گے، ایک ایسا موحول پیدا کر دیں گے جن کے اندر ارواح خبیثہ اپنا مسکن بنا لیں گی اور ایسے شخص کے ساتھ رہیں گی اور اپنی قوت کے موافق اس کا ساتھ دینگی، اس کا کہا مانینگی۔ خبیث روحوں سے موانست پیدا کر لینا ابتدائی مرحلہ ہے، اس کے بعد سحر کے بہت سے مراحل ان روحوں کے ذریعہ طے ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص کثافت مجسم کا پتلا بن چکتا ہے تو اس کو اس کا استاد کچھ دوسری قسم کے طریقے بھی بتاتا ہے۔ مثلاً ان لوگوں کو انتظار رہتا ہے کہ کوئی جلاد، کنجر، سانسی یا اسی قسم کا کوئی ناپاک اور شیطان، مجسم آدمی یا ایسا اچھوت جس کو مذہب یا خدا سے کوئی تعلق نہ ہو یا جو ایذا رسانی ہی کو اپنا شعار اور مذہب سمجھتا ہو یا مردار جانوروں کے گوشت پر بسر کرتا ہو، مرے اور یہ اس کی خبیث روح کو اپنا آلۂ کار بنائیں۔ مثلاً یہ کہ ایسے لوگ اس کی تیمارداری کے بہلنے اس کی سکرات موت کے وقت شریک حال رہ کر [illegible] رہتے ہیں اور دوا وغیرہ کے بہانے سے اس کے منہ میں چاول بھر کر مرنے کے بعد نکال لیتے ہیں یا اس کی ارتھی جب آدھی دروازہ کے اندر اور آدھی باہر ہوتی ہے اس وقت بائیں طرف دروازہ میں کچھ لڈو

[illegible]

اور کچھ سیندور یہ لکھکر رکھ دیتے ہیں کہ آج تیری دعوت ہمارے ہاں ہے اور پھر اس ارتھی کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں یہ میت جاتی ہے مرگھٹ تک ساتھ جاتے ہیں۔ جب یہ لاش جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو تھوڑی راکھ ہمراہ لے کر واپس آتے ہیں۔ جب آفتاب غروب ہونے کا وقت آتا ہے تو تنہا جگہ میں چوکا لیپ کر گوگل جلاتے ہیں۔ لیپی ہوئی جگہ پر کچھ پھول سیندور، بتاشے اور جلی ہوئی راکھ ایک تھالی میں رکھتے ہیں۔ جوتک جلاتے ہیں اور ڈورو بجاتے ہیں اور خبیث روحوں کی تعریف کے گیت گاتے ہیں۔ ایک شخص کو چوکے میں بٹھاتے ہیں اور چوکے میں بیٹھنے والا جب مست ہو کر شراب وغیرہ مانگتا ہے تو دیتے ہیں جس کو چوکے میں بٹھاتے ہیں اس کے ماتھے پر مردہ کی راکھ اور سیندور کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ جب وہ شراب مانگتا ہے اسکو شراب پلاتے ہیں۔ چوکے میں مٹھائی گوشت ناریل کلیجی سور کا خون وغیرہ بھی رکھتے اور استاد شاگرد وغیرہ مل کر کم از کم تین چار آدمی جمع ہو کر کام کرتے ہیں الغرض چوکے میں بیٹھنے والے کے اندر مردہ کی روح حلول کر جاتی ہے اور اس کا جسم پھول جاتا ہے آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ یہ علامت حلول اور دخلول کی ہے حلول و دخول کے بعد یہ لوگ اس روح سے عہد و پیمان کر لیتے ہیں اور جو کچھ وہ روح طلب کرتی ہے اسکو دیتے ہیں اور وہ روح دریافت کرنے پر کچھ ایسے الفاظ بتا دیتی ہے جن کے پڑھنے سے وہ روح فوراً حاضر ہو جاتی ہے۔ جو الفاظ وہ روح بتاتی ہے اس میں چند دوسرے الفاظ ملا کر ایک منتر بنالیا جاتا ہے، یہ منتر بنا کر اس روح کو بھی سنایا جاتا ہے، اگر وہ روح قبول نہیں کرتی تو کچھ معمولی تبدیل تغیر کر کے دوبارہ سناتے ہیں حتیٰ کہ وہ روح ان الفاظ کو قبول کر لیتی ہے اور جادو مکمل ہو جاتا ہے۔ پھر چند امور کے متعلق مختلف قسم کی بھینٹ مقرر کی جاتی ہے۔ الغرض جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو اسی طرح چوکا دیکر اور اس میں اشیا مذکورہ رکھکر ڈورو بجا کر منتر پڑھا جاتا ہے۔ لونگ، رائی، ماش، سیندور وغیرہ کو روبرو رکھکر الفاظ سحر یہ اس طرح ادا کرتے ہیں۔

یہ لونگ راتی ماتی جا بیٹھے فلاں کی چھاتی۔ سوتا ہو گا لا بیٹھا ہو اٹھا کھڑا ہو راہ لگا۔ سونے چین نہ بیٹھے سکھ جب تک منہ دیکھے وا کا مکھ۔ واسے طالب مراد ہے اور ایسے موقع پر طالب کا اور اس کی ماں کا نام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح مطلوب اور اس کی ماں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

باقی الفاظ سحر یہ۔ پھر دو منتر دہماد یو کی جاپا چھو منتر دو آدیس گرد کو ایہ منتر دونگمیں سابت لیکراُن پر کچا سوت لپیٹ کر اور لونگوں پر منتر پڑھکر مطلوب کی پشت پر مارے لیکن مطلوب کی غفلت میں۔ بس وہ ساتھ ہو لیگا جب کام ہو جاتا ہے تو پھر اس روح کو بھینٹ دیتے ہیں۔ روح کی حاضری بعد بھی چالیس روز تک اس کی بھینٹ روزمرہ دی جاتی ہے اور باقی مراحل خود روح ہی سے طے ہو جاتے ہیں۔ مگر نئے آدمی کو استاد کی شرکت ضروری ہے اور جن چاولوں کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے اُن سے بھی اسی طرح کام لیا جاتا ہے اُن کو چتا کی آگ میں اُبال کر مردہ سے یہ کہکر گھر لے آتے ہیں کہ ہمارے ہاں تیری دعوت ہے، پھر چوکا دیکر وہی سب کام کرتے ہیں جو پہلے کئے تھے یہاں تک کہ روح حاضر ہوتی ہے۔

مگر یہ طریقہ کوئی خاص طریقہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی تدبیر ہیں اور مختلف قسم کے خبیثوں کو طرح طرح کے اعمال سے تابعدار کیا جاتا ہے چونکہ اس مضمون میں ہم تعلیم سحر کا فرض ادا کرنا نہیں چاہتے بلکہ مدعا صرف احوال سحر یہ بیان کرنا ہے اس لئے باقی تفصیل کو چھوڑنا ہی مناسب ہے۔ ہمارا مدعا صرف اس قدر ہے کہ سحر بھی ایک صفت ہے اور اللہ تبارک تعالےٰ نے اس کو بھی دوسری قسم کے شر اور فتنوں کی طرح پیدا کیا ہے چنانچہ آپ نے عوام سے اکثر سنا ہوگا کہ جادو برحق کرنے والا کافر وہ یہی بات ہے اس سلسلہ میں ہمارے پاس بہت کچھ معلومات ہیں۔ مگر ایک ہی مضمون میں ان کا ختم کر دینا ناممکنات سے ہے۔ اگر موقع ملا تو پھر کسی وقت اس مبحث پر مفصل روشنی ڈالی جائے گی۔ عدیم الفرصت ہونے کے باعث میں اس مضمون کو جیسا چاہتا تھا ویسا نہیں لکھ سکا۔ اگر زندگی باقی رہی تو عالمگیر کے ذریعہ پھر کبھی اس پر ضرور سیر حاصل بحث کی جائے گی۔

غزل

عنایت کی تمنا ہے مجھے اس چشم پرفن سے
ہولکے ساتھ یہ اڑ کر لپٹ جاتی ہے دامن سے
شکن ماتھے پہ زلفیں منتشر آنکھیں گلابی سی
کہاں کی فاتحہ رخ بھی تو بھولے سے نہیں کرتا
قفس کی تیلیوں کے کام آیا آشیاں اپنا
جھکتا ہی رہا قاتل سر کتا ہی رہا قاتل!
سناؤ قصۂ موسیٰ ۔ دکھادو طور کا جلوہ
قفس میں یاد کیا کیا سیرِ گلشن کی دلاتے ہیں

نہ جس کو دوست سے مطلب نہ جس کو کام دشمن سے
جو ممکن ہو تو وہ دامن بچالیں خاک مدفن سے
قیامت کیا اٹھا کر آئے ہو تم بزم دشمن سے
الٰہی کس قدر نفرت ہے اسکو میرے مدفن سے
وہ بجلی لے گئی جو بچ رہے تنکے نشیمن سے
نہ چھوٹا ہاتھ سے دامن نہ چھوٹا ہاتھ دامن سے
نقابِ چہرۂ روشن الٹ دو روئے روشن سے
وہی دو چار تنکے بچ رہے ہیں جو نشیمن سے

فضا کس سے نہ ملئے اور ملئے کس سے دنیا میں
جسے سمجھے ہوئے تھے دوست وہ بڑھکر ہے دشمن سے

از جناب سلام اللہ صاحب — فضا الہ آبادی

محبت کی نیرنگیاں

از افسر جمال صاحبہ صدیقی میرٹھی،

ناہید، فیروزہ اور سلیم کے گھر قریب قریب تھے۔ اُن کی عمریں ایسی چھ، سات اور دس برس کی ہوں گی۔ تینوں ایک ساتھ اسکول جایا کرتے اور تینوں معصوم ہستیاں محبت کی آہنی اور نہ جدا ہونے والی زنجیروں میں جکڑی جارہی تھیں۔

کھیلنا، کودنا، کھانا، پینا اور سونا سب ایک ساتھ تھا اور اس پر یہ کہ قدرت نے اپنی اولین فیاضی سے ان تینوں کے خیالات اور ان کی جاذبیت بہ حیثیت بالکل مساوی رکھے تھے۔ [illegible] اگر ابھی محبت کے خونچکاں تیر ان کے نازک دلوں میں اپنے گہرے نشان نہ ڈال دیتے تو تعجب تھا لیکن اس [illegible] شاعرانہ کیفیت اختیار کرتا جارہا تھا کوئی تعجب کی [illegible] تھی۔

ناہید اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی اور فیروزہ و سلیم بھائی بہن۔ فیروزہ اور سلیم کی محبت جیسا سمجھا جاسکتا ہے حقیقی اور نیچرل تھی جو ہر ایک بھائی اور بہن کے دل میں قدرت ودیعت کرتی ہے۔ ہاں سلیم اور ناہید کی طبیعتوں کا لگاؤ غیر حقیقی سمجھا جاسکتا ہے لیکن اس سے کیا ہو سماج کی اذیت رساں رسوم ان معصوم ہستیوں کے دلوں میں اس قسم کے احساسات کی آفرینش نہ کرسکتی تھیں۔ وہ معصوم تھے، اس قدر کہ جب باغ میں جایا کرتے تو ناہید کا گریباں آتشیں پھولوں سے بھر کر اٹھتا اور اس کا ننھا سینہ کسی نامعلوم جوش سے تھرتھرانے لگتا۔ ناہید پھولوں کا تاج بنا کر ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سلیم کے سر پر رکھ دیتی۔ ایک پھیکے معصوم تبسم کے ساتھ جس کے اندر عشق و محبت کی لاتعداد بجلیاں رقص کرتی ہیں۔ دنیا [illegible] لیکن کون سمجھ سکتا ہے کہ اس ایک مسکراہٹ میں کس قدر [illegible] تیر نہاں تھے جو سلیم کے دل و جگر میں پیوست ہو جاتے تھے۔

غرض جس قدر زمانہ گذرتا رہا اُن کی محبت بھی زیادہ ابھرتی رہی اور آخرکار وہ زمانہ آگیا کہ جب اُن کی محبتیں جوان ہوگئیں اور وہ خود محسوس کرنے لگے کہ محبت اُن کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ مگر عالمِ وجود کے قیودات کسی ہستی کو اپنی زد سے نکل کر نہیں جانے دیتے۔ ایک دن وہ بھی آپہنچا جب سماج کی اٹل زنجیریں اُن کے ہر ایک عضو میں لپیٹ دی گئیں۔ ناہید کے ماں باپ نے اس کو پردے میں بٹھا دیا اور دیکھنے والے ایک قدرتی اثر کے زیرِ اثر اُن کو پرشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

بہرحال محبت کے نشاط آفریں احساسات کو نہ جاننے والے خشک انسان خواہ کچھ کہیں لیکن ناہید اور سلیم کی طفلانہ محبت اب شباب کو پہنچ چکی تھی اور اس کا مٹ جانا اب ایک مجنونانہ خیالات کے علاوہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سماج کی اس بندش نے دونوں کو حد درجہ ہراساں کردیا اور جیسا قدرتی امر ہے وہ انتہائی اداس رہنے لگے۔

فطرتِ انسانی پر غور کیجئے۔ ایک معمولی بات ہے کہ اگر کوئی اجنبی دو چار دن ساتھ رہتا ہے تو اس کی جدائی بھی انسانی احساسات میں کچھ نہ کچھ اداسی پیدا کردیتی ہے خواہ وہ وقتی ہی ملال ہی جائے لیکن سلیم جو ناہید کے ساتھ ہمیشہ اسکول جایا کرتا تھا اب تنہا جانے لگا۔ وہ ناہید جس کے لئے کیوپڈ کے خون آشام تیر اس کے سینہ میں بے طرح گھونپ دیئے گئے تھے، اب اس سے جدا کردی گئی، قریب ہوتے ہوئے بھی وہ اس سے دور تھی۔ ایک عجیب نیرنگی اس کو یہ محسوس ہوئی کہ جب وہ سماج کی بندشوں سے بے بہرہ اور بالکل ناآشنا تھے، اس وقت تو دنیا والے انہیں محبت کرنے سے نہ روکتے تھے، لیکن اب جبکہ اُن کے درمیانی تعلقات جڑ پکڑ چکے، جب اُن کی محبت کو، دائمی حیات کے دائرہ میں محیط کرلیا گیا۔ دنیا انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے تک نہیں دیتی۔ انہیں اس وقت جدا کیا جارہا ہے جب محبت کی سیڑھیاں تمام کی تمام طے کرلی گئیں۔ جب اُن کی محبت شباب کے منازل طے،

کر رہی ہے ــــ وہ منازل جہاں عشق حسن پر مچلتا ہے، جہاں پریم کا ساغر چلتا ہے ــ آہ! عشق کے دیوانے بچپن سے اُن کے نازک دلوں کے نشانے بنے رکھے تھے۔

قسمت دیکھئے! ــــ فیروزہ اور ناہید کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاتا ــ انہیں بھی تو حد درجہ محبت ہے، پھر کیوں اس کی طرح، اُن دونوں کو جدا نہیں کیا جاتا؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے سلیم کو عورت نہیں مرد بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔؟

بہرحال خواہ کچھ ہو لیکن سلیم اور ناہید کیلئے زیست کی ہیبتناک ناکامیوں کی ابتدا ہوگئی ــــ جو ہستیاں اس چیز سے بے خبر کہ زمانہ کی پابندیاں انسان کو کس طرح کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ حقیقی حیات کا مزا لے رہی تھیں اب زندگی کی اداسیوں اور قسمت کی سختیوں کیلئے وقف کر دی گئیں ــــ

لیکن سماج کی سختیوں نے اگرچہ انہیں ظاہر میں محبت کرنے سے روک دیا تھا لیکن محبت کی باطنی آنکھیں کسی طرح نہ بند کی جاسکتی تھیں۔ اب بھی وہ کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کا دیدار کر لیتے اور اسی دیدار کی چاشنی راتوں کو باطنی نگاہوں کے سامنے محوِ خرام ہو جایا کرتیں ــــ جب وہ ایک دوسرے سے ملتے تو وقتی طور پر اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر وہی گذرا ہوا "نشاط و کیف در آغوش" زمانہ آجاتا۔

حقیقی محبت [illegible] لینے والے انسانوں کی طرح سینہ [illegible] کے منہ سے اکثر اوقات اسی قسم کے نکلتے کہ "آہ! دنیا اور اس کے رہنے والے انہیں انسانوں کو جدا کرتے ہیں جن کی زندگی ہی ایک دوسرے کی قربت ہے۔ اور وہ لوگ جن کے ملنے کی کوئی اشد ضرورت نہیں، بے دھڑک ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں"۔ لیکن خواہ کچھ کہا جائے سماج کی بندشیں اس قسم کی باتوں سے ہلکی ہونے کے بجائے اور سخت گیر ہو جایا کرتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک خزاں رسیدہ صبح کو سلیم نے یہ خبر دی کہ اس کے والد کا تبادلہ الہ آباد کو ہوگیا۔

اب بتلایئے! زمانے سے کس طرح انتقام لیا جائے۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ اس معمولی انقلاب نے سلیم و ناہید کی اُداس و مغموم حیات میں کتنی مضمحل روحیں پھونک دیں؟ کون کہہ سکتا ہے کہ سلیم اور ناہید کی خوابگاہوں کی غمگین فضا کس قدر گرم خون آمیز آنسوؤں سے نمناک ہوگئی؟ وہ روتے جسقدر رو یا گیا۔ لیکن آہ! محبت کی ناکامیوں کی نہ مٹنے والی بھر اس کہ بقول غالب

ہے خونِ جگر جوش پہ دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

اُن کی آنکھیں اس پر بھی تشنۂ خون رہ گئیں ــــ اگر ان کی محبت کی روحانی آنکھیں ظاہری نگاہوں میں تبدیل کر دی جاتیں تو کسے معلوم ہے کہ ان کے تکلے کفِ سیلاب بن کر نہ رہ جاتے؟۔

افسوس! زمانے کی اذیت دہ نیرنگیوں کے خواہ کتنے ہی پیچھے پڑو اپنے قلم کی خواہ تمام تر جراٗت ختم کر ڈالو لیکن سماج کی بھول بھلیاں کسی ایک کو بھی "تکمیل شادکامی" کر کے نکلنے نہیں دیتی۔ یہی باعث تھا کہ ناہید کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ سلیم کی روانگی تیسرے دن بالکل ضروری ہے۔ وہ تیسرے دن ضرور الہ آباد چلا جائے گا اور اس کی تمنائیں ــــ آہ! اس کی جوان امنگیں ایک سرے سے سوختہ ہو کر رہ جائیں گی۔ ان دونوں نے بہت چاہا۔ اپنی تمام انتہائی اور امکانی کوششیں اس چیز پر صرف کر دیں کہ جانے سے پہلے اپنے مستقبل پر کچھ روشنی ڈال سکیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی مضمحل زیست کے ٹمٹماتے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیں لیکن پھر یہ خیال اُن کو اس سے روکتا تھا کہ کیا اُن کی محبت اس قدر کمزور اور پست ہمت ہے کہ انقلابات کے اثرات سے ختم ہو جانا چاہتی ہے؟ اور اگر یہ بھی خیال نہ کیا جائے تو کس آلہ سے اپنی حیات کا خاتمہ کر سکتے تھے؟ کیا وہ اپنا گلا گھونٹ لیتے یا فرہاد کی طرح "تیشہ بر سرِ خود بجائے چوبے" کے مضمون پر عمل کرتے؟ یہ بھی مان لیا جائے لیکن اس حقیقت کو کیونکر نظرانداز کیا جاسکتا ہے کہ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا،

اس کمزوری کو کس احساس سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ ــــ

آخرکار وہ دن آگیا جب لاتعداد وعدوں اور انتہائی الم آگین باتوں کے بعد سلیم کو رخصت ہونا تھا ــــ وہ یادگار دن جب ناہید کو اپنے آنکھوں کے نمناک ستارے سلیم پر نثار کر کے اس کو الوداع کہنی تھی۔

سلیم کا سفر الہ آباد تک کس طرح گذرا۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کچھ اچھی طرح لگا سکتے ہیں جو محبت کی الم انگیز ناکامیوں سے دوچار ہو چکے ہوں ــ ادھر ناہید بھی انتہائی افسردہ خاطر تھی۔ وہ کبھی زمانہ کو کوستی اور کبھی قدرت کو

سو ردِ الزام ٹھہراتی لیکن آخر الذکر غلطی کے بعد وہ تھرتھرا اٹھتی اور پھر ؟ آہ! پھر وہ سماج کی آہنی زنجیروں کو توڑ کر اپنی روح تک پہنچ جانے کی کوشش کرتی لیکن سب کچھ بے سود۔ اس کے لئے دہلی کا گوشہ گوشہ ویران ہو چکا تھا۔ اب اس وحشت خیز تنہائی میں صرف وہ وقت سکون آمیز اور کیف آلود ہوا کرتا جب اس کے پیارے سلیم کا خط "مسیر چشمی" کا باعث بنتا ــــ سلیم کا خط ایک بار نہیں کئی بار پڑھتی۔ کبھی اسے چومتی اور کبھی سینہ پر رکھکر دباتی ــ لیکن آہ! دائمی محبت سے سرشار ناہید اس پر بھی سیر نہ ہوتی۔ اس کا سوختہ جگر اس پر بھی "تکمیل سکون" حاصل نہ کر سکتا تھا۔

ایک سال کا عرصہ گذر گیا۔ اس دوران میں سلیم کئی مرتبہ دہلی آیا ناہید سے ملا اور اسکو تسلی بخش لفظوں سے اطمینان دینے کی کوشش کی ــ اس قصہ کو پڑھنے والوں میں سے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ناہید اور سلیم کی محبت مٹنے اور ختم ہو جانے والی محبت تھی ؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سلیم کے حسین و مکمل وعدے کسی قسم کی دروغ گوئی پر مشتمل کئے جا سکتے تھے ؟ مگر دنیا کی حسین اداؤں نے اس پرجوش محبت کو بھی سرد کر دیا ــ جس صورت میں سلیم کے خطوط ہر چوتھے دن آیا کرتے تھے اب ایک ایک ماہ کے بعد آنے لگے۔ پہلے وہ انتہائی رنگین ہوا کرتے تھے لیکن اب وہ حد درجہ خشک اور سادے ہونے لگے۔ یہ رنج ناہید کیلئے کچھ کم جاں سوز نہ تھا۔ اس غم میں کہ سلیم نے میری حقیقی محبت کو جس میں قدرت نے دائمی حیات کا عنصر شامل کر دیا تھا بھلا دیا۔ اس کی نرگسی آنکھیں بے رونق ہو کر رہ گئیں ــ اس کے خیالات کے محل ایک ایک کر کے گرنے لگے ــ وہ ایک ایسا پھول بنکر رہ گئی جس کو خزاں کے جانکاہ تھپیڑوں نے زمین پر گرا کر "نیم بسمل" کر دیا ہو آہ! وہ ایک ایسا پژمردہ پھول تھا جس کو گلچیں اپنی ٹوکری سے نکال کر پھینک دے "سبدِ گل فروش" سے نکالا ہوا وہ ایک کانٹا تھا جس کو محبت کی آندھیوں نے بہت دور ویرانے میں اڑا کر ڈال دیا تھا ــ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی آرزوؤں کا جنازہ نکالا جا رہا تھا۔ مسرت اور حقیقی خوشی تو پہلے ہی اس کے لئے دفن کی جا چکی تھی لیکن اب آہ! اب اس کی زندگی کا خون بہایا جا رہا تھا ــ

ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ سلیم جیسے عاشق کی طرف سے اس قدر بے اعتنائی کا طرزِ عمل دیکھکر ناہید کس قدر پریشان اور حیرت زدہ ہوتی ہوگی ــ

وہ ناہید جو بیوفائی کو لفظ بے معنی تصور کرتی تھی ــ غالب تو کہتا ہے کہ

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

لیکن معصوم ناہید اس کے بالکل برعکس بیوفائی کو ہی غیر ممکن سمجھ بیٹھی ــ کس قدر ناہموار تجربہ تھی معصوم ناہید کی! سلیم کی محبت کو لافانی سمجھ کر وہ شامِ فراق کو بھی صبح وصال اور "حیات شادکام" سمجھ رہی تھی ــــ اے کاش! اسے کوئی پہلے بتلا دیتا کہ زمانہ کی کروٹیں ایسے ایسے حیران کن انقلابات پیدا کر دیتی ہے جن کو انسانی عقلیں ناممکن اور غیر فطری تصور کر چکی ہوں ــ کیا وہ پھر بھی زہر ہلاہل کے کڑوے گھونٹوں کو "شراب کوثر" سمجھ کر چڑھا جاتی ؟ وہ شراب! جو عیش و نشاط سے لبریز دلوں میں اس نے سلیم کے ساتھ مل کر لنڈھائی تھی ــ افسوس! وہ پائیں باغ جو اس کی طفلانہ محبت کی یادگار تھا۔ جہاں وہ سلیم کے سر پر پھولوں کا تاج رکھا کرتی تھی اب اس قدر وحشتناک ہو کر رہ گیا کہ اس کی سبز روشیں پودوں کے خزاں رسیدہ پتوں سے ڈھک کر بالکل مفقود ہو چکی تھیں۔

انتہائی پریشانیوں کے بعد آخر کار فیروزہ کا ایک خط آیا مگر حد درجہ اضمحلال انگیز جس سے اس کے گہرے زخموں پر اچھی طرح نمک پاشی ہو گئی ــــ اس کا مضمون یہ تھا ــ

پیاری ناہید!

تم سوچتی ہو گی کہ فیروزہ کس قدر فراموش کار ہے کہ خط کا جواب تک نہیں دیا۔ نہ معلوم کیا کیا خیالات گردش کرتے ہوں گے، کیسے کیسے طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہوں گی۔ دل کی پرخلوص وسعتیں بے بنیاد بدگمانیوں سے سمٹ کر رہ گئی ہوں گی۔ مگر تمہیں نہیں معلوم کہ تمہاری فیروزہ کس قدر بیمار ہے، بخار کی شدت سے بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا روح حرارت سے گھبرا کر نکل جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر ناہید! اس جاں شکن کشمکش میں بھی بار بار ارادہ کیا کہ تمہیں خط لکھوں لیکن بخار کی شدت نے ایسا نہ کرنے دیا آج خصوصاً اس وقت رات کے دس بجے طبیعت کچھ مائل سکون ہے اسی لئے محنت کر کے یہ چند سطور صرف اس خیال کے زیر اثر لکھ رہی ہوں کہ تم میری معذوریوں سے آشنا ہو کر اس تاخیر کو بیجا تغافل پسندی پر محمول نہ کرو۔

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ سلیم کی حالت سے آگاہ کرتی رہوں گی،

آج تک اس وعدے کی تکمیل میں کوئی کوتاہی نہ کی لیکن آج آہ! مجھے سلیم کے متعلق کچھ لکھنا انتہائی سنگدلی معلوم ہوتی ہے۔ اُس خبر کو پہنچاتے ہوئے جو تمہاری اُداس اور نامکمل زندگی کے چند پژمردہ پھولوں کو بھی اڑا کر بالکل ویران اور مضمحل کردے گی میرا قلم رکتا ہے۔۔۔ لیکن نہیں ناہید مجھے اس قسم کا طرز نہ اختیار کرنا چاہئے۔ اگر میں نے تم سے وعدہ بھی نہ کیا ہوتا جب یہ میرا اخلاقی فرض تھا کہ ایک کمزور ہستی کو غلط فہمی میں مبتلا رہنے سے باز رکھوں۔

افسوس! زمانے کی گردشوں نے مجھے کس قدر جاں سوز فرض ادا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ فیروزہ جو ناہید کو انتہائی محبت کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی اور دیکھتی ہے آج اس خبر کی حامل بنی جو ناہید کے دل و جگر کو ۔۔۔ اس کی زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالنے کے لئے کافی ثابت ہوگی ۔۔۔ آہ! محبت کی نیرنگیوں نے مجھے کس قدر سنگدل بننے پر مجبور کر دیا۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ اب مجھے صاف صاف سب کچھ لکھ دینا چاہئے مجھے ابتدا خط ہی میں سب کچھ لکھ دینا چاہئے تھا لیکن یہ طرز میں نے صرف اسلئے اختیار کیا تاکہ تمہارا نازک جگر آہستہ آہستہ رنج اٹھانے کے قابل بن جائے اگر میں شروع میں ایسا تحریر کرنا پسند کر لیتی تو نہ معلوم تم پورا خط بھی پڑھ سکتیں یا نہیں اچھا اب سننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے اپنی تمام امکانی کوششیں اُن کو بیوفائی سے باز رکھنے کے لئے صرف کریں مگر افسوس! وہ نہ مانے اور اب کچھ عرصہ میں وہ کسی کے شریک حیات بننے والے ہیں۔

میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ میرے الفاظوں نے تمہارے دل و جگر کو مسل کر رکھ دیا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان چند مختصر الفاظوں نے تمہارے خرمن حیات پر برق کا کام کیا ہوگا لیکن مجبوری! اگر میں تمہیں یہ خبر نہ دیتی تو کچھ دنوں بعد تمہیں خود معلوم ہو جاتا پھر؟ اس درمیانی عرصہ میں تم ایک گہری غلط فہمی میں مبتلا رہتیں پھر کیا فائدہ تھا؟ اس پر بھی اگر تم مجھے قصوروار سمجھو تو سزا دے لو ۔۔۔ کوسو۔ اس قدر کوسو کہ میرا چراغ حیات گُل ہو جائے۔ اور میں تمہاری حسرت آگیں حالت کو دیکھ سکوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا تیز دماغ محبت کی پیہم ناکامیوں نے بیکار کر دیا ہے۔ آہ! کس دل سے سنوں ان باتوں کو قسم کھا کر کہتی ہوں کہ عیش و عشرت کی بہترین گھڑیاں اب خون فشانی میں گذرتی ہیں۔ وہ شعلے جو تمہاری یاد میں بھڑک رہے ہیں اپنے ناکام آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کرتی ہوں مگر بے سود ۔۔۔ بالکل بیکار ۔۔۔ اس وقت بھی تم اندازہ لگاؤ خط کے بعض حصص آنسوؤں نے خراب کر دیئے ہیں۔

معاف کر دینا ناہید اپنی فیروزہ کو جس نے تمہاری زخمی روح کو تڑپا دیا ہے۔ جس نے تمہارے گہرے زخموں پر چرکے لگائے ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں اگر تم چاہو تو سلیم کو دولہا بنتے دیکھ جانا میں زور نہیں دیتی۔ تم جیسا چاہو کرنا۔ دل و دماغ زیادہ اور کچھ لکھنے کی اجازت نہیں دیتے اسلئے معافی چاہتے ہوئے رخصت ہوتی ہوں۔ (دل فگار فیروزہ)

کیا دنیا والے ان جذبات کا کوئی معیار قائم کر سکتے ہیں جو اس خط کو پڑھ کر ناہید کے دل میں پیدا ہوئے ۔۔۔ بخصوصاً اس صورت میں جب ناہید کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ تک نہ نکلا ۔۔۔ ان آنسوؤں کے بجائے صرف ایک آہ تھی جو تمام رنج و الم اور آنسوؤں کے ہر ایک قطرے کو اپنے اندر پوشیدہ کئے ہوئے تھی۔ کون اندازہ لگا سکتا ہے ان احساسات کا جو ناہید کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوئے جب اس کی امانت سلیم کسی دوسری عورت کے پہلو میں بیٹھے دکھلائی دیتے؟ خواہ وہ تصور ہی میں یہ سب کچھ دیکھتی لیکن محبت کی روحانی آنکھیں تصور میں حقیقت سے بھی زیادہ بہت کچھ دیکھتی ہیں۔

اس حسرت آفریں حقیقت سے متاثر ہو کر ناہید کے دل میں کبھی یہ خیال بھی پیدا ہوتا کہ فیروزہ کے خط کا جواب نہ دے لیکن پھر خود سوچتی کہ اس بیچاری غریب کی کیا خطا ہے ۔۔۔ اسی خیال پر عمل کرتے ہوئے اس نے مندرجہ ذیل خط لکھنا شروع کیا۔

فیروزہ!

تمہارا ایک خط کافی عرصہ کے بعد موصول ہوا۔ یادکردگی کا شکریہ۔ تم نے اسکو یاد کیا جو انقلاب دہر کی خون آشام گردشوں میں مسل دی گئی ہے ۔۔۔ جو زمانے کی اس دشمنی سے جو لطف و کرم کے پردہ میں کی گئی بالکل ناکارہ کر دی گئی اور جو بقول شعرا "فلکی ستم ایجاد کا تختۂ مشق" بنی رہی ہے۔

پیاری فیروزہ! تم نے سلیم صاحب کی بیوفائی کا ذکر کرنے کے بعد اپنے آپ کو سزا کا مستحق بتلایا تھا۔ آہ! فیروزہ! کیا تم کو نہیں معلوم کہ میرا دل بہت پہلے سے پتھر ہو چکا ہے؟ مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا ۔۔۔ ہاں جب سلیم کی تغافل پسندی انتہا کو پہنچ گئی اس وقت ہی مجھ کو تمام حال معلوم ہو چکا تھا اس لئے اس قسم کی خبروں کا رنج میرے دل پر بالکل نہیں ہو سکتا۔ میرا دل

ہمیشہ کے لئے اس قسم کے اثرات قبول کرنے سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ میرے نزدیک تو تمہیں اس قسم کے افسوس ناک فرض کی ادائگی کے لئے داد دینی چاہیئے نہ کہ سزا!

بہن فیروزہ! میں بہت پہلے اس شعر کا مصداق بن چکی ہوں کہ؎

سارے دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
ہم نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

اگر میری پہلی بدگمانی میں غلطی کا شائبہ بھی تھا تو تمہارے خط نے مٹا دیا۔ مگر پیاری فیروزہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری محبت میں تم نے کسی قسم کی خلل اندازی کی ہے۔ نہ ہی میں سلیم سے شکایت کرتی ہوں۔ میں ان سے محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں — پہلے سے بھی زیادہ — ان کی خوشی میری خوشی ہے اگر ان کو اپنی بیوفائیوں پر مسرت حاصل ہوئی تو میرے لئے بھی یہ چیز باعث مسرت ہے وہ خوش ہیں میں بھی اسی میں خوش ہوں۔

تم نے لکھا تھا کہ اگر چاہو تو سلیم کو دولہا بنتے دیکھ جاؤ۔ فیروزہ تم میرے زخموں پر چرکے لگاتی ہو۔ کیا میں اتنی جرأت کر سکتی ہوں کہ انہیں دولہا بنتے دیکھوں — میں ایسا بھی کر سکتی تھی لیکن صرف اس خیال سے کہ مبادا میری صورت دیکھ کر اُن کی خوشی میں کوئی مضمحل احساس شعوری پیدا نہ ہو جائے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔

زیادہ کیا لکھوں دل و دماغ بیکار ہیں اسلئے رخصت ہوتی ہوں۔

ہمیشہ کے لئے! — (تمہاری ناہید)

ناہید نے انتہائی بیچینی کی حالت میں یہ خط لکھا اور سپرد ڈاک کیا۔ اس کے بعد اس نے مستقبل پر ایک سرسری نظر ڈالی اور آہ! اسوقت اسے کامل طور پر معلوم ہو گیا کہ سلیم کی بیوفائیوں نے اس کی زندگی کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور اب اس کا مستقبل بالکل تاریک ہے۔

وہ پریشان تھی۔ انتہائی پریشان! سلیم اپنے کئے ہوئے وعدوں کے لئے دروغ گوئی کا ثبوت دے چکے تھے مگر وہ ایسا نہ کر سکتی تھی۔ وہ ہو چکی تھی جس کا اسے ہونا تھا۔ اب اس کے خیال میں کوئی تدبیر نجات حاصل کرنے کی نہ تھی۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتی لیکن سلیم پہلے اس سے اس قسم کے فعل شنیع کے متعلق وعدے لے چکے تھے اور وہ آہ! وہ محبت کی دیوی سلیم کی مسلسل بے وفائیوں کے باوجود بھی اس کے دیئے ہوئے احکام — محبت کی معصوم درخواستیں اسے — منحرف نہ کر سکتی تھیں۔ اس کے نزدیک یہ انتہائی گناہ تھا کہ سلیم کی بیوفائیوں کا جواب بیوفائی سے ہی دے۔

پھر وہ پھر وہ کیا کرے؟ اس کا جواب اس کا بیکار اور افکار کے انبار سے دبا ہوا دماغ کچھ بھی نہ دے سکا اور موت و زیست کے عناصر میں خون ریز و خونناک جنگ ہوتی رہی۔

آخر کار اس نے سوچا کہ سلیم کو ایک آخری خط بھیج کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے چنانچہ اس نے قلم دوات اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

عزیز سلیم!

اگر میری ندائے درد تمہاری نشاط ریز زندگی میں چند لمحوں کے لئے مخل ہو جائے تو اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ تمہاری خوشیوں میں رخنہ انداز ہونے کی کوشش کروں۔ تم نے دوسری بار کسی اور سے محبت کی میں اس کی شکایت نہیں کرتی، ہاں میں ایک موہوم و نامعلوم خواہش کے زیر اثر جس سے میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے اس وقت خط لکھ رہی ہوں۔

اے کاش! تم سمجھتے کہ ناہید کی حیات ناکام تمہاری صرف ایک نگاہ التفات کی منتظر ہے اور بس!— کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ ناہید کی خونچکاں آنکھیں اب بھی تمہاری منتظر ہیں — سلیم تم سمجھتے ہو گے کہ تمہاری طرح میں بھی سب کچھ بھول چکی۔ نہیں سلیم! مجھے اچھی طرح یاد ہیں تمہارے پُر از محبت جملے جن میں سرور آفریں سکوت کی سینکڑوں دنیائیں مضمر تھیں۔ میرے کان اب بھی تمہارے نازک اور دلفریب وعدوں سے نغمہ قرار ہے ہیں۔ تم نہ سمجھو لیکن تمہاری اور صرف تمہاری ناہید ان نشاط آمیز دنوں کو نہیں بھول سکتی۔ جن کی گود میں تمہارے کیف آگیں الفاظ مچلتے تھے۔ خواہ تم نے ان سب باتوں پر سنگدلی کا پردہ ڈال دیا لیکن یاد رکھنا سلیم! کہ خواہ تم کسی اور کے ساتھ اپنے لمحوں کو کیف آمیز بنا لو لیکن تمہاری ناہید ہمیشہ تمہارے لئے تنہا زندہ رہے گی — میری زندگی کو موت کا پیام آ گیا۔ اور اب سلیم میں تم سے درخواست کرتی ہوں ...... درخواست نہیں بلکہ بھیک مانگتی۔ جس طرح پہلے تم نے میرے مانگنے پر اپنی فیاضی سے محبت کے چمکدار جواہر عطا کئے تھے اور مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ تمہاری محبت پر ناز کر سکوں اب بھی تم سے بھیک مانگتی ہوں — تمہاری اس اجازت کی بھیک مانگتی

ہوں کہ میں اپنی زندگی ختم کر لوں۔

سلیم تم بیوفا سہی لیکن میں تمہاری بغیر اجازت کچھ نہیں کر سکتی۔

جہاں اتنے احسانات کئے وہاں ایک کرم یہ بھی کر دو کہ مجھے مرنے کی اجازت مل جائے ـــ افسوس میں پھر شکوے کرنے لگی معاف کر دینا سلیم ـــ

دراصل میں اب وہ ناہید نہیں رہی۔ اس وقت بخار ایک سو پانچ ڈگری پر ہے نہ معلوم کس عالم میں لکھ رہی ہوں ـــ

تمہارا قیمتی وقت میری بیہودہ تحریر سے ضائع تو ضرور ہو گا مگر یہ سمجھ لینا کہ پھر کبھی ایسی تحریر پڑھنے میں نہ آئے گی۔ یہ تو یقین ہے کہ میرے متعلق چند الفاظ بھی لکھنا آپ توہین تصور کریں گے اسلئے آپ کی خاموشی کو ہی اجازت سمجھ کر مر جاؤں گی۔

مگر سلیم میں کیا بک رہی ہوں۔ تمہاری اجازت کے بغیر ہی قدرت خود اس کا فیصلہ کئے دیتی ہے ـــ آہ! سلیم جلد اجازت دیدو ورنہ میری روح بہت زیادہ اذیت سے نکلے گی ـــ آہ!

اچھا رخصت ہوں ـــ اپنے پیارے سلیم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتی ہوں ـــ (تمہاری ناہید)

ناہید نے خط لکھ کر نوکر کو سپرد ڈاک کرنے کے لئے دیا اور لیٹ گئی اس وقت اس کی حالت بخار کی شدت سے سخت خراب تھی۔ ماں باپ بھی آگئے اور آہ! ان کے دل سے کوئی پوچھے کہ اپنی نوجوان بیٹی کو موت کی بھینٹ چڑھتے ہوئے وہ کس قدر غمگین ہوں گے ؟

آخرکار وہ وقت آگیا جب سلیم کی بیوفائیوں کے بدترین نتائج ظاہر ہونے لگے ـــ جب ناہید کی روح بخار کی تپش سے بیچین ہو کر نکلنے لگی ـــ

آہ! اس وقت بھی ناہید کی آنکھیں سلیم کو تلاش کر رہی تھیں ـــ اس کی پھٹی ہوئی نیم وا آنکھیں اس عالم نزع میں بھی بربخت سلیم کو تلاش کر رہی تھیں لیکن سلیم وہاں کہاں تھا جو اس کی روح کو راحت بخشتا ـــ اس نے ہر طرف ایک حسرت آگیں آخری نظر ڈالی جس میں اس کی آرزوؤں کا ماتم کیا جا رہا تھا اور اس کی روح جسد خاکی سے جدا ہو گئی۔

ایک طرف کچھ کہہ کے رخصت ہو گیا بیمار غم
ایک طرف منہ موڑ کے رونے لگے تیمار دار

سلیم نے خط پڑھا، غور کیا اور رونے لگا۔ ناہید کا خط کس قدر غم انگیز تھا

یہ سب کو معلوم ہے کہ گذرے ہوئے دنوں کی یاد سلیم کے دل میں پھر چٹکی لینے لگی ـــ اس کی محبت پھر ایک بار اٹھی اور اسکو دیوانہ بنا دیا۔

اس نے دیوانہ وار کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر جاتا عجیب عالم تھا۔ آنسوؤں کا تار آنکھوں سے جدا نہ ہوتا تھا۔ آخرکار وہ کمرے سے نکلا لیکن نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ فیروزہ اس کی بہن دیوار سے لگی ہوئی کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ ہے۔ اور وہ دیوانوں کی طرح آسمان کو تک رہی ہے۔

سلیم بڑھا اور فیروزہ کے ہاتھ سے پرچہ لیا۔ وہ تار تھا جو سلیم کے نام آیا تھا۔ "لکھا تھا":

"ناہید مر رہی ہے جلدی آؤ"

آہ! کس قدر رلا دینے والا تھا غم ـــ کس قدر جانکاہ واقعہ۔ سلیم نے ایک آہ کی اور فرش زمین پر بیٹھ گیا۔ کون جانے اس وقت اس کے دل میں کیا جذبات موجزن تھے ؟ اس نے مستقبل ماضی اور حال، سب پر ایک سرسری نظر ڈالی اور حال پر آکر رک گیا۔ کس قدر گنہگار ہوں میں ناہید۔ اس نے دیوانوں کی سی بڑبڑاہٹ کے ساتھ یہ الفاظ ادا کئے اور ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ـــ

"او ناہید! او وفادار ناہید! میں گنہگار ہوں۔ شیطان سے بھی زیادہ گنہگار۔ میں نے ایک معصوم عورت کو قتل کیا ہے اور یا خدا سلیم اور قاتل ؟! ناہید معاف کر دے مجھ کمبخت کو۔ اے پاک خدا بخش دے مجھے"ـــ

اتنا کہکر وہ اٹھا اور پاگلوں کی مانند ہاتھ جوڑے باہر نکل گیا ـــ مگر افسوس یہ سب کچھ بے سود تھا جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور اب ـــ آہ! اب کچھ نہ تھا ـــ

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا،

پیکر افلاس!

از جناب قاضی محمد عبداللہ صاحب نئی دہلی

منظر اک شامِ رنگیں ہے سرِ بزمِ خیال
وسعتِ تخئیل سے ہر بات تھی سحرِ حلال

پاؤں پر مغرب کی دیوی کے سرِ خورشید تھا
اور ہلالِ نو کا گردوں مطلعِ اُمید تھا،

بھر رہا تھا دامنِ تنویر پر لمبے قدم
سرنگوں اک مست و بیخود سا دھندلکا دمبدم

حسرت آگیں شام کی دیوی کی تھی مستانہ چال
لب پہ ٹھنڈی سانس اور بکھرے ہوئے شانو پہ بال

سینۂ تنویر پر مستی سے لہراتے ہوئے
آرہے تھے تیرگی کے سانپ بل کھاتے ہوئے

ہر طرف عکسِ شفق پھیلا رہا تھا آسماں
سُرخ سنجافوں کا ہوتا تھا منڈیروں پر گماں

تھیں فضائیں دم بخود سی وجد میں تھا آسماں
محفلِ انجم میں چھڑنے کو تھی شب کی داستاں

رائے سینا جلوہ گاہ جنتِ شدّاد تھا،
حسن تھا یا مطلعِ حسنِ جہان آباد تھا

جمگھٹوں میں زلفِ شبگوں کے رخِ پُر آب و تاب
اس طرح، ہالے میں جیسے آگیا ہو ماہتاب

سانس کے ہر تار پر صدہا ترانے بیقرار
انکھڑیوں میں بادۂ گلرنگ کا ہلکا خمار

نازنینوں کے تبسم کی بہارِ جانفزا
بن گئی معصوم کلیوں کی چٹک کا ماجرا

بانٹتی پھرتی تھی آ آکر دماغوں میں نسیم
گلرخوں کے غازۂ مشکیں کی جاں پرور شمیم

ہوش کی دنیا پہ یہ چھائی ہوئی سرمستیاں
بن رہی تھیں منظرِ تعبیرِ خوابِ قدسیاں

الغرض اس اژدہامِ رنگ و بو کے درمیاں
موجزن تھا بیخودی کا ایک سیلابِ رواں

مستیوں کی بارشیں تھیں اور میں مدہوش تھا
کس طرف کو جارہا ہوں یہ بھی کس کو ہوش تھا

رائے سینا سے پرے کچھ، ریل کی پٹری کے پاس
تھی تکلم نوش خاموشی فضائیں تھیں اُداس

اونچی اونچی سنسناتی گھاس لہراتی ہوئی
سہم جاتی تھی نظر بھی اس طرف جاتی ہوئی

لانبے لانبے اونچے اونچے ظلمتوں کے پہرہ دار
چلتے پھرتے تھے فضاؤں میں قطار اندر قطار

میں تخیل کی زباں سے راگنی گاتا ہوا ؛ آگیا اس خامشی میں دل کو بہلاتا ہوا
چلتے چلتے یک بیک میری نگاہیں رک گئیں ایک متحرک سی شے پر آکے پلکیں جھک گئیں
دیکھتا ہوں ریل کی پٹری پہ اک عورت اُداس جس کے چہرے پر نقاہت جس کی صورت پر ہے یاس
چُن رہی ہے چھوٹے چھوٹے پتھروں کی آڑ سے کوئلے، جو ریل کے انجن سے جل کر گر گئے،
پاس اک گٹھری میں ہے سرمایۂ جانِ حزیں کوئلے وہ، راکھ جن پر نصف سے کچھ کم نہیں
مفلسی کا ہیں یہ عالم دیکھ کر تھرا گیا، بیکسی انساں کی پر مجھکو خدا یاد آگیا
آہ وہ عورت کہ جو عظمت کی ہو سرمایہ دار آہ وہ عورت جو فطرت کا ہے رنگیں شاہکار
آہ وہ عورت جو کہلاتی ہے جانِ زندگی آہ وہ عورت جو ہے روحِ روانِ زندگی

جس کو قدرت نے کیا ہو صنفِ نازک میں شمار
اس سے بہتر بھی ہے ... کام ... روزگار

ایک عورت ہے کہ ہے مصروف تزئینِ لباس ایک عورت ہے کہ فکرِ زندگانی سے اُداس
وہ بھی عورت ہے کہ جس پر نازنیں سو سو نثار جس کے غازے کا ہوائیں بانٹتی ہیں اشتہار
یہ بھی عورت ہے کہ فاقوں سے ہے گھبرائی ہوئی فرطِ خشکی سے لبوں پر بات تھرائی ہوئی
اُس طرف سو نازنیں بوئے حکومت کبر و ناز اِس طرف تشکرانہ لب پر مستقل خوئے نیاز
اُس طرف غازے کا اک سنجاف سیمیں ہے عیاں اِس طرف رخسار و ساعد پر خراشوں کے نشاں
اُس طرف ہوتی ہے کھانوں پر حقارت کی نظر اِس طرف پتھر رکھا جاتا ہے خالی پیٹ پر
اُس طرف زیبِ بدن سنجاب و قاقم پرنیاں اِس طرف لٹکی ہوئی دامن پہ سو سو دھجیاں
اِس قدر یہ قحط انصاف مشیت ہائے ہائے اِس قدر دکھتے ہوئے دل پر جراحت ہائے ہائے
اِس کو بھی قدرت نے گر بخشا ہے نسوانی غرور، اِس کا دل بھی چاہتا ہوگا سنورنے کو ضرور
اِس کو بھی رکھتی نہ ہو تزئین کی خواہش بیقرار گدگداتی ہو نہ اس کو بھی جوانی کی بہار
اِس کو بھی محنت میں آسائش کی یاد آتی نہ ہو اپنی قسمت پر کبھی یہ خون رو جاتی نہ ہو

ان مصائب میں ولیکن کس قدر مجبور ہے
یا خدا کب تک یہ تجھکو امتحاں منظور ہے

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی باتصویر رسایل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۷ | نمبر ۱۹

فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۲۷ء

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شایع کیا۔

مُلاحظات!

اُردو اور ہندی۔ "اُونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی"

آج یہ ضرب المثل بدقسمت ہندوستان پر صادق آتی ہے۔ جو اپنی تباہی، بربادی اور مفلوک الحالی کی طرف سے آنکھیں بند کئے مذہبی تعصب کی ایک ایسی رو میں بہا چلا جا رہا ہے جو معلوم نہیں اُسے کس ہولناک قعرِ مذلت میں گرا کر چھوڑیگی؟

ابسے کچھ عرصہ پیشتر تو گلئے پیپل کی ٹہنیاں مسجدوں کے آگے باجہ بجانا اور جلوسوں کے راستوں کا تعین ہی اس المناک نزاع کا باعث بنا ہوا تھا۔ لیکن اب زبان کے مسئلہ نے ایسی پیچیدہ صورت اختیار کرلی ہے کہ ہمارے خود غرض لیڈروں اور رہنماؤں کا ناخنِ تدبیر اس مشکل کو حل کرنے میں بے بس نظر آرہا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان ہے۔ اور اس بیل کو منڈھے چڑھانے میں دونوں قوموں کا اشتراکِ عمل ہمیشہ بروئے کار آیا ہے۔ ہندوؤں کے سنجیدہ اور معقولیت پسند طبقہ کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن ہمارے بعض لیڈر جو شاید ہماری شامت اعمال کے صدقے میں "صورت نادر" بنے ہوئے ہیں، اپنی لیڈری کو قائم رکھنے کیلئے آئے دن ایسے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں جو تعصب کی آگ پر ہمیشہ تیل اور ہوا کا کام دیتے ہیں۔

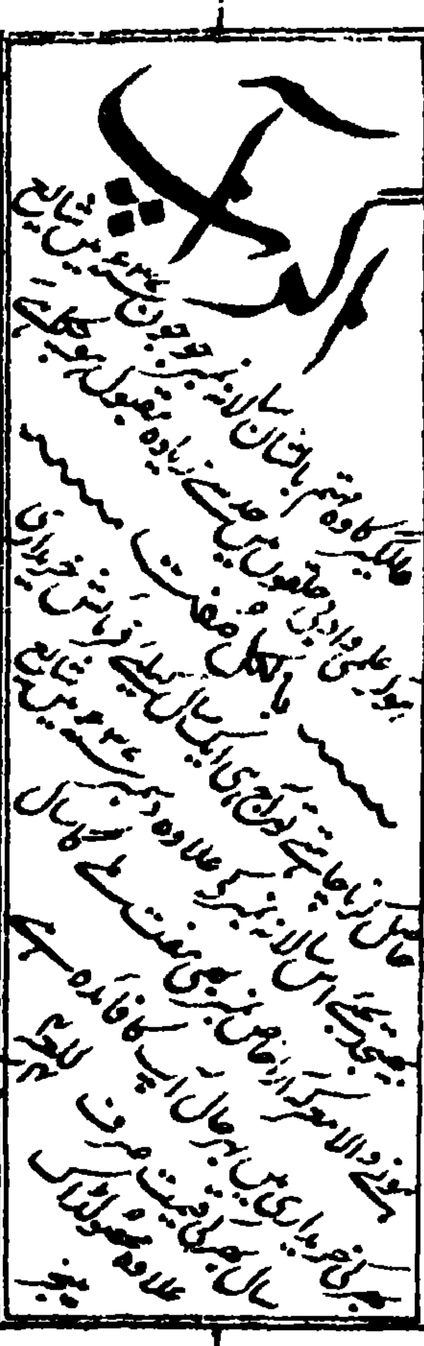
ہمیں اس بات پر قطعی کوئی اعتراض نہیں کہ ہندی کی مدد یا سرپرستی کیوں کی جاتی ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ زبانوں کی ترویج و ترقی کے لیسے طریق کار سے اجتناب کیا جائے۔ جو کشیدگی تعلقات کی خلیج کو وسعت دینے کا موجب ہے۔ بلکہ حامیانِ اُردو و ہندی نہایت سلامت روی اور نیک نیتی کے ساتھ اپنی اپنی راہوں پر گامزن رہیں۔

ہمارے برادران وطن کی اکثریت از بسکہ بہت زیادہ دولتمند اور مرفہ حال ہے۔ اور اس کے کانوں میں یہ بات ڈالدی گئی ہے۔ کہ اُردو تو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہندوؤں کی زبان صرف ہندی ہے۔ لہٰذا ہندوؤں کو ہندی کی ترویج و ترقی میں ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہیئے۔ یہ بات سن کر ریاستوں کے حکمرانوں۔ سیٹھوں اور ساہوکاروں نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ کوئی ہندی کے لئے ایک لاکھ روپیہ دے رہا ہے، کوئی اسی ہزار، کوئی پچاس ہزار۔ اس جرأت آفریں سرپرستی نے ہندی زبان کے رسائل و اخبارات کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ آپ ہندی کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھیئے اس میں آپ کو اس کثرت سے اشتہار نظر آئینگے کہ سارے رسالہ کا خرچ جو ہزارہا کی تعداد میں چھپتا ہے صرف اشتہارات کی آمدنی سے پورا ہوسکتا ہے۔

اب اس کے مقابلے میں آپ اُردو رسائل و اخبارات کی کس مپرسی ملاحظہ فرمایئے کہ نہ ان میں اشتہارات کی کثرت ہے، نہ خریداروں کی فراوانی، نہ ان کو ایسے حساس سیٹھ اور ساہوکار میسر ہیں جو مستقلاً ان کی مدد کرتے رہیں۔ لیکن اس تہیدستی اور بے مائگی کے باوجود اُردو کو جو شہرۂ آفاق اور عالمگیر فروغ حاصل ہو رہا ہے وہ اس کی ہردلعزیزی اور نظم و نثر کی حلاوت کا ایسا بیّن ثبوت ہے۔ جس کے دوست و دشمن سب مداح ہیں۔

لیکن موجودہ اور آئندہ حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے جو اُردو اور اُس کی ہردلعزیزی کے لئے خوشگوار نہیں کہی جاسکتی۔ اس لئے حامیان اُردو (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں) کا اولین فرض ہے۔ کہ وہ اُردو رسائل و اخبارات کی ہر ممکن طریق سے مدد کریں۔ خود مستقل طور پر خریدار بننے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی خریدار بنائیں اور کوئی ایسا دقیقہ فروگذاشت نہ کریں جس سے اُردو کی ہمدردی اور ترقی کا پہلو نکلتا ہو۔

یقین ہے کہ میری ان گذارشات کو شرف قبول حاصل ہوگا۔



خیّام

عالمگیر کی گذشتہ اشاعت میں میں نے خیّام کے متعلق ایک سرسری اور مجمل اعلان شایع کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا، کہ ستمبر کے عالمگیر میں اس **ہفت روزہ باتصویر** اخبار کے متعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ اظہار رائے کرونگا۔ **خیّام** کے انتظامات کی تقریباً تکمیل ہو چکی ہے۔ غالباً ۲۰ یا ۲۵ ستمبر تک اس کا پہلا پرچہ شایع ہو سکے گا۔ اخبار کا سائز بڑا یعنی ۲۰×۳۰/۸ ہوگا اور ضخامت تصاویر کے صفحات سمیت ۳۲ صفحے ہوگی۔ گویا ایک سال میں بڑے سائز کے تقریباً **سترہ سو** ۱۷۰۰ صفحات بہترین مضامین اور تصاویر کے پیش کریگا۔ اور اگر ان صفحات کو درسی کتابوں کی شکل دے دی جائے تو ان صفحات کی تعداد **چھ سات ہزار صفحات** تک پہونچتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں قیمت سالانہ صرف پانچ روپے علاوہ محصولڈاک ہوگی اور ایک پرچے کی قیمت دو آنہ ۲؍ کیا آپ کوئی ایسی نظیر پیش کر سکتے ہیں کہ آج تک آپنے بلند پایہ اور گرانقدر مضامین تو درکنار معمولی اور ادنیٰ درجے کے مضامین کی کوئی ایسی باتصویر کتاب خریدی ہے۔ جس کی قیمت **پانچ روپے** اور حجم چھ سات ہزار صفحات ہو؟

خیّام اور صرف **خیّام** ایک سال خریدنے کے بعد آپ یقیناً فخر کے ساتھ اپنے احباب سے کہہ سکینگے کہ ہم نے بہت **بڑے سائز** کی ایسی باتصویر کتاب صرف پانچ روپے میں خریدی ہے جس کی ضخامت بیحد بلند پایہ مضامین کے **۱۷۰۰** صفحات پر مشتمل ہے۔

مزید رعایت ۔ عالمگیر اور صرف عالمگیر کے خریداروں سے جو خیّام کے پہلے نمبر سے اس کی خریداری قبول فرمائینگے اس کی قیمت **پانچ روپے** کی بجائے **چار روپے** لی جائیگی۔ اور لطف یہ کہ جب تک وہ خریدار رہیں ان سے **چار روپے** ہی قیمت علاوہ محصولڈاک وصول کی جائیگی۔ اگرچہ حالات و مصارف کے پیش نظر کبھی **خیّام** کی قیمت پانچ روپے سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

خیّام کے ہر پرچے میں بالالتزام متعدد یک رنگی تصاویر کے علاوہ ایک قابل دید سہ رنگی تصویر بھی ہوگی۔ اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف سہ رنگی تصویر ہی پورے ایک پرچہ کی قیمت یعنی دو آنہ کے مقابلہ میں سستی ہوگی۔ سرورق بہترین آرٹ پیپر پر کئی رنگ میں چھپا ہوا ہوگا۔

عالمگیر کے ناظرین کرام کو **خیّام** کے نمونہ کی فرمائش بھیجنے کی ضرورت نہیں، چونکہ ادارہ خیّام کو پختہ یقین ہے کہ عالمگیر کے تمام ناظرین کرام اس عہتم بالشان اور کثیرالمصارف ہفت روزہ اخبار کی بھی ضرور سرپرستی قبول فرمائینگے اس لئے تمام ناظرین کرام کی خدمت میں **خیّام** کا پہلا پرچہ **بطور نمونہ خود بھیجدیا جائے گا** ۔ نمونہ کے لئے کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں اگرچہ خیّام کی ضخامت اور قیمت کے متعلق کسی قدر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ لیکن خیّام ہر پہلو سے کس قدر شاندار۔ کتنا باصرہ نواز اور کیسا دلکش ہوگا، اس کا جواب **خیّام** کے صفحات میں موجود ہے، وہ خود کہے گا کہ اس کے غریب مگر عالی حوصلہ پبلشر نے مجھ کو ہمہ وجوہ کامیاب بنانے میں کتنی محنت شاقہ سے کام لیا ہے۔ کتنی خطیر و کثیر اور حوصلہ شکن رقم مجھ پر صرف کی ہے۔ یہ واقعہ ہے، کہ اپنے بلند عزائم کی تصویر جو میرے تخیل نے میرے صفحۂ دل پر کھینچ دی ہے۔ اس کو میں اس کاغذی صفحہ پر پیش نہیں کر سکتا۔ آپ ملاحظہ فرمائینگے کہ **خیّام آسمان صحافت کا ایک ایسا نیّر تاباں ہے** جس کی درخشانی دنیائے علم و ادب کو بقعہ نور بنا دیگی۔ فی الحقیقت **خیّام** اپنی نظیر آپ ہوگا۔ اور اس کی ہر اشاعت اپنی پہلی اشاعت کیلئے قابل رشک ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ عالمگیر کے سلسلہ میں آج تک جتنے اعلانات میری طرف سے شائع ہوئے وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئے۔ **خیّام** کے سلسلہ میں بھی جو اعلانات میں شایع کرونگا ان کی صحت و صداقت کیلئے میں ذمہ دار ہوں۔ ناظرین عظام کو میں یقین دلاتا ہوں کہ انشاءاللہ تعالیٰ میں خیّام کو ہندوستان بھر کا بہترین اور ہر لحاظ سے عہتم بالشان اخبار بنانے کی ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لاؤنگا جو میرے حیطۂ امکان میں ہے احباب کرام کا بھی یہ علمی فرض ہے کہ وہ میری کوششوں کو کامیاب بنانے کیلئے میرے ساتھ تعاون فرمائیں خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد محبان عالمگیر کی مخلصانہ اعانت خیّام کیلئے بہت ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

(حافظ) محمد عالم عفی عنہ

ادبِ لطیف!

جگ بیتی یا آپ بیتی؟

ایک نہایت دلچسپ افسانہ

از جناب چوہدری عبدالرشید صاحب تبسم - بی - اے

۔۔۔۔ ا ۔۔۔۔

اے دوست!

یہاں سے سات سمندر پار ایک ولایت سنگدیپ ہے۔ اس میں جابجا پیچ وخم کھاتی ہوئی ندیاں بہتی ہیں۔ پانی کی افراط کی وجہ سے تمام وادیاں نرم نرم سبزہ زار سے بھری رہتی ہیں۔ وہاں ہوا کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ ان وادیوں سے بھینی بھینی خوشبو اپنے دامن میں بھر کر قرب وجوار کی بستیوں تک چھوڑ آئے۔ سنگدیپ کے باشندے بہت حسین ہیں۔ لوگوں کی زندگی نہایت سادہ ہے۔ پھول انھیں بہت مرغوب ہیں۔ امیر اور غریب سب پھولوں کے بستر پر سوتے ہیں۔ عورتیں پھولوں سے طرح طرح کے زیور بناکر پہنتی ہیں۔ اس طرح انھیں ہر شب نیا زیور میسر آجاتا ہے۔ کسان بھی ہل چلاتے وقت پھولوں ہی کے گیت گاتا ہے غرضیکہ وہاں چپے چپے پر شاعری کے چشمے اُبلتے ہیں۔ کہتے ہیں جب حضرت آدم کو بہشت سے نکل جانے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے آسمان سے اترتے وقت تمام روئے زمین پر نگاہ دوڑائی اور آخر سنگدیپ ہی کی طرف رخ کیا کیونکہ اس کی سرزمین بہشت سے کچھ ملتی جلتی تھی۔ سنگدیپ کے شمال میں ایک فلک بوس پہاڑ ہے اس کی بالائی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔

اس پہاڑ کی ایک چوٹی پر دو پتھر پاس پاس پڑے تھے۔ یہ بات انھیں خود بھی معلوم نہ تھی کہ وہ کب اور کیسے اتنی بلندی پر پہونچ گئے۔ وہاں سے آسمان بھی قریب تھا اور سنگدیپ کی تمام آبادیاں بھی صاف نظر آتی تھیں دن بھر یہ پتھر سنگدیپ کی طرف چپ چاپ آنکھیں جمائے انسان کی سرگرمیوں کو تکتے رہتے۔ شام قریب ہوتی تو ذرا آنکھ جھپکتے۔ پھر آپس میں کچھ کھسر پھسر کرتے اور ایکدم قہقہے لگانے لگتے۔

ایک کہتا۔ "انسان کتنا بیوقوف ہے۔ کھلی ہوا کے نرم نرم جھونکوں اور سورج کی تھرتھراتی ہوئی کرنوں سے بھاگتا ہے۔ بھلا چونے اور اینٹ کے مکان میں بند ہوکر اسے کیا مزا آتا ہوگا۔ دو گھنٹے بھی تو کھلی ہوا میں نہیں ٹھہرتا خدا جانے اسے کیا ہوگیا ہے اور اس کے بے ڈھنگے سے جسم کو تو دیکھو۔ سر سے پاؤں تک کپڑے کی تہہ میں چھپا ہوا پاؤگے۔ مجھے انسان پر بڑی ہنسی آتی ہے۔ اپنے آپ کو بندوں میں اس طرح جکڑنے کے بعد کہتا ہے اب میں مہذب ہوں۔ ہمیں دیکھو! ہوا کے نرم و نازک جھونکے لوریاں دیتے ہیں۔ نہ ہمیں کپڑے کی ضرورت نہ مکان کی۔ برف کے گلے ہمارا لباس۔ آسمان ہمارے مکان کی چھت اور زمین اس کا فرش قہ قہ قہ"۔

دوسرا کہتا۔ "اور اسے بھی جانے دو۔ کل رات تم نے کچھ سنا جب دیوتا رقص کرنے کیلئے یہاں آئے۔ کیا باتیں کر رہے تھے؟ اب انسان دیوتاؤں سے باغی ہو رہا ہے۔ یہ تو سچ مچ ہی اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھ بیٹھا۔ رات ایک دیوتا کہہ رہا تھا اب یہ ٹھگنا (انسان) اس پہاڑ کو اڑا دینے کی تجویزیں کر رہا ہے۔ تم سوچو، یہ پہاڑ مقدس دیوتاؤں کی تفریح گاہ ہے۔ انسان کو ایسی حرکت زیبا ہے۔؟ دیکھو ہم اپنی جگہ سے ہلتے تک نہیں ہیں"۔

"اچھا تو دیوتا انسان کو ضرور سزا دینگے"۔

"یہی کہہ رہے تھے کہ زمین کو دو ایک جھٹکے دیکر اوپر سے تھوڑا

سا پانی پھینک دیا جائے تو انسان کا دماغ درست ہو جائیگا۔ قہ قہ قہ قہ یہ ایک اور تماشا دیکھنے میں آئیگا۔ کیوں بھائی ہم کتنے محفوظ ہیں؟

دونوں پتھر شام سے لیکر پہر رات گئے تک اسی طرح انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نکتہ چینی کرتے رہتے۔ اس اثنار میں پہاڑ کی چوٹی پر دیوتا پہونچنے شروع ہو جاتے۔ سارے دیوتا اکٹھے ہو جاتے تو خوب ہنسی مذاق ہوتا اور قہقہوں سے فضا گونج اٹھتی۔ ہر دیوتا دن بھر کی سرگزشت بیان کرتا اور انسان کی مجبوریوں کا خاکہ اڑاتا۔ اس محفل میں جب کبھی انسان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کا ذکر آتا تو تمام دیوتاؤں کو پھریری سی آجاتی۔ گپ شپ کے بعد دیوتا ناچنا شروع کر دیتے اور کوئی ۔۔ پہر رات تک اسی شغل میں مصروف رہتے۔ رقص سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کام پر جانے سے پہلے وہ پھر چند لمحوں کیلئے بیٹھ جاتے۔ اور ایک ایک کر کے اگلے دن کا پروگرام سناتے۔ پتھر یہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے مگر خاموش رہتے وہ اپنے آپ کو بہت دانا سمجھتے تھے۔ کیونکہ زمین اور آسمان کا کوئی راز ایسا نہ تھا جو ان سے پوشیدہ ہو۔ دونوں پتھر انسان کو حقارت آمیز رحم کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ سنگلدیپ میں رونما ہونے والے واقعات کو دیکھ کر پتھر یہی کہتے۔ "انسان مجبور ہے اس لئے یہ رحم کا مستحق ہے مگر یہ کمبخت بات بات پر دیوتاؤں کے خلاف بغاوت پر تل جاتا ہے نا بابا یہ رحم کا حقدار نہیں"۔

اے دوست! ان پتھروں سے انسان کی کوئی بات چھپی نہ تھی۔ مگر پھر بھی ان کے دل میں ایک کھٹک سی ضرور موجود رہتی۔ وہ اپنے متعلق کچھ جاننا چاہتے تھے لیکن یہ انھیں خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا جاننا چاہتے ہیں؟ دیوتا دنیا کی ہر چیز کا ذکر کرتے مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ ان پتھروں کے متعلق بھی کوئی دیوتا ایک آدھ کلمہ کہدے۔ پتھر ایک دوسرے سے کہتے۔ "ہم بہت دانا ہیں اس لئے دیوتا ہمیں حقیر سمجھ کر تو نظر انداز کر نہیں سکتے ضرور کوئی اور بات ہوگی"۔

پھر کہتے۔ "ہم کتنے ہی دانا سہی۔ مگر آخر پتھر ہیں اور پتھر کو زندگی کی کشمکش سے واسطہ؟ یہ کشمکش انسان ہی کو مبارک رہے ہم یونہی اچھے ہیں"۔

۲

اسی طرح دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ مگر ان پتھروں کی حالت میں تبدیلی نہ ہوئی۔ ایک رات دیوتا خلاف معمول بہت دیر تک نہ آئے۔ پتھر بیتابی سے کبھی سنگلدیپ پر نگاہ دوڑاتے اور کبھی آسمان کی طرف متجسس نظروں سے دیکھتے۔ مگر دیوتاؤں کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ پتھروں کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ کبھی وہ کہتے شاید دیوتاؤں نے اپنے لئے پہاڑ کی کوئی اور چوٹی پسند کر لی ہے۔ پھر وہ کہتے یہ کیونکر ہو سکتا ہے خود دیوتا بارہا کہہ چکے ہیں کہ رقص کیلئے اس سے بہتر چوٹی اور کوئی نہیں۔ انھیں یہ خیال بھی گذرا کہ ہو نہ ہو دیوتاؤں کو علم ہو گیا ہے کہ ہم ان کی ہر بات سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ضرور خیال کیا ہوگا کہ شاید ہم کسی دن ان کا کوئی راز فاش کر دینگے۔ مگر ہم کس کے سامنے افشائے راز کر سکتے ہیں۔ یہاں تک تو کسی انسان کی رسائی ہی نہیں۔ آخر دونوں پتھر اس بات پر متفق ہوئے کہ آج تمام دیوتا ملکر کسی بڑی مہم پر گئے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا؟

پتھر ابھی یہ قیاس آرائیاں کر ہی رہے تھے کہ ہوا زور سے چلنے لگی۔ اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ آسمان تاریک ہو گیا اور فضا میں درندوں کی سی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دیوتا آپس میں لڑ بھڑ کر گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر ہوا کے طوفان پہلے بھی آئے تھے مگر آج کا طوفان دہشت اور ہیبت میں اپنی مثال آپ تھا۔ پتھروں کے دل سہم گئے اور انھیں چاروں طرف تباہی ہی تباہی نظر آنے لگی۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکتے تھے۔ یکایک طوفان کی رفتار پہلے سے بیسیوں گنا زیادہ ہو گئی۔ اب پتھر اپنے آپ کو سنبھالنے پر قادر نہ ہو سکے۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور پیشتر اس کے کہ وہ ایک دوسرے کو الوداع کہہ سکیں پہاڑ کی چوٹی سے لڑھک کر کئی فرسنگ نیچے پہونچ گئے لڑھکتے وقت ان کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا مگر اب یہ فاصلہ انچوں سے گزوں اور گزوں سے میلوں میں تبدیل ہو چلا تھا۔ وہ مختلف سمتوں کو لڑھکتے تھے کسی کو دوسرے کی حالت کا علم نہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک پتھر اپنے متعلق بھی صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ جب وہ ایک پتھر کا سہارا لینا چاہتا ہے تو وہ اسے لڑھکا کر آگے دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے۔ کسی

جگہ خود بخود رک جانا ان کے اختیار میں تھا۔ اور کوئی دوسرا پتھر انھیں سہارا دینے کو تیار نہ تھا۔ ان پتھروں کے چہرے مسخ، تمام اعضا شکستہ اور جسموں سے ٹکڑے کٹ کٹ کر جدا ہوگئے۔ شدت درد اس حد تک پہونچ گئی جہاں سے بےحسی کی ابتدا ہوتی ہے۔

زمین کی سطح تک پہونچتے پہونچتے پتھر بالکل گھس گئے تھے۔ ایک پتھر ابھی زمین سے چند فٹ بلند ہی تھا کہ بالکل ریت ہو کر رہ گیا۔ تند و تیز ہوا کا ایک جھونکا بگولے کی صورت میں آیا اور اس مٹھی بھر ریت کو اپنے دامن میں لپیٹ کر چلتا بنا۔ وہ بگولا اس ریت کو کہاں لے گیا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ دوسرا پتھر بھی ٹھوکریں کھاتا اور سر پٹکتا سطح زمین کی طرف آرہا تھا کہ زمین پر پہونچتے پہونچتے اس میں سے ایک نہایت چمکدار چیز برآمد ہوئی جس نے اندھیرے میں چمک چمک کر فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیوتاؤں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دیوتا فضا کو تاریک سے تاریک تر بنانا چاہتے تھے انھیں یہ بغاوت سخت شاق گذری۔ اے دوست! ان دیوتاؤں نے اسے اٹھا کر سمندر کی تہ میں پھینک دیا۔ دراصل وہ ایک لعل تھا جو صدیوں سے پتھر کے دل میں پرورش پا رہا تھا۔

یہ تھا دو دانا پتھروں کا حشر!

۳

اے دوست! تم پوچھتے ہو کہ میری زندگی ان دو پتھروں میں سے کس پتھر کی زندگی کے مشابہ ہے؟ آہ اس کا مجھے خود بھی علم نہیں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں کسی بلند مقام پر رہتا تھا۔ مجھے زمین و آسمان کے سب راز معلوم تھے مگر یہ کھٹک میرے دل میں تھی کہ مجھے اپنے متعلق بھی کچھ معلوم ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آخر ایک دن مصائب و آلام کا طوفان اٹھا اور اس نے مجھے میری بلند نشست گاہ سے لڑھکا دیا۔

اے دوست اس وقت مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کس مقام پر ہوں اور میری منزل ابھی کتنی دور ہے۔ میرا جسم زخموں سے چور ہے۔ میں بےحس ہوں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں جہاں گرتا ہوں وہاں سے آگے پھینک دیا جاتا ہوں۔

مگر اے دوست! میں تجھ سے ایک دفعہ ضرور ملونگا۔ اگر میں لعل کی صورت میں باقی رہ گیا تو کسی ایسے تاج کی زینت بنونگا جسے ایک دن تیرے قدموں پہ نثار ہونا ہو۔ اور اگر ــــــ اگر میری مٹھی بھر خاک کو ہوا لے اڑی تو پھر؟ ـ

اے دوست! میں پھر بھی ایک بار تجھ تک ضرور پہونچونگا۔ یوں کرونگا کہ میں اپنے کسی رقیب کی آنکھ میں جا پڑونگا۔ جب وہ تجھے ہجر کی فرضی داستان سنانے بیٹھے گا تو اسے اپنے الفاظ کو موثر بنانے کیلئے دو ایک آنسوؤں کی ضرورت پیش آئیگی ــــ

اے دوست! میں اس وقت رقیب کی آنکھ میں حرکت کرونگا۔ شدت درد اس کی آنکھوں سے پانی بہا دیگی۔ میں ان آنسوؤں میں مل کر تیرے قدموں پر آ گرونگا۔

مجھے اپنی دانائی پر گھمنڈ نہیں مگر اے دوست! میری کامیابی یقینی ہے۔



رباعی

چون آب بجویبار و چون باد بدشت
روز دگر از عمر من و تو بگذشت
تا من باشم غم دو روزه نخورم
روزی که نیامدست و روزی که گذشت

محبّت

از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی

اے گرفتارِ مجاز، اے مطلقاً صرفِ مجاز! کر سکے تو کر محبّت اور ہوس میں امتیاز
روح کو اپنی بنا لذّت شناسِ بیخودی زندگی کو کر عطا آسودگی تابندگی
شب کے سنّاٹے میں اپنے دل کی اک آواز سُن تجھ سے فطرت کہہ رہی ہے عرش کا اک راز سُن
نفس کی خاطر تو کی، اب روح کی دعوت بھی کر اپنے دل کو آشنائے جلوۂ فطرت بھی کر
ہاں مگر تجھ سے نہ ہوگا کچھ مجھے معلوم ہے تو محبّت کے ابھی مفہوم سے محروم ہے
مادّیت کے پجاری جنّتِ اُلفت میں آ پستیوں کو چھوڑ دیوانے رہِ عظمت میں آ
دل کو اپنے کر محبّت کی خلش سے آشنا اور پھر اس غیر فانی کیفیت میں ڈوب جا
ہے محبّت ہی نجاتِ زندگی کی شاہراہ اب بھی ممکن ہے کہ تو ہو جائے محفوظِ گناہ

اک محبّت ہی سکونِ روح دل کا چین ہے
حاملِ عرشِ الٰہی، حاصلِ کونین ہے

رومال

ازجناب اے۔آر۔ رشدی صاحب

میں مسٹر رشید کے یہاں چاء پر مدعو تھا۔ سامنے کرسی پر رشید اور دوسری کرسی پر مسز رشید، رونق افروز تھیں — کھڑکیوں سے سورج کی پاکیزہ کرنیں چھن چھن کر کمرہ میں آ رہی تھیں اور پارک کی دلکشی کھڑکی کے شیشوں سے جھلک رہی تھی — ہم سب چائے نوشی میں مصروف تھے کہ یکایک مسز رشید نے کہا — "مسٹر یوسف! یہ رومال کیسا ہے؟"

رومال دراصل میرے کوٹ کے جیب سے نظر آ رہا تھا۔ "جی کچھ نہیں — یونہی ہے" — میں نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

"آپ تو کبھی جیب میں رومال نہ رکھتے تھے۔" مسز رشید نے مسکراتے ہوئے کہا — "اور پھر اس کے کونہ پر تو دیکھئے حرف "ق" کس خوبصورتی سے کڑھا ہوا ہے۔"

"بجا ارشاد ہوا — یہ کوئی خاص بات نہیں" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ضرور اس رومال سے کوئی نہ کوئی داستان وابستہ معلوم ہوتی ہے" مسز رشید نے کہا۔

"دریں چہ شک — ؟ — دنیا کی ہر شے سے کچھ نہ کچھ داستان وابستہ ہوا کرتی ہے۔" میں نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"خوب! تو اس سے بھی کوئی اہم داستان وابستہ ہے؟"

"جی ہاں!"

میرے اس اعتراف پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اب مجھے اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا۔

"وہ داستان کیا ہے مسٹر یوسف؟"

"اجی داستان یہ ہے کہ کپاس سے روئی نکلی — اور روئی سے تاگا بنا — اور تاگے سے کپڑا — اور کپڑے سے اس رومال کی ساخت عمل میں آئی۔"

"اور — کسی حسین ہستی نے اسے سیا — کاڑھا اور آپ کو پیش کر دیا۔" مسز رشید نے میرے چہرہ کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

میری اس وقت عجب حالت تھی — دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی — ہاتھ پاؤں میں رعشہ سا آ گیا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔

۲

اس رومال سے واقعی ایک اہم داستان وابستہ ہے — یکایک ایسا معلوم ہوا کہ گزشتہ واقعات کی کتاب کے ورق الٹنے لگے۔ عہد رفتہ کے مناظر — پردۂ فلم کی تصویر کی طرح — آنکھوں کے سامنے رقصاں نظر آنے لگے۔ آہ! — میں اس سے محبت کرتا تھا۔ اور وہ بھی میری محبت میں سرشار تھی۔ یہاں تک کہ ہم ایک جان دو قالب بن گئے تھے — قدسیہ کا سویرے ہی پہاڑی پر چہل قدمی کرتے ہوئے آنا اور پھر — سرگوشیاں — راز و نیاز — شکوہ شکایات — محبت، حسن، موسیقی۔ اور شعریت کا اجتماع۔ آہ! کیا وقت تھا — سورج کی سنہری کرنیں — اس کے صبیح چہرے پر ارغوانی سی جھلک پیدا کر دیتی تھیں — نسیم صبح اس کی زلفوں سے لطافت لیا کرتی — جاڑے کی شدت میرے ہوش و حواس پراگندہ کئے دیتی تھی۔ لیکن مجھے قدسیہ کی موجودگی میں — کچھ احساس ہی نہ تھا۔

ہماری ملاقاتیں طویل ہوتی گئیں ...... چاندنی راتوں میں جب ماہ تاباں کی ضیا پاشی .... اس کی نور بیز تجلیاں ..... ملکہ شب کے جانثار ستارے ... عطر آگیں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے ہمیں ایک جگہ دیکھتے تو خوش

خوش ہوتے۔ ہمیں جنت ارضی حاصل تھی ؂

وہ لمحے آہ وہ رنگین لمحے اُبھی تک دل پہ کوئی چھا رہا ہے

پہروں قدسیہ کے ساتھ سرگوشی . . . اور اس کا اپنی نازک حسین انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنا... کس قدر نشاط آفرین لمحے تھے۔ محبت کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ یکایک . . . . فلک کج رفتار نے ہماری زندگی کے اوراق پھر الٹ دیئے۔

ایک رنگین شام میں جب ماہ؛ یاں کسی شعلہ رو معشوق کی طرح لبالب فلک پر محوِ خرام تھا . . . . اور پگھلی ہوئی چاندی کی بارش کر رہا تھا .... درختوں کے پتے چمک رہے تھے . . . . چٹانوں پر ایک نقرئی سیلاب تھا اور میں اپنی راہ طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا ...... پہاڑ کے پیچھے آبشار ایک عجیب ترنم کے ساتھ بہہ رہا تھا ــــ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور . . . آسمان کے حسن شبینہ سے لطف اندوز ہونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی . . . مُڑ کر دیکھا تو پری جمال قدسیہ! جو ایک عجیب انداز سے آ رہی تھی . . . آنچل ڈھلک گیا تھا اور ہوا کے سرد جھونکے اس پر نثار ہو رہے تھے۔

میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ "تم آ گئیں قدسیہ ؟"

"جی ہاں !"

" ارے تم تو رو رہی ہو قدسیہ ! ــــ ہیں آج تمھارا چہرہ زرد کیوں ہے؟"
میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کیوں رو رہی ہوں ؟ ــــ اپنی برگشتہ قسمت کو ! اور آج کیا ہمیشہ روتی رہونگی !"

" آخر ہوا کیا ؟"

"کچھ نہیں "

" آخر بتاؤ تو سہی !"

" نہ سُنو "

"کس نے آج تمھیں تکلیف دی ہے ؟"

"کسی نے نہیں "

" پھر یہ رونا کیسا ؟"

اُس نے اپنا سر میرے سینہ پر رکھ دیا اور کہنے لگی ــــ "آہ ہماری محبت کا حال ابا جان کو معلوم ہو گیا !"

"یہ تو بُرا ہوا !"

" یہی نہیں ــــ بلکہ آج ہمارا رخت سفر بھی بندھ چکا ہے !"

" ارے میں یہ کیا سن رہا ہوں ؟"

" والد نے کہا کہ تمھاری شادی عنقریب تمھارے منگیتر سے کر دی جائیگی"

" پھر تم نے کیا جواب . . . . "

"کچھ نہیں !"

"کچھ نہیں ؟"

"تم جانتے ہو کہ وہ اس معاملہ میں کس قدر بے رحم واقع ہوئے ہیں"

" تو قدسیہ تم جا رہی ہو ؟"

"جی ہاں" اُس نے گلوگیر آواز سے کہا۔ . . . اور اس کی ہچکی بندھ گئی وہ وفورِ غم سے مجھ سے لپٹ گئی . . . . . آہ ! یوسف الفراق ... الفراق !!
ہمارا سارا اسباب بندھ چکا ہے اور کل صبح روانہ ہو جائینگے" ــــ یہ کہہ کر اُس نے ایک رنگین رومال ــــ میری جیب میں رکھ دیا۔

میں وفورِ جذبات سے خاموش تھا۔ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ آہ ! ایک الوداعی بوسے نے ــــ میری قدسیہ کو ہمیشہ کیلئے مجھ سے جدا کر دیا۔

غم کی فطرت شاد نہ ہو گی نئی خوشی ایجاد نہ ہو گی
دل کی دنیا وہ دُنیا ہے اُجڑی تو آباد نہ ہو گی

قدسیہ چلی گئی ــــ دل رنگین پر ایک داغ آ گیا۔

۳

مسز رشید نے ایک متین قہقہہ کے ساتھ مجھے پکارا ــــ مسٹر یوسف ! کہاں کھو گئے ــــ ؟"

میں نے کہا "کہیں نہیں" ــــ اور چائے کی پیالی اٹھالی۔

سینۂ کائنات ہے پُر درد
سنبھل اے دل! نوائے تلخ نہ چھیڑ
[illegible]

میر تقی

از جناب سیفی صاحب گنوری

اس فناپذیر عالم ایجاد میں کسی شے کی بقا، کا امکان نہیں۔ مگر علم ایک ایسی غیر فانی قوت ہے جو انسان کو زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے عہد حاضر تک بیشمار و لاتعداد فقید المثال و عدیم النظیر ہستیاں خود تو زیب خاک ہوگئیں مگر ان کے کارناموں کو حیات ابدی حاصل ہے اور بدیں وجہ ان کا نام بھی رہتی دنیا تک مٹ نہیں سکتا۔ اسی شمارہ میں ملک الشعراء حضرت میر تقی میر رحمۃ دہلوی کا اسم گرامی بھی آتا ہے۔

یوں تو شعراء متقدمین میں ہر ایک اپنی جگہ پر استاد فن، قابل قدر ہے اور میں اپنے قلب کے گوشے گوشے کو ان کی عزت سے لبریز پاتا ہوں مگر میر صاحب موصوف کا کلام اقلیم شاعری میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

اولاً یہ کہ میر صاحب کے کلام کو ان کی زندگی ہی میں مقبولیت عام کا شرف حاصل ہوا۔ حتیٰ کہ عوام بھی ان کی غزلوں کو بطور تحفہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جاتے تھے۔

ثانیاً یہ کہ ماہران فن جس کی قدر و منزلت کریں وہ یقیناً فائق و برتر ہستی ہے۔ چنانچہ ہر دور کے اساتذہ سخن ان کے کمال کے معتقد ہیں مثلاً غالب ایسا بلند پایہ شاعر ایک جگہ اس طرح لکھتا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اس شعر سے میر موصوف کے متعلق غالب و ناسخ کے خیالات کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ مرزا سودا لکھتے ہیں ؎

سودا تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھکو میر سے استاد کی طرح؟

خاقانی ہند حضرت ذوق ارشاد فرماتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اگر اساتذہ فن کے وہ اشعار جن میں میر کے کمالات شاعری کا اعتراف کیا گیا ہے نقل کروں تو مضمون بیحد طویل ہو جائیگا اس لئے صرف حالی مرحوم کا ایک شعر نقل کرتا ہوں لکھتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

ناسخ نے جو تاریخ کہی اس سے بھی میر صاحب کا مرتبہ ظاہر ہے۔

"واویلا مُرد شہ شاعراں"

ثالثاً چونکہ شاعری ذوقی و وجدانی چیز ہے اس لئے اچھا شعر وہ ہے جس کے سنتے ہی سامع پر اس کا اثر ہو جائے چنانچہ میر صاحب کے کلام میں یہ بات بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

میر صاحب کی تمام عمر پریشانی و سراسیمگی میں بسر ہوئی چونکہ شعر جذبات دل کی ترجمانی کرتا ہے اس لئے ان کا بیشتر کلام درد و غم اور حسرت و یاس کا مرقع ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار دل پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں اور انقباضی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ انقباضی کیفیت کا درجہ انبساطی سے بلند ہے کیونکہ آہ کا اثر واہ سے کہیں زیادہ اور دیرپا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ میر صاحب کا کلام خیالی نہیں بلکہ حالی اور واقعیت پر مبنی ہے۔

قدمائے عظام کا قول ہے "اچھا شعر وہ ہے جس کو سن کر کہا جائے کہ سچ کہا ہے" چنانچہ میر صاحب کے تقریباً تمام کلام میں داخلی پہلو نمایاں ہے اور خارجی سے شاذ ہی کسی شعر میں بحث کی گئی ہے۔

بعض کے نزدیک شعر کی خوبی نفس مضمون اور طرز بیان ہے چنانچہ میر صاحب کا انداز بیان نہایت دلکش و پاکیزہ ہے۔ الفاظ سادہ و شیریں استعمال کئے ہیں۔ زبان سلیس ہے۔ محاورے برمحل اور اس عمدگی سے

نظم فرمائے ہیں کہ شعر میں غذدیت باقی رہتی ہے۔ ورنہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر اصحاب محاورات و الفاظ کا استعمال اس بُری طرح کرتے ہیں کہ شعریت فنا ہو جاتی ہے روانی کافی موجود ہے اور کلام میں اکثر محاکاتی پہلو نمایاں ہے۔ اس لئے بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر صاحب کا کلام کیت و کیفیت دونوں اعتبار سے بہترین ہے۔

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ چھوٹی بحروں میں کامیاب اشعار نکالنا قریب قریب ہر شاعر کو دقتوں میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن یہ خصوصیت صرف میر صاحب ہی کو حاصل ہے کہ ان کی کامیاب بلکہ کامیاب تر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہی ہیں۔

دنیا عالم اسباب ہے اس میں بغیر علت و سبب کے ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا۔ اس نظریہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں لطافت۔ شیرینی۔ نزہت اور ندرت کے دریا کیوں موجزن نظر آتے ہیں۔ جبکہ ان کی زندگی کے حالات پڑھنے سے ایک ناظر اس بات پر نظر کرتا ہے کہ ان کو زبان کا تحفظ اس درجہ مدنظر تھا کہ اس کے مقابلے میں بڑی سے بڑی دولت کی قربانی کو وہ ہر وقت تیار رہتے تھے۔ نیز عامی اور کج مج زبان رکھنے والوں سے بات چیت کرنا ان کو کسی حالت میں گوارا نہ تھا۔ جس کا شاہد وہ واقعہ ہے جبکہ وہ دہلی سے تنگی و عسرت کے عالم میں لکھنؤ جا رہے تھے اور کرایہ کی کمی سے انھیں ایک شخص کی بہلی میں شرکت کرنی پڑی اور جب اس نے راہ میں سلسلہ کلام کا اجرا کیا تو میر صاحب خاموش رہے اور غالباً سہ بارہ خواہش تعارف پر آپ نے فرمایا تھا کہ میں نے تمہاری سواری میں شرکت کی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم سے بات چیت کر کے اپنی زبان بگاڑ لوں۔

اللہ اللہ! حفاظت زبان کی اس سے بلند معیار رکھنے والی کوئی مثال دنیائے ادب میں نظر نہیں آتی۔ آج اگر ان کی زبان ٹکسالی نہ مانی جائے تو کس کی مانی جائے۔

اپنے مضمون کی صداقت میں چند اشعار کی تشریح پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

(تشریح) اس شعر میں میر صاحب نے زندگی و موت کا فلسفہ نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا منظر کس قدر پُراثر و دلکش پیرایہ میں دکھلایا ہے۔ انسان کا تعارف، اس کی ہستی اور ہستی کی نزاکت و ناپائداری سے جن الفاظ میں کرایا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یہ شعر عبرت کا بہترین مرقع ہے۔ اخلاقی پہلو پر نہایت لطیف انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ سلاست و روانی کافی موجود ہے۔ محاکاتی پہلو بھی نمایاں ہے۔ گو آج اس مضمون کے اشعار کثرت سے جاری سماعت میں آ چکنے کے باعث ہم اس شعر کی کچھ قدر نہ کر سکیں لیکن میر صاحب کے بہت حد تک جدت کا پہلو رکھتے ہوئے وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوگا۔

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا

(تشریح) یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے اس کو ہی اصل حقیقت سمجھ کر اسی پر کلیتہً مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ دیگر ماحول کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن جب اس کا پردہ واقعات زمانہ کی رفتار کے مطابق اٹھتا ہے تب وہ متحیر ہو کر رہ جاتا ہے اور گذشتہ کم فہمی پر افسوس کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ اس حقیقت کو میر صاحب نے اس شعر میں جوانی و پیری دو ماحول قائم کر کے واضح کر دیا ہے یہ شعر انسان کی فطرت و حیات کا صحیح ترجمان و نادر نمونہ ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

(تشریح) یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں ہر کام کے آغاز میں حوصلہ فرسا و ہمت شکن واقعات پیش آتے ہیں حتیٰ کہ امید کی کرن بھی دھندلی نظر آنے لگتی ہے اور منزل مقصود تک رسائی "ایں خیال است و محال است و جنوں" کا مصداق بن کر رہ جاتی ہے۔ انھیں تاثرات کے ماتحت انسان میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار اپنے درد و غم کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ میر صاحب انسان کو مستقبل کا عالم دکھاتے ہوئے طعنہ آمیز پیرایہ میں تلقین فرماتے ہیں۔ یہاں انسان کی تنگ ظرفی و غیر مستقل مزاجی کو بھی واضح کر دیا ہے۔ یہ بھی سمجھایا ہے کہ عشق انسان کی ہمت۔ استقلال اور صبر و ضبط کے جائزہ لینے کا معیار ہے۔ اس لئے اس وادی میں انسان کو

سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیئے اور اقدام کے بعد مردانہ وار راستہ کی دشواریوں کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے۔ سادگی اس شعر کا خاص جوہر ہے۔ مصرعہ ثانی میں محاورہ کا استعمال نہایت خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔

دکھائی دیئے یوں کہ بیخود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

(تشریح) ارباب معرفت کا یہ مسلک ہے کہ انسان خداوند عالم کی حقیقت کو اسی وقت پہچان سکتا ہے جب اپنی ہستی کو اس کی ذات میں فنا کر دے اور اس کے دل سے ما و تو کا امتیاز مٹ جائے۔ پس جب انسان اس مرتبہ پر پہونچ جاتا ہے تو تعینات کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ اور انسان کی نگاہیں حسن ازل کے جلووں کی مرہون احسان ہو جاتی ہیں۔ اس مسئلہ کو میر صاحب نے اپنے شعر میں حل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوزہ کو سمندر میں بند کیا ہے۔ اس قدر وسیع مفہوم کو اس سادگی و صفائی سے اور ان مختصر الفاظ میں بیان کرنا میر صاحب ہی جیسے قادر الکلام شاعر کا کام تھا۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی،
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا،

(تشریح) روز ازل کردگار عالم نے اپنی نعمتوں کو مرحمت فرماتے وقت جمیع مخلوق سے سوال کیا کہ غم کون لینا چاہتا ہے؟ اس نعمت کو انسان نے قبول کیا۔ اسی واقعہ پر میر صاحب نے اپنے شعر میں روشنی ڈالی ہے۔ اس شعر کے مفہوم پر گہری نظر ڈالنے سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا کتنا بہتر ثبوت مل جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کی بلند ہمتی۔ عالی حوصلگی۔ تفوق و برتری اور صبر و استقلال مسلم ہو جاتا ہے۔ شعر رواں۔ الفاظ سادہ و شیریں اور انداز بیان سلیس و دلکش ہے۔ اس شعر کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایئے۔ کہ آج اس شعر کی تقلید میں قریب قریب ہر شاعر نے بہ تبدیل الفاظ شعر کہے ہیں۔

میر صاحب کی وفات کو کافی مدت گذر چکی ہے اور اس وقت سے اب تک فن شاعری میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے بلکہ عصر حاضر کو شاعری کے عروج و کمال کا وقت کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا حتیٰ کہ میر صاحب کے زمانے کے کلام کو دیکھ کر ایک قسم کا تکلف ہوتا ہے۔ مگر میر صاحب کے کلام کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کے اشعار سن کر وہی کیف و لطف حاصل ہوتا ہے جو دور حاضر کے ایک شاعر کے شعر سن کر ہو سکتا ہے۔ یعنی آج بیسویں صدی میں بھی ان کے کلام کو سن کر اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ اور یہی ان کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ نمونہ کلام:-

آگے جمال یار کے معذور ہو گیا — گل اک چمن میں دیدۂ بے نور ہو گیا
اس ماہ چاردہ کا چھپے عشق کیونکر آہ — اب تو تمام شہر میں مشہور ہو گیا
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے — نگاہ مست نے ساقی کی انتقام لیا
مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

سینہ کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا
بوئے خوں سے جی رکا جاتا ہے اے باد بہار
ہو گیا ہے چاک دل شاید کسو دلگیر کا
کس طرح سے مانیئے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

جیتے جی آہ ترے کوچہ سے کوئی نہ پھرا — جو ستم دیدہ رہا جا کے سو مر کر نکلا
دل کی ویرانی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ — جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
اپنے شہید ناز سے بس ہاتھ اٹھا کہ پھر — دیوان حشر میں اسے لایا نہ جائیگا
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائیگا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا
کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب — شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا
وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہ عشق کی — دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
فلک کا منہ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا — ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا
سراہا ان نے ترا ہاتھ جب نے دیکھا زخم — شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

خداوند عالم میر صاحب مرحوم کی روح پاک پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے۔ آمین۔

لمعات!

از نیّر امرتسری

کیسے گذریگی اب خدا جانے — ایسے روٹھے کہ پھر نہیں مانے
کچھ خبر بھی ہے تم کو دنیا نے — گھڑ لئے ہیں ہزاروں افسانے
عشق والے عجیب انساں ہیں — گاہے دیوانے گاہے فرزانے
دل بھی اب دم انھیں کا بھرتا ہے — ہوتے جاتے ہیں اپنے بیگانے
کچھ تہِ دام کچھ درونِ قفس — اپنی تقدیر کے جو ہیں دانے
بیخودی میں بتا گئے سب کچھ — کتنے ہشیار ہیں یہ دیوانے
شمع اپنی لگی بجھا نہ سکی — کاش سمجھیں یہ راز پروانے
میری وحشت بڑھا گئے ناصح — اچھے آئے تھے گھر سے سمجھانے

کعبے جائیں تو کس طرح نیّر
راہ روکے ہوئے ہیں بتخانے

بنت عم

افسانہ

از جناب عزیز احمد صاحب خلش صدیقی بی۔ اے (آنرز)

رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے لیکن شاہد ابھی گھوم کر واپس نہیں آیا سب لوگ کھانا کھا کر اپنی اپنی جگہ جاکر سو رہے۔ ماما بھی اپنا کھانا لیکر چلی گئی عروسہ نے جب یہ دیکھا کہ شاہد کو دیر ہو گئی ہے تو وہ کروشیا کا کام لیکر بیٹھ گئی تاکہ شاہد کے لئے جو تکیہ کا غلاف وہ بنا رہی ہے اس کی بھی تکمیل ہو جائے اور شاہد کا انتظار بھی کر لے ورنہ کھانا انھیں کس طرح ملے گا۔ وہ خود نکالنے سے رہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھوکے ہی سو رہینگے اور دروازہ کھولنے کا بھی تو سوال ہے۔ اگر کہیں چچا میاں کی آنکھ پکارنے میں کھل گئی تو وہ خفا ہونگے کہ اتنی رات گئے گھوم کر لوٹتے ہیں۔۔۔ عروسہ تصورات میں ڈوبی ہوئی "میکانکی" طور پر کروشیا کا کام بنانے میں مصروف ہو گئی۔

عروسہ، شاہد کی چچازاد یتیم بہن تھی۔ جسے آٹھ برس کی عمر سے شاہد کے والدین نے اپنی لڑکی کی طرح پرورش کیا تھا اب اس کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ شاہد اس سے چار سال بڑا تھا۔ دونوں بچپن سے ساتھ کھیلے تھے۔ آپس میں بڑی محبت تھی۔ شروع سے اب تک کبھی آپس میں لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ شاہد ذرا لاابالی طبیعت کا تھا اور اکثر اسے غصہ آجاتا تھا مگر عروسہ بہت سمجھدار تھی اور ضبط کا مادہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ شاہد دو ایک بار اس سے روٹھا مگر عروسہ نے اسے فوراً منا لیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

بمقابلہ مرد کے عورت کو زیادہ یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ مرد کا دھیان بھٹکا سا رہتا ہے۔ اس کے خیالات کچھ منتشر سے رہتے ہیں۔ بالخصوص عنفوان شباب میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہد تو عروسہ کی طرف سے غافل و لاپروا رہا مگر عروسہ کو اس سے دلی محبت ہو گئی۔ محبت شاہد ابھی عروسہ سے تھی مگر وہی مربیانہ محبت جو ایک بڑے بھائی کو اپنی چھوٹی بہن سے ہوتی ہے۔ عروسہ اسے اپنا مالک سمجھتی تھی۔ شاہد جیسا لاابالی انسان غور کرنے کا عادی نہیں ہوتا ورنہ عروسہ کے جذبات کو جان لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ جان توڑ کر اس کی خدمت کیا کرتی تھی اور عورت کی نظر ہمیشہ غماز ہوتی ہے۔ عروسہ کو کبھی اظہار کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ وہ شاہد کے خیالات کو جان لینا چاہتی تھی ایک بار کسی موقع پر اُس نے کہا تھا۔

"پہلے ہم آپ ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے گھنٹوں سر جوڑ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ مگر آپ اب باہر ہی باہر پھرا کرتے ہیں۔ اب آپ کو ہم سے محبت نہیں رہی۔"

لیکن شاہد اس کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا۔ وہ یہ نہ سمجھا کہ یہ الفاظ ایک عورت کہہ رہی ہے اسے صرف اسی قدر احساس تھا کہ یہ الفاظ عروسہ نے اُس کی چھوٹی بہن نے کہے تھے۔ اور اگر اُس نے اسے سمجھا بھی تو اس کے انداز سے کچھ مترشح نہ ہوا۔

"نہیں عروسہ! مجھے تم سے پہلے سے بھی زیادہ محبت ہے بچپن کے دن بہت گذر جاتے ہیں اب وہ دن واپس نہیں آسکتے۔ کیسی کیسی بیوقوفی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اینٹوں کے گھروندے بنا کر اسے محل سمجھا کرتے تھے۔ تمھیں یاد ہے عروسہ! وہ جو ہم نے تمھارا گھروندا بگاڑ دیا تھا اور تم روتی ہوئی ابا میاں کے پاس گئی تھیں۔ انھوں نے ہمیں بہت زور سے ڈانٹا تھا۔ اتنی زور سے کہ میں رونے لگا تھا اور میرے ساتھ پھر تم بھی رونے لگی تھیں؟——"

وہ یاد ماضی میں ڈوب گیا۔

"ہاں! یاد ہے" عروسہ کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"اور یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار آپنے میری انگلی چاقو سے تراش دی تھی میں رونے لگی اور چچی جان نے جب پوچھا کہ کیا ہوا تو آپ صاف انکار کر گئے

اور الٹا الزام میرے سر تھوپ دیا کہ چاقو سے کھیل رہی تھی۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا ———،

"تو کیا اب تک تمھیں یقین ہے کہ میں نے جان کر تمھاری انگلی تراش دی تھی؟ ——— اچھا جاؤ میرے لئے چاء بناؤ۔"

غرضکہ عروسہ کی محبت کا اظہار شاہد پر بہت عرصہ تک نہ ہو سکا۔ ہاں! ——— بہت عرصہ تک۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے دروازہ پر شاہد کی ہلکی سی آواز آئی "عبداللہ" مگر عبداللہ کب ایسے چوکنے سونے والے تھے جو جاگ جاتے۔ عروسہ فوراً کروشیا اور فریم پلنگ پر رکھ کر ننگے پاؤں دوڑی گئی تاکہ چچا میاں جاگ نہ جائیں۔

"کون؟ عروسہ!"

"جی!"

"کیا سب سو گئے؟"

"ابھی کہاں۔ میرے علاوہ سب جاگ رہے ہیں۔"

"شریر کہیں کی۔"

"آپ کو دیر سے آنا تھا تو آج مجھے بتا کر کیوں نہ گئے ——— فرض کیجئے میں نہ جاگتی رہتی۔"

"مجھے یقین تھا کہ میری عروسہ بہت سمجھدار ہے اور میرے لئے ضرور جاگتی رہیگی۔ بات یہ ہوئی کہ ارادہ جلد ہی آنے کا تھا مگر جلیل وغیرہ سینما پکڑ لے گئے ابا میاں نے مجھے پوچھا تو نہیں تھا؟"

"پوچھا تو تھا مگر میں نے کہدیا کہ کسی دوست کے پاس کوئی کتاب لینے گئے ہیں ——— آپ کی وجہ سے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔"

"اس کی بھی عادت ڈالو۔ دنیا میں اسکی بھی ضرورت پڑتی ہے؟"

"اچھا چلئے کمرے میں۔ میں کھانا گرم کرکے لاتی ہوں۔"

"کھانا؟ اب رہنے دو۔ کھڑ بڑ ہوگی۔ ابا میاں کہیں جاگ نہ جائیں"

شاہد اپنے کمرے میں جاکر کپڑے اتارنے لگا۔ جب کپڑے اتار چکا تو اسے اطمینان ہوگیا کہ ابا میاں جاگ بھی جائیں تو کہہ دونگا بس تو دیر سے پڑھ رہا ہوں۔ اُسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا ہی تھا کہ جاکر عروسہ سے کھانے کیلئے کہدے کہ عروسہ کشتی میں کھانا لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی شاہد نے خوش ہوکر کہا ——— "شاباش! تم واقعی ہماری بہن ہو۔"

وہ کھانے میں مشغول ہوگیا۔ عروسہ گلاس میں پانی لینے چلی گئی۔

گرمیوں کی سہانی شام تھی۔ شاہد گنگنا کر بکس میں سے سوٹ منتخب کر رہا تھا۔ عروسہ سامنے بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ آخر گہرا نیلا سوٹ شاہد نے منتخب کیا اور اسی کے میل کی ٹائی تلاش کرنے لگا۔ دو تین ڈبے کھول کر دیکھے مگر جو ٹائی وہ چاہتا تھا وہ نہ ملی۔ عروسہ کنکھیوں سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شاہد کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ "آج پھر کہیں کے انتظامات ہیں"۔ اس نے دل میں کہا۔

"ارے عروسہ! ہماری وہ نیلی ٹائی کیا ہوئی جس پر سفید جال سا بنا ہوا تھا ———؟"

عروسہ نے سوئی روک کر غور کرتے ہوئے شاہد کی طرف دیکھا۔ وہ یاد کر رہی تھی کہ کون سی ٹائی؟"

"وہی جو میں نمائش سے لایا تھا — جس دن تمھارے لئے بندے خریدے تھے۔" شاہد نے یاد دلایا۔

"اچھا وہ ———؟ وہ دیکھئے سامنے جو ہرا بکس رکھا ہے اس میں ٹین کے لانبے ڈبے میں رکھی ہے۔ لیکن ٹھہرئیے۔ آپ نہ نکالئے گا۔ سارا بکس گڑبڑ کر دینگے۔ پھر مجھے گھنٹہ بھر ٹھیک کرتے لگے گا۔ میں ابھی آئی آپ جب تک پتلون وغیرہ پہنئے ———"

"اوہو! گویا بکس کا گڑبڑ ہو جانا ہماری نالائقی کا ثبوت ہے! عورتوں کو بڑا ناز ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیا کو ایک ہی بکس میں سمیٹ سکتی ہیں ایک چیز نکالنا ہو تو پورا بکس الٹنا پڑے۔ اچھا صاحب! آپ ہی سلیقہ مند سہی۔"

عروسہ اسے دیکھکر مسکرائی۔ شاہد "متوالے نینوں والی۔ گھنگرالے والی" گاتا ہوا پردے کے پیچھے پتلون پہننے کیلئے چلا گیا۔ عروسہ لجاکر اپنی سلائی میں مشغول ہوگئی۔ جیسے شاہد نے اسی سے مخاطب ہوکر یہ گیت کا ٹکڑا گایا ہو۔ اسے اپنے گھنگرالے بالوں اور متوالی نظروں پر ناز سا ہونے لگا۔ اللہ اللہ محبت کے یہ درد بھرے مغالطے۔ یہ رس بھرے دھوکے۔

شاہد پردے کے پیچھے ہی تھا کہ عروسہ چپکے سے اٹھی اور آہستگی کے ساتھ ٹائی نکال کر چھوٹی میز پر رکھ آئی اور اپنی سلائی میں مصروف ہوگئی۔ شاہد گنگناتا ہوا پردے سے باہر آیا۔

"ٹائی نہیں نکالی ؟"

"آپ خود ہی نکال لیجئے نا ــــ میں تو بدسلیقہ ہوں !"

"ہا ہا ہا !" شاہد نے ٹائی کو میز پر رکھا ہوا دیکھ لیا ۔" تم بڑی شریر ہوتی جا رہی ہو ــــ جب تمھاری شادی ہو جائیگی ، جب تم ہمیں خوشی خوشی چھوڑ کر سسرال چلی جاؤگی تو ہمیں بہت دکھ ہوگا ۔ یہ باتیں یاد آئینگی ۔"

عروسہ پر سناٹا چھا گیا ــــ کلیجہ دھک سے ہو گیا ۔

شاہد نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی باندھی ۔ کوٹ پہنا کوٹ کی جیب میں رومال کا پھول بنا کر رکھا ۔ چھڑی ٹیک کر ایک نظر اپنے اوپر ڈالی ۔ شام کی ہیٹ ذرا ترچھی کر کے پہنی اور ایک آخری نگاہ آئینہ پر ڈال کر مڑا ــــ "گڈ ایوننگ مس عروسہ ! ــــ کہو سوٹ ٹھیک رہا ۔"

عروسہ نے درد و غم کی موجیں ہٹا کر مسحور مگر مغموم تبسم کے ساتھ شاہد کو دیکھا ــــ "آپ یہ سوٹ پہن کر کہیں نہ جایا کیجئے ــــ" اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا ۔

"شریر !" شاہد نے پیار کے ساتھ کہا ۔" لاؤ کالا ٹیکا کیوں نہیں لگا دیتیں تاکہ نظر نہ لگے ۔"

عروسہ شرما کر چپ ہو گئی ۔ نظر جھکا کر سلائی کرنے لگی ۔ شاہد کی طرف زیادہ دیر تک اس سے دیکھا نہ گیا ۔ آج خاص طور پر اس کا دل دھڑک رہا تھا گلا روندھا جا رہا تھا ۔ بادل اُمنڈ رہے تھے ۔ اور برس پڑنے کے لئے بیتاب تھے ۔

شاہد گنگناتا ہوا پاس سے گذرا ۔ عروسہ نے اس کی طرف نہ دیکھا ۔ شاہد نے دروازے کے پاس رک کر اس سے کہا ــــ " دیکھو ! عروسہ میں آج دیر کو لوٹوں گا ۔"

" اچھا " اُس نے بغیر اسکی طرف دیکھے ہوئے کہا ۔

جب شاہد دروازے کے باہر ہو گیا تو اس کا دل مچل پڑا ۔ اسکے دل نے ایک پکار لگائی ، زبان نے بھی ساتھ دیا ۔

" اور آپ جا کہاں رہے ہیں ــــ سینما ؟"

"نہیں ! ــــ لوٹ کر بتاؤں گا !"

شاہد زینہ سے اُتر گیا ، عروسہ کے دل میں ہوک اٹھی ۔ سلائی ایک طرف ڈال کر گھٹنوں پر سر رکھ کر چپکے چپکے رونے لگی ۔ آج نہ معلوم کیوں اس کی زندگی آنسو ہو کر بہہ جانا چاہتی تھی ۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی ۔

عروسہ سب کو کھانا کھلا کر شاہد کا انتظار کرنے لگی ۔ وہ سوچ رہی تھی "کیا میں کہدوں کہ آپ سے محبت کرتی ہوں ۔" لیکن کہیں وہ ڈانٹ نہ دیں ۔ عزت بھی جائے ــــ لیکن اگر کوئی اور اُن کو جیت لے گیا ۔

اُس نے بغیر آگے سوچے ہوئے فیصلہ کر لیا ۔ ایک بیتاب فیصلہ ، کہ آج وہ ضرور کسی نہ کسی طرح شاہد سے کہہ دیگی ــــ راز محبت کا بار بہت بھاری ہوتا ہے ۔

شاہد دس بجے واپس آیا ۔ وہ کچھ متفکر سا تھا ۔ گفتگو بہت کم کی عروسہ نے کھانا لا کر سامنے رکھا ۔ وہ خاموشی کے ساتھ کھانے میں مصروف رہا بیچ بیچ میں وہ کچھ سوچنے بھی لگتا ۔ نظر گاڑے ہوئے ایک ہی نقطہ کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اور "میکانکی" طور پر کھانے میں مشغول تھا ۔

عروسہ نے سوچا کہ آج "محبت" کے اظہار کے لئے ٹھیک نہیں ہے کل دیکھا جائیگا یا خط میں لکھ کر دیدوں گی ۔ لیکن وہ سوچ کیا رہے ہیں ؟ بہت متفکر معلوم ہوتے ہیں ۔ بات کیا ہے ــــ وہ برابر شاہد کا جائزہ لیتی رہی ۔ اُسے یقین ہو گیا کہ آج ضرور کوئی اہم بات ہے ۔ کوئی شدید تکلیف پہنچی ہے ۔ کوئی گہری فکر ہے ۔

"کھانا بڑھاؤ" شاہد نے بے پروائی کے ساتھ کہا اور ہاتھ دھونے چلا گیا ۔ عروسہ سکتے میں رہ گئی ۔ اُس نے برتن نہ اٹھائے جب شاہد واپس ہوا تو عروسہ نے پوچھا ۔

" آج کیا بات ہے بھائیجان ، آپ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں ۔"

" کچھ نہیں ۔" اُس نے تولئے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا ۔ اور سگرٹ جلا کر آرام کرسی پر دراز ہو گیا ۔

"ضرور کوئی بات ہے !" عروسہ نے کہا ــــ "آپ مجھ سے راز رکھنا چاہتے ہیں ۔"

شاہد نے کوئی جواب نہ دیا ۔

" اچھا تو نہ بتائیے گا ۔" عروسہ نے محبت آمیز دھمکی کے ساتھ پوچھا شاہد پھر بھی خاموش رہا ۔ عروسہ دلشکستہ ہو کر برتن کشتی میں جمانے لگی ــــ ، کشتی لیکر چلی ہی تھی کہ شاہد نے پکارا ۔

"عروسہ!"

وہ ٹھہر گئی۔ مڑکر دیکھا۔ "کہئے" اُس کی آواز میں بیابانوں کا سا سناٹا تھا——،

"یہاں آؤ —— کیا روٹھ گئیں۔؟"

"مجھے روٹھنے کا کیا حق؟"

"اچھا یہاں تو آؤ —— کشتی میز پر رکھدو۔"

عروسہ اس کے قریب آکر اس رخ سے بیٹھ گئی کہ روشنی اس کے چہرے پر نہ پڑے۔

"میں عرصے سے تم سے ایک راز کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی کچھ شرم سی آتی ہے میں نے کبھی تم سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ اور اس کے علاوہ کوئی بات آج تک چھپائی نہیں —— لیکن آج میں اس کے اظہار پر مجبور ہوا جارہا ہوں ——"

عروسہ کا چہرہ چمک اٹھا۔ امید نے دل میں گدگدی پیدا کردی، اس کا جی چاہا کہ وہ گلے میں باہیں ڈالکر کہہ دے کہ "مجھے معلوم ہے آپ جو کہینگے —— میں بھی آپ سے یہی کہنے کیلئے بیتاب تھی ——" لیکن وہ جلدباز نہ تھی۔ ضبط کرگئی۔

"کہئے، وہ راز جلدی کہئے۔" اُس نے بیتاب ہوکر کہا۔

"مجھے ایک سے محبت ہوگئی ہے۔" اس نے نغمہ ریز انداز میں کہا۔

"اس کا کیا نام ہے؟ عروسہ نے دھڑکتے ہوئے دل اور بیچینی کے ساتھ پوچھا۔"

"کیوں کیا تم اس سے واقف ہو؟"

"شاید! —— کہہ نہیں سکتی ——"

"اُس کا نام ہے 'نشاط' ——!!!"

عروسہ پر بجلی گر گئی —— اس کا جی چاہا کہ ایک چیخ مار کر شاہد سے لپٹ جائے۔ مگر وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اگر اس کا چہرہ روشنی میں ہوتا تو شاہد دیکھتا کہ اس کا رنگ فق ہوگیا ہے —— کاش اس کا چہرہ روشنی میں ہوتا۔

"اب بتاؤ —— عروسہ! —— تم نشاط کو جانتی ہو؟"

"نہیں ——!" عروسہ نے بڑی کوشش کے ساتھ کہا۔

"یہاں ایک بیرسٹر ہیں۔ احمد حسین صاحب، ان کی لڑکی ہے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتی ہے۔ پردہ نہیں کرتی ہے۔ بہت خوبصورت ہے، بالکل تمہاری جیسی —— ایک روز سینما میں ساتھ ہوا تھا۔ میرے دوست جلیل نے اس کا پورا پتہ لگاکر مجھے بتایا —— اگر پیام بھیجدیا جائے تو شاید انکار نہ کرینگے؟"

"آپ نشاط سے واقعی محبت کرتے ہیں؟"

"عروسہ! اب میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ وہ مجھے کس قدر پسند ہے!"

"پسندیدگی اور محبت میں فرق ہے۔"

"ہاں ہاں میں اس سے محبت کرتا ہوں!"

"وہ بھی آپ سے محبت کرتی ہے؟"

"میں ابھی ٹھیک کہہ نہیں سکتا، مگر محبت میں بڑا اثر ہے عروسہ!"

"ہوگا ——!"

"عروسہ اگر نشاط کو مجھ سے محبت نہ ہوئی تو میں بے موت مرجاؤنگا۔"

"اگر آپ کو دوسری لڑکی نشاط ہی جیسی ملجائے اور آپ سے محبت بھی کرتی ہو تو آپ اس سے شادی کرلینگے؟"

"محبت روحانی تعلق کا نام ہے عروسہ! تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔"

عروسہ کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"اچھا تو بتلایئے میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟ —— مجھے جان دینے میں بھی عذر نہ ہوگا؟"

"یہ میں جانتا تھا —— تم میرے لئے بہت کچھ کرسکتی ہو —— بہت کچھ رشید کے گھر میں اور ان کے گھر میں آنا جانا ہے۔ ایک روز رشید سے دعوت دلواؤنگا۔ وہ لوگ بھی مدعو ہونگے اور تم لوگ بھی۔ وہاں ملاقات ہوجائیگی دوستی کرلینا تمہارا کام ہے۔ اس کے بعد تم ان لوگوں کو مدعو کرنا۔ اس طرح تعلقات بڑھ جائینگے۔ خط وکتابت بھی تمہارے ذریعہ سے ہوسکتی ہے اس کے بعد جب موقع آجائے تو امی جان سے بھی کہدینا۔ ٹھیک ہے نا؟"

عروسہ نے دل پر پتھر رکھ کر کہا —— "اچھی بات ہے۔"

اُسے سخت افسوس تھا کہ اس نے اس سے پہلے اپنی محبت کا اظہار شاہد پر کیوں نہ کردیا —— لیکن قسمت کی ستم ظریفی کا کیا علاج، اب کیا ہوسکتا تھا؟ اب اس کا کچھ کہنا فضول تھا۔ اب تو اس پر شاہد کی امداد کرنے کا تلخ فرض عائد ہوچکا تھا۔

ایک روز رات کو عروسہ پلنگ پر لیٹے لیٹے بڑی دیر تک جاگتی رہی طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ وہ اپنی قسمت پر غور کر رہی تھی۔ کم عمر تھی کہ والدین نے ساتھ چھوڑ دیا۔ چچا نہ ہوتے تو زندگی کے لالے پڑ جاتے چچا نے اپنی بیٹی کی طرح پرورش کیا۔ اس کے سر پر ان کا اتنا احسان تھا کہ اس کے بار سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی کے احسان کے بار میں جکڑ جانا یہ بھی ایک بد قسمتی ہے — کاش شاہد اس کا ہمجولی نہ ہوتا اور بچپن میں اس کے ساتھ کھیلا نہ کرتا۔ کاش — "کاش" کا لفظ اس کے ذہن پر چھایا جاتا تھا۔

پاس کے کمرے سے چچی کی آواز آئی — ایک ہلکی سی آواز۔ عروسہ کے کان ادھر لگ گئے۔ اُسے اپنا نام سنائی دیا۔ وہ اور زیادہ متوجہ ہو گئی۔

چچی کہہ رہی تھیں۔ "شاہد اور عروسہ میں بڑی محبت ہے — عروسہ ذرا اور سیانی ہو جائے تو دونوں کی شادی کر دی جائے۔"

"بڑی سعادتمند لڑکی ہے۔ خدا اسے خوش نصیب کرے۔" چچا نے کہا۔

"میں نے اس کی تربیت کی ہے۔ لڑکی کی طرح پالا ہے۔ میں کوئی جاہل تو ہوں نہیں جو اسے بھی گنوار لٹھ رکھتی — اللہ رکھے سگھڑ ہے۔ ہنرمند ہے۔ ہاتھ میں مزا، طبیعت میں انتظام کا مادہ ہے اور پھر اتنی بھولی بھالی۔"

"لیکن شاہد کا خیال بھی معلوم کر لیا ہے؟"

"دیکھتے نہیں ہو کتنی محبت آپس میں ہے۔ اس سے جب یہ بات کہی جائیگی تو اچھل پڑے گا!"

"لیکن ہم کو اچھی طرح یقین کر لینا چاہیئے کہ واقعی وہ دونوں ایک دوسرے کے خواہشمند ہیں یا نہیں۔ ایک ساتھ رہتے رہتے انسیت تو بڑھ ہی جایا کرتی ہے مگر محبت اس سے زیادہ گہری چیز ہے۔"

"مجھے یقین ہے دیکھو۔ شاہد جب کہیں جاتا ہے عروسہ کیلئے ضرور کچھ نہ کچھ لاتا ہے۔ اور عروسہ کیسی اس کی خدمت کرتی ہے۔ ہلوگوں سے زیادہ فکر رکھتی ہے۔"

"لیکن شاہد اس سے بات کرتے ہوئے۔ اسے چیز دیتے ہوئے جھجکتا نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی چور نہیں ہے۔ ممکن ہے محبت دل میں جگہ کر چکی ہو مگر اس کا احساس اسے خود بھی نہ ہو۔"

"کبھی نہ کبھی احساس ہو ہی جائیگا۔"

"لیکن دیکھو! ایک بات کرنا۔ اپنے اس خیال کو دونوں میں سے کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا۔ اس وقت تک انتظار کرنا کہ وہ خود ایک دوسرے کی تمنا کرنے لگیں — اور اگر وہ دونوں ایسا نہ چاہیں تو ہمارا کوئی ہرج نہیں۔ نہ شاہد کیلئے لڑکیوں کی کمی ہے نہ عروسہ کیلئے لڑکوں کی — ابھی پرسوں ہی حامد حسین نے اپنے لڑکے حمید کیلئے ذکر کیا تھا۔ مگر میں نے یہ کہکر ٹال دیا کہ ابھی وہ چھوٹی ہے۔ حامد حسین تم جانتی ہو اچھے خوشحال ہیں۔ حمید کو ولایت ڈاکٹری پڑھنے کے لئے بھیجا ہے — اسی سال میں آ جائے گا۔"

"ہاں! بہر حال زبردستی شادی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں — مگر میرا خیال ہے شاہد عروسہ ہی کیلئے کہے گا۔"

عروسہ سنتی رہی۔ دھڑکتے ہوئے دل اور رُندھے ہوئے گلے کے ساتھ سنتی رہی آخر تاب نہ رہی اور اپنی رضائی میں مُنہ لپیٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ "کاش ایسا ہو سکتا۔" اس کے دل نے کہا۔ کیا ستم تھا کہ اس کی راہ میں خود شاہد ہی حائل تھا۔ اور کوئی رکاوٹ اس کے راستے میں نہ تھی یہ بات اور باعث حسرت تھی۔

عروسہ کی زندگی ہی بدل گئی۔ وہ شوخی وہ متوالا پن جاتا رہا۔ چمپئی رنگ پر زردی غالب آنے لگی۔ گفتگو کم ہو گئی۔ اب وہ صرف ضرورتاً بولتی تھی۔ کشیدہ کاری، سلائی کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ ہر وقت سوچنے کو جی چاہتا تھا۔ اگر وہ جانتی تو اس سے پہلے کہ شاہد اس سے اپنا معاملہ بتلائے اپنا راز شاہد پر ظاہر کر دیتی۔ کاش وہ اس دن اصرار کر کے شاہد سے اس کے دل کی بات نہ پوچھتی۔ مگر کس طرح ممکن تھا کہ شاہد پریشان ہو اور وہ وجہ پریشانی دریافت نہ کرے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کس طرح اس کے دن کٹیں گے۔ سوچتے سوچتے وہ رونے لگتی۔

شاہد نے اس کے بعد نشاط کا کوئی ذکر نہ کیا لیکن بذلہ سنجیاں اور طراریاں اس کی بھی غائب تھیں۔ عروسہ اپنے غم میں مبتلا تھی۔ ایک روز شاہد کی نظر نے اسے سہما دیا۔

"میں نے اس روز کے بعد آج سے دریافت بھی نہ کیا کہ کب رشید کے گھر دعوت ہوگی۔ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ مجھے فکر نہیں ہے۔ خفا نہ ہو جائیں۔ اب

سے دسے کے ان کی خوشنودی ہی وجہ حیات رہ گئی ہے۔"

یہ سوچکر اٹھی اور شاہد کے پاس جاکر دریافت کیا۔ "بھائیجان! رشید کے گھر دعوت کب ہوگی؟"

"کیوں! بھابی کے دیکھنے کا شوق بیتاب کئے ہوئے ہے؟"——

——عروسہ خاموش رہی۔

"جس دن دعوت ہوگی بتادونگا —— لیکن عروسہ تم نے کئی دن سے پڑھا نہیں۔ میں پریشان تھا تو تمہیں نے تقاضہ کرکے پڑھ لیا ہوتا۔"

"آپ کی پریشانی ہی کی وجہ سے آپ کو دق کرنا مناسب نہیں سمجھا میں اپنی تعلیم کو آپ کی پریشانی سے زیادہ اہم تو سمجھتی نہیں۔"

"خیر اب ناغہ ہونا نہ چاہیئے۔"

عروسہ اداس ہوکر چلی آئی۔ اس کے دل کی پیاس اس قسم کی گفتگو سے نہ بجھ سکتی تھی۔

شاہد رضائی اوڑھ کر لیٹ رہا۔ اُس کی طبیعت کچھ سُست ہو رہی تھی۔ شاہد دن کو اس طرح لیٹنے کا عادی نہ تھا۔ شاہد کی والدہ کسی کام سے اس کے کمرے کی طرف آئیں دیکھا کہ شاہد رضائی اوڑھے لیٹا ہے۔ دل دھک سے ہوگیا۔ شاہد تو کبھی دن کو نہیں لیٹتا تھا۔ کیا بات ہے؟ انھوں نے دل میں سوچا۔

"شاہد! کیا بات ہے بیٹا! آج لیٹے کیوں ہو؟" انھوں نے پلنگ کے قریب آکر پوچھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پھر ماتھے پر ہاتھ رکھکر دیکھا انھیں کچھ گرمی محسوس ہوئی۔

"کچھ نہیں!" شاہد نے کہا۔ "طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ یوں ہی لیٹ گیا کچھ خنکی معلوم ہوئی اس لئے رضائی اوڑھلی۔"

"تمہیں تو اچھا خاصہ بخار ہے۔ دیکھو ساجد آئے تو اسے تمھارے پاس بھیجتی ہوں۔ پرچہ پر حال لکھ کر ڈاکٹر سے دوا منگالینا۔"

"نہیں امی جان! میں بالکل اچھا ہوں۔"

عروسہ نے سنا تو پریشان ہوگئی —— یہ وہ جانتی تھی کہ بخار نہیں ہے اس نے فوراً یہ سوچ لیا کہ نشاط کے لئے پریشان ہونگے۔ بہرکیف اسے مزاج پرسی کئے بغیر کس طرح چین آسکتا تھا۔

"میں نے سنا آپکے دشمنوں کی طبیعت کچھ خراب ہے؟" عروسہ نے شاہد سے پوچھا

"نہیں تو، امی کو ذرا میں وہم ہوجاتا ہے۔"

"تو آخر آپ اس قدر پریشان کیوں ہوتے ہیں——؟ میں دعا کرتی ہوں کہ آپ کامیاب ہونگے۔"

"پریشان کیوں ہوتا ہوں؟" شاہد نے کہا۔ "تمہیں کسی سے محبت ہوتی تو پوچھتا۔"

عروسہ نے مُنہ پھیر لیا۔ لاکھ روکا۔ مگر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے چاہا کہ اٹھ کر چلی جائے۔ مگر شاہد نے پلو تھام رکھا تھا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ شاہد اس کے دوپٹے کا کونا مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے تھا۔ عروسہ کی آنکھیں رقیق موتیوں سے مزین تھیں۔ چہرے پر ایک تلخ اُداسی تھی۔

"یہ تم رو کیوں رہی ہو؟" شاہد نے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ادھر آؤ" اس نے پلو پکڑ کر کھینچا۔ عروسہ پلو کے ساتھ کھینچ آنے پر مجبور ہوگئی جس کرسی پر پہلے بیٹھی تھی اسی پر پھر بیٹھ گئی۔ مگر اب دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا —— کرسی کے دستہ پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی ——

شاہد یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔

"کیا ہوا عروسہ! —— کیوں رو رہی ہو؟ —— مجھے نہ بتاؤگی۔ دیکھو میں نے اپنی بات تمھیں بتادی۔ مگر تم مجھ سے راز رکھوگی——؟"

مگر عروسہ نے کچھ نہ سنا۔ اس سے جتنا رویا گیا۔ روئی۔ شاہد حیران بیٹھا رہا کہ وہ کیا کرے۔ عورت کے آنسو مرد کیلئے وسان خطا کر دیتے ہیں۔ عورت مرد کے آنسوؤں سے کھیلتی ہے۔ ان سے پورا پورا لُطف اُٹھاتی ہے۔

شاہد کی آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں۔

عروسہ نے اپنے آنسو پونچھے اور اُٹھ کر جانے لگی۔

"عروسہ!" شاہد نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز سے پکارا۔

اس آواز میں کچھ ایسی دھمکی تھی کہ عروسہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ قدم نہ اٹھے۔ مڑ کر دیکھا شاہد کی آنکھوں میں بھی آنسو مچل رہے تھے۔

"تمھاری آنکھیں سُرخ ہوگئی ہیں —— ابھی مت جاؤ۔"

—— عروسہ واپس آگئی۔ تھوڑی دیر سناٹا رہا۔

"تو عروسہ تم نہ بتاؤگی؟" —— شاہد نے شکوہ کیا۔

—— عروسہ نے جواب نہ دیا۔

"تمھیں خود معلوم ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اور بہت

آزاد خیال بھی واقع ہوا ہوں۔ تمھیں اگر کسی سے محبت ہوگئی ہے (عروسہ نے گردن جھکالی) اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔ تو میں ہر طرح سے تمھاری مدد کے لئے تیار ہوں ——— نہ مدد کروں تو میری گردن اڑا دینا۔"

"عورت کو محبت ہی نہیں ہوتی ——— اسے محبت کرنے کا حق ہی نہیں ہے اس کے اجارہ دار تو مرد ہیں۔"

"تب تو ضرور تمھیں کسی سے محبت ہے۔ تم لاکھ چھپاؤ میں مان نہیں سکتا۔"

"اچھا آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو ——— !"

"اگر آپ کی شادی نشاط کے ساتھ نہ ہو سکی تو آپ کیا کرینگے؟"

"تو میں عمر بھر شادی نہ کرونگا۔"

"لیکن چچا جان؟"

"وہ مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔"

——— تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"اچھا ایک بات اور پوچھوں؟" عروسہ نے پھر سوال کیا۔

"وہ بھی پوچھ لو۔"

"اگر مجھے کبھی ضرورت پڑی تو آپ میری مدد کرینگے؟"

"یہ ابھی تک تمھیں پوچھنا باقی" شاہد نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا۔

"اچھا تو مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑنے والی ہے۔"

"کس طرح ———؟"

"میں شادی نہیں کرونگی ——— اس بات کے آپ ذمہ دار ہیں کہ مجھے کوئی مجبور نہ کرے۔"

"مگر کیوں؟ ——— کیوں شادی نہ کروگی۔ جس سے تمھیں محبت ہے، اسی سے شادی کرا دوں تو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ مجھے اس کا نام بتاؤ۔"

"مجھے کسی سے محبت ہی نہیں۔"

"سولہ آنے جھوٹ ——— میں قسم کھا سکتا ہوں کہ تمھیں ضرور کسی سے محبت ہے۔"

"اگر آپ کو اتنا ہی یقین ہے، اپنی قابلیت پر اتنا ہی ناز ہے تو بتا دیجئے پندرہ دن کے اندر معلوم کر کے بتا دیجئے۔"

"اگر بتا دیا تو کیا انعام دوگی؟"

"جو آپ مانگیں گے ——— منہ مانگا انعام دونگی۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے ساری کائنات کی مالک وہی ہے۔

"قسم کھاؤ۔"

"میں آپ کی قسم کھاتی ہوں۔"

"واہ ——— تاکہ ساری آئی گئی میرے سر ہو۔"

"کیا میں آپ کی جھوٹی قسم کھاؤنگی؟"

"اچھا تو ———" وہ آنکھیں بند کرکے سوچتا ہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھولکر مسکراتا ہے۔ "میرا علم بتاتا ہے کہ تمھیں جس شے سے محبت ہے، اس کا نام ہے شاہد ———" عروسہ نے لجاکر منہ پھیر لیا ——— شاہد نے پھر کہا ———

"یعنی میں ——— !"

عروسہ نے منہ پھیرتے ہوئے کہا ——— "جھوٹ!"

شاہد نے پوچھا ——— "سچ؟"

"سچ ——— !" عروسہ نے تڑسے جواب دیا۔

"اب تو تم نے خود سچ مان لیا" شاہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

عروسہ اس حاضر جوابی سے خفیف ہوگئی۔

"اچھا میرا انعام؟" شاہد نے کہا۔

عروسہ نے پہلے ہی یہ سوچ لیا تھا کہ شاہد زیادہ سے زیادہ جو اس سے مانگے گا "عروسہ" کو مانگے گا۔ اس کے علاوہ کچھ مانگ ہی نہیں سکتا۔ اس کے جواب میں وہ کہدیگی کہ "میں آپ کی کنیز ہوں۔"

"کیا مانگتے ہیں آپ؟" عروسہ نے لجاکر منہ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ پھر اسی انداز سے کہ جیسے وہ سب کچھ دیدینے پر قادر ہے۔ مگر شاہد چالاک تھا اس نے کہا۔ "مجھے دولاکھ روپیہ دیدو۔"

عروسہ پریشان ہوگئی۔ اب وہ کیا کہے۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ غور کر رہی تھی۔ جواب آخر سمجھ میں آگیا۔

"میں آپ کی کنیز ہوں۔" اس نے یہی کہا۔

"لیکن میں تو دولاکھ روپیہ طلب کر رہا ہوں۔"

"کیا آپ کی نظر میں میری قیمت دولاکھ سے کم ہے؟" اس نے طنزیہ انداز سے کہا اور مسکرادی۔

شاہد لاجواب ہوگیا اسے عروسہ کی ذہانت نے مسحور کر لیا۔ لیکن اس نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا۔ کہنے لگا۔

"تمہاری قیمت تو دو لاکھ سے کہیں زیادہ ہے اتنی کہ تصور میں بھی نہیں آ سکتی"

"تو آپ مجھے قبول کر لیجئے اور باقی فاضل قیمت کے عوض آپ میرے ہو جائیے"

"تو کیا میری قیمت تم سے دو لاکھ روپیہ کم ہے؟"

"نہیں روپیوں میں تو آپ کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ جو خدا کی قیمت ہے۔ وہی آپ کی"

"خدا کی قیمت تو پرستش ہے"

"میں آپ کی پرستش کرونگی" ـــ شاہد خاموش ہو گیا۔

"مگر نشاط مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے" شاہد نے شرارت سے کہا۔

عروسہ خاموش رہی وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

"نشاط کی تصویر دیکھو گی؟" شاہد نے پھر پوچھا۔

"جی ہاں!" عروسہ نے ہونٹوں کو دانتوں کے ساتھ دبا کر کہا۔

شاہد اٹھا، اپنا آفس بکس کھولا اور ایک لفافہ نکال کر عروسہ کی گود میں ڈال دیا۔ عروسہ جب اسے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھول رہی تھی تو شاہد نے کہا۔ "مجھے نشاط ہی سے محبت ہے، میں اسی سے شادی کرونگا"

عروسہ نے تصویر نکالی تو دیکھا کہ وہ خود اسی کی تصویر تھی جو شاہد نے عید کے روز کھینچی تھی۔ اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ "نشاط"

عروسہ نے ناز سے جھنجھلا کر تصویر شاہد پر پھینک دی اور باہر بھاگ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کونے میں منہ ڈالکر خوب ہنسے۔

شاہد تصورات میں ڈوبا ہوا مسکرا رہا تھا ـــ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ کس قدر بد قسمت ہیں جن کے کوئی چچا زاد بہن محبت کرنے کیلئے نہیں۔ میں سوسائٹی کی قبیح و احمقانہ پابندیوں سے کس قدر آزاد رہا۔

عروسہ نے یہاں سے جاتے ہی آوما کا ریکارڈ لگا دیا ـــ

"بسنت رت آئی آئی ـــ پھول کھلے ڈالی ـــ ڈالی
کنج کنج کوئلیا بولے ـــ"

شاہد اٹھا اور اس کمرے کی جانب چلا جہاں گراموفون رکھا تھا عروسہ اسے آتا دیکھ کر چپکے سے ـــ ریکارڈ کو بجتا چھوڑ کر ـــ قریب کے دروازے سے برآمدہ میں چلی گئی۔

شاہد نے آتے ہی دوسرا ریکارڈ لگا دیا۔

تم نے ہم کو پریم سکھایا!
سوئے ہوئے ہردے کو جگایا!!
ایک نئی دنیا میں لبایا!!
روپ دکھایا مست بنایا گیت سنایا!
تم ہی پریم سنگھار بالم!!
تمہیں ہو پریم سنگھار بالم!!

عزیز احمد خلش صدیقی۔ بی۔ اے (آنرز)

قطعات

سروں پچھلے پہر یہ دل زدہ تھا
پہنچتی تا عرش جس کی ہائے و ہو
آخر ہیں یاد لیکن وہ کافر!
جس نے بدلا نہ نیند میں پہلو

بام پر آپ اب نہیں آتے
کیا سبب؟ کہئے کیا ہوا صاحب
آپ کی سمت ہم نہ دیکھینگے!
اچھا لو، جو ہوا، ہوا صاحب!

اعجاز

مزدور کی شام

از حضرت احسان بن دانش

غروبِ مہر دُھندلی سی کہر چُپ چاپ ویرانہ
زبانِ شام پر اِک خوابگوں آغازِ افسانہ!

رواں ہے اس طرح مزدور گھر کی سمت جنگل سے
کھنچا جاتا ہو جیسے شمع کے جلووں میں پروانہ

چمکتا پھاوڑا رکھے ہوئے مضبوط کاندھے پر
سرِ سیما شفق کے عکس کا گلرنگ نذرانہ

تہی آنکھیں، تہی سینہ، تہی کیسہ، تہی دامن
لبالب بادۂ نابِ وفاداری سے پیمانہ

فلاکت کے سیہ گرداب میں گھومی ہوئی کشتی
رگ و ریشہ میں چکرایا ہوا خونِ خلیلانہ

چٹختی ہڈیوں سے اک کھٹک صحرا کے سینے میں
دھڑکتے دل کی ہر اک گت سے پیدا سازِ عرفانہ

پھٹے کرتے کی ہلتی دھجیاں ٹھنڈی ہوا ؤں میں
سنہری بھبتیاں آنکھوں میں دل میں عزمِ مردانہ

برستی جا رہی ہے ٹوکری سے بھربھری مٹی،
نکھرتا جا رہا ہے خاک سے حسنِ شریفانہ

دلِ مخزوں کی ہر دھڑکن کسک، ہر سانس اک نشتر
لبوں پر مانعِ فریاد اندازِ کلیمانہ

تصوّرِ خستہ جاں اطفال کا رفتار میں تیزی
قدم دُھندلی سی بُٹیا پر، تخیّل میں الم خانہ

لپکتا جا رہا ہے دشت میں عنوانِ مجبوری
برہنہ پاؤں کا ہر نقش اک تہمت کا افسانہ

فضا کی جیب میں ہے پیشگوئی حشرِ دولت کی
زمیں کے دوش پر ہے ارتقا کی زلفِ بے شانہ

دُکھیا ماں!

از محترمہ شمیم صغرا صاحبہ، بی - اے

مجھے وہ دن یاد ہیں ماں! ــــ جب تو حوروں سے زیادہ حسین اور پریوں سے زیادہ جمیل تھی۔ ــــ تیری دولت کی دھوم نے بڑے بڑے شہنشاہوں کو تیرے ــــ آستانے پر لا جھکایا تھا۔ لیکن آج ــــ تیرے ابرو ٹوٹی کمانوں کی طرح جھکے پڑتے ہیں ــــ اور ــــ ریشمیں پلکوں کی دراز جھالر کے اندر ــــ تیری حسین آنکھیں ــــ صبح کے دوبے نور تارے معلوم ہوتے ہیں ــــ تیرا چہرہ زرد ہے ــــ خزاں کے پتوں سے بھی زیادہ زرد۔ اور تیرے سفید بال شانوں پر پریشان ہیں ــــ آخر اس کی وجہ ــــ؟

ماں! تیری بیش قیمت اطلسی پوشاک کیا ہوئی ــــ یہ موٹا بھدا کھدر دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے ــــ ہائیں میری ماں! تیرے پر تاج بھی تو نہیں ــــ ماں! تیرا تاج کیا ہوا ــــ تیرے مرمریں ہاتھوں میں سنہری کنگنوں کے بجائے ــــ یہ ــــ سیاہ لوہے کے کڑے کیسے ہیں۔؟ تیرے نازک پاؤں سے پازیب کی سُریلی جھنکار کے بدلے ــــ یہ ــــ کرخت آہٹ کیسی سنائی دی ــــ تیری خوبصورت گردن میں یہ ــــ لوہے کی بھاری بھرکم زنجیریں کیسی ہیں؟ ــــ

کیا کہا ــــ؟ تو قیدی ہے! نہیں، تیری آغوش میں تو چشموں اور دریاؤں کو آزادی نصیب ہوتی تھی ــــ تو اور قیدی اُف! میرے اللہ! کیسی قید؟ ــــ کیسا جرم؟ کون صیاد ماں؟ ــــ ہائے یوں نہ گھور ماں ــــ مجھے وحشت ہوتی ہے ــــ ڈر لگتا ہے تو پھر میں ــــ جرم کا ذکر نہ کروں ــــ صیاد کا نام نہ لوں ــــ اچھا ماں! جیسی تیری مرضی! ــــ لیکن پھر تو روتی کیوں ہے؟ ــــ

ــــ تو روتی ہے اپنے ان سورما ــــ شیر دل غازیوں کے لئے ــــ جو تیری حفاظت کی خاطر ــــ آندھی بن کر اٹھتے اور ــــ طوفان بن کر چھا جاتے تھے ــــ جن کی تلواروں کے سلئے تلے بہشت کی بہاریں مچلتی تھیں ــــ جنھوں نے تیرے وحشی بچوں کو ــــ جو ــــ ننگے دھڑنگے جنگلوں میں مارے پھرتے تھے ــــ اور ــــ خدا کو بھول کر سانپ اور پتھروں کو پوجتے تھے ــــ ایک مرکز پر جمع کر کے ــــ رفعت و محبت کا درس دیا ــــ اور ان کے مغرور سر ایک خدا کے حضور میں جھکائے ــــ آہ! مادر وطن! تو روتی ہے ــــ ان کے لئے جن کے پردۂ موت میں روپوش ہوتے ہی ــــ وسیع حکومتیں برباد اور ساری جمعیتیں پریشان ہو گئیں ــــ اور تیری ــــ بہاریں خزاں میں بدل گئیں۔ ایسی بدلیں کہ پھر بہار کا کوئی امکان ہی نہ رہا ــــ لیکن بھارت ماتا! ــــ تو گذری ہوئی باتیں بھول کیوں نہیں جاتی؟

کیا کہا؟ تو ایسی احسان فراموش نہیں ــــ مغل شہنشاہوں کی دولت، حشمت، اور طاقت کی یاد ــــ دل سے مٹائی نہیں جا سکتی ان کے احسانات کی مُہریں ــــ صدیاں گذر جانے پر بھی تیرے دل پر قائم ہیں ــــ لیکن ماں! بعض انھیں متعصب اور تنگدل کہتے ہیں۔

کیا؟ ــــ یہ بکواس ہے، جھوٹ ہے، سراسر جھوٹ، تیرے تمدن میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کرنے والے ــــ وہ ــــ جنھوں نے اپنے گھر اجاڑ کر تیرا گھر بسایا ــــ وہ تیرے علوم و فنون کو ازسرِ نو زندہ کرنے والے ــــ تنگ دل نہیں ہو سکتے ہاں سچ ماں! ــــ تیرا گھر وحشیوں کا مسکن تھا ــــ جہاں ــــ انسانوں کے جیتے خون کی ارغوانی ندیاں ــــ بے حس و بے جان بڑے بڑے پتھر کے بتوں کے سامنے بہائی جاتی تھیں۔ وہ جنھوں نے

ان وحشتوں اور ظلموں کو مٹا کر ——— رحم و کرم کا پیغام سنایا ——— متعصب نہیں ہو سکتے !! ——— لیکن ماں ! یوں نہ رو، میرا دل دکھتا ہے ——— !

——— جب سب امیدیں مٹ جائیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے، یہی کبھی نہ تھمنے والے آنسو ——— ہاں تو ٹھیک کہتی ہے، لیکن کیا سچ مچ، سب اُمیدیں مٹ گئیں ؟ ——— کیا تیرے کانوں تک ہمارے لیڈروں کی آوازیں ——— نہیں پہونچتیں ؟ ——— وہ قوم قوم پکار رہے ہیں ——— وہ تیری ان زنجیروں کو توڑ ڈالینگے ——— وہ تیری خاطر دولت وشہرت و زندگی سب کچھ قربان کر ڈالینگے ——— اور ——— تو ایک بار پھر آزاد ہوگی ! ——— تو ہنس کیوں پڑی ماں ؟ ——— کیا میں جھوٹ کہتی ہوں ——— ؟

کیا کہا ؟ ——— یہی لیڈر تو تیری زنجیروں کو مضبوط کر رہے ہیں ——— انھیں کی وجہ سے تو موت کے عمیق گڑھے میں تیز تر دھکیلی جا رہی ہے ! ——— اُف یہ ہے حقیقت لیکن تو پھر ماں ——— ہم کس کی مدد سے تجھے بچائیں ——— ؟

——— ہماری یہی کمزوری تو تیری بربادی اور تباہی کا باعث ہے ——— کہ ——— ہمیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ——— ہم اپنی عقل سے کام نہیں لیتے ——— ہم دوسروں کے دست نگر ہیں، اور تیرے بچانے کا واحد ذریعہ ان نام نہاد لیڈروں کو سمجھتے ہیں ——— جن کے پاس صرف الفاظ ہیں ——— لیکن الفاظ کیا کر سکتے ہیں ؟ صرف الفاظ ! الفاظ ! ! ہاں ماں ! تو سچ کہتی ہے ——— صرف الفاظ دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

آنسو پونچھ ڈال ماں ! میں سمجھ گئی تو کیا چاہتی ہے ——— میں اس سر زمین کے کونے کونے میں جا کر تیرے ان بیٹوں سے جو آپس کی مسلسل جنگ و جدل میں کٹ رہے ہیں ——— کہدونگی ——— کہ ——— اگر انھیں مادر وطن کی عزت و زندگی عزیز ہے تو صلح و آشتی کے جھنڈے لہرائیں ——— اگر بھارت ماتا سے پیار ہے تو ایک دوسرے سے پریم کریں ——— اور سچے پریم کی خاطر مذہب اور ذات پات کے تفرقے مٹا دیں۔

میں کہدوں گی ——— تیرے ان بیٹوں سے جنھوں نے یورپ کی باد سموم کو ——— نسیم خوشگوار سمجھ رکھا ہے ——— اور تیرے ان بیٹوں سے جو مغرب کی اندھا دھند تقلید میں تیری نجات سمجھتے ہیں ——— کہ دوسروں کی خصوصیات قومیت میں محو ہو جانا ——— اپنی قومیت، تمدن اور معاشرت کا خون کرنا ہے۔

——— ان ملاؤں اور پنڈتوں سے ——— جن کی بدولت ہم بھٹک گئے ہیں ——— اس سچے رستے سے جس پر ہمیں ہمارے مذاہب لئے جا رہے تھے ——— جن کے زیر سایہ انسان انسان سے الگ ہو بیٹھا ہے ——— کہ ——— رسموں کا نام مذہب نہیں ——— بلکہ رسمیں تو وہ فولادی زنجیریں ہیں جنھوں نے ہمیں اس مضبوطی سے باندھ رکھا ہے ——— کہ اگر ہم مادر وطن کی آہ و بکا سُن کر کچھ کرنا بھی چاہیں تو نہ کر سکیں ——— اگر انھیں تیری عزت کا پاس ہے ——— تو ——— ان زنجیروں کو توڑنا پڑیگا ——— میں کہونگی، کیوں نہ ہر ایک اپنا روحانی رہنما آپ ہو۔

میں کہدونگی کہ یہ لیڈر جو قوم قوم پکار رہے ہیں، ان میں قومیت کی روح مفقود ہے ——— وہ اپنی دولت وشہرت و زندگی کو تیرے لئے قربان نہیں کرتے ——— بلکہ ——— انھیں حاصل کرنے کیلئے تیرے غریب و نادار بیگناہ بچوں کا خون بہانا اپنا عین ایمان سمجھتے ہیں ——— میں اُن لوگوں کو اس عہد کے قصے سناؤنگی ——— جب ——— تیری گود میں ایسے ایسے سپوت کھیلتے تھے جو دوسروں کیلئے اپنی زندگی قربان کر دینا شعار مردانگی سمجھتے تھے ——— جو خود موت سے کھیلتے اور موت پر ہنستے تھے۔

آنسو پونچھ ڈال ——— اے مقدس ماں ! ——— کیونکہ میں جان گئی ہوں ——— کہ ——— تیری ———

آزادی کا راز "عمل" میں مضمر ہے !

میں پکار پکار کر تیرا یہ پیغام تیرے بچوں کو پہونچاؤنگی ——— اور ——— میری آواز فضا میں گونجتی رہیگی جب تک ہمارے لیڈر لفاظی کا جامہ اتار نہ پھینکیں گے ، ماں ! ——— مجھے یقین ہے ——— کامل یقین ——— کہ "عمل" کا جھنڈا بلند ہوتے ہی ——— تیری زنجیریں ٹوٹ کر زمین پر آ رہینگی ——— اور تب فضا میں گونجتی ہوئی میری آواز تھرتھرا کر ڈوب جائیگی ——— اور اس کی جگہ فتح و نصرت کے مقدس نعرے بلند ہونگے ——— کیسی نیک ساعت ہوگی وہ ——— اے مادر وطن ! جب لوگ اللہ کے حضور میں شکرانے کے سجدے کر رہے ہونگے اور ——— تیرے سر پر ایک بار پھر وہی تاج جگمگا رہا ہوگا !

نسیم صغرا - بی - اے ۔

غزل

بیتابئ دل ہے شب غم اور زیادہ! | رکتا ہے مرے سینہ میں دم اور زیادہ
دل ہاتھ سے جاتا ہے صنم اور زیادہ | دو کاکل پیچاں کو نہ خم اور زیادہ
اک دل ہے وہ لیجائیں عزیز ان سے نہیں ہے | کچھ پاس نہیں رکھتے ہیں ہم اور زیادہ
مرتا ہوں روانی پہ تری خنجر قاتل! | اس سے بھی مرے سر کی قسم اور زیادہ
اس طرح رہ شوق میں ہمراہ رہا دل | مجھ سے بھی چلا چار قدم اور زیادہ
جو کچھ ہو وہ اے پیر مغاں منہ سے لگا دے | اس وقت نہیں سوجھتی کم اور زیادہ
دل یوہیں تھا بے صبر شب وصل ہمارا | کرتی ہے حیا ان کی ستم اور زیادہ
اب جان لڑا دینے پہ آمادہ ہیں عشاق | چمکاؤ نہ شمشیر دودم اور زیادہ
آنسو وہ محبت سے مرے پونچھ رہے ہیں | یارب ابھی دے چشم کو نم اور زیادہ

تا دیر رہی ایمان پہونچنا ہوا مشکل؛
دشوار ہے پھر راہ حرم اور زیادہ

محبوب پاشا!

اقطاع آراضی

پنجاب کا ایک اہم معاشی مسئلہ

از عبدالرحیم صاحب شبلی۔ بی۔ کام

اقطاع آراضی کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں زمینداروں کے پاس چھوٹی چھوٹی منتشر آراضی ہوگئی ہیں جن کو وہ بمنفعت زیر کاشت نہیں لا سکتے۔

انتشار آراضی کے اسباب اس انتشار آراضی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں مروجہ قوانین وراثت تمام ورثاء کو برابر کا حصہ دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہندوؤں میں دو قسم کے قوانین مروج ہیں دیابھاگ اور متیاکشر۔ اول الذکر کی رو سے بیٹا باپ کی وفات کے بعد ہی اس کی جائداد کا وارث بنتا ہے لیکن موخر الذکر کی رو سے وہ اپنے باپ کی زندگی میں ہی وارث تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے قوانین بھی کچھ اس طرح کے ہیں کہ سب بیٹوں کو برابر کا حصہ ملے۔

چونکہ ہندوستان میں غربت پہلے ہی سے ہے اور ایک اوسط آدمی کوئی غیر معمولی جائداد جمع نہیں کر سکتا اس لئے جب تھوڑی سی متروکہ زمین پر تمام ورثاء برابر کے حصہ دار بن جاتے ہیں تو اسے کئی حصوں میں منقسم کرنا پڑتا ہے۔

علاوہ ازیں رسم و رواج بھی انتشار آراضی میں ممد ثابت ہوتے ہیں مثلاً ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی زمین کئی مقامات پر واقع ہو اب رواج یہ ہے کہ ہر مقام کی زمین میں سے ہر بیٹے کو برابر کا حصہ ملے۔ اس طرح سے گویا زمین نہ صرف منقطع اور منتشر ہو جاتی ہے بلکہ وہ منقطع در منقطع اور منتشر در منتشر ہو جاتی ہے۔

اقطاع کے نقصانات اس اقطاع آراضی کا بڑا نقصان یہ ہے کہ زمیندار بڑے پیمانے پر اپنی آراضی کو زیر کاشت نہیں لا سکتے۔ مشینوں۔ نئی قسم کے ہلوں۔ جدید کھادوں اور اعلیٰ بیجوں وغیرہ کے لئے ضروری ہے کہ زمین بھی کافی ہو تاکہ ان بیش قیمت اشیاء کے استعمال میں کفایت رہے۔ لیکن ہمارے کاشتکاروں کے مقبوضات چونکہ غیر اقتصادی ہیں اس لئے وہ اکتشافات عصر یہ سے کماحقہ فائدہ اٹھانے سے محروم ہیں۔

انتشار آراضی سے قوت و طاقت اور وقت وغیرہ بھی بہت ضایع ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ زمینیں ادھر ادھر منتشر ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے اور آلات کشاورزی وغیرہ کے انتقال سے نہ صرف وقت ضایع ہوتا ہے بلکہ بہت سی قوت و طاقت بھی رائگاں جاتی ہے۔

یہ اسی اقطاع آراضی کا نتیجہ ہے کہ زراعت اب منفعت بخش پیشہ متصور نہیں ہوتا۔ بہت سے زمیندار کاشتکاری کو چھوڑ کر دستکاری اور صنعت و حرفت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

پنجاب کے اعداد و شمار ۔ پنجاب میں اقطاع اور انتشار آراضی کا منظر ہندوستان کے تمام صوبوں سے بھیانک ہے۔ ایک گاؤں میں معلوم کیا گیا تھا کہ ۵۸۴ مالکین کے پاس ۲۳۵۳ ۔ ایکڑ زمین ہے۔ اور یہ زمین بھی انھوں نے ۱۶۳۱۱ حصوں میں منقسم کی ہوئی تھی۔ اور ایک آدمی کے پاس اوسطاً ۴ ایکڑ زمین تھی۔ اب ظاہر ہے کہ نگی ہلنے گی کیا اور بچھڑ یگی کیا۔ اتنی زمین سے کاشتکاری کیا ہو سکتی ہے اور روزی کس طرح کمائی جا سکتی ہے۔

ضلع جالندھر میں اقطاع آراضی کا یہ حال ہے کہ کنوؤں کو بھی آپس میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایک کنوئیں کے آٹھ آٹھ بلکہ سولہ سولہ مالکین ہیں۔ پنجاب کے دیہاتوں کی ایک خاص اقتصادی تفتیش ہوئی تھی جس سے

معلوم ہوا کہ ۱۷٫۹ فیصدی مالکین کے پاس صرف ایک ایکڑ زمین ہے ۵٫۴۵ فیصدی کے پاس ایک ایکڑ سے ۳ ایکڑ سے ۵ ایکڑ تک اور ۱۸ فیصدی کے پاس ۵ سے ۱۰ ایکڑ تک زمین ہے۔ دوسرے الفاظ میں مقبوضات کا ۴۳٫۵ فیصدی حصہ تین ایکڑوں اور ۵۸ فیصدی حصہ پانچ ایکڑوں سے بھی کم ہے۔

کثرت بارش کا اثر قطاع ملکیت پر

پنجاب میں ملکیت آراضی کے مفصل اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اضلاع میں بارش بہت ہوتی ہے ان میں انقطاع آراضی بھی بہت ہے اور جن اضلاع میں بارش کم ہوتی ہے وہاں انقطاع آراضی کم ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جہاں بارش زیادہ ہوتی ہے وہاں لوگ بھی زیادہ آباد ہیں اس لئے زمین پر بوجھ زیادہ ہے اور انقطاع آراضی عام ہے۔ مثلاً راولپنڈی۔ شملہ، انبالہ اور گورداسپور میں بارش کی اوسط سب مقامات سے زیادہ ہے اور یہاں انقطاع آراضی بھی شدت سے ہے۔

جوں جوں ہم جنوب مغرب یعنی ملتان کی طرف جائیں بارش کم ہوتی جاتی ہے اور انقطاع آراضی بھی کم ہے۔ جنوب مغربی علاقوں میں کم ریلوں کی تعداد میں کمی اور مقدمہ بازی کی زیادتی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شمال مشرقی علاقوں کی نسبت خوشحالی کم ہے۔

ذیل میں ہم ایک نقشہ دیتے ہیں جس سے معلوم ہوسکے گا کہ دریائے ستلج کے بائیں اور دائیں کنارے پر آباد تحصیلوں میں جس علاقہ میں بارش زیادہ ہوتی ہے وہاں دس ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالکوں کی نسبت دس ایکڑ سے کم مالکوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

ستلج کا بایاں کنارہ

نام تحصیل	بارش انچوں میں	دس ایکڑ سے زیادہ کے مالکین کی تعداد	دس ایکڑ سے کم کے مالکین کی تعداد
روپڑ	۲۹٫۱۶	۸٫۸	۹۱٫۲
لدھیانہ	۲۶٫۲۱	۱۸٫۱	۸۱٫۹
فیروزپور	۱۷٫۷۸	۲۳٫۷	۷۶٫۳
فاضلکا	۱۱٫۰۸	۸۱٫۲	۱۹٫۰

ستلج کا دایاں کنارہ

نام تحصیل	بارش انچوں میں	دس ایکڑ سے زیادہ کے مالکین کی فیصدی تعداد	دس ایکڑ سے کم کے مالکین کی فیصدی تعداد
گڑھ شنکر	۳۰٫۵۸	۶٫۲	۹۳٫۷
پھلور	۲۴٫۷۶	۱۲٫۳	۵۷٫۸
نکودر	۲۲٫۴۷	۷٫۶	۹۲٫۵
ترن تارن	۲۲٫۲۴	۲۳٫۰	۷۶٫۹
قصور	۱۵٫۵۲	۳۲٫۷	۶۷٫۲
چونیاں	۱۳٫۶۳	۴۲٫۹	۵۷٫۱
دیپالپور	۹٫۵۴	۵۷٫۹	۴۲٫۲
پاک پتن	۸٫۸۲	۴۷٫۰	۵۳٫۱
لودھراں	۵٫۱۸	۴۵٫۵	۵۴٫۴

اسی طرح دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے دائیں اور بائیں کناروں کی تحصیلوں میں مالکین آراضی کی نسبت بھی یہی ہے۔

نوآبادیوں میں اس مرض کا اندفاع

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملکیت آراضی پر زیادتی بارش کا اثر بھی ہوتا ہے لیکن گذشتہ چند برسوں سے پنجاب میں ایک اور سبب بھی پیدا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے انقطاع آراضی کا امکان بڑھ گیا ہے اور وہ آب پاشی ہے جن علاقوں میں نہروں کا پانی بغرض آبپاشی لایا گیا ہے وہاں تو اس سبب کا زیادہ اثر نہیں ہوا لیکن جن علاقوں میں نوآبادیاں قائم کی گئی ہیں وہاں اس کا اثر ظاہر ہو رہا ہے۔ گورنمنٹ نے وہاں اس مرض کا اندفاع کرنے کے لئے دو طریق استعمال کئے ہیں۔

۱۔ انتقال آراضی پر بندشیں۔

۲۔ صرف ایک وارث کو ترکہ دیکر باقی ولدثوں کو کچھ امداد دینا۔

تحریک اشتمال آراضی

ایک اور طریق جس سے پنجاب میں انقطاع آراضی کا اندفاع کیا گیا ہے تحریک اشتمال آراضی ہے یعنی زمینداروں میں آپس میں سمجھوتہ کروا کے آراضی کا اشتمال اور اتحاد کروایا جا رہا ہے



رباعی

این کوزہ چو من عاشق زارے بودست
در بند سر زلف نگارے بودست
این دستہ کہ بر گردن او می بینی
دستیست کہ بر گردن یارے بودست

ہفتہ وار

خیّام

لاہور

خیّام اپنے محاسن و اوصاف اور ظاہری و باطنی خوبیوں کے اعتبار سے لاجواب ہوگا +

خیّام کے دانش افزا مقالے ذہن و دماغ کو علمی و تحقیقی معلومات سے روشن کرینگے +

خیّام کی وجد آفریں نظمیں جدید شاعری اور شاعرانہ ترقی کیلئے چراغ رہنمائی ہونگی +

خیّام کے دلچسپ افسانے نفسیات انسانی کے تمام پہلوؤں کی نقاب کشائی کرینگے +

خیّام کی نظر افروز تصویریں فن مصوری کے عروج و ترقی کا حقیقی نمونہ ہونگی +

خیّام سال بھر میں بڑے سائز کے سترہ سو (۱۷۰۰) صفحات کے وہ مضامین پیش کریگا جو ہر حیثیت سے عدیم النظیر ہونگے +

خیّام بتائیگا کہ اردو صحافت کس زینے سے ایوان کمال پر جا سکتی ہے +

خیّام صحافت کے جدید اور ترقی یافتہ تخیل کی صورت ہوگا +

خیّام کا مطالعہ فکر و نظر کی تربیت اور تہذیب ذہنیت کا باعث ہوگا +

بایں ہمہ خیّام کی سالانہ قیمت صرف پانچ روپے علاوہ محصولڈاک ہے لیکن عالمگیر اور صرف عالمگیر کے خریداروں سے صرف چار روپے للعہ علاوہ محصولڈاک لئے جائیں گے

عالمگیر کے تمام خریدار حضرات کی خدمت میں "خیّام" کا پہلا پرچہ بطور نمونہ خود بھیجدیا جائے گا۔ اس لئے نمونہ کیلئے کارڈ لکھنے کی ضرورت نہیں!!

یہ کام محکمہ امداد باہمی کو تفویض کیا گیا ہے جو اس بارے میں مفید کام سرانجام دے رہا ہے۔
اشتمال آراضی کی تحریک کو کام کرتے ہوئے تیرہ چودہ برس گذر چکے ہیں اور اس عرصہ میں کافی کچھ ہو چکا ہے۔ میرے پاس تازہ اعداد و شمار تو نہیں ہیں لیکن پہلے پانچ برس میں ۳۹۷۵۷ ایکڑ زمین زیر اشتمال لائی گئی۔ اس کے بعد ایک برس میں بیس ہزار ایکڑ اور پھر ۱۹۲۷ء میں اٹھانوے ہزار ایکڑ سے زائد زمین کا اشتمال کروایا گیا۔ اب مجھے امید ہے کہ اس سے تین چار گنا زمین پر یہ تحریک زیر عمل لائی جا چکی ہوگی۔

کیا قوانین وراثت تبدیل کرنے چاہئیں؟ بعض لوگ قوانین وراثت کے تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صرف بڑے لڑکے کو جملہ جائداد کا وارث بنانا چاہئیے۔ باقی ورثا کو کچھ امداد دے کر صنعت اور دستکاری وغیرہ کی طرف مائل کرنا چاہئیے۔
لیکن میرا خیال ہے کہ یہ طریق منفردیت اور شخصیت پسند یورپ میں زیر عمل لایا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان میں جہاں زندگی مشترکہ اصول کے مطابق گذاری جاتی ہے اور جہاں اخوت اور کنبہ داری یورپین ممالک سے کہیں زیادہ ہے اس تحریک کی کامیابی مشکل نظر آتی ہے۔
بس یہاں بہترین تجویز یہی ہوگی کہ تحریک اشتمال آراضی کو تعلیم اور پروپگنڈے کے ذریعہ سے وسیع کیا جائے۔

شبلی - بی کام۔

بُلبُل

رابرٹ برجز ROBERT BRIDGES کی مشہور نظم NIGHTINGALE, کا ترجمہ

از محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی

— ۱ —

اے حسین پرند — تو جہاں سے آیا ہے ... وہ پہاڑ کس قدر حسین فرحت افزا ... اور ... جاذب نظر ہونگے ... ہاں ... جہاں تو نے یہ جادو بیانی سیکھی ہے ... ضرور ... وہاں کی وادیاں اور کہسار پھولوں سے لدے ہونگے ... بتا ... اے خوبصورت پرند ... مجھے بھی بتا کہ وہ جگہ کہاں ہے؟ ... وہ حسین، روح افزا صحرا کہاں ہیں؟ ... میں چاہتا ہوں کہ ان دلفریب صحراؤں کی سیر کروں ... جہاں کے حسین پھول ... اپنی رعنائیوں سے ہر دیکھنے والے کے دل پر مقناطیسی اثر پیدا کرتے ہیں جن کی ... ہر پنکھڑی حسنِ دلربا کی ایک سچی تصویر ہے ... یا کتاب حُسن کے ایک ورق کا حکم رکھتی ہے ... میں چاہتا ہوں کہ تیری طرح ... وہاں کے دلکش کہساروں ... حسین مناظر ... سرسبز اور شاداب وادیوں سے لُطف اندوز ہوں ... "

— ۲ —

نہیں ... وہاں کے کہسار سنسان پڑے ہیں ... ان میں کوئی بھی کشش نہیں ... وہاں نہ پھول کھلتے ہیں ... نہ کلیاں مسکراتی ہیں ... اور نہ بادِ صرصرِ نازک ... حسین ... پھولوں کی پنکھڑیوں کے بوسے لیکر محبت کے راگ چھیڑتی ہے ...'

ہمارے سحر آفریں راگ ... ہمارے دل کے ٹوٹے ہوئے ساز کے وہ پر سوز نغمے ہیں ... جو فضا میں بلند ہو کر ... ہر طرف ... غم، حرماں نصیبی ... اور نا امیدیوں کی گھٹائیں چھا دیتے ہیں ... فضا میں ڈوبے ہوئے درد انگیز نغمے ... خرمنِ دل کو جلا دینے والے نالے ... ہمارے درد انگیز نغموں کی ترجمانی نہیں کر سکتے ...'

جب آفتاب دنیا کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے چادرِ فلک میں رُپوش ہوتا ہے ... دنیا کی ہر شے ساکت و خاموش نظر آتی ہے۔ ہر طرف تاریکی چھا جاتی ہے ... اس وقت ہم اپنے پر سوز نغموں سے ساری فضا کو مترنم کرتے ہیں ... لیکن جونہی سحر پردۂ اُفق پر نمودار ہوتی ہے ... نونہالانِ چمن اپنا سرسبز جامہ زیبِ تن کرتے ہیں ... اور صدہا حسین پرند پھولوں کو بہار کی آمد پر مبارکباد پیش کرتے ہیں ... ہم اس وقت بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی

پُراسرار سرائے!

اِرونگ واشنگٹن کا ایک شاہکار

از جناب علی احمد صاحب علی فرزند نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مد ظلہ

آخر شام تھی۔ رنگ شفق تاریکی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ٹھیک اس وقت ایک گاڑی جس میں گھوڑے جتے ہوئے تھے آہستہ آہستہ کوہ اسپین کی دشوار گذار وادیوں میں سے گذر رہی تھی۔ یہ ویران پہاڑی راستہ نہایت پرخطر تھا۔ اس لئے یہاں آئے دن حیرت انگیز واقعات اور پراسرار قتل ہوا کرتے تھے۔ گاڑی بہت قدیم زمانے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے اندر ایک لانبا، دُبلا اور بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ لباس فوجی وضع کا تھا۔ اس کے چہرے کی جھرّیوں سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ اب اس کے لڑائی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ اُس کے قریب ایک دُبلی پتلی، کمزور، خوبصورت ۱۸۔ سال کی لڑکی بیٹھی تھی۔ گاڑی کے سامنے کے حصے پر ایک قوی تنومند نوکر بیٹھا تھا مونچھیں بڑی بڑی تھیں اور چہرے پر زخموں کے نشان جابجا تھے جس سے واضح تھا کہ وہ بھی کبھی فوجی ملازمت انجام دے چکا ہے۔

دراصل یہ پولینڈ کا کونٹ تھا۔ جب پولینڈ میں سیاسی انقلابات ہوئے تو اس کو اپنے ملک کی طرفداری کے جرم میں شہر بدر کر دیا گیا۔ پہلے چند سال یہ کونٹ اٹلی کے شہروں میں اپنی لڑکی کی تعلیم کیلئے گھومتا رہا۔ وہاں بڑی بڑی سوسائٹیوں میں وہ جاتا اور اپنی لڑکی کو بھی ساتھ لے جاتا۔ لڑکی کے حسن کا چار سو شہرہ ہو گیا تھا اور ہر ایک اُس سے ملاقات کا متمنی تھا۔ پھر یکایک اس لڑکی کی صحت خراب ہوتی گئی۔ وہ کمزور اور دُبلی ہو گئی۔ پھول سے سُرخ رخسار زرد پڑ گئے۔ بوڑھے کونٹ نے اپنی لڑکی کے اس تغیر کو محسوس کیا اور تبدیلی مقام کا ارادہ کیا۔ کچھ دنوں بعد یہ خاندان جو صرف دو افراد پر مشتمل تھا وفادار ملازم کیسپیر کے ساتھ اسپین کی وادیوں سے گذرتا نظر آتا ہے۔

شام کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اونچی اونچی چٹانوں کے درمیان تنگ راستوں سے گذرتے رہے۔ فضا خاموش اور وحشتناک تھی۔ کسی آبادی تک پہونچنے کیلئے ابھی انھیں آٹھ نو میل اور چلنا تھا۔ لیکن گاڑیبان پیٹرو نہایت اطمینان کے ساتھ گنگنا رہا تھا۔ بادل کے سیاہ اور بھورے ٹکڑے آسمان پر چھا رہے تھے۔ ہوا مرطوب اور سرد تھی۔ کونٹ نے گاڑی کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے پیٹرو کو مخاطب کیا۔

"تیز چلو" اس نے کہا "کسی سرائے تک پہونچتے تک ہمیں آدھی رات ہو جائیگی"۔

"اب وہ زیادہ دور نہیں ہے" گاڑیبان نے جواب دیا۔

"کہاں؟" کونٹ نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیا ہے" پیٹرو نے ایک ویران اور شکستہ سرائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب صرف نصف میل ہمیں چلنا ہے"۔

"کیا وہ یہی ہے؟" کونٹ نے تعجب سے کہا۔ "یہ تو ایک کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس بوسیدہ سرائے میں شب باشی کرنے کے بجائے کسی گاؤں میں پہونچنا زیادہ مناسب ہوگا"۔

"ناہموار سڑکوں اور پہاڑی وادیوں میں چلتے چلتے گھوڑے بہت تھک گئے ہیں" پیٹرو نے کہا۔ "خوف ہوتا ہے کہ آبادی تک پہونچتے پہونچتے کہیں یہ گر نہ جائیں۔ اس محفوظ اور آرام دہ سرائے میں پہونچکر سرکار بہت خوش ہونگے"۔

کونٹ بغیر کسی تکرار کے راضی ہو گیا۔ اس لئے کہ ہوا بہت سرد

تھی اور رات تاریک ہو چکی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی لڑکی کو کسی طرح جلد محفوظ مقام پر پہونچا دے۔ چنانچہ گاڑی گھڑگھڑاتی ہوئی۔ سرائے کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یہاں خاموشی بالکل خاموشی تھی۔

وہ لوگ جو گاڑی پہونچنے پر پیشوائی کے لئے آئے ان کے لباس میلے اور گرد آلود تھے۔ ان کی شباہتیں عجیب تھیں۔ وہ سب پیٹرو کو جانتے تھے اس لئے کہ اس کو دیکھتے ہی وہ لوگ اس سے بغلگیر ہوئے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

مالکہ سرائے کونٹ اور اس کی بیٹی کو کمرے دکھانے کیلئے لے گئی۔

عمارت بہت قدیم تھی اور غیر منظم طریقے پر بنائی گئی تھی۔ دیواریں سیاہ تھیں اور کہیں کہیں ان پر بڑی بڑی بھدی تصویریں آویزاں تھیں۔ کونٹ نے دو کمرے پسند کئے جو ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ اندرونی کمرہ لڑکی کے لئے اور دوسرا اپنے لئے۔ جو پلنگ ان کو سونے کیلئے دیئے گئے تھے وہ لکڑی کے بنے ہوئے بدشکل اور سخت تھے۔ کونٹ نے اپنے شانے ہلائے اور خاموش ہو گیا۔ اس لئے کہ اس سے بہتر آسائش کا مہیا ہونا وہاں ناممکن تھا۔ کمرہ کے درمیان میں لکڑی کی ایک میز رکھی تھی اور ایک گوشے میں آتشدان میں آگ سلگ رہی تھی۔

علاوہ ان سب کے کونٹ کو جس چیز نے متحیر کیا وہ مالکہ سرائے کا لباس تھا۔ اس کے کپڑے اگرچہ میلے تھے اور ان سے بدبو آ رہی تھی مگر قیمتی تھے انگلیوں میں متعدد بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں گلے میں ایک ہار تھا جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے جو روشنی میں چمک رہے تھے۔ کمرے کا تمام انتظام مکمل کرنے کے بعد وہ ایک سیاہ اور بدشکل ملازمہ کو چھوڑ کر چلی گئی۔ کیسپر کونٹ کا وفادار ملازم، گاڑیبان پیٹرو پر بہت برہم تھا اور کئی مرتبہ اس سے جھگڑ بھی گیا اس لئے کہ وہ ویران سرائے اسے بالکل ناپسند تھی۔

کونٹ نہایت خوش مزاج شخص تھا اسے کسی قسم کا تردد تھا نہ کوئی فکر تھی وہ مطمئن تھا۔ شاید جنگ کی دلیرانہ زندگی نے اس کے دل کو سخت بنا دیا تھا۔ اس نے ایک آرام کرسی اپنے لئے اور ایک اپنی لڑکی کے لئے کھینچی اور دونوں آگ کے قریب بیٹھ گئے۔ آتشدان میں لکڑی کی کمی کی وجہ سے دھواں کمرے میں پھیل رہا تھا چنانچہ کونٹ نے ملازمہ سے جو ایک کونے میں کھڑی ہوئی تھی لکڑی لانے کیلئے کہا۔ وہ گئی اور جونہی لکڑی کا گٹھا لئے کمرہ میں داخل ہوئی اس کا پاؤں پھسل گیا اور کرسی پر جا گری۔ کنپٹی سے خون بہنے لگا اور وہ بیہوش ہو گئی +

جب اسے ہوش آیا تو اس نے کونٹ کی بیٹی کو اپنی تیمارداری میں مصروف پایا۔ وہ اس کے زخم پر پٹی باندھ رہی تھی۔ لڑکی کے اس ہمدردانہ اخلاق نے ملازمہ کے دل میں گھر کر لیا۔ وہ بہت متاثر ہوئی اور تعظیماً اس نے لڑکی کے ہاتھ کو چوما۔

ایک نئی آمد نے سرائے کی خاموشی کو ہنگامے میں تبدیل کر دیا۔ یہ ایک اسپینی ملکہ کی سواری تھی جس کے ہمراہ بہت سے لوگ تھے۔ مالکہ سرائے اپنے معزز مہمانوں کی پیش قدمی کے لئے دوڑی اور کچھ دیر کے لئے کونٹ اور اس کی لڑکی کے کھانے کا انتظام ملتوی ہو گیا۔

لڑکی نوواردوں کو دیکھنے کیلئے اپنی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی جہاں سے نیچے کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ ایک نوجوان شخص گاڑی سے اترا اور اپنے ہاتھ کا سہارا دیکر معزز ملکہ کو اتارا۔ یہ ایک میانہ قد کی بوڑھی عورت تھی۔ چہرہ چوڑا اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ لباس خوشنما اور زرین تھا۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کا سرا سونے کا تھا۔ نوجوان شخص جو اس کے ساتھ تھا۔ لانبا اور خوبصورت تھا۔ کونٹ کی لڑکی نے جب اسے دیکھا تو جھجک گئی۔ اس نے ایک لانبی سانس لی اور کھڑکی کو بند کر دیا۔ اس سرد آہ کا کیا مطلب تھا نہیں کہا جا سکتا! شاید اس کی وجہ وہ فرق تھا جو ملکہ کی خوبصورت گاڑی اور اس کے باپ کی بھدی قسم کی گاڑی میں تھا۔ جو ایک دوسرے کے قریب ہی کھڑی تھیں +

بہرحال جو سبب بھی ہو لڑکی نے ایک آہ کے ساتھ کھڑکی کے در بند کر دیئے اور اپنی کرسی کے پاس واپس آ گئی۔ اس کا نحیف اور نازک جسم کانپ گیا۔ کرسی کے دستے پر اس نے اپنی کہنی ٹیکی اور ہتھیلی پر اپنے زرد رخسار رکھ کر غم آلود نگاہوں سے آتشدان میں جلتی آگ کو دیکھنے لگی۔

کونٹ نے محسوس کیا کہ آج اس کی لڑکی روز سے زیادہ زرد معلوم ہو رہی ہے۔ "میری لڑکی! تجھے کس بات کا غم ہے؟" اس نے کہا۔

"پیارے باپ! کچھ نہیں"۔ لڑکی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ایک آنسو کا قطرہ اس کی سیاہ آنکھوں سے نکل کر زرد رخسار پر ڈھلک گیا۔ اور اس نے اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا۔

"کھڑکی کی سرد ہوا نے تیری طبیعت کو مضمحل کر دیا ہے۔" کونٹ نے کہا، "لیکن آج کی رات کے مکمل آرام سے تیری طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔"

میز پر کھانا چن دیا گیا تھا جبکہ مالکہ سرائے اندر آنے کی اجازت چاہتے ہوئے اور معافی مانگتے ہوئے نو واردوں کو ساتھ لیکر نمودار ہوئی اس لئے کہ رات کافی سرد تھی اور اس کمرے کے سوائے کہیں اور آتشدان نہ تھا۔ ابھی اس کی گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ملکہ اسپین نوجوان کا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ کونٹ فوراً انھیں پہچان گیا۔ اس لئے کہ وہ ان کے ساتھ اٹلی اور نیپلس کی بہت سی محفلوں میں اپنی لڑکی کے ساتھ شریک ہو چکا تھا نوجوان جو ملکہ کا بھتیجا تھا لڑکی کو دیکھ کر متعجب ہوا کیونکہ وہ نیپلس میں اس سے بارہا مل چکا تھا۔ فریقین نہایت پرجوش طریقے پر ایک دوسرے سے ملے۔ وہ نوجوان لڑکی کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی کرسی کے قریب جا کر کچھ آہستہ سے کہا۔ لڑکی اُٹھی اور جھک گئی نہ تو اس کی طرف دیکھا نہ کچھ کہا۔ پھر بدستور کرسی پر بیٹھ گئی اور آتشدان کی روشن آگ کو تکنے لگی اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا اور ایک جا رہا تھا۔

اس نوجوان جوڑے کی خاموش ملاقات کو نہ تو کونٹ نے دیکھا اور نہ ملکہ نے اس لئے کہ وہ دونوں ابھی تک مصروف گفتگو تھے۔

ایک ہی میز پر سب نے رات کا کھانا کھایا۔ کونٹ اور ملکہ کھانا ختم ہونے تک باتیں ہی کرتے رہے لیکن یہ دونوں بالکل خاموش رہے لڑکی نے کچھ نہ کھایا حالانکہ ملکہ اس سے باربار اصرار کرتی رہی +

"آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" کونٹ نے کہا۔ "ابھی جب یہ کھڑکی سے باہر آپ کی گاڑی کو دیکھ رہی تھی تو اسے چکر آ گیا تھا۔"

لڑکی کے چہرے پر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنی رکابی پر جھک گئی، اور اس کے سیاہ منتشر بالوں نے اُس کے حسین چہرہ کو چھپا لیا۔

جب کھانا ختم ہو گیا تو وہ سب آتشدان کے اردگرد کرسیوں پر سردی دور کرنے کیلئے بیٹھ گئے۔ ایک ستار جو کونٹ کے ساتھ آیا تھا دیوار کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ ملکہ نے اُسے دیکھا۔

"ہم رخصت ہونے سے پہلے کیا کچھ موسیقی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں!" ملکہ نے کہا کونٹ اپنی لڑکی کے گانے پر بہت نازاں تھا۔ اس لئے اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ملکہ کے نوجوان بھتیجے نے جلدی کی اور فوراً ستار لاکر حسین مغنیہ کو پیش کیا۔ وہ یقینی انکار کر دیتی لیکن وہ اس قدر پریشان اور محجوب تھی کہ کچھ کہہ نہ سکی۔ بجز اس کے کہ ستار کے تاروں کو اپنی لرزاں انگلیوں سے مرتعش کر دے اور فضا کو اپنے حسین نغموں سے معمور کر دے۔ کونٹ کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنی لڑکی کو گھور رہا تھا۔ ملکہ گانے سے مسحور ہو کر جھوم رہی تھی اور نوجوان حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔

ملکہ کے اصرار سے پھر اس نے ایک اسپینی گیت چھیڑا جو محبت کی ناکامیوں کا حامل تھا۔ گیت اس قدر پر اثر تھا کہ وہ خود اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور رونے لگی۔ نغمہ یکایک ختم ہو گیا اور کمرے میں سکوت ہو گیا۔

"اب تو بہت تھک گئی ہے۔" کونٹ نے اپنی لڑکی کو آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے تجھے بہت تکلیف دی۔ تیرا مزاج بھی درست نہیں اپنے کمرے میں جا اور آرام کر۔"

وہ اٹھی اور سب سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"اس کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔" کونٹ نے ملکہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی۔ روز بروز کمزور اور زرد ہوتی جا رہی ہے۔"

"ممکن ہے کسی کی محبت میں مبتلا ہو۔" ملکہ نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا

"ناممکن!" کونٹ نے کہا ــــ "اس نے اس بارے میں کبھی مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔"

غریب کونٹ اس دوشیزہ کے دل کی گہرائیوں کو کیا جانے جو کسی کی محبت کا شکار ہو چکی ہے۔ اور جو معصوم کہ خود مشکل سے اپنے دل کی حالت کو سمجھ سکے وہ دوسروں کو کیا سمجھائے۔

ملکہ کا بھتیجا اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔

جب لڑکی اپنے کمرہ میں پہونچی اور خود کو تنہا پایا تو اس کے جذبات متلاطم ہوئے۔ اور وہ رونے لگی۔ اس نے اپنی کھڑکی کے پٹ کھولدیئے اور کھڑی ہو گئی۔

"اس نے مجھے روتا ہوا دیکھ لیا۔" لڑکی نے اپنے دل میں کہا۔ "لیکن کیا ہرج ہے۔ کوئی ہرج نہیں۔" بہت دیر تک وہ اپنے خیالات میں گم رہی یہاں تک کہ ملکہ، اس کا بھتیجا۔ سب رخصت ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے لڑکی نے ایک طویل سانس لیا اور کھڑکی کے پٹ بند کرنے کیلئے بڑھی تھی کہ

اس نے چند آوازیں سُنیں۔ کھڑکی کے نیچے دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہوئے گذر رہے تھے۔

"لیکن بیچاری نوجوان لڑکی کا کیا حشر ہوگا؟" ایک نے کہا۔ لڑکی نے اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ آواز ملازمہ کی تھی۔

"ہش! ہم کو اس سے کیا۔ اس کی قسمت!" دوسرے نے جواب دیا یہ آواز گاڑیبان پیٹرو کی تھی۔

"مگر کیا وہ بچائی نہیں جا سکتی؟" عورت نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔ "وہ بڑی رحمدل ہے۔"

"آخر تیرا ارادہ کیا ہے؟" بوڑھے گاڑیبان نے ذرا ترش ہوکر جواب دیا۔ "ایک بیوقوف لڑکی کی خاطر تو سب بنا بنایا کھیل بگاڑ دینا چاہتی ہے۔"

اس وقت تک وہ لوگ کھڑکی سے اس قدر دور پہونچ گئے تھے کہ لڑکی کچھ اور نہ سن سکی۔

اس قسم کی گفتگو لڑکی کو حیرت میں ڈالنے کے لیئے کافی تھی۔ اس نے بہت سے سوالات اپنے دل سے کئے۔ کیا یہ باتیں اسی سے متعلق تھیں؟ اور اگر ایسا ہو بھی تو وہ کونسا خطرہ ہے جس سے خبردار رہنا چاہیئے؟ دو تین مرتبہ وہ اپنے باپ کے کمرے کے دروازے تک گئی تاکہ جو کچھ سنا تھا اسے بتلا دے لیکن پھر اُس نے سوچا ممکن ہے اس کو غلط فہمی ہو رہی ہو اور وہ باتیں کسی اور سے متعلق ہوں۔ بہرحال اس کے لئے یہ ایک ایسا معمہ تھا جو کسی طرح حل نہ ہو سکتا تھا۔

لڑکی ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ کمرے کے تاریک کونے سے اُسے ایسی آواز آئی جیسے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اسے اس چور دروازے کا پہلے سے علم نہ تھا۔ وہ پریشان سی ہوگئی۔ کمرے کے لیمپ کو روشن کیا اور آنے والے کا نام دریافت کیا۔ ایک عورت نے جواب دیا۔ یہ آواز ملازمہ کی تھی۔ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اُس نے بلاخوف دروازہ کھول دیا۔ سوہی سیاہ ملازمہ کمرے میں چپکے سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی داخل ہوئی۔

"فرار ہو جاؤ۔" اُس نے کہا۔ "اس سرائے کو فوراً چھوڑ دو۔ یہاں جان کا خطرہ ہے۔"

نوجوان لڑکی آنے والے خطرہ کے خوف سے کانپتی ہوئی اُس سے وجہ دریافت کرنے لگی۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔" ملازمہ نے کہا۔ "اب میں زیادہ یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن جلدی کرو۔ جلد یہاں سے نکل جاؤ۔"

"اور اپنے باپ کو چھوڑ دوں؟"

"وہ کہاں ہے؟"

"سامنے والے کمرہ میں۔"

"تب جلد اُسے بلاؤ۔ دیر نہ کرو۔"

لڑکی نے اپنے باپ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ ابھی تک سویا نہ تھا۔ لڑکی کمرہ میں داخل ہوئی اور کونٹ کو خطرہ سے آگاہ کیا۔ وہ کیپیبر کو ساتھ لیکر لڑکی کے کمرے میں گیا اور ملازمہ سے چند سوالات کئے۔ معلوم ہوا کہ حقیقت میں وہ سرائے ڈاکوؤں سے گھر گئی ہے اور وہ لوگ نصف شب گذر جانے پر حملہ آور ہونگے جبکہ سرائے کے تمام لوگ مصروف خواب ہونگے۔

"لیکن ہم سرائے کی مورچہ بندی کرکے خود کو محفوظ کر سکتے ہیں۔" کونٹ نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" ملازمہ نے کہا۔ "یہ ممکن نہیں اس لئے کہ خود سرائے کے محافظ ڈاکوؤں سے سازباز کئے ہوئے ہیں۔"

"تب ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟" کونٹ نے کہا۔ "کیا ہم گاڑی منگوا کر اس وقت روانہ نہیں ہو سکتے۔"

"سردار کونٹ غنیم کو یہ معلوم کرا دیگا کہ ان کا راز فاش ہوگیا ہے اور خطرہ کا باعث ہوگا۔ وہ اسی وقت حملہ کر دینگے۔ ملکہ اسپین جیسے مالدار شکار کو وہ ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دینگے۔"

"پھر ہم کو آخر کیا کرنا چاہیئے؟"

"صرف سرائے کے عقب میں ایک گھوڑا ہے۔" ملازمہ نے کہا۔ "ڈاکوؤں کا ایک آدمی جو ابھی ابھی آیا ہے اس کو وہاں چھوڑ گیا ہے۔"

"صرف ایک گھوڑا!" کونٹ نے کہا۔ "اور ہم جملہ تین ہیں۔"

"اور ملکہ اسپین ——؟" لڑکی نے بیقرار ہو کر کہا۔ "وہ لوگ اس خطرے سے کیسے بچائے جا سکتے ہیں؟"

"اس سے مجھے کیا تعلق۔" ملازمہ نے ذرا تیز ہو کر جواب دیا۔ "میں تو صرف تم کو بچانے آئی ہوں۔ اگر تم نے میرے کہنے پر عمل نہیں کیا تو یاد رکھو ہم سب جان سے مارے جائینگے۔ جلدی کرو۔"

اُس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف ایک بات اور کہنی ہے یہ دروازہ ایک سرنگ سے متعلق ہے جو ایک کھیت میں نکلتی ہے۔ وہاں تم کو ایک گھوڑا ملے گا۔ اس پر چڑھ کر گنجان درختوں اور چٹانوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ ہوشیاری سے گذر جانا۔ کچھ دور چلکر ندی پار کرنے کے بعد شاہراہ ملیگی۔ وہاں پہونچکر اپنے گھوڑے کی رفتار کو تیز کر دینا اس لئے کہ کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا۔ یہ راہ سیدھے گاؤں کی طرف جاتی ہے"

یہ کہکر ملازمہ چلی گئی۔ لڑکی۔ کونٹ اور کیسپیر تینوں سرگوشیاں کرنے لگے۔ لڑکی کا یہ اصرار تھا کہ ملکہ وغیرہ کو اس طرح خطرہ میں چھوڑ کر فرار ہو جانا آئین انسانیت کے خلاف ہے۔ کونٹ بھی اس کا ہمخیال تھا۔

"لیکن معزز کونٹ! اس نوجوان لڑکی کا کیا انجام ہوگا" وفادار کیسپیر نے کہا۔ "جبکہ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ اب ڈاکوؤں سے محفوظ ہو گئی ہے"

اس وقت کونٹ کی محبت پدری جوش میں آگئی۔ اس نے لڑکی کو دیکھا۔ وہ دبلی۔ کمزور اور پریشانی سے بہت زرد معلوم ہو رہی تھی۔ لڑکی کو اپنے بچانے کی فکر نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ملکہ اسپین اور اس کے بھتیجے کو اس خطرہ سے آگاہ کر دیا جائے۔

"بہرحال"—— کیسپیر نے ایک آخری اور قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب زیادہ وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔ ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ لڑکی کو خطرہ کی جگہ سے دور کر دیا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کو لیکر گھوڑے پر فرار ہو جائیں۔ اور گاؤں کے لوگوں کو ہماری مدد کیلئے جلد سے جلد بھیجیں۔ میں یہاں ٹھہرتا ہوں اور ملکہ وغیرہ کو اس خطرے سے آگاہ کرتا ہوں اور اُن کی حتی الامکان مدد کرتا ہوں جب تک کہ گاؤں سے ہمیں کوئی مدد نہ مل جائے"

کونٹ کیلئے اب صرف یہی چارہ کار تھا کہ لڑکی کو لیکر فرار ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے اپنا پستول نکالا اور لڑکی کو لیکر سرنگ کی طرف چلا۔

"لیکن ——!" لڑکی نے چلنے میں پس وپیش کرتے ہوئے کہا۔ "ملکہ کے ساتھ اس کا نوجوان بھتیجا بھی ہے۔ اس کا بچانا نہایت ضروری ہے"

"میں سب سمجھتا ہوں" کیسپیر نے کہا۔ "اُس کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوگا"

"میرا یہ مطلب نہیں" لڑکی نے کہا۔ وہ کچھ اور کہنے والی تھی لیکن کونٹ اس کو لیکر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ سے باہر نکلنے پر ایک گھوڑا ملا۔ کونٹ گھوڑے پر سوار ہو گیا لڑکی کو اپنے پیچھے بٹھالیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ ملازمہ کے بتائے ہوئے راستہ پر روانہ ہوا۔ ندی کو عبور کرنے میں کچھ فاصلہ رہ گیا تھا کہ ایک آواز آئی۔ "کون جا رہا ہے؟" کونٹ نے یہ سنکر گھوڑے کی رفتار تیز کر دی لیکن ایک شخص نے آکر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ گھوڑا چمک کر پیچھے ہٹ گیا۔ لڑکی اگر اپنے باپ کو مضبوط پکڑے نہ ہوتی تو یقیناً گھوڑے کے نیچے جا پڑتی۔ اس طرح کونٹ تمام مشکلات کا سامنا کرتا ہوا بخیر وخوبی گاؤں پہونچ گیا۔

لڑکی کو وہاں چھوڑ کر اور پولیس کی کافی مدد کے ساتھ کونٹ فوراً روانہ ہو گیا اور وقت پر سرائے پہونچ گیا جب غارتگروں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا سارا راز فاش ہو گیا ہے تو انھوں نے مقابلہ کی ٹھانی اور اپنی جان پر کھیل کر حملہ کر دیا۔ وفادار کیسپیر اور ملکہ اسپین کے نوجوان بھتیجے نے اگر کافی مدد نہ کی ہوتی تو شاید کامیابی غنیم ہی کے حصہ میں رہتی۔ اس کے بعد شاید یہ کہنا بیکار ہوگا کہ کونٹ کی لڑکی اور ملکہ اسپین کے نوجوان بھتیجے کی آپس

تجلیات!

از جناب حکیم خورشید حسن صاحب خورشید

تو نے دل میں کیا مرے اے روئے جاناں رکھ دیا
طور کی بجلی کا دل اس دل میں پنہاں رکھ دیا

عشق نے سر میں مرے وحشت کا ساماں رکھ دیا
چار دیوارِ عناصر میں بیاباں رکھ دیا

گو جگر کی داستاں خونی تھی پیکاں نے ترے
اس فسانے میں نیا ٹکڑا مزیجاں رکھ دیا

شوخیٔ افسانۂ حسنِ دہن کھلنے لگی
جب لبِ لعلیں نے اک رنگیں سا عنواں رکھ دیا

طور کی برقِ طپاں دل سے لپٹ کر رہ گئی
نام جس کا سوزِ الفت نے رگِ جاں رکھ دیا

کس نے میرے آشیاں کے چار تنکوں کیلئے
برق کی زد میں گلستاں کا گلستاں رکھ دیا

خونِ فصلِ گل کے چھینٹے جا پڑے کچھ باغ میں
ہائے ان کا نام کیوں گلہائے خنداں رکھ دیا

کر دیا مثلِ گہر ننگِ فشردن سے بری
اے صفائے قلب تو نے مجھ پہ احساں رکھ دیا

ہوں وہ خس پارہ سرِ موجِ طلسمِ زندگی
جس کے پہلو میں سبکساری نے طوفاں رکھ دیا

مطلعِ چاکِ گریباں کی ضیا کے واسطے
اِس اُفق میں آفتابِ داغِ ہجراں رکھ دیا

کام آئے داغ دل کے ہم نے اے خورشید جب
اُن کو شامِ زلف میں بھر کر چراغاں رکھ دیا

جابر بن حیان

از جناب طالب صاحب الہ آبادی

۱۔ تاریخی اہمیت

ابا عبداللہ یا ابو موسیٰ[1] جابر بن حیان بن عبداللہ علم عربی میں اپنے وقت کے سب سے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ محفل تمدن اور بزم کمال کے معروف اور با اثر رہبروں میں سے ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ فرانس کے مشہور کیمیا داں پروفیسر برتلو "قرون وسطےٰ میں تاریخ کیمیا" کے مصنف کا خیال ہے کہ جو عظمت ارسطو کو تاریخ منطق میں حاصل ہے۔ وہی مرتبہ جابر کو تاریخ کیمیا میں حاصل ہے۔ برتلو صاحب کے نزدیک جابر ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے علم کیمیا کے لئے علمی قواعد وضع کئے تھے۔

جابر مغرب والوں میں جبیر Geber کے نام سے معروف اور اپنی کتاب (Summa Perfectionis) کے ذریعے سے مشہور ہیں۔

ہلمیارڈ Holmyard کا بیان ہے یہ کتاب جابر کی اصل کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ جابر کی بہت سی کثیر الاشاعت اور مشہور تالیفات لاطینی زبان میں جبیر کے نام سے موجود ہیں۔

جابر و جبیر کے اختلاف نے بعض مورخین کو اس شبہ کا شکار کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں نام دو آدمیوں کے ہیں۔ مگر پروفیسر ہلمیارڈ نے ثابت کر دیا ہے کہ جبیر کے منہ میں جابر ہی کی زبان ہے اور جتنے ترجمے یا اقتباسات یورپ کی زبانوں میں جبیر کے نام سے ہیں سب جابر ہی کے ہیں جو اصلاً ایرانی تھے اور عرب سے منسوب ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی (دوسری صدی ہجری) میں جابر بن حیان ہارون الرشید کے دربار میں مسند علم و ہنر کے تاجدار تھے۔ بغداد میں قیام تھا اور برآمکہ سے بہت زیادہ بنتی تھی۔ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفۂ وقت سے زیادہ برامکہ سے ربط و ضبط تھا۔ خود جابر نے اپنی کتاب "خواص" کے سلسلے میں محاورات کی تشریح و تفصیل کے ضمن میں اپنے اور برآمکہ کے مشورہ و بحث کی طرف اشارات کئے ہیں۔

علامہ قفطی نے تاریخ الحکماء میں جابر کا حال اس طرح لکھا ہے،

موصوف اپنے زمانے کے تمام علوم میں دستگاہ رکھتے تھے اور خصوصاً علم کیمیا میں سرآمد روزگار تھے۔ علم طب اور طریق معالجہ میں بھی دلچسپی تھی اور کیوں نہ ہوتی اس زمانہ میں طب اور کیمیا کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

۲۔ ولادت اور حیات

جائے ولادت تحقیقی طور پر معلوم نہیں مگر مونگا ف مورخین کا اتفاق ہے کہ طوس خراسان یا شمال شرقی ایران یا حران عراق میں پیدا ہوئے۔ بعض مستشرقین کو احتمال ہوا ہے کہ طوس ہی مسقط الراس تھا۔ بہرکیف تمام ثقات متفق ہیں کہ موصوف کی حیات کا کافی حصہ کوفہ میں گذرا ہے۔ ہارون الرشید کے وزیروں سے اور خاص کر برآمکہ سے بڑی دوستی تھی۔ وہ بغداد میں بھی بہت دنوں تک جلوہ افروز رہے واسٹن فیلڈ Wasten Feled ان کو حران کا صابئی مانتے ہیں ڈربلو Dr. herbelot نے اپنی تصنیف "کتابخانہ شرقی" کے صفحہ ۳۶۰ پر اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔ بعض فرنگیوں نے البتہ عجیب و غریب افسانے گڑھ لئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے شبیلہ اندلس سے نسبت رکھتے ہیں۔ کسی کا بیان ہے کہ عرب کے مشہور ترین امراء اور فلاسفہ میں سے ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں

---

[1] ابا عبداللہ اور ابو موسیٰ میں بعض محققین کو اشتباہ اور اختلاف ہے۔ مگر بلا سبب، صاف سی بات ہے کہ جابر کے دو بیٹے ہوں گے ایک کا نام عبداللہ اور دوسرے کا موسیٰ ہوگا۔

جابر کہیں تو مر کر صفات اور کہیں عاری صفات ملنے گئے ہیں طرہ یہ کہ ایک مسودے میں تاجدار عجم اور دوسرے مبیضہ میں بادشاہ ہند کا لقب دیا گیا ہے
معتبر تاریخوں سے ثابت ہے کہ برامکہ ۷۸۶ء سے ۸۰۳ء تک یعنی ۱۷۰ھ سے ۱۸۷ھ تک دربار خلافت میں مورد اعتماد تھے لہذا دور تاریخ کے حساب سے جابر کے شباب کا زمانہ ۷۷۶ء سے ۸۰۳ء تک متصور ہو سکتا ہے۔ کشف الظنون کے مصنف حاجی خلیفہ نے ۱۶۰ھ میں موصوف کی وفات لکھی ہے۔ مگر یہ نظریہ قطعاً قرین قیاس نہیں ہیں۔ روابط برامکہ محقق ہیں اور مستند۔

جلاقی نے اپنی کتاب نہایت الطلب میں لکھا ہے کہ جابر نے کئی دفعہ شکنجۂ موت سے رہائی پائی۔ لوگ ان کے کمال کی بنا پر رشک و حسد کا اظہار کرتے تھے۔ مجبور ہو کر موصوف نے اپنے بعض اسرار صناعت ہارون الرشید۔ یحییٰ برمکی اور فضل و جعفر کو دیدیئے جن کی بدولت وہ لوگ صاحب ثروت ہو گئے۔ اب تختے الٹ گئے اور جابر باغی سمجھے گئے۔ ناچار کوفے کی طرف ہجرت کر گئے۔ مامون کے زمانے تک پوشیدہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انتقال خلیفہ کے بعد ظاہر ہوئے۔ اس روایت سے ہمیں صرف اتنا ہی فائدہ ہوتا ہے کہ جابر نے کافی عمر پائی تھی۔ ورنہ مامون الرشید کی خلافت میں ان کا سایہ بھی نہ ملتا۔

۳۔ مولفات کتب اصلی کی فہرست جو ابن ندیم صاحب "الفہرست" کے پاس تھی کہیں ضایع ہو گئی۔ ابن ندیم کے نزدیک وہ فہرست معتبر بھی نہ تھی۔ مگر جرمن پروفیسر فلوگل Flugel نے اس فہرست کو مستند مانا ہے۔ بہر کیف اگر جابر کے تمام مشہور مولفات کا ذکر کیا جائے تو میزان عدل میں تحقیق کا پلہ سبک ٹھہرے گا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صرف مشہور ترین کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

السموم:۔ اب صرف نام ہی نام باقی ہے کتاب کا کوئی نشان نہیں

۱۔ اسطقس الاس الاول، ہندوستان کے سربی چھاپے کی
سنہ طبع ۱۸۹۱ء

۲۔ اسطقس الاس الثانی۔ ہندوستان کے سربی چھاپے کی۔
۱۸۹۱ء صرف جزو دوم چھپا ہے۔

۳۔ اسطقس الاس الثالث۔ ہندوستان کے سربی چھاپے کی ۱۸۹۱ء

۴۔ تفسیر الاسطقس۔ اس کا ذکر ابن ندیم نے نہیں کیا۔

۵۔ الواحد الاول۔ پیرس کے کتاب خانہ ملی میں ایک نسخہ موجود ہے (کلیکس ۲۶۰۶) غالباً یہ وہی کتاب ہے جو الفہرست میں الواحد الکبیر کے نام سے مذکور ہے۔

۶۔ الواحد الثانی۔ یہ بھی صدر الذکر کتاب خانے میں ہے اور الفہرست میں الواحد الصغیر کے نام سے درج ہے۔

۷۔ الرکن۔ اس کا ایک حصہ مجریطی کی کتاب رتبۃ الحکیم میں بھی شامل ہے۔

۸۔ البیان۔ ہندوستان میں ۱۸۹۱ء میں چھپی۔

۹۔ النور۔ ہندوستان میں ۱۸۹۱ء میں چھپی۔

۱۰۔ الزیبق۔ زیبق غربی اور زیبق شرقی کے نام سے دو نسخے پیرس کے ملی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۱۱۔ التبویب۔ برٹش میوزیم کلیکس ۸۲۲۹

۱۲۔ الدرۃ المکنونہ۔ برٹش میوزیم ک ۲۲ ۷۷

۱۳۔ الشعر۔ برٹش میوزیم ک ۲۲ ۷۷

۱۴۔ ۱۵۔ الشمس و القمر۔ سونے چاندی کی کتاب شاید الاحجار السبعہ کا خلاصہ ہے۔ پیرس لائبریری میں موجود ہے۔

۱۶۔ التراکیب۔ پیرس لائبریری میں۔

۱۷۔ الحیوان۔ جلاقی نے اسی کتاب کا ذکر حیات الحیوان کے نام سے کیا ہے۔

۱۸۔ الاسرار۔ غالباً وہی کتاب ہے جس کا دوسرا نام سر الاسرار ہے برٹش میوزیم ک ۲۱۸ ۴ ۱۳ نمبر ۱۱ میں موجود ہے۔ لاطینی میں ایک مسودہ Secreta Scretorum, کے نام سے ہے اور دو کالجوں میں Gonville + Cauis + بھی نمبر ۹۹ پر موجود ہیں۔ ایک Corpuschrust میں دوسرا ہے میں۔

۱۹۔ الارض۔ پیرس ک ۲۶۰۶

۲۰۔ التراکیب الثانی پیرس ک ۲۶۰۶

۲۱۔ الخواص ک ۲۹ ۴ ۲۳ نمبر ۱۴ ۲۰

۲۲۔ کتاب الذکیر۔ انگریزی میں The book of

rendering Mascalin کے نام سے بلیمارڈ نے ترجمہ کی ہے۔ اصل بحث تولید سے ہے۔

۲۳۔ الاستتمام۔ برٹش میوزیم نمبر ۸۲۲۹ لاطینی میں بھی Giberde inmestigation Perfectioni کے نام سے موجود ہے۔

۲۴۔ الاحجار۔ ہندوستان میں چھپی ہے۔

۲۵۔ الروضہ۔ اس کا ذکر نہایت الطلب میں ہے۔

۲۶۔ المنافع۔ مسودہ برلن لائبریری نمبر ۱۹۹ء۴۔

۲۷۔ صحیات افلاطون۔ ایک نسخہ۔ اسلامبول راغب پاشا لائبریری ک ۹۶ نمبر ۱۴ میں محفوظ ہے۔

۲۸۔ الایضاح۔ ہندوستان میں طبع ہوئی۔

۲۹۔ الضمیر یا الضمیر فی خواص الاکسیر۔ پیرس، پبلک لائبریری۔

۳۰۔ الموازین Giber de Ponderi — bis artius کے نام سے پیرس نمبر ۲۶۵۴ صفحہ ۱۰۳ میں اس کا ذکر ہے۔

۳۱۔ الملک۔ کارینی Carini نے اس کا ذکر Pruis ta Sicula کے نام سے کیا ہے۔ پیرس میں اس کے دو نسخے موجود ہیں جن میں تھوڑے سے اختلافات بھی ہیں۔ ہندوستان میں بھی دو نسخے چھپ چکے ہیں۔

۳۲۔ الریاض۔ ایک نسخہ بوڈلی لائبریری نمبر۔ اور دوسرا برٹش میوزیم ک ۷۷۲۲ نمبر ۵ میں محفوظ ہے۔

طالب الہ آبادی

ریویو:- علم الحروف یا تحقیقات ماہر

یہ کتاب خاں صاحب حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر اکبرآبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس میں علم الحروف کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تاریخ کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ حروف کے اسباب تخلیق اور ان کی امتزاجی خصوصیات کا تذکرہ مورخین نے تسلسل کے ساتھ نہیں کیا اس لئے اس موضوع پر قلم اٹھانا آسان نہیں۔ اور اگر اس میدان کی طرف قدم بڑھایا بھی جائے تو معلومات کی کمی مستقل رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ماہر صاحب نے علم الحروف کی تصنیف سے ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے جس کے پہلے حصے میں قدیم زبانوں کی تدریجی ضروریات پر بحث کی گئی ہے اور مختلف زبانوں کے امتزاج اور انسانی دماغ کی غیر مسلسل تربیتوں پر گفتگو کی گئی ہے اور اس تذکرہ کے دوران میں علم الحروف کے تصور اور اس کی حقیقی صورتوں کے تغیر و تبدل پر تاریخی شہادتوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس حصہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت محتاج بیان نہیں رہتی کہ الفاظ کو حروف بنانے کیلئے انسان کو جس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا دسواں حصہ بھی خیال و اشارہ کو لفظ بنانے وقت ظاہر نہیں ہوا۔ اس کے بعد خطوط و حروف اور کتابت و تحریر کے مختلف مدارج اور اصلاحی مرحلوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں ایرانی زبانوں اور عجمی حروف و خطوط کی قدامت پر بحث کی گئی ہے اور خط نستعلیق کے محرکات۔ اس کی تدریجی اصلاحوں اور مصلحین کا تذکرہ تاریخی صورت میں کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں کاغذ، قلم، سیاہی اور خطاطی کی دوسری ضروریات پر بحث کرنے کے بعد تمام اشیاء کے بنانے کی ترکیبیں بتائی گئی ہیں۔ چوتھے حصہ میں قدیم حروف کی تاریخ ان کی صورتیں اور خصوصیات پر معلومات افزا تبصرہ کیا گیا ہے۔ کتاب مجموعی طور پر حد درجہ مفید ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے کسی حد تک بے نظیر کہلانے کی مستحق ہے۔ کاغذ اور کتابت درمیانہ قیمت تین روپے۔ کتاب معلومات سے لبریز ہے اور بڑی کاوش سے مرتب کی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین عالمگیر اس کتاب کو ملاحظہ فرما کر اپنی معلومات میں اضافہ کریں گے۔

ملنے کا پتہ:- خانصاحب حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر۔ فراشخانہ دہلی۔

جان نثار

اناطول فرانس کا ایک شاہکار

ازجناب میرزا مظفر صاحب سیفی دہلوی ؛؛

کچھ عرصہ تک سنسان سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد اندرے Andre دریائے سین کے کنارے ایک طرف خاموش بیٹھ گیا۔ وہ دریا کی موجوں کو پہاڑی سے ٹکراتے اور پیچ وتاب کھا کر واپس لوٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ کے سامنے بہت سے واقعات ماضیہ سینما کے فلم کی طرح گزر رہے تھے۔ اس لئے کہ اس مقام پر وہ بارہا اپنی منظور نظر لوسی کے ہمراہ آیا تھا اور مسرت وانبساط کے بیشتر لمحات اس نے یہاں گزارے تھے۔

مدت سے اُسے سکون وآرام نہیں ملا تھا۔ ۸ بجے صبح اس نے غسل کیا۔ ایک ہوٹل میں جاکر کھانا لانے کا حکم دیا۔ جب تک کھانا سامنے آئے میز پر پڑا ہوا ایک تازہ اخبار اٹھاکر دیکھنے لگا۔ جس میں ۲۴ فروری کو میدان قصاص میں قتل کئے جانے والوں کی فہرست درج تھی۔

اس نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اُٹھ کر ایک آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ کوٹ اور کالر کو درست کیا اور بشرہ پر تبسم آمیز جھلک پیدا کرکے ایک جانب کو روانہ ہوگیا۔ چلتے چلتے وہ ایک مختصر سے مکان کے قریب پہونچا جس میں لردین (Lardillon) انقلابی عدالت کا ڈپٹی کورٹ انسپکٹر رہتا تھا۔ اس (Deputy Police Accuser) اس کے متعلق اندرے جانتا تھا کہ وہ پیشتر انگرس Angers کے مقام پر پادری کی خدمات انجام دیتا تھا لیکن اب پیرس کی انقلابی جماعت کا نہایت پرجوش کارکن ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ پادری نہایت دوست نواز اور خاموش طبیعت کا انسان ہے۔

دروازے پر پہونچکر اس نے دستک دی۔ چند لمحہ سکوت کے بعد پادری لردین نے کھڑکی میں سے جھانکا اور اپنے ملاقاتی کے نام اور شکل وشباہت کا تیقن کرنے کے بعد آخر دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ گداز رنگ صاف، آنکھیں روشن۔ ناک متوسط اور پیشانی کشادہ ونمایاں تھی۔ اس کے چہرہ پر مسخرہ پن برس رہا تھا۔ وہ اندرے کو اپنے مکان کے بیرونی کمرے میں لے گیا۔

ایک مختصر سی میز پر دو آدمیوں کے لئے کھانا چنا ہوا تھا۔ اندرے نے دیکھا کہ کھانے میں کئی قسم کے قورمے تھے۔ ایک بالٹی میں چند بوتلیں شراب کی بھیگی ہوئی ہیں اور سامنے الماری میں چند مزید بوتلیں کاغذوں میں لپٹی رکھی ہیں۔ دوسرے کمرے کے نیم کشادہ دروازے میں سے ایک پرتکلف مسہری بچھی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔

"جناب لردین صاحب" اندرے نے سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست لیکر حاضر ہوا ہوں۔"

"بھائی citizen میں اسے منظور کرنے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ ہماری ری پبلک (قومی حکومت) کے مفاد کے منافی نہ ہو۔"

"جو تکلیف میں آپ کو دینی چاہتا ہوں۔" اندرے نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "وہ آپ کی قومی حکومت اور خود آپ کی ذات کے عین مطابقت میں ہے۔"

لردین کے اشارے پر اندرے بیٹھ گیا اور یوں گویا ہوا "جناب ڈپٹی صاحب، آپ اس امر سے بخوبی واقف ہونگے کہ میں گذشتہ دو

سال سے آپ کے دوستوں کے خلاف سازش کر رہا ہوں۔ "قربانگاہ خون" کے عنوان سے میرا ہی مضمون تھا۔ لہذا مجھے گرفتار کر لینے میں آپ مجھ پر کوئی احسان نہ فرمائینگے بلکہ اپنا فرض ادا کرینگے۔ اور اس کے لئے میں کوئی درخواست بھی لیکر نہیں آیا۔ سنئے سنئے! مجھے محبت ہے اور میری "دیوی" قید خانہ میں ہے"۔

لردیلن نے اپنا سر جھکا کر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ وہ اس قسم کے جذبات کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔

"لردیلن صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی اپنے پہلو میں جذبات سے معمور دل رکھتے ہیں۔ آپ کے بھی دل میں کسی کی محبت ہوگی۔ اس سے ملنے کی خواہش ہوگی۔ بہت سے ارمان ہونگے۔ تمنائیں ہونگی ـــ لہذا خدا را آپ کی محبت کا واسطہ دیکر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ التجا کرتا ہوں کہ آپ مجھے میری محبوبہ سے ملا دیجئے۔ یعنی مجھے بھی قید خانہ بھیجدیجئے"۔

"واہ وا" لردیلن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ تو تم مجھ سے جان سے بھی زیادہ عزیز شے طلب کر رہے ہو۔ اس سے تمھاری مراد دلی بر آئیگی۔ یہ تمھاری زندگی کی بہترین تمنا ہے۔ یہ تمھاری دائمی مسرت کا سوال ہے"۔

خوابگاہ کے کمرے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ چلایا۔ "اپیکرلس اپیکرلیس Epicharis"۔

جواب میں ایک کشیدہ قامت، سیاہ زلف خاتون دروازہ میں نمودار ہوئی۔ وہ ایسے لباس میں ملبوس تھی جس میں گردن و بازو عریاں تھے قمیض کے اوپر ایک پیٹی کوٹ پہنے ہوئے تھی اور بالوں میں پھول لگے تھے۔

"میری پیاری حورا!" لردیلن نے اس خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس شخص کے چہرے کی طرف دیکھو اور اس کی صورت کبھی مت بھولنا ہماری طرح اس کے جذبات بھی نہایت لطیف و نازک ہیں۔ یہ بھی ہماری طرح ہجر و فراق کے صدمے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ اپنی منظور نظر کے ساتھ قید خانہ گیا۔ پھانسی کے تختہ تک جانے کیلئے تیار ہے۔ اپیکرلیس۔ کیا ہم کو اس کی یہ درخواست رد کر دینی چاہیئے"؟

خاتون نے پادری کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔"

"تم نے میری دیوی ٹھیک کہا۔ ہمیں ان دو محبان صادق کی امداد کرنی چاہیئے۔ اندرے جرمین Andre Germain مجھے اپنا پتہ بتلاؤ اور آج رات کو تم قید خانہ میں آرام کرتے ہوگے"۔

"مجھے منظور ہے" اندرے بولا۔

"ٹھیک ہے منظور" لردیلن نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "جاؤ اور اپنی محبوبہ سے دل کھول کر ملو اور اس سے کہدینا کہ تم نے اپنی ان آنکھوں سے اپیکرلیس کو لردیلن کے آغوش میں دیکھا ہے۔ خدا کرے ہماری یہ تصویر الفت تم دونوں کے پژمردہ دلوں میں گوناگوں تخیلات کے پیدا کرنے کا موجب ہو"۔

اندرے نے جواب میں کہا "میں آپ کی یاد کو تادم زیست تازہ رکھونگا اور آپ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے میری درخواست کو بلاحیل و حجت منظور فرما لیا۔ کاش مجھے اتنا موقع ملتا کہ میں آپ کے اس احسان کا بدلہ اتار سکتا ـــ"

"انسانی ہمدردی کوئی احسان نہیں اور نہ اس کیلئے کسی معاوضہ کی ضرورت" لردیلن نے کہا۔ اور اپنی محبوبہ اپیکرلیس کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔ "کیا خبر ہماری باری کب آجائے۔ لہذا جب تک زندہ ہیں ہمیں ہنسی خوشی وقت گذارنا چاہیئے"۔

"آؤ بھائی۔ کیا تم ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگے؟"

اپیکرلیس نے بھی اس تجویز کی تائید کی۔ ان لوگوں نے اندرے کو باصرار روکنا چاہا لیکن وہ ڈپٹی کورٹ انسپکٹر کے وعدہ پر مسرور و خاموشی سے نکل کر چل دیا۔

(ترجمہ از انگریزی)

غزل

از مولانا بیباکؔ مرحوم شاہجہانپوری تلمیذ حضرت داغؔ دہلوی

آپ ناصح اُن کو سمجھاتے تو ہیں! | جور سے لیکن وہ باز آتے تو ہیں
مجھ سے اچھّے تیرے ارمانِ وصال | وقت پر یہ پھر بھی کام آتے تو ہیں
اور کیا ملتا جنابِ عشق سے | رات دن خونِ جگر کھاتے تو ہیں
دیکھئے جب ساتھ دے تقدیر بھی | راہ پر اُس بُت کو ہم لاتے تو ہیں
اے دلِ مُشتاق کچھ بھی ہو مگر | ذکرِ محشر پر وہ گھبراتے تو ہیں
ذکرِ محشر پر یہ اس بُت نے کہا | آپ کی دھمکی میں ہم آتے تو ہیں
خیر مُنہ دیکھی محبّت ہی سہی! | وہ مرے سر کی قسم کھاتے تو ہیں
غم نہیں کچھ بھی مگر اے جذبِ عشق | غیر اپنے دل میں اتراتے تو ہیں
یہ بھی کیا کم ہے دلِ مشتاقِ وصل | وہ یہاں آتے تو ہیں جاتے تو ہیں
یہ نہ کہئے وصل میں کیسا حجاب؟ | بندہ پرور آپ شرماتے تو ہیں
میری قسمت کے لکھے کو کیا کریں | دوست اُس ظالم کو سمجھاتے تو ہیں
دیکھئے کب تک کرم کی ہو نگہہ | وعدۂ دیدار فرماتے تو ہیں
خیر اے بیباکؔ اتنا تو ہوا | اب وہ ہنس کر سامنے آتے تو ہیں

مرسلہ محمد احمد صدیقی شاہجہانپوری

[illegible]

ریویو

طبِ اسلامی

یہ کتاب ابن مظہر قاضی معین الدین صاحب رہبر فاروقی کی علمی تحقیق و مساعی کی شاندار یادگار ہے۔ فاضل مصنف نے تاریخ طب کی تمام بکھری ہوئی کڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک سلسلہ تیار کیا ہے جو اُن کے ذوق ادب کی پختگی پر ہمیشہ شہادت دیتا رہے گا۔

"طب اسلامی" ترتیب کے اعتبار سے تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں سلاطین عرب و عجم کے ادوار میں طب کی تدریجی ترقی اور اس کی مقبولیت کے تمام مدارج و مراحل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کام کیلئے فاضل مصنف کو جس تحقیق و تدقیق سے کام لینا پڑا وہ اس امر سے ظاہر ہے۔ اسلامی تمدن کے ان گوشوں کی بھی نقاب کشائی کی گئی ہے جو عرصہ سے تاریخی جہالت میں مدفون تھے۔ اور نظام تمدن کی ان گلیوں سے بھی واقعات چن چن کر لائے گئے ہیں جن کی تاریکی چراغ تاریخ کی روشنی سے بھی دور نہیں ہو سکی۔

دوسرے حصہ میں ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی طب پروری اور طبیب نوازی پر بحث کی گئی ہے۔ یہ حصہ بھی معلومات افزا ہے۔ لیکن ہنوز مزید وسعت کا طالب ہے۔

تیسرے حصہ میں عام حیدرآبادی مصنفوں کی طرح کتاب کو ساری دنیا کی سیر کرانے کے بعد دکن میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ امر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دکن سے چاہے کسی موضوع پر کوئی کتاب شائع ہو لیکن اس کے دامن انجام سے ضرور حیدرآباد لپٹا ہوتا ہے۔ بہرحال اسلامی طب مجموعی طور پر ایک بےنظیر کتاب ہے۔ ہم رہبر صاحب کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں کہ ان کی مساعی ایک زندہ جاوید کارنامہ پر منتج ہوئیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ کوئی علمی حلقہ اس گنجینہ معلومات سے محروم نہیں رہیگا۔ قیمت ۴ عہ ملنے کا پتہ کی سن ریچ ہاؤس۔ عابد بلڈنگ مصطفےٰ بازار حیدرآباد دکن،

خریداران عالمگیر سے!

التماس ہے کہ خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری اور پورا نام و پتہ تحریر فرمایا کریں۔ آئندہ سے تمام ایسے خطوط بغیر جواب دیئے ضائع کردیئے جائیں گے جن پر نمبر خریداری و نام و پتہ خوشخط درج نہ ہوگا۔ نام پورا لکھا کیجئے صرف تخلص یا مخفف نام کافی نہیں ہے۔

منیجر عالمگیر لاہور

نیاز مند

از حضرت کوثر چاند پوری

یہ وہ خط والے نیاز مند نہیں ہیں جو مکتوبات کے آخر میں - نیاز مند نیاز آگیں یا نیاز کیش وغیرہ کے نیچے پھول یا چڑیا کی شکل میں نظر آیا کرتے ہیں، بلکہ وہ فدوی، خادم، فرمانبردار اور اطاعت شعار قسم کے انسان ہیں جو اکثر اوقات پولیس کی سلک ملازمت میں داخل ہوتے ہیں یا کسی امیر نواب، فرمانروا، حاکم اور تعلقدار کے دسترخوان پر ندیم، دوست یا اتالیق کی حیثیت سے موجود رہا کرتے ہیں۔ بالعموم ان کی ڈاڑھی صاف یا چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ مونچھیں بڑی۔ آنکھیں چھوٹی اور چہرہ سیاہ ہوتا ہے جس پر چیچک کے دانوں کی پچی کاری بھی ہوتی ہے۔ نیاز مند دنیا کے تمام فنون و کمالات میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان کا شاعر، سخن سنج، ظریف، ادیب، نثار اور مقرر ہونا تو لازمی ہے۔ بعض قسم کے نیاز مند حکیم، ڈاکٹر، مولوی اور عالم بھی ہوتے ہیں۔

ایک دن ہم چار پینے میں مصروف تھے کہ مذکورہ بالا صفات کے ایک نیاز مند وارد ہوئے اور آتے ہی فرمانے لگے۔

"خدا کی قسم! اس وقت کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی خیال ہوا تھا کہ چار کا وقت ہے اگر مل جائے تو ساری تھکن دور ہو جائے۔ یہاں آکر جو دیکھتا ہوں تو گویا آپ صاحبان میرے منتظر ہی بیٹھے ہیں۔"

"افسوس چار ختم ہو چکی!" ہمارے ایک دوست نے جو ان کی نیاز مندی سے غالباً پہلے ہی سے اکتائے ہوئے تھے بے تکلف فرمایا۔

"کچھ تو ہوگی؟" — وہ بغیر کسی پشیمانی کے بولے۔

"دودھ بالکل نہیں، چار تھوڑی بہت ہو تو دیکھ لیجیے۔"

نیاز مند نے چار دانی اٹھائی اور ایک پیالی میں چار کا نہایت گاڑھا اور رنگین پانی انڈیل کر شکر کے چھ سات چمچے ڈالے اور پینا شروع کر دیا۔ ہم سے یہ نظر خراش منظر نہ دیکھا گیا۔ ہم نے پیالی ان کے ہاتھ سے لیکر شکر دانی سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"بندہ نواز! آپ غالباً محض شکر کے لئے چار پیتے ہیں۔ تکلف نہ فرمایئے۔ خالص شکر جس قدر ہو سکے کھا لیجئے اور اتنی تیز چار نہ پیجئے کہ رات بھر اختر شماری کی زحمت برداشت کرنی پڑے۔"

"آپ مطمئن رہئے نیاز مند ایسی ہی چار پینے کا عادی ہے۔" انھوں نے پیالی ہمارے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

اسی درمیان میں کسی صاحب نے گھوڑوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ انھیں اپنے گھوڑے سے یہ شکایت تھی کہ راستہ ہی کہیں نہ کہیں سوار کو گرا ضرور دیتا ہے نہایت تیز، شریر اور خطرناک جانور ہے۔

"حضور والا! امید ہے کہ نیاز مند اس گھوڑے کو دبا لے گا۔" نیاز مند نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ فوراً گھوڑا کسوا کر منگوایا گیا اور نیاز مند نہایت شان کے ساتھ ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کا رجز پڑھتے ہوئے سوار ہو گئے۔ گھوڑے نے انھیں صرف بیٹھنے کا موقع تو دیا لیکن سنبھلنے نہ دیا۔ پیر بھی رکاب میں نہ آئے تھے کہ گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔ اور نیاز مند ایسے بدحواس ہوئے کہ جنگل کی طرف لیجانے کی بجائے گھوڑے کا رخ آبادی کی طرف پھیر دیا۔ اور بیچ بازار میں گرنے کے متعلق ان کی وہ پیشین گوئی جو سوار ہوتے وقت شعر کی صورت میں ان کی زبان سے ادا ہوئی تھی پوری ہو گئی۔ گھوڑا بھاگتا ہوا آ رہا تھا کہ سامنے ایک گاڑی آگئی وہ کترا کر مڑا تاکہ گاڑی کو بچا کر نکل جائے۔ مگر نیاز مند نہایت صفائی سے

زمین پر آ رہے۔ کچھ لوگ تو قہقہہ مار کر ہنسے اور کچھ دیکھنا پکڑنا۔ روکنا، اٹھانا کہتے ہوئے دوڑے۔ اور نیاز مند کو اٹھا کر ایک صاف چبوترے پر ڈال دیا، مجمع میں ہر قسم کے حضرات تھے۔ بعض ڈاکٹری اور طبابت جاننے کے بھی مدعی تھے۔ ان ارباب فن میں یہ بحث چھڑ گئی کہ حالت بیہوشی میں نیاز مند کے پیر اونچے کئے جائیں یا سر۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے خون کو سر کی طرف زیادہ جانا چاہیئے لہذا پیر ذرا بلند جگہ پر رکھو۔ دوسرے کہتے تھے نہیں سر کے نیچے گاؤ تکیہ رکھدو۔

نیاز مند کے چوٹ تو زیادہ نہ آئی تھی مگر وہ شرمندہ بہت تھے ایک تو گھوڑے سے گرے۔ پھر بازار میں۔ بھلا شرمندگی کیوں نہ ہوتی۔ اس لئے وہ خاموش، آنکھیں بند کئے پڑے تھے تاکہ دیکھنے والوں کو تکلیف کے وقت ان سے ہمدردی پیدا ہو اور مذاق نہ اڑایا جائے۔ لیکن سر اور پیر کی بحث سے انھیں تردد ہوا۔ کہیں اختلاف زیادہ نہ بڑھ جائے۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر پست آواز میں کہا۔ "میں بیہوش نہیں ہوں"۔

گھوڑا سوار کو منزل مقصود پر پہونچا کر تنہا گھر واپس آیا تو ہم دوڑے کر دیکھیں نیاز مند کیا ہوئے۔ بازار میں آ کر دیکھا کہ ایک جگہ کافی ہجوم ہے۔ ہم دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہی نیاز مند کا جلوس ہے اور خوش قسمتی سے زندگی ہی میں ان کی یہ منظوم تمنا ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ پوری ہو گئی۔ قریب پہونچکر مزاج پوچھا تو بولے "کیا کہوں؟ گرنے والا تو نہیں تھا۔ مگر بری گھڑی آتے دیر نہیں لگتی۔ گھوڑے کو دبائے چلا آ رہا تھا کہ سامنے گاڑی آ گئی اور گھوڑا بھڑک گیا۔ ادھر میرا سر چکرایا اور زین ران سے نکل گیا مگر خدا کی قسم گھوڑا بھی یاد ہی کریگا کہ کسی سے کام پڑا تھا۔ ہڈی پسلی ایک کر دی ہے واللہ میں نے مارے ایڑوں کے"۔

"کیوں نہیں۔ وہ تو اب بھی تھان پر کھڑا ہنہنا رہا ہے نہ معلوم یاد کر رہا ہے۔ یا آپ کو اپنی زبان میں برا بھلا کہہ رہا ہے"۔

نیاز مند تھے نہایت مستقل مزاج۔ دس بارہ دن کے بعد ہی ہمارے چند احباب گھوڑوں پر تفریح کو جانے لگے تو نیاز مند سے صبر نہ ہو سکا وہ فوراً بول اٹھے۔ "نیاز مند کا بھی جی چاہتا ہے کہ آج گھوڑے پر بیٹھے"۔

ہم نے کہا "وہی گھوڑا ہے جس نے آپ کو گرایا تھا۔ کہئے تو حاضر

کیا جائے۔ انھوں نے پیشانی پر بل ڈالکر کہا۔ "کیا گرائے گا وہ جی! ایک اتفاق تھا لاؤ آج اسے ٹھیک ہی کر دوں"۔

چنانچہ گھوڑا پیش کیا گیا اور نیاز مند اس پر سوار ہو گئے۔ تھوڑی ہی دور چلے ہونگے کہ راستہ میں ایک نالہ ملا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ادھر اُدھر کناروں پر کیچڑ بھی بہت تھی۔ سب اپنے اپنے گھوڑوں کو روک کر کہنے لگے۔ ہماری تو ہمت نہیں ہوتی نالے میں اترنے کی۔ نہ معلوم کتنا گہرا ہے۔ گھوڑا کہیں کیچڑ میں پھنس گیا تو مصیبت ہی آجائیگی۔ سب کے حوصلے پست دیکھکر نیاز مند یہ شعر پڑھتے ہوئے بڑھے ؎

جو جھجکے کے رہ گیا سو رہ گیا ادھر
جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

اور زور سے گھوڑے کو ایک ہنٹر رسید کیا۔ گھوڑا بجلی کی سی تیزی سے جھک کے چشم زدن میں اس کنارے پر تھا مگر نیاز مند نالے میں پڑے ہوئے غوطے کھا رہے تھے۔ کہنے لگے "اس میں شک نہیں۔ گھوڑا ہے بہت تیز۔ اس وقت بھی ترکیب کر گیا۔ ہنٹر کھا کر اڑا اگر کمر دوہری کر کے نہایت صفائی کے ساتھ مجھے گرا دیا۔ مگر خیر دیکھونگا"۔

نیاز مند نے بڑی ہمت سے کام لیا کہ پھر سوار ہو گئے اور دو تین میل تک انھوں نے بڑی بے رحمی سے گھوڑے کو دوڑایا۔ گھوڑا پسینہ پسینہ ہو گیا۔ ہم نے کہا "بس جناب اب ٹھیک ہو گیا۔ آہستہ چلیئے"۔

"ابھی ٹھیک ہو گیا۔ اکڑ پھر ڈھیلے کر دیئے میں نے اس کے"۔

نیاز مند ابھی کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ قریب کے کھیت میں سے ایک شخص دفعتہً کھڑا ہو کر بولا۔ "حضور سلام"!

ہم ادھر متوجہ ہوئے تھے کہ گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو نیاز مند راستہ پر پڑے کروٹیں بدل رہے ہیں اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا چلا جا رہا ہے۔ نیاز مند فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کپڑے جھاڑتے ہوئے بولے۔ "پھر بھڑکا! ---- یہ مردود بھی تو ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ اطمینان سے باگیں ڈھیلی چھوڑے بیٹھا تھا۔ ان اتفاقات کو کیا کروں کہ ناگہانی طور پر پیش آجاتے ہیں۔ آخر انسان ہوں جس خطرے سے آگاہ ہوتا ہوں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔ غیب داں تو ہوں نہیں کہ ہر خطرے کو پیش آنے سے پہلے بھانپ لیا کروں"۔

گھوڑے کی سواری میں نیاز مند چند بار فیل ہو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں اب زیادہ گنجائش نہ تھی۔ لیکن ابھی اور بہت سے کمالات باقی تھے۔ اتفاق سے نیاز مند کی موجودگی میں کھانے پر تذکرہ ہوا کہ اگر کوئی اچھا فارسی داں ملجائے تو بچوں کو گلستاں ہی پڑھا دیں۔

"فارسی داں اس کوردیہہ میں کہاں رکھے ہیں"؟ ایک صاحب نے لاپروائی سے کہا۔

نیاز مند اب تک خاموش تھے مگر اب ان کے بولنے کا وقت آگیا تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کیا فرماتے ہیں جناب؟ کوئی جگہ اللہ کے نیک بندوں سے خالی نہیں"۔

"نیک بندوں سے خالی نہ ہو مگر گلستاں پڑھانے والوں سے تو یقیناً خالی ہے ہمارا گاؤں"۔

"یہ تو آپ کا خیال ہے"۔

"اور آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا آپکو کچھ دعویٰ ہے فارسی دانی کا؟"

"دعویٰ تو میں نہیں کرتا۔ مگر خدا نے چاہا تو گلستاں نیاز مند اچھی طرح پڑھا دیگا۔ اور گلستاں ہی پر کیا موقوف ہے، بوستاں، سکندر نامہ، ابوالفضل، انوار سہیلی، یہ سب کتابیں نیاز مند کی نکلی ہوئی ہیں مگر خدا کی شان ہے کہ پڑھیں فارسی بیچیں تیل۔ وہی مثل ایسی صادق آئی ہے کہ بقول شخصے تیل ہی بیچ رہے ہیں"۔

نیاز مند نے اتنی بڑی بڑی کتابوں کے نام بتائے تھے کہ زبردستی سب کو اُن کی فارسی دانی کا یقین آگیا۔ اور چند لڑکے جو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ چکے تھے گلستاں، بوستاں بغل میں داب کر صبح کو ان کی خدمت میں پہونچ گئے۔ نیاز مند نے سب کو پڑھا دیا۔ کئی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن ہمارا بچہ گھر میں بیٹھا ہوا سبق یاد کر رہا تھا اور زور زور سے کہہ رہا تھا۔ شب آدینہ، آدھی رات، شب آدینہ، آدھی رات، ہم نے پلنگ پر پڑے پڑے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا بکتے ہو!"

وہ غریب ہماری صورت دیکھنے لگا۔ اور بولا "کچھ نہیں۔ سبق یاد کر رہا ہوں"۔

"شب آدینہ کے کیا معنی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آدھی رات"۔ اس نے جواب دیا۔

"کس نے بتائے ہیں؟ تم بھول گئے ہو شاید۔"

"نہیں، میرے پاس لکھے ہوئے موجود ہیں۔" اور فوراً اُس نے نیاز مند کے ہاتھ کے لکھے ہوئے معنی ہمیں دکھا دیئے۔

ہم نے اسی دن جملہ ارباب اولاد کو خطرے سے مطلع کر دیا اور صاف صاف بتا دیا کہ نیاز مند جیسے شہسوار ہیں ویسے ہی وہ فارسی داں بھی ہیں۔ بچوں کی تعلیم عزیز ہے تو انھیں آئندہ مسند درس پر جلوہ افروز ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔

یہ قصہ تو خیر ختم ہوگیا اور نیاز مند کو تسلیم کرنا پڑا کہ "اگرچہ میں نے فارسی کی تمام بڑی بڑی کتابیں پڑھی ہیں مگر شب آدینہ کے معنی یاد نہیں۔"

نیاز مند ہمارے یہاں بیٹھے ہوئے بڑے خلوص سے پینترے بدل بدل کر کھانا تناول فرما رہے تھے کہ ایک بدمذاق شاعر نے ایک شعر پڑھ دیا۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

بدقسمتی سے "کروبیاں" کے متعلق ان میں اور نیاز مند میں بحث شروع ہوگئی۔ شاعر صاحب کہہ رہے تھے۔ کروبیاں سے مراد جن ہیں جو ہمیشہ سے خدا کی عبادت کرتے آئے ہیں۔ مگر "محبت" ان میں نام کو نہیں ہوتی۔ نیاز مند بولے۔ تم غلط کہتے ہو۔ تمھیں زبان کے محاوروں پر عبور نہیں اور تم واقعات عالم سے بھی بالکل ناواقف ہو۔ تمھیں معلوم نہیں کہ جنوں میں سینکڑوں عاشق اب تک گذر چکے ہیں۔ ہزاروں قصے ان کے عشق و محبت کے بڑی بوڑھی عورتیں بیان کرتی ہیں۔ پھر کیسے کہتے ہو جنوں میں محبت نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ تم نے کروبیاں کا مطلب ہی غلط سمجھا ہے۔ اصل میں کروبیاں سے مُراد ہیں جانوروں سے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو صرف درد دل یعنی عشق اور محبت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ورنہ عبادت کرنے کیلئے جانور کم نہیں ہیں۔ ہر جانور خدا کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک چیونٹی بھی اس کی عبادت کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان میں محبت نہیں ہوتی۔"

شاعر صاحب بولے۔ "ہوتی کیوں نہیں محبت جانوروں میں؟ سارس، چکور اور چکوا چکوی کے متعلق آپ کیا کہینگے؟ جن کی محبت کے افسانوں سے ہندی لٹریچر بھرا پڑا ہے۔"

"ایک سارس اور چکور کے محبت کرنے سے میرا دعویٰ باطل نہیں ہوتا یہ بات الشاذ کالمعدوم میں داخل ہے!"

"یہ تو میں بھی جنوں کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ جنھوں نے محبت کی وہ بھی اسی تحت میں آتے ہیں۔"

اب نیاز مند ذرا خاموش ہوئے۔ ہم نے کہا اس فضول بحث سے کیا نتیجہ۔ ذرا غیاث اللغات اٹھا کر دیکھو اس میں کروبیاں کے کیا معنی لکھے ہیں۔ غیاث اللغات سے نیاز مند بہت چڑھتے تھے۔ اس کتاب نے چند مرتبہ پہلے بھی انھیں شکست دی تھی۔ انھوں نے جل کر کہا۔ غیاث پر میں بھروسہ نہیں کرتا۔" ہم نے کہا جانے دیجئے برہان دیکھیے۔ غرض دونوں کتابیں منگا کر دیکھی گئیں۔ دونوں میں کروبیاں کے معنی "فرشتوں" کے لکھے تھے

نیاز مند کی شہسواری، علمیت اور شعر فہمی کے تجربے ہو چکے تھے مگر ابھی علاج معالجہ کا میدان باقی تھا جس میں بڑی وسعت تھی۔ نیاز مند

اپنے باپ دادا کی حذاقت و مسیحا نفسی کے اکثر واقعات سنایا کرتے تھے لیکن احباب ان سے بدظن ہوگئے تھے اس لئے ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانا خطرے سے خالی نہ تھا لیکن ضرورت آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔

ایک دن نیاز مند نے ہمارے ایک نوجوان دوست سے اپنی معجون مقوی کی بہت تعریف کی۔ اتفاق سے وہ اس قسم کی چیزوں کے ضرورت مند تھے اور ان کی شادی بھی عنقریب ہونے والی تھی۔ انھوں نے نیاز مند سے فرمایا۔ پورے نسخہ کی تیاری میں کیا مصارف ہونگے؟ —— انھوں نے کہا "دس روپے"!

درمیانی واقعات کا ہمیں علم نہیں مگر اتنا معلوم ہے کہ اس غریب کی شب وصل بیت الخلا میں بسر ہوئی۔ بار بار لوٹا لیکر جاتے اور معمول سے زیادہ وہاں بیٹھتے۔ صبح تک ان کی حالت خراب ہوگئی آخر ہمارے پاس اطلاع آئی۔ ہم فوراً اندر گئے۔ دیکھا کہ رات جس تندرست نوجوان نے شادی کے قیمتی ملبوسات زیب تن کئے تھے اس وقت وہ دو مہینے کا بیمار نظر آرہا تھا منہ زرد ہوگیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ پیاس اتنی شدید تھی کہ رات بھر میں کئی گھڑے پانی پی چکے تھے اور اب اتنی طاقت بھی نہ رہی تھی کہ اٹھ کر رفع حاجت کے لئے جاسکیں۔ لہذا ان کے پہلو میں جہاں نوعروس کا پلنگ ہونا چاہئے تھا "کموڈ" رکھا ہوا تھا۔ ہمیں سخت حیرت ہوئی اور پوچھا آخر ہوا کیا؟ وہ ذرا شرمندگی سے بولے۔ "تنہائی میں بتاؤنگا" ہم نے سب کو ہٹا دیا تو بولے۔ "خدا غارت کرے تمھارے اس نیاز مند مردود کو۔ اس نے مجھے ایک مقوی معجون بنا کر دی تھی۔ میں نے سر شام ہی اس کی ایک خوراک کھالی۔ دو گھنٹے بعد ہی سے دست آنے لگے۔ نہ معلوم کیا کھلا دیا کمبخت نے؟"

فوراً محلے کے حکیم صاحب کو بلا لیا گیا اور خدا خدا کرکے وہ تندرست ہوئے ورنہ نیاز مند نے تو "وصال" کے پورے سامان جمع کر دیئے تھے۔

نیاز مند سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا۔ انھیں کی غلطی تھی مارے ہوس کے دگنی تگنی کھا گئے ورنہ اس میں فائدے ہی فائدے ہیں نقصان کا تو کوئی احتمال ہی نہیں۔ اس کے بعد نیاز مند صرف دسترخوان کی زینت رہے کسی علمی مسئلہ میں انھوں نے کبھی دخل نہیں دیا۔

کوثر چاندپوری

اعجاز بیان!

از جناب سعید احمد صاحب اعجاز

حیف اُس کے سنگِ در سے شناسا نہیں ہوں میں! ‏ پہنچے جو واں وہ گردِ تمنا نہیں ہوں میں
یارب زمانہ روندتا ہے کس لئے مجھے ‏ کوئی گلِ فتادہ جادہ نہیں ہوں میں
رہنے دے ہم جلیسِ گل و لالہ، باغباں ‏ گلشن میں کوئی سبزۂ بیجا نہیں ہوں میں
ساقی! بقدرِ قطرۂ شبنم نہ دے مجھے ‏ رندِ کہن ہوں ساغرِ لالہ نہیں ہوں میں
اللہ ری اپنی بیخودی، اللہ رے سحرِ حسن ‏ میں یوں ہوں اُن کے پاس کہ گویا نہیں ہوں میں
فردوسِ گوش میری صدا بن گئی ہے کیوں؟ ‏ نالہ بلب ہوں زمزمہ پیرا نہیں ہوں میں
یارب گراں ہوں کس لئے میں اُن کی طبع پر ‏ شوقِ فضول و شکوۂ بیجا نہیں ہوں میں
مستی میں آج چومتا ہوں نقشِ پائے یار ‏ اُس آستاں پہ ناصیہ فرسا نہیں ہوں میں
بیگانہ وار ایک ادا چاہئے ہنوز ‏ لذت کشِ شکستِ تمنا نہیں ہوں میں
دل ہے حریمِ ناز میں نظارگی طلب ‏ اور آشنائے رسمِ تقاضا نہیں ہوں میں
کیوں کاروانِ گردِ تمنا ہے ساتھ ساتھ ‏ بانگِ جرس نہیں ہوں میں صحرا نہیں ہوں میں

اعجاز! بندۂ صنمِ سادہ کار ہوں
دلدادۂ بُتانِ خود آرا نہیں ہوں میں

خود غرض جن

شہرۂ آفاق افسانہ نویس آسکر وائلڈ کے بہترین افسانہ کا ترجمہ

از ایم۔ اے متین شیخوپوری

شام کا دلفریب اور سہانا وقت۔ شفق کی شراب ریز رنگینی، طائران خوش الحان کے دل آویز چہچہے۔ ہوا کی ہلکی ہلکی مستانہ سرسراہٹ سے ایک ترنم لطیف پیدا۔ اور فضا سے اک تبسم محجوب ظاہر!۔۔۔ ماحول کا یہ نکھار! یہ پیغام زندگی!! یقیناً ضبط مہمل تھا۔۔۔ اور اضطراب لازمۂ احساس!!۔

گھنٹی بجی، بچے، معصوم اور بھولے بچے، کتاب بغل میں دبائے خود غرض "جن" کے دل آویز اور بہار آفریں باغ میں بادل نشاط اور ہنگامہ آرائیاں کرتے ہوئے آئے۔ اور چند ہی لمحے میں فطرت کی رنگینیوں اور مسرت کے پُر فضا بہاروں میں کھوئے کھوئے معلوم ہونے لگے۔

اُس خوشنما اور بہار آفریں باغ میں جہاں جابجا سبز مخملی فرش بچھے تھے۔ زمین پھولوں سے لدی پڑی تھی۔ کہیں گلاب تھا کہیں گیندا کہیں چنبیلی کہیں موتیا اور کہیں بیلا۔ غرض تمام اشجار زمردیں لباس پہنے پھولوں سے لہلہا رہے تھے۔ جیسے رات کے وقت آسمان پر ستارے درخشاں، اور زمین پر رنگ برنگ کے پھول نکہت بیزی کر رہے تھے۔ باغ کیا تھا کہ سرسبزی اور شادابی کا گہوارہ تھا۔

وسط باغ میں شفتالو کے بارہ پیڑ لگے تھے جو میوؤں کے بار سے خوشی میں مست ہو ہو کر زمین کے بوسے لے رہے تھے۔ اور باغ کی چڑیاں شاخوں پر بیٹھی نغمہ سرائیاں کر رہی تھیں، میٹھی اور پیاری آوازیں دل چھینے لیتی تھیں۔ بانسری کے دل پسند نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ وہی بچے معصوم اور بھولے بچے چمن کی رعنائیوں اور چڑیوں کے دلکش نغمے سنکر شاداں و فرحاں نظر آرہے تھے۔ پیاری اور میٹھی آواز پر اپنی جان صدقے کر رہے تھے وہ اپنا کھیل بھول چکے تھے۔ اور خوشی میں مست ہو کر گاتے تھے۔

"کیسے خوش ہیں ہم اور کیسا شاداب ہے باغ!!"

سات سال کا عرصہ گذر چکا تھا فطرت کی رنگینیاں اور قدرت کی دلفریبیاں بدل چکی تھیں۔ دنیا کا قانون بدل چکا تھا۔ اس مدت میں خود غرض "جن" بھی اپنے دوست "کارنش اگرو" کے یہاں سے واپس آچکا تھا۔۔۔ اپنے باغ میں، شاداب اور ہرے بھرے باغ میں۔

ایک سنہری شام کو وہ اپنے باغ کی سیر کر رہا تھا۔ آفتاب ساری دنیا کو منوّر کرنے کے بعد بلند اور فلک بوس پہاڑوں سے گذر کر آہستہ آہستہ مغرب کی وادیوں میں روپوش ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری شعاعیں درخت کی پتیوں سے چھن چھن کر "جن" کے سامنے رقص کر رہی تھیں۔۔۔ وہ چونکنا ہو گیا، اس کی شراب ریز آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ غصہ سے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ بچوں کے قریب آیا اور نہایت بلند اور کرخت آواز سے ساری فضا کو سر پر اٹھا لبد چلایا۔۔۔

"کمبخت دور ہو۔ شریر بچے، باغ سے نکل جا!"

غریب بھولے بھالے اور معصوم بچے افتاں وخیزاں، لرزاں و ترساں بھاگے۔

اب خود غرض "جن" اپنی جگہ پر بیٹھ چکا تھا۔ اور غصہ سے بڑبڑا رہا تھا

"یہ پُر فضا باغ یہ رنگین کیاریاں اور یہ چڑیوں کے چہچہے صرف میری دلبستگی اور خوشنودی کے لئے ہیں۔ پھر اس میں بچے آکر کیوں کھیلتے ہیں؟ اُف! سات سال کا عرصہ گذر گیا۔ مجھے خوب یاد ہے، ان پھولوں کو خود میں نے اپنے ہاتھوں سے سینچا تھا۔ پھر آج اس میں بچے کیوں آتے ہیں۔ اُن کو حق ہی کیا ہے اور ان پھولوں سے اپنی خوشی کیوں بڑھاتے ہیں۔ اور پھر اس پہ یہ طرہ کہ شور وغل سے ساری فضا کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ جس سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی"۔

دن گذرتے دیر نہیں لگتی۔ اب بھی وہی باغ ہے اور وہی خود غرض "جن" اب باغ میں بچے نہیں جاتے۔ وہی بچے جن سے باغ کی زیبائش اور خوبصورتی تھی۔ وہی بچے جن سے فطرت کی رنگینیاں اور قدرت کی، دلفریبیاں بھی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ نہیں داخل ہوتے، کیونکہ باغ کے، چاروں طرف ایک بلند چہار دیواری کھچوا دی گئی تھی۔ اور ایک چوڑی تختی پر جلی حروف میں یہ عبارت لکھ دی گئی تھی۔

"اندر آنا منع ہے"

اب بھی وہی مدرسہ تھا اور وہی بچے اور ان کے روزانہ مشاغل کھیل کود۔ اب بچوں کے کھیلنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ انھوں نے باغ سے ملی ہوئی سڑک پر کھیلنا چاہا مگر سڑک پر گرد و غبار اور چاروں طرف کنکر پتھر کی وجہ سے وہ اس جگہ کھیلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرے "جن" انتہائی خود غرض، البتہ جب بچوں کو مدرسہ سے چھٹی ہوتی تو باغ کی چہار دیواری کے گرد چکر لگایا کرتے۔ اور اس کی دلفریبیوں کو دیکھ کر گاتے،

"وہاں کس قدر خوش تھے ہم اور کیسا شاداب تھا باغ!!"

بہار کا موسم شروع ہو گیا۔ تمام اشجار رنگین لباس پہن کر ذرا کی ذرا میں بن سنور گئے۔ تختہ ہائے چمن میں شجر ہائے گل ابھی خشک، پژمردہ اور بے برگ و بار تھے۔ باد بہاری چلی اور آن کی آن میں ان کی دلفریب ہری ڈالیاں عدم کا گھونگھٹ الٹ کر بے نقاب ہو گئیں۔ ٹہنیاں جھلیں، غنچے لگے پھول کھلے، فضا ابھی ساکت و نا مرتعش تھی۔ اور وہ ابھی ابھی بلبلوں کی نوا سنجیوں قمریوں کی نغمہ ریزیوں اور پپیہوں کی مست بولیوں سے گونج اٹھی۔ زمزمہ خیز بن گئی لیکن صرف خود غرض "جن" کا باغ ان تمام دلفریب رنگینیوں سے سونا پڑا تھا۔ نہ تو بلبل کے چہچہے اور نہ تو بچوں کی بولیاں سنائی دیتیں، باغ سونا معلوم ہو رہا تھا۔ ہُو کا عالم تھا۔ نوا سنجان فطرت نوحہ کرتے تھے فطرت کو رنگین بنانے والے بچوں کی عدم موجودگی پر، اور نوحہ کرتے باغ کی زیبائش اور خوبصورتی کے اٹھ جانے پر ہر چہار جانب سے ایک آواز آتی۔

"اُف! اس نے بڑا ظلم کیا! اس کی عقل ماری گئی ہے۔ بہار کیا خاک آئے گی۔ اصل بہار تو بچوں ہی سے ہے"۔

تمام خوبیاں اس معبود حقیقی میں ہیں۔ جو سب کا پالنہار ہے، ایک پھول اسی باغ میں کِھلا۔ پتے غنچے، غنچہ سے پھول ہوا۔ پھر خود غرض "جن" کی خود غرضی پر مسکرایا۔ زور سے قہقہہ مارا۔ لیکن جب اس کی نظر اس تختہ پر پڑی تو اس کو دو بچے یاد آ گئے۔ اس کا سر فورِ غم سے جھک گیا۔ حسرت بھری نظروں سے باغ کا ماتم کیا اور کہا ــــ

"ظالم جن! پچھتائے گا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ فطرت کی دل آویزی اور خوبصورتی بچوں سے ہے۔ اور زندگی کی تمام خوشیاں اور بہار کی تمام رنگینیاں بچوں ہی کے قلب میں ہوتی ہیں۔ آہ! ــــ آج اس باغ میں ہُو کا عالم ہے۔ ہری بھری پتیوں اور ڈالیوں پر صرف برف کے تودے ہیں۔ اب نہ تو چڑیوں کے چہچہے سننے میں آتے ہیں اور نہ بچوں کی پیاری آواز اُف! یہاں کی کل کائنات برف سے ڈھکی ہے۔ اور ظالم سرد ہوائیں چل رہی ہیں ــــ

اب خود غرض "جن" کی حالت حد درجہ بدل چکی ہے۔ اور وہ سردی کا عادی ہو گیا ہے۔ جس وقت باد صبا کے خوشگوار اور روح پرور جھونکے، چلتے ہیں، وہ خواب سے بیدار ہوتا ہے۔ اور ہر روز تین گھنٹے نہایت جانفشانی اور محنت سے برف کا تودہ کاٹ کر باغ کے اندر جاتا ہے۔ اور پھر اکھڑی اکھڑی ٹھنڈی سانس لینے لگتا ہے۔

باد نسیم کے تند اور خوشگوار جھونکے چل رہے تھے۔ خود غرض "جن"۔ کھڑکی کھول کر دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار بکے جاتا تھا۔ اُف! اب تو فطرت کا ہر قانون بدل چکا ہے۔ نہ تو اب موسم کی رنگینیاں اور فضا کی دلفریبیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اور نہ تو اب وہ خوشگوار اور دلفریب سماں۔ اُف! میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ ساری کائنات خوش و خرم اور شاداب ہے۔ اور دنیا کی تمام فضا بہار کی دلفریبیوں اور رنگینیوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اُف میرا باغ بہار کی تمام دلفریبیوں اور رنگینیوں سے خالی ہے یہ سب کچھ میرے کئے کی سزا ہے۔ واقعی بچوں ہی سے باغ کی رنگینیاں، تھیں۔ آہ! ــــ میں کیسا خود غرض ہوں۔ میرے باغ میں صرف برف کے تودے ہی ہیں اور وہی ظالم سرد ہوائیں۔

ایک دن خود غرض "جن" اپنے بستر پر محو خواب تھا۔ صبح نمودار ہو چکی تھی۔ چڑیوں کی میٹھی میٹھی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ وہ چونک پڑا، اور بستر سے اٹھ بیٹھا۔ ایک دیوانہ اور مجنون کی طرح اس کے دل پر ایک بےخودی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ خوشی سے اچھل رہا تھا۔ اور دیوانہ وار

جھوم جھوم کر بکتا تھا ـــــ

"ہائیں یہ کیا! ارے میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ میرے کانوں میں کیسی آواز آرہی ہے۔ پیاری اور میٹھی آواز۔ میں ضرور خواب دیکھ رہا ہوں کیونکہ میں نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ بچّوں کو باغ سے نکال دیا ہے۔ پھر یہ کیسی آواز آرہی ہے؟ ــــ نہیں نہیں یہ ضرور کوئی پرستان کی چڑیا گا رہی ہے جو میرا دل چھینے لیتی ہے۔ یا نہیں تو کسی نے جادو کر دیا ہے جس کی آواز فضا میں گونج رہی ہے"۔

شاداں و فرحاں، اپنے بستر سے وہ اٹھا اور اچھلتے کودتے باغ کے اندر آیا۔ آنکھوں نے بھولے بھولے معصوم بچّوں کو دیکھا۔ اور کانوں نے بچّوں کی پیاری اداؤں اور پیاری آوازوں کو سنا۔ وہ بالکل بیخود ہوگیا اور اپنا گذشتہ غم بھول گیا۔ اس نے دیکھا کہ بچے چہار دیواری کے ایک مختصر روزن کے ذریعہ باغ میں داخل ہوگئے تھے۔ اور ڈالیوں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ اور بہت خوشی میں جھوم رہے تھے۔ ڈالیاں بھی رقص کر رہی تھیں۔ اور پھولوں سے لدی پڑی تھیں۔ طائران خوش الحان درختوں پر بیٹھے اپنے میٹھے سُروں سے دلکش تانیں لگا رہے تھے۔ باغ پھولا پھلا معلوم ہو رہا تھا۔ پائیں باغ کا صرف ایک کونہ ویران اور اُجاڑ معلوم ہوتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا بچہ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا بلک بلک کر رو رہا ہے۔ وہ اس قدر چھوٹا تھا کہ اس کی باہیں درخت کی شاخوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس کی ڈالیاں اس سے بہت اونچی تھیں۔ اور برف سے ڈھکی ہوئی۔ وہ درخت بالکل خزاں رسیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ نہ تو چڑیوں کے چہکار نہ پھولوں کا انبار تھا۔

خودغرض "جن" بہت دیر تک کھڑا اس منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آخر اس نے مہر سکوت توڑی، اور خوشی سے جھومنے لگا۔ دم بخود ہو کر کہنے لگا "واہ! ــــ اب تو میری قسمت کے دن پھر گئے۔ اب نوا سنجان فطرت کے نغمے سننے میں آرہے ہیں۔ یہ صرف بچّوں کے آنے کی برکت ہے۔ آج میں نے بچّوں کو کچھ نہیں کہا تو باغ کا رُت ہی بدل گیا۔ اب میں بچّوں کو کبھی اندر داخل ہونے میں منع نہیں کروں گا۔ بلکہ چہار دیواری توڑ دوں گا تختہ کو بھی اتار لوں گا"۔

اب خودغرض "جن" بچّوں کے بہت قریب تھا۔ بچّوں نے اسے دیکھا اور وہ بھاگے لرزاں و ترساں، افتاں و خیزاں۔ صرف ایک ننھا بچہ جو ان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھا نہ بھاگ سکا۔ اس نے اسے نہیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اور آنسوؤں سے بھری ہوئی۔

"جن" بچّہ کے قریب آیا۔ اور اسے گود میں اٹھالیا۔ پیار کیا۔ بوسہ لیا اور درخت کی ڈالیوں سے جھولا جھلایا۔ بچّہ نے فرط انبساط سے "جن" کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ خوشی سے جھومنے لگا۔ تمام اشجار زمردین لباس میں ملبوس ہوگئے۔ چڑیاں آئیں اور اپنی چہکار سے فضا میں ایک دل آویز لہر پیدا کر گئیں۔ ڈالیاں ڈالیوں سے اٹھکھیلیاں کرنے لگیں۔ غرض وہ درخت سب سے زیادہ شاداب اور ہرا بھرا ہوگیا۔ اور درختوں سے پھول جھڑنے لگے،

دوسرے بچّوں نے جب دیکھا کہ اب "جن" مہربان ہوگیا ہے وہ بھی دوڑے اور باغ میں داخل ہوگئے۔ اور اس کے ساتھ کھیل میں حصہ لینے لگے۔ اب باغ میں بہار ہی بہار تھی۔ اور "جن" بچّوں کے ساتھ جھوم جھوم کر کھیل رہا تھا ــــ

دن کے بارہ بج چکے ہیں۔ آفتاب کی کرنیں بدستور ہیں۔ ہر آنے جانے والا باغ کی خوبصورتی کو دیکھکر خوش ہوتا ہے۔ کبھی کبھی درختوں کے تنا میں آرام بھی کر لیتا ہے۔ لوگوں نے دیکھا "جن" کو خوش و خرم اور بچّوں کے ساتھ کھیلتے کودتے۔

اب بچّے باغ میں روز آتے ہیں۔ اور ڈالیوں کو پکڑ کر جھومتے ہیں "جن" بھی بچّوں کے ساتھ کھیل کود میں حصہ لیتا ہے۔ وہ بہت خوش نظر آتا ہے۔ اور بچّوں کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتا ہے۔ بچّے بھی اس سے، خوش رہتے ہیں۔ اور پیار و محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ جھومتے ہیں۔ ناچتے ہیں اور پیاری پیاری بولیاں بولتے ہیں۔

ایک رنگین شام کو جب آفتاب کی سنہری اور روپہلی کرنیں چمن کی ڈالیوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں "جن" بچّوں کے ساتھ کھیل کود میں کافی حصہ لے رہا تھا۔ لیکن بایں ہمہ اس کے چہرے سے غم کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت زیادہ مغموم نظر آرہا تھا اور بچّوں سے کہہ رہا تھا ــــ

"میرے پیارے اور آنکھوں کے تارے! ــــ آج میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ بتا جلد بتا۔ وہ ننھا بچہ جسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور گود میں لیکر پیار کیا تھا۔ ــ سے جھولا جھلایا تھا۔ کہ ...

مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ مری پریشان اور بے قرار آنکھیں ہر وقت ڈھونڈتی ہیں۔ آخر تم لوگوں کے ساتھ کھیلنے کیوں نہیں آتا ہے؟ میرے دلنواز ـــــ! جلد بتا۔ وہ چاند کا ٹکڑا کہاں ہے؟ وہ ننھا بچہ پھر کیوں نہیں آتا؟"

بچوں نے اپنے گلابی ہونٹوں کو حرکت دی اور کہا ـــــ

"ہم نہیں جانتے! وہ کہیں چلا گیا ہوگا! ـــــ"

کہاں کہاں! تم نہیں جانتے۔ اچھا دیکھو اُسے بھول نہ جانا۔ کل اپنے ساتھ اُس کو باغ میں ضرور لانا۔ وہ میری آنکھوں کا تارا ہے۔ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ اس سے باغ کی زینت ہے۔ وہ ایک رنگین پھول ہے۔ ایسا پھول جو کسی چمن کو نصیب نہیں۔ دیکھو بھول نہ جانا........"

"اُف! ـــــ نہ معلوم وہ کہاں رہتا ہے۔ ہم لوگوں نے کبھی اُسے نہ دیکھا۔ وہ نور کا فرشتہ تھا۔ بھولا بھالا اور ننھا سا۔ اسے ہم نہیں دیکھ سکتے" بچوں نے کہا۔

"جن" کی تمناؤں اور ارمانوں کا خون ہو گیا۔ اس پر بجلی گر پڑی، بڑا افسردہ خاطر ہوا۔ زار و قطار رونے لگا۔ اس کے رونے سے ہواؤں نے گریہ و زاری کی۔ شبنم نے اشکباری کی۔ کالی کالی گھٹاؤں نے نالہ و زاری کی اور چڑیوں نے آہ و فغاں کی۔ اس کے ساتھ در و دیوار روئے۔ سارا باغ ماتم کدہ بن گیا۔

اب "جن" خود غرض نہ رہا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ ہمیشہ بلاناغہ۔ لیکن اس کی زندگی میں اب کچھ تبدیلی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ کسی کی متلاشی رہتیں۔ اور وہ کھویا ہوا معلوم ہوتا۔ اسکو تلاش تھی اس بچے کی۔ وہی گورے گورے گالوں والا بچہ کہ جس کی آنکھیں لوگوں کو گرویدہ بنا ڈالتی تھیں۔ وہ اس کی محبت کا دم بھرتا۔ اور بچوں سے کہتا۔

"بتاؤ وہ کہاں رہتا ہے؟ اب اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟ اس کے بغیر میرا باغ سونا معلوم ہوتا ہے۔ اور میرا دل ہمیشہ دھڑکتا رہتا ہے"

وہ ہمیشہ اس بچے کو یاد کرتا۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے۔

بس وہ تھا اور اس بچے کی یاد۔!

زمانہ گذرتا گیا۔ "جن" کمزور اور ناتواں ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بوڑھا ہو گیا۔ اب وہ بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ بلکہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا [illegible] وہ دیکھا کرتا۔ بچے [illegible] بھی وہی ہمدرد [illegible] تھا۔

کہتا کہ اگر پھول سے زیادہ کوئی بیش قیمت اور بیش بہا چیز ہے تو صرف یہی خوبصورت اور حسین بچے جن سے فطرت کی رنگینیاں قائم ہیں۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ موسم بہار کے فیاض ہاتھوں نے باغ کے اندر گلکاری کر دی تھی۔ "جن" اپنے باغ میں بیٹھا ان گورے گورے گالوں والے بچے کے تصور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ وہ محبت کی شراب پی رہا تھا۔ یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر مسرت کے آثار جھلملانے لگے۔ کبھی چمن کی رنگینیوں کو دیکھتا، کبھی پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کو۔ ابھی وہ اس نظارے سے لطف اندوز بھی نہیں ہو سکا تھا کہ یکایک دم بخود ہو گیا۔ اس نے دیکھا اس بچہ کو جس کے تصور میں سرد آہیں بھرا کرتا تھا۔ اور ہمیشہ جس کی یاد زبان پر وِرد تھی۔ وہی بچہ درخت کے نیچے پھولوں کے جھرمٹ میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"جن" خوشی سے اچھل پڑا۔ کھوئی ہوئی دولت مل گئی۔ پژمردہ دل کنول کی طرح شگفتہ ہو گیا۔ بچے کے قریب گیا خلوص و محبت بھرے دل سے لیکن فوراً ہی وہ اس کے نزدیک جاتے ہی غصہ سے بھُن گیا۔ آنکھیں پیلی ہو گئیں۔ لیکن فوراً ضبط کیا۔ اور اس بچے سے پوچھا ـــــ

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میرے دل کے ٹکڑے!! بتا اتنے دنوں کہاں تھا۔ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں! ایک طویل مدت کے بعد ملاقات ہوئی۔ پھر اس قدر رنج و دکھ میں مبتلا۔ اور یہ تمہارے ہاتھوں سے خون، کیوں بہہ رہا ہے۔ ہائے لخت جگر! میرے تارے!! بولو اور جلد بولو۔ تمہارے نازک ہاتھوں کو کس نے زخمی کیا۔ ہائے یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں، اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں۔ جلد بتا۔ میں تمہاری ہر طرح امداد کرنے کیلئے تیار ہوں۔ اس کی گردن پر چمکدار اور آبدار تلوار ہو گی جس نے تمہارے ہاتھوں کو زخمی کیا۔ اور جس سے خون رواں ہے"

بچہ مسکرایا اور کہا "یہ محبت کے زخم ہیں" ـــــ!!!

"جن" اس راز کو سمجھ گیا۔ وہ بیخود ہو گیا۔ وفورِ شوق میں پھولا نہ سمایا، کیونکہ دو محبت بھرے دل ایک جگہ تھے۔ وہ بچے کے قدموں پر گر پڑا۔ اس کے قدموں کے بوسے لئے اور کہا "تم کون ہو پھر؟"

بچہ پھر مسکرایا اور کہا "تم نے ایک دن مجھے اپنے شاداب باغ میں کھیلنے کی اجازت دی تھی۔ آج میں تمہیں اپنے باغ میں لیجاؤں گا جسکا نام بہشت بریں ہے"

ص

جوانی

از فضلیؔ مرحوم

جوانی! ہاں جوانی ہی خزانہ ہے محبّت کا
جوانی! ہاں جوانی ہی فسانہ ہے محبت کا

جوانی نام ہے جذباتِ رنگیں کے ترانے کا
جوانی نام ہے پرسوز لے میں راگ گانے کا

جوانی بانسری کے سوز میں مستور ہوتی ہے
جوانی میں ہر اک شے حسن سے معمور ہوتی ہے

جوانی ماحصل ہے ارتقائے زندگانی کا
محبّت کرکے مر جانا خلاصہ ہے جوانی کا

جوانی نام ہے احساسِ جذباتِ محبّت کا
جوانی نام ہے بیداریٔ جذباتِ الفت کا

دلوں میں گدگدی محسوس ہوتی ہے جوانی میں
لبوں سے آہ بھی مانوس ہوتی ہے جوانی میں

جوانی ہی میں رہ رہ کر کسی کی یاد آتی ہے
مزہ دردِ محبت کا جوانی ہی سکھاتی ہے

حسینوں کو حسیں بننا جوانی ہی سکھاتی ہے
حسیں کو فتنۂ محشر جوانی ہی بناتی ہے

قیامت خیز بنتا ہے تبسم نوجوانی میں
محبّت خیز ہوتا ہے ترنّم نوجوانی میں

خدنگِ غم جگر کے سامنے ہو یہ جوانی ہے
کوئی کافر نظر کے سامنے ہو یہ جوانی ہے

تصور میں فنا رہنا کرشمہ ہے جوانی کا
کسی کی یاد میں رونا ہی نغمہ ہے جوانی کا

جوانی نام ہے سنتے ہیں کیف و شادمانی کا
مگر فضلیؔ ذرا ماتم کرو میری جوانی کا
کہ ہے صرفِ الم ہر لمحہ میری زندگانی کا

اب ہم کیا کریں؟

یہاں سے اب ہمیشہ کیلئے ہماری زندگیاں جدا ہونگی، پریتم! ..... میری شاہراہ اس طرف ہے اور تمہاری دوسری طرف ..... آہ! حسین دل!! اس بیتاب محبت کو کیا کریں؟ یہ تو ہر روز بوجھل اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے۔ اسے چھپا دیں؟ زمین کے وسیع اور تاریک غاروں میں۔ لیکن آہ! پیارے اُسے چھپانے کیلئے وہ بھی تنگ ہیں؟ ——— اور مجھے خوف ہے کہ ماضی کا عظیم مخزن بھی اسے ہماری نگاہوں سے نہیں چھپا سکے گا۔ اسے ڈبو دیں؟ لیکن اگر تمام سمندر بھی مل کر ایک عظیم اور وسیع سمندر بن جائے تو اس جذبے کو غرق کرنے کیلئے بہت پایاب ہوگا۔ حتیٰ کہ اپنی حرکت اور زندگی بھی کھو بیٹھے گا۔

اسے جلا دیں؟ لیکن دوزخ کی بھٹی کے تمام شعلے ملکر بھی اسے ہزار سالوں میں نہیں جلا سکیں گے۔

نہیں! یہ جذبہ انسان میں بڑھے گا اور پرورش پائیگا۔ کیونکہ پیدائش ہی سے یہ آگ پر پلتا آیا ہے ——— اسے بھوکا ماردیں؟ ہاں صرف یہی طریق ہے کہ اسے نگاہوں، امیدوں، وراہوں کی کوئی خوراک نہ دیں۔

بیتے ہوئے دنوں کی یاد ——— اور ——— بے سود، اندوہگیں واقعات اس سے چھین لیں ——— اور

اور اسے مرنے دیں!

آمین حزیں (بھاولپور)

رہائی

از جناب سعید احمد صاحب اعجاز

وہ جیل خانے سے متصل ٹیلیفون کے ایک کھمبے سے لگ کر کھڑی تھی۔ سامنے جیل کا بڑا دروازہ تھا جس پر پہرہ دار متعین تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھیں گھنی پلکوں کے درمیان سے پہرہ دار کی ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو اسکے مرمریں جسم کو پوری طرح پوشیدہ کرنے کے لئے ناکافی تھا۔ اس کی نیم عریانی ہر راہ گیر کو دعوتِ نظر دے رہی تھی۔

وہ یونہی محو کھڑی تھی کہ اس کے بازو پر ایک مردانہ ہاتھ کی لمس نے اُسے چونکا دیا۔ اس نے حسبِ عادت مسکراتے ہوئے اس کی طرف اپنی گردن پھیری۔ اور پھر اسی آن میں اپنے جسم کو سمیٹ کر پرے ہٹ گئی "یہ چڑچڑی، عصمت باختہ!" مرد نے حقارت آمیز لہجے میں یہ لفظ کہے اور چلا گیا۔ پہرہ دار نے پھاٹک کی سلاخوں سے سب کچھ دیکھا۔ یہ نظر، سوائے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے اس پر کوئی کیفیت طاری نہ کر سکا

دوشیزہ پھر کھمبے کے پاس اپنی جگہ پر آگئی۔ اور از سرِ نو اسی محویت میں ڈوب گئی۔ اِس وقت بارہ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔ دوپہر کو اس پھاٹک سے ہریش ایک آزاد آدمی کی حیثیت سے نکلے گا۔

کتنی تعجب کی بات تھی کہ وقت کی رفتار حد سے زیادہ سُست پڑ گئی تھی۔ چھ سال کے لگ بھگ اس نے اس لمحے کے لئے انتظار کیا تھا۔ کیا وہ پھاٹک کبھی نہ کھلے گا؟ ـــــ

وہ سوچ نہ سکتی تھی کہ وہ اسے یہاں کھڑا پا کر کیا کہے گا۔ کیا وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے لیگا؟ اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ وہ آتے ہی ضرور اس کا بوسہ لیگا ـــــ شاید اس دن کی طرح جب قسمت کی سفاکی نے دونوں کو جدا کر دیا تھا۔ وہ امید کر رہی تھی کہ اس کے خاوند ہریش کو یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ کہ کس چیز نے اس کی معصوم، جوانی اور پھول سے چہرے کو پامال کر دیا ہے۔ اس نے ہریش ـ ـ یہی، من وعن کہہ دیا تھا۔ کہ اسے پھانسی سے بچانے کے لئے اس نے کسطرح روپیہ حاصل کیا تھا۔ مقدمے کے مصارف پورا کرنے کے لئے وہ اپنا سب کچھ دے چکی تھی۔ ہریش کی جان بچ گئی تھی اور اب وہ رہا ہونیوالا تھا۔

جب ہریش کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تھا اس وقت سے اس نے مقدمہ لڑنا شروع کیا تھا۔ کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ ......اس کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ بھی نہیں۔ اس نے ڈاکٹر سے مدد طلب کی۔ اسے ایسا مجبوراً کرنا پڑا۔ وہ اپنے پتی ہریش کے لئے ہر چیز قربان کر سکتی تھی .... آہ! ہریش، جس کو جیوری نے قتل کا ملزم ٹھہرایا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ ہریش بے گناہ ہے۔ محض یہ امر کہ پیدا ہونے والے بچے کی خاطر وہ ٹیکسی سے زیادہ کمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بات کا ثبوت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ قاتل گروہ کا فرد ہے۔ ہو سکتا ہے، اس نے اُن کو جواہرات کے ذخیرے میں گھستے دیکھا ہو۔ مگر اس نے اس میں حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ اس گروہ کی طرف سے باہر نگرانی کے لئے مقرر نہیں تھا۔ جیسا کہ مخالف گواہوں کا بیان تھا۔ وہ تو دوکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اپنے کرائے کے انتظار میں جیسا ہر ٹیکسی والا کر سکتا ہے۔

صرف اس لئے کہ اس نے کوئی معلومات بہم پہنچانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس پر گروہ سے تعلق رکھنے کا شبہ ہوتا تھا۔ اور اس لئے عدالت سزائے موت پر اصرار کر رہی تھی۔ ہریش کو خدشہ تھا کہ ساری بات بیچاری شانتا کے سر آئے گی۔ یہی سوچ کر اس نے اپنا مُنہ بند رکھا۔

شانتا مقدمے کو اپیل کی عدالتوں تک لے جانے میں اپنی ساری پونجی خرچ کر چکی تھی۔ یہی کافی نہ تھا۔ روپے کی ابھی اور ضرورت تھی ....

آہ روپیہ کہاں سے آئے .... عورت کے پاس آخری ملکیت اس کی عصمت ہے۔ روپیہ حاصل کرنے کے لئے آخر اس کو بیچنی پڑی .... بدنصیب شانتا اب کوٹھے والی تھی۔ اس کی جوانی بڑی بڑی قیمتوں پر بکی۔ مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ، جیوری نے ایک اور سماعت سے انکار کر دیا ہے۔ تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ گورنر کے روبرو مقدمے کی پیروی کے لئے جتنا روپیہ چاہئے تھا اتنا حاصل کرنا قریباً ناممکن تھا۔ مگر اس نے کسی طرح حاصل کر ہی لیا۔

اس مقصد کے لئے اُسے اپنے تئیں معصیت کے انتہائی، غاروں میں گرانا پڑا۔ اسے ایسی حیا سوزیوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ جن کے تصور ہی سے کبھی اس کی روح لرز جاتی تھی۔

خیر کسی طرح ہریش کی سزا حبس دوام کے درجے تک گھٹ کر رہ گئی۔ معافی کا بورڈ اس کے بعد تھا۔ وہ ایک پلید سایہ بن چکی تھی اسے اپنا جسم غلیظ ترین انسانوں کے سامنے، اُن کے سیاہ تعیش، کی خاطر پیش کرنا پڑتا تھا۔ جہنم کی آگ لپٹیں اس کی روح سے آ کر ٹکراتی تھیں۔ وہ کانپ کانپ اٹھتی تھی۔ مگر ہریش کے چھوٹ جانے کا خیال اس کے سوہان روح میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دیتا تھا۔ ہریش کے سوا اُسے کس کی پرواہ تھی؟ .... مگر خیر اب اس تاریکی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

بارہ کا گھنٹہ بجا۔ جیل کی چہار دیواری کے اندر ایک سیٹی کی آواز گونجی۔ پھاٹک کھل گیا۔ اور وہ باہر آ رہا تھا۔ ہریش نے پہلے اس کو نہ دیکھا۔ مگر جب اس نے رومال سے اشارہ کیا تو وہ خوشی سے چونک کر اس کی طرف بڑھا۔

وہ کبھی نہ جان سکی کہ حقیقتاً کیا ہوا۔ ایک بڑی موٹر کار نہ جانے کہاں سے وہاں آ گئی .... اور پھر گولیوں کے چلنے کا دھماکا ہریش سڑک کے کنارے ڈھیر ہو کر گر گیا۔ شانتا نے محسوس کیا کہ اس کی روح مر گئی —— مگر وہ نے ہریش کی زبان ہمیشہ کے لئے خاموش کر دی تھی۔ دوسرے لحظہ میں شانتا ایک پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت پھٹی ہوئی آنکھوں سے ہریش کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آئے اور لاش کو پھاٹک کے اندر لے گئے۔

شانتا نے محسوس کیا کہ ایک مردانہ ہاتھ نے اس کے خوبصورت بازو کو چھوا۔ مرد کے موٹے موٹے ہونٹوں سے نکلا کہ وہ کون ہے۔ اندوہ میں ڈوبی ہوئی ایک سسکی کے ساتھ وہ اس کی طرف مڑی اور ساتھ چلی گئی!—

اعجانا

خیابانِ تخیل!

از ادیب الملک شاہزادہ ایاز

اس طرح ہے مری صورت سے نمایاں کوئی
جیسے تصویر مقدر پہ ہو عنوان کوئی،

ابھی تکمیل محبت کو ہے عرصہ باقی
کام تعمیرِ جنوں کا نہیں آساں کوئی،

کاش آ کر مرے آدابِ اسیری دیکھیں
کتنا جارح ہے اسیرِ غمِ زنداں کوئی،

اُن کے انداز محبت نے کیا تھا بےخود
مرے انجام جنوں سے ہے پریشاں کوئی

وہ اٹھائیں رخِ مقصود سے پردہ اکبار
سامنے طور کے ہے سوختہ ساماں کوئی

غیرتِ سوزِ محبت مری تقصیر معاف
آج کرتا ہوں شریکِ غمِ ہجراں کوئی

ہر تڑپ میں ہے حجابِ رخِ محبوب ایاز
میرے ہر اشکِ ندامت میں ہے پنہاں کوئی

مری انتہائے نگارش یہی ہے - ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

عالمگیر
لاہور

قیمت فی پرچہ پانچ آنہ قیمت سالانہ چار روپے چار آنے

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

تمدنِ عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۹۱۰ء کی صفحہ بصفحہ جامع محتویات کے علاوہ اور

نواب حیون یار جنگ بہادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے

عالمانہ تبصرہ، ناقدانہ مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے

جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۲۷) تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ جس کی قیمت پچاس روپے

تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی اب

اعلیحضرت فرمانروائے دکن دام ظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہوئی ہے قیمت فی نسخہ پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل بکڈپو و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

اطلاعنامہ بنام رسپانڈنٹ مشعر اطلاع تاریخ مقررہ سماعت اپیل

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر بارہ بنکی مقام بارہ بنکی۔ مقدمہ اپیل نمبر ۱۳ سنہ ۱۹۳۵ء اپیل لگان

شیخ حبیب اصغر اپیلانٹ بنام مسماۃ بی بی سعید النساء وغیرہ رسپانڈنٹ

اپیل بنا راضی تجویز ڈگری عدالت پنڈت کنہیا لال صاحب آنریری اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اول مقام بارہ بنکی

مورخہ ۲۰ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۵ء

بنام گجراج سنگھ ولد ... سنگھ قوم ٹھاکر ساکن لال کور مرزدہ محمد پور پرگنہ دیوی تحصیل نواب گنج ضلع بارہ بنکی رسپانڈنٹ

مطلع ہو کہ اپیل بنا راضی ڈگری بقایا لگان اس مقدمہ میں مسمی شیخ حبیب اصغر نے پیش کیا۔ اور وہ اس عدالت میں درج رجسٹر ہوا اور اس عدالت نے تاریخ بارہ ۱۲ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۶ء واسطے سماعت اس اپیل کے مقرر کی ہے اور اگر خود یا تمہارا وکیل یا کوئی اور شخص جو قانوناً تمہاری طرف سے اپیل بابت جواب وسوال کرنے کا مجاز ہو حاضر نہ آئیگا تو اس کی سماعت اور تجویز تمہاری غیر حاضری میں یکطرفہ کی جائیگی۔

آج بتاریخ ۲۸ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط صاحب جج بہادر بخط انگریزی

تنبیہہ :- اگر اجرائے ڈگری کے ملتوی ہونے کا حکم ہوا تو اس کی اطلاع اس اطلاعنامہ ... ہے

وقت حاضری دفتر ... بجے سے ۴ بجے تک

اپنے لمحاتِ فرصت کی قدر کرنا سیکھیں

موسم سرما آرہا ہے۔ ان طویل راتوں میں

ذیل کے بہترین علمی شہ پاروں کے مطالعہ سے اپنی اسلامی ادبی تاریخی معلومات بڑھائیے

علامہ سہیل ... تمام سلاطین عالم کے ...

... وہ کیا گروہوں تھا جس کا ہے اک تو ماہ تاب ... لیکن وہ ... تاج سردارا

چودہ سو سال کی مستند اسلامی تاریخ

... جس پر تمام اسلامی متعدد اخبارات نے شاندار ریویو کئے ہیں۔ ... مکمل پانچ حصے ہیں مجلد سنہری جس میں ... اسلام ... ایک سال ... کے حالات اسلام کی متعدد ... اسلام ... کی ... خلفائے عباسیہ خلفائے عثمانیہ ... اسلامی طریق تمدن و طرز معاشرت پر مفید بحث کی گئی ہے۔

قیمت مجلد سنہری صرف تین روپے (سے)

اسلام کے مایہ ناز مجاہد عظیم سپہ سالار اعظم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات دو ... بکھرے مجاہدانہ جانثاریوں کے تھرا دینے والے واقعات

سیرۃ خالد بن ولیدؓ

شکار ... جن کی شمشیر خارا شگاف کے آگے بڑے بڑے ... پادشاہ باوجود لاکھوں لشکر جرار رکھنے کے لرزہ براندام ... تقریباً ... صفحات کی ایسی تاریخ ہے جس میں ہر ایک ... کے متعلق مستند تاریخی کتب کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

ادیب شہیر ایم اسلم کے دو جدید شاہکار

تفسیر حیات

(چالیس افسانوں کا مجموعہ)

جن اصحاب نے ایم اسلم صاحب کے افسانے پڑھے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ایم اسلم صاحب ان معمولی واقعات میں جو انسان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کی ہوا پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی ہے۔ کہ ہر ایک افسانہ مکمل ڈرامہ معلوم ہوتا ہے۔ تفسیر حیات قابل مصنف کے ایسے ہی دلکش اور پر تاثیر چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا حجم تقریباً ساڑھے سات سو صفحات ہے اور نہایت خوشنما گیز کاغذ پر چھپا ہے مجلد سنہری ڈائی کی خوبصورت جلد قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ)

آشوب زمانہ

یہ بھی ایم اسلم صاحب کی بہترین تصنیف ہے جس میں قابل مصنف نے اپنی وسعت مشاہدہ ۔ عمیق نظری معلومات نفسیات انسانی کے مطابق نہ صرف مرد و عورت کے ربط و ضبط جذبات محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ بلکہ اخلاق ادب تمدن معاشرت پر بھی بحث تمحیص کی ہے آخری صفحات پر نالہ فراق کے نام سے قابل مصنف نے ایک امید وار محبت کا ایسا مایوس کن واقعہ لکھا ہے جس کو پڑھ کر پتھر دل انسان بھی آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ: ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز تاجران کتب بل روڈ کشمیری بازار لاہور



برده فروش

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۷ — فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۳۷ء — نمبر ۶

خاص نمبر ۱۹۳۸ء کے تمام اعلانات حرف بحرف ملاحظہ فرمائیے

ملاحظات: دسمبر ۳۷ء میں شایع ہونے والے خاص نمبر ۳۸ء کے متعلق چند گزارشات!

حسب معمول دسمبر ۳۷ء میں عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۸ء انشاء اللہ العزیز ان گوناگوں خوبیوں اور معرکہ آرا خصوصیات کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا جو عالمگیر اور صرف عالمگیر کے خاص نمبروں کا حصہ ہیں۔

میری دلی تمنا تھی کہ میں خاص نمبر ۳۸ء میں شایع ہونے والے گرانقدر مضامین اور تصاویر کے متعلق کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال کر کے عالمگیر کے ناظرین کرام کو یہ یقین دلا دیتا کہ فی الواقع آپ کے عالمگیر کا خاص نمبر ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے اپنی نظیر آپ ہوگا۔ لیکن میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں تمام مضامین، تمام افسانوں، تمام حصہ نظم اور تمام تصاویر پر مختصر الفاظ میں بھی اظہار خیال کر سکوں اور اگر چند ایک عنوانات کو اظہار تفصیل کے لئے منتخب کروں تو یہ بھی ممکن نہیں ہے اس لئے کہ عالمگیر کے خاص نمبر کے مضامین اور تصاویر شروع سے آخر تک اس قدر دلآویز اور کامیاب ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بہترین منتخب کرنا سعی لا حاصل ہے۔ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

تصاویر

خاص نمبر ۳۸ء کی تمام تصاویر بے انتہا کاوش، دوڑ دھوپ اور پیہم جستجو کے بعد منتخب کی گئی ہیں۔ ہر تصویر فن مصوری اور آرٹ کے ارتقار کا نایاب نمونہ ہے۔ بعض تصاویر ہندوستان اور یورپ میں آرٹ کی نمائشوں میں گرانقدر انعامات کی مستحق قرار دیجا چکی ہیں۔ غرضکہ نصف درجن سے زائد سہ رنگی اور ایک درجن سے زائد یک رنگی ایسی عدیم النظیر تصاویر شایع کی جارہی ہیں کہ انھیں ملاحظہ فرماکر آپ بیحد محظوظ ہونگے۔

مضامین

ادارہ عالمگیر کی خوش قسمتی سے خاص نمبر کے لئے ہندوستان کے مشہور ادبار کے ایسے گرانقدر علمی و ادبی بلند پایہ مضامین مہیا ہوگئے ہیں کہ جس کی نظیر کسی رسالہ کے خاص نمبر میں ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عالمگیر میں ہندوستان کے بہترین ادبا ہمیشہ اپنے نگارشات جمیل پیش کرتے ہیں اور خاص نمبر کے لئے تو انھوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ ان کے کاوش دماغ اور تفکر ذہن کے ایسے نادر و نایاب نمونے ہیں کہ ان کا مطالعہ آپکے ذہن و دماغ کو حقائق سے لبریز کر دیگا۔

افسانے

یورپ کے کسی "نقاد" کا قول ہے کہ "کسی ملک کی ادبی زندگی کا راز معلوم کرنا ہو تو اس ملک کی قومی زبان کے افسانے پڑھو"۔

فی الحقیقت اگر آپ ہندوستان کے معاشرتی، اقتصادی اور اجتماعی حالات کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو خاص نمبر ۳۸ء کے افسانے مطالعہ فرمایئے۔ ایسے حیرت انگیز۔ اتنے پر تاثیر، اس قدر کامیاب اور اس درجہ مکمل رازہائے حیات سے آپ آج تک آشنا نہ ہوئے ہونگے۔ خاص نمبر ۳۸ء کے افسانے یقیناً فن افسانہ نویسی میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

ناظرین کرام کی تفنن طبع کے لئے بعض دلچسپ، تبسم خیز مزاحیہ افسانے بھی شریک اشاعت ہیں۔

حصہ نظم

عالمگیر کی اس خصوصیت خاص میں کوئی رسالہ اس کا مقابل

خاص نمبر ۱۹۳۸ء آپ کی توقعات سے کہیں زیادہ شاندار ہوگا

نہیں ہوسکتا کہ اسکے خاص نمبر کا حصہ نظم اتنا بلند ہے اور اس میں قدیم و جدید طرز کی غزلوں اور نظموں کا اتنا معتدبہ حصہ شائع کیا جا رہا ہے کہ اس کی نظیر ملنی محال کیا بلکہ ناممکن ہے۔ جلیل القدر شعراء مثلاً نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل استاد حضور نظام خلداللہ ملکہٗ، نواب اختر یار جنگ بہادر۔ اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری، فصیح العصر حضرت نوح ناروی، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جگر مرادآبادی۔ حضرت فطرت واسطی۔ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق۔ حضرت ماہر القادری۔ مولانا امجد حیدرآبادی وغیرہ کے بلند پایہ اور گرانقدر منظومات خاص نمبر کی آرائش و زیبائش کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

الغرض عالمگیر کے خاص نمبر کا ہر ورق بلکہ ہر صفحہ "دامان باغبان وکف گلفروش" کا جواب پیش کر رہا ہے۔

عالمگیر

کے تمام اعلانات صحت و صداقت پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے مندرجہ بالا سطور میں خاص نمبر کی جو ایک ہلکی سی جھلک پیش کی گئی ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے اور آپ خاص نمبر کو انشاءاللہ اس سے کہیں زیادہ جاذب نظر پائیں گے۔ آخر میں یہ بھی عرض کر دینا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ جہاں ادارہ عالمگیر اس عدیم النظیر خاص نمبر پر تقریباً

پانچ ہزار روپے

کی کثیر رقم صرف کر رہا ہے وہاں ناظرین کرام پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اگر وہ عالمگیر کے خریدار نہیں ہیں تو آج ہی عالمگیر کی خریداری قبول فرمائیں اور اگر وہ قبل سے عالمگیر کے خریدار ہیں تو اپنا سلسلہ خریداری قائم رکھیں اور توسیع اشاعت کے سلسلہ میں کوشش فرما کر اپنے عالمگیر کی جائز امداد سے چشم پوشی نہ کریں۔

سالانہ خریداری کی صورت میں یہ عدیم النظیر اور فقید المثال خاص نمبر حسب معمول **مفت** آپ کی خدمت میں پیش کیا جائیگا۔

(حافظ) محمد عالم عفی عنہٗ

اگر آپ

عالمگیر کا وہ عدیم النظیر اور فقید المثال خاص نمبر جو دسمبر میں شایع ہو رہا ہے بالکل

مفت

حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی عالمگیر کی خریداری قبول فرمایئے اس صورت میں جون ۳۸ء میں شایع ہونے والا سالانہ نمبر بھی آپ کو مفت ملیگا۔ عالمگیر چودہ سال سے جاری ہے اور ہر سال اپنے خریداروں کی خدمت میں دو خاص نمبر (دسمبر اور جون میں) مفت پیش کرتا ہے۔ سالانہ خریداری کی صورت میں بہرحال آپ کا فائدہ ہے۔ قیمت سال بھر کے لئے صرف چار روپے چار آنے للعہ علاوہ محصولڈاک۔ نیاز مند مینجر عالمگیر لاہو

چار آنے کی ٹکٹیں!

عالمگیر کے جن خریدار حضرات کی میعاد خریداری ختم نہیں ہوئی ان کے نام کے ساتھ چٹ پر جس چھپا ہوا ہے وہ اپنا خاص نمبر بحفاظت منگانے کیلئے چار آنے کی ٹکٹیں ارسال فرمائیں تاکہ خاص نمبر انہیں بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے۔ نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں البتہ جن حضرات کی میعاد خریداری اس پرچہ (نومبر) کے ساتھ ختم ہو رہی ہے اور ان کے نام کے ہمراہ خ چھپا ہوا ہے وہ ٹکٹیں نہ بھیجیں خاص نمبر انکی خدمت میں آئندہ سال کے لئے

آہ شفاء الملک

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

۲۰ اکتوبر ۳۷ء کی رات کتنی قیامت خیز تھی کہ اس نے ہندوستان اور پنجاب کی ایک ایسی مایہ ناز ہستی کو ہم سے چھین لیا کہ جس کا مثل و نظیر زمانہ شاید صدیوں میں پیدا نہ کر سکے گا۔ حضرت شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کی ذات گرامی کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آہ وہ اقلیم طبابت کا شہنشاہ، وہ فن مصوری و خطاطی کا بے بدل استاد، وہ ادب و زبان کا بلند نظر نقاد آج ہم سے منہ موڑ کر عالم جاودانی کی جانب کوچ کر گیا۔ "عالمگیر" سے مرحوم کو دلی عشق تھا اور ہمیشہ آپکے مفید مشوروں سے میرے لئے چراغ راہ کا کام دیا کرتے تھے۔ آخر میں ہم دست بدعا ہیں کہ خداوند جل شانہٗ مرحوم کی روح کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپکے ہزارہا عقیدتمندوں اور دوستوں کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

حافظ محمد عالم عفی عنہٗ

نظامی عروضی سمرقندی

ایک تاریخی مکاشفہ!

از جناب سجاد صاحب ہاشمی چنیوٹوی

ابوالحسن نظام الدین احمد بن عمر بن علی سمرقندی معروف بہ نظامی عروضی چھٹی صدی ہجری کے ارباب علم وفضل میں تھے۔ عروضی کے متعلق کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ آخر یہ لفظ آپ کے نام کے ساتھ کس طرح ملحق ہوا۔ ممکن ہے کہ علم عروض سے آپ کو زیادہ دلچسپی رہی ہو۔ علامہ موصوف نے خود بھی اس کے متعلق روشنی نہیں ڈالی۔

آپ کے کلام بلاغت نظام سے سوائے چند اشعار کے زمانہ حاضرہ میں کچھ بھی نہیں باقی رہا مگر نثر میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ آپ کی تصنیف "چہار مقالہ" جس کا اصلی نام "مجمع النوادر" ہے انشاء فارسی کی بہترین تصنیف ہے، جو کہ ۵۵۲ھ میں لکھی گئی۔

ولادت ۵۰۰ھ سے قبل ہوئی سنہ وفات کے متعلق کوئی اندازہ نہیں بہر حال آپ ۵۵۲ھ تک ضرور زندہ تھے۔ کیونکہ چہار مقالہ کو ملوک غوریہ کے سلسلے ایک شہزادہ ابوالحسن حسام الدین علی کے نام پر تالیف کیا ہے۔ اور یہ زمانہ ملوک غوریہ کا تھا۔ ہمیں آپ کے سوانح حیات سوائے چہار مقالہ کے کہیں سے نہیں ملتے کیونکہ سارے تذکرہ نویسوں نے اپنی عادت کے موافق ایک دوسرے سے نقل کیا ہے لہٰذا ان کے حالات لکھنا بے سود ہے تاہم قارئین کے استفادے کے لئے چار تذکروں سے جو کہ نسبتہً قدیم ہیں مصنف کے حالات نقل کرتا ہوں۔

سب سے قدیم کتاب جس میں علامہ نظامی عروضی کے حالات ملتے ہیں وہ نور الدین محمد عوفی کی کتاب لباب الالباب ہے جو ۶۱۷ھ یعنی چہار مقالہ سے تقریباً سات سال بعد کی تصنیف ہے۔ عوفی لکھتے ہیں۔

"الاجل نظام الدین نظامی۔ عروضی سمرقندی۔ نظم نظامی عروضی کہ نقود وعروض طبع او نتیجہ کاں را تعبیر کند سلک درری است کہ عقد ثریا را تزییف دکمر جوزا را تحقیر کند اکثر شعر او مثنوی است واز متقدمان صنعت است از اشعار او آنچہ درخاطر بود تحریر افتاد۔"

لیکن افسوس کہ اس قرب عہد کے باوجود علامہ عوفی نے عبارت آرائی کے سوا کچھ روشنی نہیں ڈالی ہے۔ لب الالباب میں ایک اور مقام پر رودکی کے حال میں ان دو شعروں کو نظامی عروضی کی طرف منسوب کیا ہے۔

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی — ایں طعن کردن تو ز جہل است و کودکیست
کاں کس کہ شعر داند داند کہ در جہاں — صاحب قران شاعری استاد رودکیست

علامہ عوفی کے بعد حمداللہ مستوفی تاریخ گزیدہ میں جو ۷۳۰ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں۔

"نظامی عروضی معاصر نظامی گنجوی بود وکتاب مجمع النوادر (چہار مقالہ) از مصنفات اوست اشعار خوب دارد گویند سلطان ازو پرسید نظامی غیر از تو کیست؟ گفت

در جہاں سہ نظامیم اے شاہ — کہ جہانے زما بافغانند
من بود شاہ پیش تخت شہم — واں دو در مرد پیش سلطانند
بحقیقت کہ در سخن امروز — ہر یکے مفخر خراسانند
من تر ایم کہ شاں چو در یابم — ہر دو از کار خود فرومانند"

مگر مستوفی کا یہ خیال کہ نظامی عروضی نظامی گنجوی کے ہم عصر تھے بالکل غلط ہے کیونکہ چہار مقالہ کی جس حکایت سے مندرجہ بالا اشعار لئے

گئے ہیں خود اس بات کی تردید کرتی ہے۔

"ہمیدوں آں پادشاہ را دیدم کہ متغیر گشت و دراں حال روئے سوئے من کرد و گفت جز تو جائے نظامی ہمت گفتم بلے اے خداوند! دو نظامی دیگر اند۔ یکے سمرقندی است و او را نظامی منیری گویند و یکے نیشاپوری و او را نظامی اثیری گویند۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مندرجہ دو نظامی، نظامی گنجوی کے علاوہ ہیں۔ اس کے سوا جس وقت نظامی گنجوی کا دور شاعری شروع ہوتا ہے نظامی عروضی کا زمانہ اس وقت ختم ہوجاتا ہے۔ نظامی گنجوی کا سنہ ولادت ۵۳۵ھ ہے اور ان کی پہلی تصنیف "مخزن اسرار" ۵۷۲ھ میں شایع ہوتی ہے۔

مستوفی کے بعد دولت شاہ اپنے تذکرہ الشعراء جو ۸۹۲ھ کی تصنیف ہے مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتے ہیں۔

"ذکر مقبول الملوک نظامی عروضی سمرقندی مردے اہل فضل بودہ و طبعے لطیف داشتہ از جملہ شاگردان معزی است و در علم شعر ماہر بودہ۔ داستان ویس و رامین را نظم آوردہ و گویند کہ آں داستان را شیخ بزرگوار، نظامی گنجوی نظم کردہ قبل از خمسہ و کتاب چہار مقالہ از تصانیف نظامی عروضی است و آں نسخہ ایست بغایت مفید در آداب معاشرت و حکمت عملی و دانستن آئین خدمت ملوک وغیر ذالک و ایں بیت از داستان ویسہ و رامین کہ از نظم نظامی عروضی است آوردہ می شود تا وزن ابیات آں نسخہ معلوم گردد۔"

از اں خوانند آرش را کماں گیر کہ از آمل بہ مرو انداخت او تیر"

لیکن ارباب تذکرہ کا اتفاق اس بات پر ہے کہ تاریخ ویس و رامین فخر الدین اسعد گرگانی کی تصنیف ہے۔ نظامی عروضی کو اس سے کوئی تعلق نہیں دولت شاہ کے بعد امین احمد رازی تذکرہ ہفت اقلیم میں جو ۱۰۰۲ھ کی تالیف ہے لکھتے ہیں۔

"نظام الدین احمد بن علی العروضی از نیکو طبعان زمان خود بودہ دراں عصر نظمش نتیجہ کاں را تعبیر دادے و نثرش عقد ثریا را تحقیر نمودے و او در مثنوی از متقدمان صنعت است و چند تالیف دراں پرداختہ مجمع النوادر در چہار مقالہ در نثر از مصنفات اوست نور الدین محمد عوفی در تذکرہ خود و لے را در سلک شعرائے سلطان طغرل بن ارسلان سلجوقی نوشتہ اما در چہار مقالہ خود را از متبعان ملوک غور شمرد۔"

اب میں علامہ نظامی عروضی کے وہ حالات جو مولانا وجاہت حسین عندلیب شادانی رامپوری نے چہار مقالہ سے ہی انتخاب کرکے ترتیب دیئے ہیں درج ذیل کرتا ہوں۔

ولادت سنہ ۵۰۰ھ سے قبل ہوئی۔ سنہ ۵۰۶ھ میں اپنے وطن سمرقند ہی میں تھے اور وہیں کی شاعر کے متعلق دہقان ابو رجا سے بعض حالات انھیں معلوم ہوئے تھے۔

سنہ ۵۰۶ھ میں بلخ پہونچکر اپنے استاد عمر خیام کو ملتے ہیں اور اسی موقع پر حضرت عمر خیام نے ان سے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ میری قبر پر ہمیشہ گل افشانی ہوتی رہے گی۔

سنہ ۵۰۹ھ میں ہرات میں قیام پذیر تھے۔

سنہ ۵۱۰ھ میں ہرات سے روانہ ہوکر سلطان سنجر کے لشکر میں جا ملتے ہیں جو دشت تروق میں خیمہ زن تھا۔ وہاں سے ملک الشعراء امیر معزی کی خدمت میں پہونچتے ہیں۔ اپنے اشعار انھیں دکھلاتے ہیں اور بے روزگاری کی شکایت کرتے ہیں۔ امیر معزی انھیں تسلی دیتے ہیں اور اپنے حالات ان سے بیان کرتے ہیں۔

سنہ ۵۱۲ھ میں آپ نیشاپور گئے۔

سنہ ۵۱۴ھ میں امیر معزی نیشاپور میں ہی ان سے محمود اور فردوسی کے متعلق ایک حکایت بیان کرتے ہیں گویا اس چار پانچ سال کے دوران میں ان کا قیام نیشاپور میں ہی رہا۔

سنہ ۵۳۰ھ ہجری میں پھر نیشاپور پہونچتے ہیں اور حضرت عمر خیام کے مزار مبارک کی زیارت کرتے ہیں اور جو بیس سال پہلے حضرت عمر خیام نے ان سے اپنی قبر پر گل افشانی کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی اسے حرف بہ حرف صحیح پاتے ہیں۔

۵۴۷ھ میں جبکہ سلطان سنجر سلجوقی اور سلطان علاءالدین غوری کے درمیان صحرائے اوبہ (حدود ہرات) میں جنگ ہوئی تھی تو آپ بھی غوریوں کے لشکر میں موجود اور غوریوں کی شکست کے بعد سلطان سنجر کے خوف سے مدت دراز تک ہرات میں چھپے رہے۔

چہار مقالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیوۂ شاعری اور دبیری کے علاوہ فن طب و نجوم میں بھی پورے ماہر تھے۔ چنانچہ مقالہ سوم وچہارم کی آخری حکایتیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے۔

"۵۴۷ھ میں سلطان عالم سنجر بن ملک شاہ اور سلطان علاءالدین کے درمیان جنگ ہوئی تھی اور خداوند سلطان مشرق گرفتار ہوگیا اور خداوند زادہ ملک عالم شمس الدولہ بھی سپہ سالار کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اور پچاس ہزار دینار مقرر ہوئے۔ کہ اس کا آدمی بامیان کی طرف جائے اور اس مال کو حاصل کرے اور جب مال ہرات میں پہونچے تو خداوند زادہ کو آزاد کردیں۔ جب آدمی کو روانہ کئے ہوئے چند دن گذر گئے میں غلام (نظامی) اس حالت میں اس کی خدمت میں پہونچا۔ ایک دن بہت غمگین حالت میں ارشاد فرمایا کہ مشکل کب حل ہوگی اور یہ مال کب پہونچے گا۔ میں نے سیاروں کی بلندی معلوم کی اور طالع کھولا آخر کار بڑی سعی و کوشش کو عمل میں لایا۔ اس سوال کے حل پر نیر اروز دلالت کر رہا تھا میں دوسرے دن آیا اور کہا کہ کل نماز ظہر کے وقت پہونچیگا۔ وہ شاہزادہ تمام دن اسی فکر میں رہا۔ اگلے دن میں خدمت میں گیا اس نے کہا آج کا وعدہ ہے میں نے کہا ہاں اور نماز ظہر تک اس کی خدمت میں حاضر رہا جب نماز کے لئے اذان کی آواز کانوں میں آئی تو اس نے بے صبری کی وجہ سے کہا کہ نماز ظہر کا وقت آگیا اور کوئی خبر نہ پہونچی۔ وہ شہزادہ یہی کہہ رہا تھا کہ ایک قاصد آیا اور مژدہ سنایا کہ مال آپہونچا جو پچاس ہزار دینار بکریوں اور دوسری اشیا پر مشتمل تھا۔ اگلے روز شہزادہ نے بادشاہ عالم کا خلعت زیب تن کیا اور آزاد ہوگیا۔ اس مسرت کی بنا پر شہزادہ نے میرے منہ کو دو دفعہ سونے سے بھروایا۔"

—— اسی طرح آپ طب وحکمت کے بارے میں آخری مقالہ کی آخری حکایت میں رقمطراز ہیں۔

"۵۴۷ھ میں انہیں جنگ کے دنوں میں میں ہرات میں روپوش تھا۔ اسی دوران میں میں ایک رات ایک آزاد مرد کے یہاں فروکش ہوا جب ہم کھانا کھا چکے تو وہ میری اور ہی طریق سے عزت وحرمت کرنے لگا جیسے حاجتمند کرتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد میرے پاس آبیٹھا اور کہنے لگا کہ اے فلاں میری ایک لڑکی ہے اور اس کے سوا کوئی اولاد نہیں اور مال ونعمت موجود ہے اس لڑکی کو ایک بیماری ہے کہ ایام کے دنوں میں دس پندرہ من (طبیبوں کے نزدیک دو رطل یعنی ایک سیر وزن کو کہتے ہیں) خون اس سے خارج ہوتا ہے اور وہ بہت کمزور ہوجاتی ہے اگر خون کو بند کرتے ہیں تو پیٹ پھول جاتا ہے اور اگر کھول دیتے ہیں تو خون کا جریان شروع ہوتا ہے میں نے کہا اب جب یہ مرض ظاہر ہو تو مجھے خبر کرنا دس روز کے بعد بیمار کی والدہ آئی اور مجھ کو لے گئی میں نے لڑکی کو دیکھا جو کہ نہایت حسین لیکن زندگی سے مایوس تھی دفعتہً میرے پاؤں پر گر پڑی اور بولی کہ اے ابا میری فریاد رسی کر کیونکہ میں جوان ہوں اور ابھی دنیا کو نہیں دیکھا ہے میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور اس کو تسلی دی اس کی نبض کو دیکھا تو مضبوط پایا میں نے فصاد کو بلوایا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں سے رگ باسلیق (وہ رگ جو دل وجگر میں سے اٹھتی ہے) کو کھولدے اور عورتوں کو اس کے سامنے سے ہٹادیا اور گندا خون بہہ رہا تھا۔ بیمار کو بیہوشی لاحق ہوگئی۔ میں نے آگ جلوائی اور کباب بھوننے شروع کردیئے حتی کہ گھر کباب کے دھوئیں سے پر ہوگیا اور اس کے دماغ تک گیا جس سے وہ ہوش میں آگئی۔ ہلی اور رونے لگی پھر ایک شربت پیا اور میں نے اس کو اعتدال مزاج پر لانے م

م کے لئے ایک مفرح دوائی تیار کی اور ایک ہفتہ تک علاج کرتا رہا خون اپنی جگہ پر آگیا اور وہ مرض رفع ہوگیا اور معمولی عذر برقرار ہوگیا میں اسے فرزند کہہ کر پکارتا تھا اور وہ ✻

✻ باپ کہہ کر پکارتی اور آج تک مجھ سے دوسرے فرزندوں کی طرح محبت کرتی ہے

بکھرے ہوئے پھول

حضرت مولانا ماہر القادری

گلاب کا پھول گلقند بن جانے کے بعد میٹھا ہوتا ہے۔ مگر گلاب نہیں رہتا۔

اوس پتیوں کو نمناک بنا سکتی ہے مگر کلیوں کی پیاس نہیں بجھا سکتی۔

پیپل کے تنا ور درخت کے مقابلہ میں بنفشہ کی پنکھڑی کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔

غیرت کا احساس بہت نازک ہوتا ہے اسے بار بار ٹھیس نہ لگاؤ۔

بادشاہ کے دربار میں اس کمہار کی قدر ہوتی ہے جو خوشامد کے بہتر سے بہتر کھلونے بنا سکتا ہے۔

جو زبان شراب کی تلخی گوارا کر سکتی ہے وہ دہکتے ہوئے انگاروں کی لذت کی مستحق ہے۔

قمری کا طوق اس کی آزادی میں خلل انداز نہیں ہوتا۔

کنواری لڑکی کو جب پہلی مرتبہ محبت کا احساس ہوتا ہے تو اس کے جذبات کو پسینہ آجاتا ہے۔

مزدور کا کھولتا ہوا خون آگ کا طوفان ہے جو ٹاٹا کے آہنی شہتیروں اور فورڈ کی صبا رفتار موٹروں کو آن واحد میں غرق کر سکتا ہے۔

بچے کے استفسار کا ترشروئی سے جواب دوگے تو اس کی "قوت دریافت" مجروح ہو جائیگی۔

جو بچہ شعر و نغمہ سے رغبت رکھتا ہو اس کے کردار پر سختی کے ساتھ نگاہ رکھو۔

عورت کے آنسو سچے موتیوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ مگر یہ موتی اکثر خاک کی نذر ہو جاتے ہیں۔

اگر میرے سامنے اشرفیوں کی تھیلیاں اور دیوان غالب رکھے جائیں تو میں بے اختیار دیوان غالب اٹھالوں گا۔ وہ لوگ جو "عقل" پر بھینس کو ترجیح دیتے ہیں میرے اس انتخاب پر غالباً مسکرائینگے۔

عراق کے مرغزاروں کی قسم! کشمیر کے باغیچوں کی سوگند! میں تم کو نہیں بھولا کسی جگہ اور کسی حال میں نہیں بھولا۔ تم بھلا بھولنے کی چیز ہو۔ تمھاری ہر بات یاد ہے اور بالفرض محال تمھاری تمام باتوں کو بھول بھی جاؤں لیکن تمھارے ان جملوں کو تو میں قیامت تک نہیں بھول سکتا۔

"ماہر! تمھارا یہ شعر ورد زبان ہے۔

یہ کس نے نقاب رخ الٹ دی کلیوں کو بھی آگیا پسینہ

میرے شعر کو تمھاری زبان دہرائے اور بار بار دہرائے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں اور میرا شعر کس قدر کامیاب ہے۔

کچی کلیوں کے گجرے اور تمھاری نازک کلائیاں؟ آخر قیامت کب آئے گی؟ اور صور حشر کب پھونکا جائے گا؟ اس رنگین نظارے کے بعد سے اب تک میں اپنی نگاہوں کو مبارکباد دے رہا ہوں۔ میرا بس چلتا تو میں اپنی آنکھوں کو روز چوما کرتا۔

مزدور کا لڑکا گلی سے گاتا ہوا گذرا۔

"بالم آئے بسو مورے من میں"!

یہ "بالم" اور "من" کے مفہوم سے قطعاً نا آشنا ہے۔ مگر "لے" کے مزے لے رہا ہے دنیا کے لوگ بھی "حقیقت" کے ذہنی تصور سے اسی طرح خوش ہوتے ہیں۔

یورپ میں ایمان اور غیرت کے سوا ہر چیز مل سکتی ہے۔

جو انگلیاں کانٹوں کی نوک سے ڈرتی ہیں وہ پھول کی نرمی سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتیں۔

انگریز کے شیک ہینڈ کے جھٹکوں اور اس کے قہقہوں سے کبھی دھوکا نہ کھاؤ ــــ طوالت کا اندیشہ ہے ورنہ تاریخ کے بیشمار اوراق الٹ دیتا۔

ماہر القادری

مقالاتِ حسرت

از حضرت مولانا حسرت موہانی مدظلہٗ

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے
اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے

دل سے اربابِ وفا کا ہے بھلانا مشکل
ہم نے یہ اُن کے تغافل کو سنا رکھا ہے

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

سخت بے درد ہے تاثیرِ محبت کہ انھیں
بسترِ ناز پہ سوتے سے جگا رکھا ہے

آہ وہ یاد کہ اس یاد سے ہو کر مجبور
دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

حسن کو جور سے بیگانہ نہ سمجھو کہ اُسے
یہ سبق عشق نے پہلے ہی پڑھا رکھا ہے

تیری نسبت سے ستمگر ترے مایوسوں نے
داغِ حرماں کو بھی سینہ سے لگا رکھا ہے

نگہِ یار سے پیکانِ قضا کا مشتاق
دلِ مجبور نشانہ پہ کھلا رکھا ہے

اس کا انجام بھی کچھ سوچ لیا ہے حسرت
تو نے ربط اُن سے جو اس درجہ بڑھا رکھا ہے

کیپٹلائین وینس کا مجسمہ

از جناب محمد افتخار الدین صاحب وامق بی-اے (کامرس)

پہلا سین!

روم میں ایک آرٹسٹ کا سٹوڈیو

"آہ! جارج، تم نہیں جانتے مجھے تم سے کس قدر محبت ہے!"

"خدا تمھاری محبت میں برکت دے۔ میری! میں جانتا ہوں۔ لیکن تمھارا والد بھی تو سنگدل ہے۔"

"یہ مت کہو جارج! اس کا نظریہ بہترین ہے۔ اس کے نزدیک آرٹ محض تضیع اوقات ہے۔ وہ صرف بیوپار جانتا ہے، اس کا خیال ہے کہ تمھارے یہاں فاقہ کشی میرا روز کا معمول ہو جائیگا۔"

"اس کی عقل پر ہزار لعنت۔ ایسی عقل اعلیٰ و ارفع تخیلات کی دشمن ہے، میں ایک روپیہ کمانے والی بے دماغ مشین نہیں۔ بلکہ عرفانی خیالات کا آئینہ دار مجسمہ تراش ہوں جس کے پاس کھانے کیلئے بھی کچھ نہیں۔"

"مایوسی کو اس سلسلے میں دخل انداز نہ ہونے دو۔ اس کی تنگ نظری خود بخود مر جائیگی جبکہ تم پچاس ہزار ڈا.....؟"

"پچاس ہزار شیطان ــــ! میری جان ابھی تک میں نے اس فلیٹ کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا۔"

دوسرا سین

روم میں ایک عالیشان محل کا ایک کمرہ

"حضرت! اس موضوع پر کسی قسم کی گفتگو بالکل لاحاصل ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن میں اپنی بیٹی کو۔ محبت۔ آرٹ، اور فاقہ کشی کے معجون مرکب سے شادی کی اجازت دینے کے لئے رضامند نہیں میرا خیال ہے کہ آپ اس کے سوا اور کچھ پیش نہیں کر سکتے۔"

"جناب! یہ سچ ہے کہ میں غریب ہوں، لیکن کیا شہرت کوئی چیز نہیں؟ آنریبل بلی فورڈل آف ارکنا سس کا خیال ہے کہ میرا "امریکہ" کا مجسمہ فن سنگتراشی کا بہترین نمونہ ہے اور وہ مطمئن ہیں کہ ایک دن میری شہرت چار دانگ عالم میں ہوگی۔"

"ہش، وہ ارکنا سس کا گدھا کیا جانتا ہے۔ شہرت لا[illegible] چیز ہے تمھارے زاغ نما مجسمہ کی بازاری قیمت صرف اس پر ایک نظر ہے۔ تم نے اس کی تراش پر چھ ماہ ضایع کئے۔ لیکن تم اسے ایک سو ڈالر سے زیادہ قیمت پر فروخت نہیں کر سکتے۔ نہیں جناب! مجھے پچاس ہزار ڈالر دکھلا دیجئے پھر میری بیٹی سے شادی کر سکتے ورنہ وہ سنر سمپر سے شادی کریگی۔ روپیہ کمانے کے لئے آپ کو چھ ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ صبح بخیر۔"

"آہ! مفلسی!۔"

تیسرا سین

سٹڈیو میں

"آہ! میرے بچپن کے دوست جان! میں دنیا میں سب سے بدقسمت آدمی ہوں۔"

"تم نرے کاٹھ کے الو بھی ہو۔"

"میں اب سوائے اپنے مجسمے کے کس سے محبت کر سکتا ہوں۔ اور دیکھو مجسمے کے سنگ مرمر کے ٹھنڈے دل کو بھی مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں آہ کس قدر خوبصورت اور کتنا سنگدل!"

"تم ــ تم ــ بالکل بودم بے دال ہو۔"

"جان! ـــ"

"بکومت، کیا تم نہ کہتے تھے کہ تمہیں روپیہ جمع کرنے کے لئے چھ ماہ کی مہلت ملی ہے؟"

"مجھے آلام کے مزید غاروں میں مت کھینچو۔ جان! اگر مجھے چھ صدیوں کی بھی مہلت ملتی تب بھی میں کچھ نہ کر سکتا۔ ایک قلاش، بے سرمایہ، بلا شہرت بے یار و مددگار کیا کر سکتا تھا؟"

"واہیات، بزدل، بچے، روپیہ جمع کرنے کیلئے چھ ماہ کی مدت ــ چار ماہ کافی سے زیادہ ہیں"

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے"

"سب چیز مجھ پر چھوڑ دو۔ میں تمہارے لئے روپیہ جمع کرونگا"

"تمہارا کیا مقصد ہے جان، تم اس قدر روپیہ میرے لئے کس طرح جمع کر سکتے ہو؟"

"کیا تم سب باتیں مجھ پر نہ چھوڑ دو گے؟ میں کہتا ہوں، تم اس معاملے میں دخل مت دو۔ کیا تم قسم کھاتے ہو کہ تم میرے معاملات میں نہ دخل دو گے؟ کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ تم میرے افعال پر نکتہ چینی نہ کرو گے"

"میں عجب کشمکش میں ہوں۔ پریشان۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں"

جان ایک ہتھوڑا اٹھا کر "امریکہ" کی ناک آہستگی سے اُڑا دیتا ہے۔ ایک اور چوٹ، اُس کی دو انگلیاں بھی زمین پر آ گرتی ہیں۔ ایک اور، کان کا بھی صفایا ہو گیا۔ مجسمہ کے پاؤں میں بھی خراش آ گئی۔ ایک ٹانگ گھٹنے سے اتر گئی۔

جان ہیٹ پہن کر جاتا ہے۔ جارج مجسمے کو دیکھتا ہے جو کہ دو منٹ پہلے آرٹ کا بہترین نمونہ تھا۔ وہ متذبذب ہو کر ایک صوفے پر لیٹ جاتا ہے۔ جان آہستہ آہستہ سیٹی بجاتا ہوا داخل ہوتا ہے۔

"جارج! اٹھو، نیچے چھکڑا کھڑا ہے اسے اٹھانے میں مجھے مدد دو"

(دونوں جاتے ہیں)۔

چوتھا سین

سٹڈیو

"چھ ماہ کے اختتام میں اب صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔ آہ، افسوس، میری زندگی تباہ ہو گئی۔ کاش کہ موت مجھے قبر میں آرام کی اجازت دیدے۔ کل ہات مجھے کھانا نہ ملا۔ آج صبح کو چائے بھی نصیب نہ ہوئی۔ میں کسی ہوٹل میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بھوک، اس کا ذکر فضول ہے۔ موچی مجھے قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ حجام اُسترے سے میرا گلا کاٹنے پر تلا ہوا ہے۔ درزی اور دھوبی مجھے بازار میں برہنہ کر دینے پر آمادہ ہیں۔ اُس دن سے آج تک میں نے جان کو بھی نہیں دیکھا۔ جب وہ کسی تفریح گاہ میں مجھے ملتی ہے تو میری جانب دیکھتی ہے۔ مسکرا دیتی ہے مگر اس کا ہاتھی نما باپ اس کو دوسری جانب دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہیں دروازہ کون کھٹکھٹاتا ہے۔ شاید یہ وہی بدمعاش موچی ہے ــ کون ہے اندر آ جاؤ"

"عالی جاہ! خدا کرے کہ مسرت آپ کی دائمی رفیق رہے۔ آسمانی بادشاہت حضرت تقدس مآب پر ہمیشہ رحمت کے پھول برسایا کرے۔ میں حضور اقدس کے لئے نیا بوٹوں کا جوڑا لایا ہوں۔ قیمت کے متعلق چنداں خیال نہ کیجئے۔ کوئی جلدی نہیں۔ مجھے اس بات پر فخر ہوگا اگر جناب ہمیشہ مجھے اپنی عنایات سے اسی طرح سرفراز کیا کریں۔ تسلیم"

"بوٹوں کا جوڑا خود بخود لے آیا۔ قیمت کے لئے کوئی تقاضا نہیں آتے اور جاتے جھک گیا۔ یہ شاہانہ عزت میرے لئے۔ میری مزید عنایات کا امیدوار کیا دنیا اپنے انجام کو پہونچ گئی، کون ہے، اندر آ جاؤ"

"معافی کا خواستگار ہوں حضور اعلیٰ، یہ سوٹ میں نے آپ کے لئے رات بھر میں تیار کیا ہے جو کہ نوابوں ہی کے شایان شان ہے۔ اس سے بہتر سوٹ سارے روم میں کوئی بھی تیار نہیں کر سکتا"

"کون ہے اندر آ جاؤ"

"بغیر اجازت داخلے کے لئے ہزار بار معافی کا خواستگار ہوں جناب عالی میں نے پہلے فرش پر حضور کی رہائش کے لئے موزوں کمرے فرنیچر سے آراستہ کر دیئے ہیں۔ یہ غار جناب کے لئے کبھی موزوں نہیں"

"کون ہے اندر آ جاؤ"

"میں عالیجاہ کی خدمت میں یہ عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کا حساب متعدد بار اپنی پستی کی حالت پر پہونچ گیا تھا لیکن اب آپ کا اکاؤنٹ بالکل صاف ہے۔ ہمارے لئے یہ بات باعث مسرت ہوگی اگر حضور گاہے بگاہے جس رقم کا بھی چیک ......"

"کون ہے اندر آ جاؤ"

"میرے ہونہار بیٹے۔ وہ تمہاری ہے۔ وہ ابھی ایک لمحہ میں حاضر خدمت ہو جائیگی۔ اس سے محبت کیجئے۔ شادی کیجئے۔ خدا کرے کہ آپ دونوں کی زندگی دائمی، ہپ، ہپ، ہر.....،"

"کون ہے اندر آجاؤ"

"اوہ جارج! میرے پیارے جارج! ہم دونوں بچ گئے"

"اوہ، میری، ہم بچ گئے۔ لیکن میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں اب تک بیخبر ہوں کہ یہ کیوں اور کس طرح ہوا؟"

پانچواں سین

روم میں امریکن کلب کا ایک کمرہ

چند امریکن بیٹھے ہیں اور روم کے مختلف اخبارات سے ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اٹھکر پڑھتا ہے۔

"ایک عجیب و غریب دریافت :- کوئی چھ ماہ کا عرصہ ہوا کہ ایک امریکن مسمی جان سمتھ نے جو کہ اب روم میں مستقل سکونت اختیار کر چکے ہیں ایک ٹکڑہ زمین کمپانگنا میں خریدا یہ جگہ سیکتو خاندان کے مقبوضہ کے عین نیچے واقع ہے۔ یہ ٹکڑہ شہزادی برگیس [illegible] ایک دیوالیہ رشتہ دار کی ملکیت تھا۔ مسٹر سمتھ نے بعد ازاں وزیر ریکارڈ کے دفتر میں جاکر یہ ٹکڑا ایک غریب امریکن آرٹسٹ جارج ارنلڈ کے نام منتقل کر دیا اور بیان دیا کہ یہ انتقال اس نقصان کی تلافی ہے جو کہ مسٹر سمتھ نے کچھ عرصہ ہوا اتفاقیہ طور پر مسٹر ارنلڈ کے سامان کو پہونچایا اور مزید کہا کہ وہ اس زمین کو درست اور ہموار کرنے کے اخراجات بھی خود برداشت کرینگے تاکہ کماحقہ تلافی ہو سکے۔ جاننے ہوئے جب کہ ایک جگہ ضروری طور پر زمین کو کھودا جارہا تھا تو انہیں رومن آرٹ کا بہترین نمونہ ایک مجسمہ ملا۔ یہ ایک عورت کا مجسمہ ہے۔ گو دنیا کے انقلابات نے اس کو کافی نقصان پہونچایا ہے لیکن اب بھی کوئی شخص اس پر ایک نظر ڈالکر آسانی سے ہٹا نہیں سکتا۔ گو ایک ٹانگ، ایک کان اور دو انگلیاں ٹوٹ چکی تھیں لیکن ابھی یہ چیز یادگار کے طور پر رکھنے کے قابل ہے۔ گورنمنٹ نے اسی وقت اس مجسمے کو بحق ملک معظم ضبط کر لیا۔ اور اس کی قیمت اور آرٹ کا اندازہ کرنے کے لئے مجسمہ تراشوں، امرا حکومت اور پادریوں کی ایک کمیٹی تشکیل کی تاکہ زمین کے مالک کو اس مجسمہ کی قیمت ادا کر دی جائے۔ یہ تمام واقعات کل رات تک بالکل صیغۂ راز میں رکھے گئے۔ اس اثنا میں کمیٹی بالکل بند دروازے کے کمرے میں بحث کرتی رہی۔ کل رات متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ یہ مجسمہ وینس کا تھا۔ اور یہ کسی نامعلوم مجسمہ تراش کا بہترین شاہکار تھا جسے آرٹ بطور خدائی عطیہ کے ملا تھا خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مجسمہ آج سے ۲۲ سو سال پیشتر کا ہے اور دنیا "وینس دیوی" کا اس سے بہتر مجسمہ آج تک پیش نہ کر سکی۔ کل رات کمیٹی کی ایک آخری نشست ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ اس کی قیمت دس ملین (ایک کروڑ) فرانک ہے رومن قانون کے مطابق کیا گیا کہ گراونڈ سے برآمد شدہ چیزوں میں نصف کی مالک گورنمنٹ ہے اور چونکہ گورنمنٹ اس مجسمہ کو کیپٹل میں نصب کرنا چاہتی ہے لہذا مسٹر جارج ارنلڈ پانچ ملین فرانک وصول کر کے مجسمہ سے دستبردار ہو جائینگے۔ اس فیصلے کے ماتحت ہز ہولی نس دی پوپ کے حکم سے کمیٹی مسٹر جارج ارنلڈ کو آج دوپہر کو ۵ ملین کی رقم سونے کی صورت میں ادا کر دیگی"

سب :- "یہ سب قسمت ہے"

ایک آواز "معززین! میرا خیال ہے کہ ہم ایک متحدہ سرمایہ کی کمپنی کھولیں جو کہ اس زمین سے مجسموں کو برآمد کرے اور اس کا تعلق وال سٹریٹ (لندن) کی حصص کی مارکیٹ سے ہو۔

سب "بہت بہتر"

چھٹا سین

کیپٹل مجسمے کے بت کے قریب

"عزیز ترین میری! یہ دنیا کا سب سے بہترین مجسمہ ہے اسکو کیپیٹالائن وینس کا نام دیا گیا ہے اسکی بابت تم نے بہت کچھ سنا ہے یہ اب اصلاح شدہ مجسمہ ہے جسے روم کے بہترین مجسمہ تراشوں نے نہایت محنت سے تیار کیا ہے اور اپنے ناموں کو زندہ جاوید کیا ہے یہ جگہ کس قدر عجب معلوم ہوتی ہے آج سے دس سال پیشتر جبکہ میں اس جگہ پر کھڑا تھا خدا تمہیں برکت دے میں امیر آدمی نہ تھا۔ میری جیب میں ایک سنٹ بھی نہ تھا لیکن پھر بھی اس عظیم الشان آرٹ کو اس قدر اہمیت دینے والا میں ہی ہوں جس کا آج سب روم مداح ہو رہا ہے۔"

"یہ قابل پرستش کیپیٹالائن وینس۔ اسکی قیمت کیا ہے دس ملین فرانک"

"ہاں، اب اس کی یہی قیمت ہے؟"

"آہ جارج! یہ کس قدر خوبصورت ہے؟"

"ہاں! لیکن اس قدر خوبصورت نہیں جس قدر پہلے تھی اس سے پیشتر کہ جان سمتھ کے مبارک ہاتھوں نے اسکی ٹانگ اور ناک کو توڑا دنیا کا عقلمند ترین انسان سمتھ، شریف ترین، معزز ترین سمتھ لیکن سنو یہ کون کھانس رہا ہے۔ میری اگر شا کو کالی کھانسی ہو گئی ہے خدا جانے تمہیں بچوں کی پرورش کا سلیقہ کب آئیگا؟"۔

محمد افتخار الدین بی اے

کیفِ غم

شعلۂ شوقِ حسن زا نہ رہا
رہنما بھی تو رہنما نہ رہا

دل تو سینے میں ہے مگر بے کیف
مایۂ زندگی جو تھا نہ رہا

چھا گئی کچھ فسردگی ایسی
درد بھی زور آزما نہ رہا

حاصلِ عمر تھا جو لمحۂ زیست
نہ رہا وہ گریز پا نہ رہا

یوں تو پہلو تہی نہیں لیکن
وہ دلِ لذت آشنا نہ رہا

ہے کوئی انتہائے محرومی
نشترِ غم بھی دلکشا نہ رہا

انتظارِ اجل میں جیتا ہوں
اور اب کوئی آسرا نہ رہا

مرحبا دل نوازئ احباب
گلۂ عمرِ بے وفا نہ رہا

کب ہوئی فکرِ چارہ فرمائی
درد جب لائقِ دوا نہ رہا

کھو گیا لطفِ التفات میں دل
ہوشِ اظہارِ مدعا نہ رہا

جذبِ دل کام آ گیا کوکب
شکوۂ پائے نارسا نہ رہا

حوصلہ، جوش، ولولہ نہ رہا
دل تو ہے دل کا قافلہ نہ رہا

رہ گئی ہے بس اک اجل باقی
اور اب کوئی مرحلہ نہ رہا

ہر قدم پر بدل گئے دو چار
ہمسفر کوئی آبلہ نہ رہا

مضمحل ہو چلی ہے موجِ نفس
استوار اب یہ سلسلہ نہ رہا

چار دن میں وہ لطف اٹھائے ہیں
اور جینے کا حوصلہ نہ رہا

اللہ اللہ ہجومِ رنج و الم
بھاگنے کا بھی راستہ نہ رہا

دوستوں نے وہ مہربانی کی
دشمنوں سے کوئی گلہ نہ رہا

جب سے بستی اجڑ گئی دل کی
رات دن کا وہ مشغلہ نہ رہا

جان پر آ گئی ہے الفت میں
اب یہ دل کا معاملہ نہ رہا

پھر وہ کیوں مجھکو یاد آتے ہیں
مجھ سے جب کوئی واسطہ نہ رہا

چھا گئی دل پہ بیخودی کوکب
آرزو کا وہ ہمہمہ نہ رہا

کوکب شاہجہانپوری

اردو زبان اور انگریزی الفاظ

از جناب جبّار اختر صاحب

اُردو کی تخلیق ہی دو زبانوں کی آمیزش سے ہوئی۔ پھر اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی صلاحیت کیوں نہ ہوتی۔ اُردو حقیقتہً بھاشا اور فارسی کے مرکب کا نام ہے اور چونکہ بھاشا اور فارسی، سنسکرت اور عربی سے متاثر ہیں۔ اس لئے اُردو کو بھی ان دونوں کا ممنون ہونا پڑا۔ سوائے چند زبانوں کے جو دنیا کی ابتدائی زبانیں کہی جا سکتی ہیں اور جو فی زمانہ اگر معدوم نہیں تو کم از کم مجہول و متروک ضرور ہو چکی ہیں دنیا کی تمام زبانیں اس قسم کی آمیزش کی کم و بیش حامل ہیں اور ان کے دامنوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ عربی سنسکرت، یونانی، عبرانی اور لاطینی زبانوں کو لے لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کو دنیا کی قدیم زبانوں کا درجہ حاصل ہے اور سوائے عربی اور یونانی کے جو دو ملکوں سے متعلق ہیں اور دو قوموں کی زبانیں ہیں اور اسی لئے اب تک زندہ ہیں باقی زبانیں قریب قریب فنا ہو چکی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی تنگ نظری اور کوتاہ دامانی ان کی فنا کا باعث ہوئی تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

دور کیوں جایئے، صرف سنسکرت ہی کو دیکھ لیجئے۔ اگر یہ صرف برہمنوں کی زبانوں تک محدود نہ ہو جاتی اور اپنے دامن لغات پر جدید الفاظ کو بدنما داغ نہ سمجھتی تو آج اس کو اس طرح فنا نہ ہونا پڑتا۔ اور آج جو زبان ہندوستان کے طول و عرض میں رائج ہوتی بہت ممکن ہے کہ اس کا نام سنسکرت ہی ہوتا۔ خواہ اس میں قدیم سنسکرت کا ایک لفظ بھی باقی نہ رہتا۔ یہاں بادی النظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قدیم الفاظ ہی نہ رہ جائیں تو صرف زبان کے نام سے اس کا قیام کہاں تک سمجھنا چاہیئے؟ اور کیوں؟ لیکن حقیقتہً یہ تنگ نظری ہے۔ زبان کا وجود صرف اس کے نام پر منحصر ہے۔ قدیم الفاظ کا متروک ہونا۔ اور فصیح و جدید الفاظ کا رائج ہونا اس کی فنا کا مترادف نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تبدیلیاں ناگزیر ہے اور انہیں سے زبان کی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

دنیا ابتدائے آفرینش سے اب تک اور قیامت تک ایجاد و اختراع کا گہوارہ بنی رہی ہے اور بنی رہیگی۔ سائنس کی روز افزوں ترقی کے زیر اثر آج جو چیزیں موجود ہیں وہ کل تک خواب و خیال میں بھی نہ تھیں لہذا آج ان کے اظہار کے لئے ہمیں اپنی زبان میں الفاظ کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ یہ اضافہ دو صورتوں میں ہوتا ہے۔ اول تو ایجاد شدہ چیز کی نوعیت اور زبان کے موجودہ لغات کی مناسبت کو مد نظر رکھتے ہوئے مثلاً الیکٹرک لائٹ (Electric light) کے لئے روشنی کی تیزی اور خاصیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو بجلی کی روشنی کہا گیا۔ دوسرے یہ کہ جس ملک کی ایجاد ہو اس ملک کی زبان کا قبول کر لیا۔ لیکن اس میں بھی فصاحت کے اصول کو نظر انداز نہیں ہونے دیا گیا۔ اگر غیر زبان کا لفظ ثقیل نہ ہو اور کانوں کو ناگوار نہ معلوم ہو تو اس کو بجنسہٖ لے لیا۔ مثلاً گلاس۔ اسٹیشن۔ انجن۔ بٹن۔ کاپی۔ وغیرہ ورنہ اس کے تلفظ میں تغیر و تبدل کر کے اس کو مانوس کر لیا ہے جیسے گوڈاؤن Godoon سے گودام یا سپٹمبر September سے ستمبر وغیرہ۔

اور اگر تبدیلی کے باوجود تلفظ میں اجنبیت باقی رہنے کا اندیشہ رہتا ہے تو اکثر ترجمہ کر لیتے ہیں مثلاً ایرشپ Air ship سے ہوائی جہاز۔ یا وائر wire یا ٹیلیگرام Telegram سے تار، وائرلیس wireless سے لاسلکی وغیرہ۔

مندرجہ بالا امکانات ایسے ہیں جن سے ہر ایک زبان کو زندہ رہنے کے لئے ایک دوسرے سے خلط ملط کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اردو اور انگریزی سے تعلقات ان امکانات سے بھی متجاوز اور بالاتر ہیں۔ حکومت و سیاست۔ تجارت و معاشرت اور ربط و ضبط کے ماتحت انگریزی اور اردو ایک دوسرے سے بہت متاثر ہوئی ہیں کہ دونوں زبانوں میں اپنی اپنی زبانوں کے الفاظ ہوتے

ہوئے بھی انھیں مفہوم کے لئے دوسری زبان کے الفاظ بھی رائج ہیں مثلاً انگریزی میں فارسٹ [illegible] کے ہوتے ہوئے بھی جنگل استعمال ہوتا ہے۔ پرے [illegible] کے باوجود شکار رائج ہے۔ اور رابر Robber کی موجودگی میں ٹھگ اور ڈکیت کو جگہ ملتی ہے۔ جب انگریزی حاکموں کی زبان ہوتے ہوئے خود کو اس آمیزش سے پاک نہ رکھ سکی تو اردو اس سے کس طرح بچ سکتی تھی جبکہ وہ محکوموں کی زبان ہے۔

اردو میں آج جو انگریزی الفاظ رائج ہیں وہ ہماری تحریروں میں تو کم لیکن روزمرہ کی گفتگو میں بہت زیادہ ہیں جن کو خواہ غیر مستند سمجھا جائے یا انگریزی داں اصحاب کی اپج، لیکن یہ کہنا یقیناً انصاف سے بعید نہ ہوگا کہ وہ اردو زبان میں شامل ضرور ہیں۔ انگریزی الفاظ کا اردو سے یہ اشتراک کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ یہ آمیزش ایک عرصہ سے چلی آ رہی ہے اور نواب سعادت علی خاں کے عہد حکومت میں بھی یہ خلط ملط جاری تھا۔ اس زمانہ کی روزمرہ کی گفتگو میں اس آمیزش کی جو نسبت بھی رہی ہو اس کا ہم صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لیکن جس مستند طریقے پر اہل زبان اور اہل قلم حضرات نے اردو میں انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

گلاس Glass اور بوتل Boottle

اپنے گیلاس شگوفے بھی کرینگے حاضر ۔۔۔ آکے جب غنچۂ گل کھولینگے بوتل کے دہن

آرگن۔ Orgein

کھینچکر تار رگ ابر بہاری سے گیا ۔۔۔ خود نسیم سحر آ بیٹھی بجانے ارگن

اردلی Orderly اور بگل Bugle

اردلی کے جو گرانڈیل ہیں سب ہونگے جمع ۔۔۔ ان کے اپنا بگل پھونکے گا جب سکھ درمن

حاضری اور ٹفن۔

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ اک بسکا ۔۔۔ حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن

بگھی Boggy

بگھیاں پھولوں کی تیار کرائے بوئے سمن ۔۔۔ کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن

پوڈر Powder

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنی پوڈر ۔۔۔ کرسی ناز پہ جلوے کی دکھائیگا پھبن

کوچ Couch

نسترن بھی نئی صورت کا دکھائیگا رنگ ۔۔۔ کوچ پر نازکے جب پاؤں کھینچیگا بن ٹھن

یہ تفریح طبع کے لئے غزل کے اشعار نہیں ہیں بلکہ ایک قصیدہ کے چند اشعار ہیں جس میں شاعر پر پوری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

صرف انشا ہی پر منحصر نہیں دیکھئے مرزا غالبؔ کے شاگرد اور ہمعصر سرکش دہلوی لکھتے ہیں۔

برانڈی Burgundy.

کوئی بوتل اچھی سی لادے مجھے ۔۔۔ اگر ہو برانڈی پلا دے مجھے

حالی جیسا سلیس گو اور مصلح شاعر کہتا ہے ؎

کونسل Council

حکم سے میری ہوئی کونسلوں کی معزولی ۔۔۔ رائے سے میری بنیں سلطنتیں جمہوری

امیر مینائی لکھنوی کے ایک قصیدہ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کورٹ Court

آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا ۔۔۔ کرلیا تازہ مضامیں کا علاقہ کورٹ

رپٹ Report

کون وہ کلب علیخان بہادر جم جاہ ۔۔۔ دیتے ہیں جس کو ملک عالم بالا کی رپٹ

پرمٹ Permit

دم بخشش اسے درکار ہیں ڈھیروں موتی ۔۔۔ کھونیساں سے کہ بحرین کا کھلے پرمٹ

گزٹ۔ Gazette

سب رئیسوں سے سبقت ہے تری بالا ۔۔۔ معتبر جیسے ہے اخبار میں اخبار گزٹ

گورنر جنرل۔ Governor General

خلعت خاص پنہانے کو ترے آقا کے ۔۔۔ آج کلکتہ سے آئے ہیں گورنر جنرل

— ڈاکٹر نذیر احمد جیسے سلیس نگار ادیب کا اثر خامہ ملاحظہ فرمایئے۔

کوئن Queen

کوئن زندہ سلامت بخیر و با اقبال ۔۔۔ یہی دعا ہے خدا سے ہماری آٹھ پہر

ڈاکٹر Doctor.

جہان دیکھے ہوئے ڈاکٹر گروہ گروہ ۔۔۔ یہ کرکے چھوڑینگے طاعون کو نئی دن میں

پلیگ۔ Plaque

پلیگ آتے تو آئی پر اس نے کیا دیکھا
کہ اس کی دفع کی خاطر ہے مستعد لشکر

اس کے علاوہ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی مرحوم نے جس بے تکلفی

فراخدلی اور فراوانی سے انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں وہ اپنی آپ مثال ہیں لیکن چونکہ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مزاحیہ پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں لہٰذا اس موقعہ پر ہم اس کے بیان سے احتراز کرتے ہیں لیکن اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ اکثر انگریزی الفاظ ان کے یہاں ایسے ہیں جن کا استعمال ناگزیر ہے - بہرحال اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اشعار کا نمونہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مندرجہ بالا مثالیں دلیل کے استحکام کے لئے کافی سے زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔

جبار اختر،

ادب لطیف؟

میری روحانی زندگی کی یاد

آہ!... یاد ایام کہ تھی قید بدن سے آزاد ... ہائے وہ روح پرور زمانہ یاد آتا ہے جب میری تخلیق باغ ارم کے سرسبز و شاداب گلستان میں ہوتی تھی ... تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہوں۔ پیارے وطن، تیری یاد دلوں کو تڑپاتی ہے۔ آہ!... کیا زمانہ تھا.. کیا بہار تھی۔ میں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گرد و پیش وہ روحانی اور حقیقی منظر دیکھے۔ جن کی یاد اب نشتر بن کر دل میں کھٹکتی ہے... ہائے وہ خلد بریں کی فضائے رنگیں.... میرا معصومیت کے جھولوں میں جھولنا... ملائے اعلیٰ کا مجھے نغمۂ توحید کی لوریاں سنا سنا کر مسرور کرنا، یہ سب جب یاد آتا ہے.... میرے دل پر مردنی چھا جاتی ہے۔

ہائے!... میری زندگی کیسی دلفریب تھی؛ کیسی پاکیزہ تھی، جس پر فرشتوں کو رشک آتا۔ آٹھوں بہشت میرے زیر نگیں تھے... میں رنج و غم سے آزاد۔ فکر و تردد سے بے نیاز.... فردوس بریں کی عنبریں ہواؤں میں گلگشت کیا کرتی۔ سدرہ کی مقدس ٹہنیوں پر میرا آشیانہ تھا اور طوبیٰ کی سرسبز شاخوں پر میرا بسیرا... خلد بریں کی ساری بہاریں میرے لئے وقف تھیں۔ باغ جنت کے خوشگوار میوے میری خوراک تھے اور کوثر و تسنیم کے چشمے مجھے سیراب کرنے کو موجود تھے، میں توحید کے نغمے گاتی۔ تقدیس کے راگ الاپتی، ہنستی، کھلکھلاتی صداقت کے پھولوں سے کھیلتی پھرتی تھی، نہ صیاد کا خوف تھا نہ گلچیں کا کھٹکا!

آہ! میں اس بےخبری کی حالت میں تھی، مجھے نہ معلوم تھا کہ میرے عیش کا زمانہ ختم ہونے والا ہے.... میں نہ جانتی تھی کہ میرا حقیقی چین جلد چھینا جائیگا؟.... آہ انقلاب زمانہ مجھکو میرے پیارے وطن سے جدا کر دیگا۔ غرض مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک دن مجھے پکڑ کر عناصر کے پنجرے میں قید کر دیا گیا.. اور ساتھ ہی مجھے جلا وطن کر دینے کا حکم آگیا۔

قید ہوتے وقت میں بہت روئی چلائی۔ پھڑ پھڑائی لیکن حاکم اعلیٰ کے حکم کے سامنے کچھ پیش نہ چلی۔ افسوس مجھے ایک دور دراز ملک میں جس کو دنیا کہتے ہیں بھیج دیا گیا۔ اگرچہ میرے بہلانے کے یہاں بہت کچھ سامان تھے جس نے ایک حد تک مجھے اپنے وطن کی یاد سے بیگانہ بنا دینے کی کوشش کی لیکن نظر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ہر طرف دھوکا ہی دھوکا ہے۔ یہاں کے سبزہ زاروں میں کذب و افترا کے سانپ بچھو چھپے بیٹھے ہیں۔ جن کے ڈس لینے کا ہر وقت خطرہ۔ یہاں کے چشمے گدلے، یہاں کا پانی تلخ۔ یہاں کے پھولوں کی رنگت دلفریب لیکن خوشبو ناگوار، روح پرور ہواؤں کے بدلے روح فرسا باد سموم کے جھونکے آتے ہیں جو ایک دم سے جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ آلام کی کالی گھٹائیں چاروں طرف گھری ہیں۔ ادبار کی بارشیں ہو رہی ہیں جن سے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں۔ اُف! اُف! خلد بریں کے ساکن کو یہ سخت سزا۔ فردوس کی پروردہ کے لئے یہ محبس خانہ... لیکن مالک کے حکم سے کیا چارہ؟ ..... نہیں معلوم کب رہائی کا حکم صادر ہوتا ہے..... معلوم نہیں اس قید عناصر سے کب چھٹکارا ہو، اور یہ قفس کب ٹوٹ کر مجھے آزاد کرے ہائے! پنجرے کی قید نے پر و بال کو بیکار کر دیا۔ لیکن آرزو ہے کہ اس قید سے چھوٹ کر میں پھر اسی سرسبز وادی کی طرف پرواز کر جاؤں۔ آہ،

یاد ایام کہ تھی قید بدن سے آزاد   روح میری کہ ہے اب مورد آلام و ہموم
آشیانہ تھا ہمارا خس و خاشاک سے پاک   راہ پاتی تھی وہاں تک نہ کدورت نہ سموم

(سیدہ نواب بیگم منشی فاضل)

بادۂ عرفان!

از جناب سید جلال الدین صاحب حیدر دہلوی

دل مست، فضا مست، صبا مست، نظر مست
سب لطف ہے ساقی کے یکے بعد دگر مست

گلشن میں بہار آتے ہی میخواروں کی بن آئی
رقصیدہ و لغزیدہ اِدھر مست اُدھر مست

کیا بات ہے ساقی ترے الطاف و کرم کی
مستی میں بھی رکھتے ہیں تجھے پیشِ نظر مست

اللہ رے جوانی کا دلآویز زمانہ
ہر چند کہ تاریک ہے یہ رات، مگر مست

لبریز ہو پیمانۂ ہستی کہ چھلک جائے
کروٹ کبھی بدلی ہے نہ بدلیں ترے سرمست

گر حسنِ بتاں طالبِ دل جاں طلب ایماں
بتخانے کی شب مست ہے کعبے کی سحر مست

رفتار تری، مے کا برستا ہوا بادل
جس راہ سے تو گذرے وہی راہگذر مست

سر پائے خمِ مے سے ہٹائے نہ ہٹے گا
اس باب میں غافل نہیں ہشیار ہیں ہر مست

آفاتِ زمانہ کا سرِ میکدہ کیا کام؟
ہم ہوش سے بیگانہ یہ بدمست وہ سرمست

ہم تلخیٔ الفت کو نہ سمجھے کبھی "تلخی"
تم حسن کے "نشے" میں رہے شام و سحر مست

مستانِ ازل کو مے و میخانہ سے مطلب؟
حیدر ہے ترے عشق میں سرگشتہ و سرمست

محبّت

ٹیگور کا ایک تازہ ترین المیہ شاہکار

مترجمہ جناب سید کاظم حسین صاحب بی-اے

میں ایک مصنّف ہوں، لیکن میرے قلم کی جنبشیں عوام کو خوش نہیں کرتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میری تحریروں کے متعلق جو تنقیدیں میرے کانوں تک پہونچتی ہیں وہ اکثر و بیشتر تلخ ہوتی ہیں اور بعض اوقات اعتراضات کی تکرار خواہ وہ اس قابل ہی کیوں نہ ہو کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے مجھے بےچین رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ خود فراموشی کیلئے میں ایسا کنج عزلت تلاش کرتا ہوں جہاں مادر فطرت کی پرسکون آغوش میرے لئے ایک گونہ بےخودی کا سامان مہیا کر دے میں اپنے آپ کو جذب کر دینا چاہتا ہوں اور دُنیا و مافیہا سے بےخبر ہو جاتا ہوں۔

کلکتہ سے دور ایک ایسا مقام ہے جہاں میں اطمینان سے کام کر سکتا ہوں اور یہاں رہ کر میں اپنی شخصیت سے متعلق سارے خیالات بھول جاتا ہوں کیونکہ یہاں کے بھولے بھالے دیہاتی ابھی میری تحریروں پر رائے زنی کرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ میں ان کے نزدیک نہ تو رند بادہ خوار ہوں اور نہ زاہد خشک اس لئے میری ظاہری حالت اس قسم کے خیالات کی تائید نہیں کرتی۔ نہ تو وہ مجھے زائر سمجھتے ہیں اس لئے کہ میری صحرا نوردی کا کوئی مقصد انھیں معلوم نہیں تھا اور نہ مجھے دنیا داری خیال کرتے ہیں کیونکہ بظاہر ان کے ہاں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ غرضکہ مجبوراً انھوں نے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

باوجود اس کے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں صرف ایک ہستی ایسی ہے جو میرے متعلق کسی نتیجہ پر پہونچ سکی ہے اور جو شاید اسی وجہ سے مجھ سے بے اعتنائی نہیں برتتی کہ اس سے میری پہلی ملاقات ایک دفعہ برسات کے دنوں میں ہوئی تھی۔

درختوں کے پتوں کی وہی حالت تھی جو اشکبار پلکوں کی آنسو تھم جانے کے بعد ہوتی ہے۔ ہوا کی خنکی پتہ دے رہی تھی کہ بارش ابھی ابھی رکی ہے۔ میں باغ میں حوض کے کنارے کھڑا ایک گائے کو دیکھ رہا تھا جو چرنے میں مصروف تھی جونہی سورج کی شعاعوں نے اس کے جسم کو چھوا مجھے انسان کی ان کوششوں کا خیال آیا جن کا مقصد لباس کا پردہ حائل کر کے ان شعاعوں کو انسانی جسم سے پرے رکھنا ہوتا ہے جو صحت کے لئے حد درجہ [illegible]۔

اتنے میں ایک عورت نے مجھے [illegible] سلام کیا۔ اس کے پاس پھولوں کے ہار تھے۔ "میرے خدا کی بارگاہ میں میرا [illegible] [illegible] نے ہاتھ جوڑ کر ایک ہار مجھے پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد وہ غائب [illegible] اور میں اس کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکا۔

بادی النظر میں اس کا یہ فعل کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کا اثر جو مجھ پر ہوا اسے میرا ہی دل جانتا ہے۔ گائے کا آہستہ آہستہ چرنا اور اپنی دُم کو بار بار جنبش دینا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاعوں کی رنگینیاں مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ ممکن ہے کہ قارئین کے نزدیک اس منظر میں کوئی جاذبیت نہ ہو لیکن اس وقت مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور میرے دل کی گہرائیوں میں اس کا نقش مرتسم ہو چکا تھا۔ میں اپنے معبود کی بارگاہ میں کچھ دیر کیلئے سر بسجود ہو گیا اور تھوڑی [illegible] پتے توڑ کر گائے کے سامنے ڈالنے [illegible] ہوں۔ میرا دل مسرتوں سے لبریز ہو گیا۔

اس سے میری دوسری ملاقات موسم بہار میں ہوئی۔ موسم نہایت دلفریب تھا۔ آفتاب کی شعاعیں ایک خوشگوار گرمی پیدا کر رہی تھیں۔ میں بالاخانہ پر بیٹھا لکھ رہا تھا۔ میرے ملازم نے آکر کہا کہ کوئی عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے بغیر سوچے ہوئے کہ وہ کون ہو سکتی ہے میں نے اسے بلوا لیا۔

کچھ دیر بعد وہ داخل ہوئی اور میرے پاؤں کی گرد صاف کرنے لگی۔ اس وقت میں نے پہچانا کہ وہ وہی تھی جسے میں نے باغ میں دیکھا تھا۔ اس کا سن اس قابل تو نہ رہا تھا کہ اس کی خوبصورتی کے متعلق خیال آرائی ضروری کی جائے البتہ اس کا جسم سڈول اور اس کا قد اوسط سے کسی قدر لمبا تھا۔ اس کی طرز گفتگو میں ایک گونہ بیساختہ پن پایا جاتا تھا۔ اس کے چہرے سے تقدس کے آثار ظاہر ہوتے تھے اس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی آنکھیں تھیں جو آن کی آن میں دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی تھیں۔

دل کو ٹٹولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "میں آپ کے ارد گرد کیا دیکھ رہی ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی کون سی چیز مجھے آپ کے چرنوں تک کھینچ لائی ہے؟ کیا ہی اچھے تھے وہ دن جب میں آپ کو باغ میں دیکھا کرتی تھی"۔

اس کے ان الفاظ سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ اکثر مجھے میرے علم کے بغیر باغ میں چلتے پھرتے دیکھا کرتی تھی۔ اس واقعہ کے بعد چند دنوں تک میں نزلہ کی وجہ سے گھر ہی میں بند رہا اور اپنے کمرہ میں بیٹھ کر شام کے منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا اس زمانے میں میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔

ایک دفعہ اس نے کہا "میرے گورو، میرے اوتار! مجھے زندگی کا پیغام سناؤ"۔ اول تو میں پریشان ہوا لیکن جلد جذبات پر قابو پا کر گویا ہوا "یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ۔۔ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا!۔۔۔ لیکن اب، جبکہ تم تصور کی دنیا کے علاوہ حقیقت کی دنیا میں بھی موجود ہو تو مجھے دونوں غیر متوقعہ نعمتیں حاصل ہیں لطف تکلم اور ذوق نظر۔۔۔"

اس سے وہ بہت خوش ہوئی اور "گورو، گورو" چلانے لگی۔ اس نے کہا "خدا اپنی زبان سے نہیں بولتا بلکہ وہ کسی کو اپنی طرف سے بولنے کے لئے دنیا میں بھیجتا ہے اور اس طرح اس کی ذات بالواسطہ گویا ہوتی ہے"۔

"ہم خاموشی میں اس کی آواز سن سکتے ہیں اور اسی کے سننے کیلئے میں اس مقام پر آتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"میں یہ جانتی ہوں اور یہی جان کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں" اس نے کہا۔

میں نے اس کے خاندانی حالات معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن میری کوششیں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئیں البتہ اتنا معلوم ہو سکا کہ اس کی ماں ایک خوشحال عورت تھی۔ اپنی لڑکی کی موجودہ زندگی کا اسے علم ہو چکا تھا اور اس کی انتہائی خواہش تھی کہ انندی اپنے شوہر کے گھر چلی جائے لیکن انندی اس کے لئے ہرگز راضی نہ تھی۔

"تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ جواب میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی معتقد نے اسے کچھ زمین تحفتہً پیش کی تھی جن کی آمدنی کافی سے زیادہ تھی اس کے بعد ایک ہلکے تبسم کے ساتھ اس نے کہا "میرے لئے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اب مجھے کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ اور موجودہ حالت میں بھیک مانگ کر پیٹ پال لیتی ہوں۔ کیا آپ کی سمجھ میں اس کی کوئی وجہ آسکتی ہے؟۔۔۔"

اگر یہ سوال مجھ سے کلکتہ میں کیا جاتا تو اس بارے میں بہت کچھ کہنے سننے کا امکان تھا۔ میں اسکے اس طرز عمل کو سوسائٹی کے حق میں نقصان دہ بتاتا۔ لیکن اس مقام پر جہاں سوال کیا گیا تھا انسان کو اپنی قابلیت اور کتابی معلومات کو بالائے طاق رکھ دینا پڑتا ہے۔ اس خانہ بدوش عورت کی سادہ لوحی کے آگے سارے اصول معاشیات ہیچ تھے۔ مجھ سے کچھ بن نہ پڑی اور میں خاموش ہو رہا۔

"نہیں نہیں!" اس نے کہا۔ گویا کہ وہ میرے خیالات سے واقف ہو چکی تھی۔ "میری موجودہ زندگی پر دنیا کی نعمتیں قربان ہیں اور جو لطف مجھے بھیک مانگ کر پیٹ پالنے میں حاصل ہوتا ہے وہ اس سے قبل نصیب نہیں ہوا تھا"۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ مانگنے سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ مانگنے والے کے دل میں اپنے مالک کا خیال پیدا کر دیتی ہے۔ میں اس کی ازدواجی زندگی کے متعلق دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ اس نے اپنے شوہر کے بارے میں کوئی ذکر ہی نہ کیا اس لئے میں نے اس موضوع پر گفتگو کرنی پسند نہ کی۔

خانہ بدوش عورت گاؤں کے شرفاء کے محلوں میں نہ جاتی تھی۔ "وہ خدا کی راہ میں کچھ نہیں دیتے" اس نے کہا "کیونکہ انہیں تو صرف نفع حاصل کرنے ہی کی فکر رہتی ہے"۔

وہ محلہ جہاں آج کل وہ مقیم تھی بدنام تھا۔ "ان لوگوں میں زندگی گذارنا بہتر ہے۔" میں نے کہا "اس لئے کہ ان کو راہ راست پر لانا عبادت کرنے کے مترادف ہے"۔

لیکن اس سے وہ کچھ متاثر نہ ہوئی۔ "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ۔۔"

اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "چونکہ خدا گنا ہگاروں کے درمیان ہے اس لئے میں ان میں زندگی بسر کرکے اُس کی قربت حاصل کر سکونگی؟"۔

"ہاں ---!" میں نے جواب دیا۔

"اس میں کچھ شک نہیں" اُس نے کہا۔ "خدا ہر چیز کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اس سے مجھے کیا واسطہ ہم مجھے تو اپنے خدا کی تلاش ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو"

میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا کہ اُس کی ساری گفتگو مجھ سے متعلق تھی۔ اس لئے میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ خدا کے ہر جگہ موجود ہونے کا خیال صحیح ہے۔ لیکن وہ وہیں ہے جہاں کہ آپ اس کو تلاش کریں۔

موجودہ مادی دور کے اثرات سے میں کسی طرح محفوظ نہیں ہوں۔ میں اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتا ہوں لیکن ان سے جو کچھ بھی میں نے حاصل کیا ہے اس کی بنیاد محض سُنی سنائی چیزوں پر ہے اس لئے میں کسی خاص نتیجہ پر اب تک نہیں پہونچ سکا تھا۔ لیکن عمر بھر میں پہلی دفعہ اس دہقانی عورت نے مجھے حقیقت سے روشناس کیا۔

دوسرے روز صبح کو میں حسب معمول لکھنے میں مصروف تھا کہ وہ آئی۔ مجھے مصروف دیکھ کر اسے تکلیف ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے لباس سے اسے رنج پہونچا تھا۔ مجھ تک آنے کیلئے اسے پہلے تو سیڑھیاں چڑھنی پڑتیں اس کے بعد جب وہ میرے پاؤں چھونے کے لئے بیٹھ جاتی تو اسے بہر سے پاؤں سے جرابیں نکالنی پڑتیں اس کے علاوہ میں لکھنے میں منہمک رہتا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا خدا نے تمھیں اس قدر کام کرنے کی ہدایت کی ہے جس سے تمھاری صحت پر اثر پڑے" اُس نے کہا۔

"میں ایک گناہگار بندہ ہوں ساور اس طرح مصروف رہنے ہی میں میری بہتری ہے۔ ممکن ہے کہ بیکاری میرے حق میں مضر ثابت ہو" میں نے جواب دیا۔

"گورو" اُس نے والہانہ انداز میں کہا۔ "آج سویرے نیند سے چونکتے ہی مجھے آپ کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا۔ آہ! میں بیان نہیں کر سکتی کہ اس سے مجھے کتنی مسرت حاصل ہوئی کہ میں نے ان قدموں کو اپنی پیشانی سے لگائے رکھا"

دوسری شام کو وہ پھر آئی اور اس طرح اپنی کہانی شروع کی۔

"میرے شوہر ایک سادہ انسان تھے۔ اکثر لوگ انھیں ان کی اس سادگی کی وجہ سے بیوقوف سمجھتے لیکن میرا خیال ہے کہ جو سادگی پسند ہیں وہی کسی چیز کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور میں دیکھتی تھی کہ وہ اپنی کاشتکاری ہی یا اور معاملات میں کبھی دھوکا نہیں کھاتے تھے۔ وہ اپنے گھر میں اور دوسرے کاروبار میں اصول سے کام کرتے تھے۔ وہ حریص بھی نہ تھے اس لئے زیادہ نفع کمانے کا خیال ان کو کبھی ہوا جو کچھ ان کے بس میں ہوتا اس کے حاصل کرنے کی ممکنہ کوشش کرنا اور آئندہ کی توقعات پر وقت ضایع کرنا انھیں پسند نہ تھا۔

میری شادی سے قبل میرے خسر کا انتقال ہو چکا تھا اور شادی کے بعد خوشدامن صاحبہ نے داعی اجل کو لبیک کہی۔ اس طرح ہمارے گھر میں کوئی بزرگ باقی نہ رہا تھا۔ یہاں میں یہ کہتے ہوئے شرماتی ہوں کہ وہ میری عزت کرتے تھے حالانکہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور میں صرف باتونی تھی۔

وہ دنیا میں اپنے خاندانی مذہبی پیشوا یعنی گروجی کا سب سے زیادہ احترام کرتے تھے لیکن ان کے نزدیک یہ احترام محض رسمی پابندی یا قدیم روایات کی حد تک نہ تھا۔ اسے وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ان کے گروجی ان کے ہم عمر تھے۔ اور ان کی خوبصورتی ------ آہ! میں بیان نہیں کر سکتی کہ کتنے خوبصورت تھے؟"

یہاں پہونچکر اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور وہ ایک گیت گانے لگی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز پر غور کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔

"گروجی ان کے بچپن کے ساتھی تھے اور لڑکپن ہی سے میرے شوہر کا دل ان کی طرف کھنچا چلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دل سے ان کے معتقد ہو گئے۔ لیکن کمسن گرو کا طرز عمل ان کے ساتھ بالکل جداگانہ تھا۔ وہ انھیں بیوقوف تصور کرتے تھے۔ وہ اور ان کے ساتھی میرے شوہر کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو ستایا کرتے تھے۔

شادی کے بعد جب میں نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو میں نے ان کے گرو کو نہیں دیکھا۔ وہ ان دنوں بنارس میں مذہبی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور میرے شوہر ہی ان کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ جب گروجی فارغ التحصیل ہو کر واپس لوٹے تو میرا سن اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا۔

اس سے کچھ عرصہ قبل میرے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ بچوں کی پرورش کے معاملہ میں میں بالکل ناتجربہ کار تھی۔ میرا زیادہ وقت سہیلیوں کے ساتھ گاؤں میں ادھر اُدھر پھرنے میں صرف ہوتا تھا اور میں یہ محسوس کرتی کہ میرا بچہ میری آزادی میں حائل ہے۔ بعض اوقات میں جھنجھلا اٹھتی۔ اس خیال سے کہ وہ میرے دل میں گھر لوٹنے کا خیال پیدا کرتا ہے۔

آہ! --- کیا دنیا میں ایک ماں کیلئے اس سے زیادہ کوئی مصیبت

ہوسکتی ہے کہ اس کا لخت جگر اس کی آغوش میں آنے کے لئے ہاتھ پھیلائے اور ماں اس سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔

لڑکا اپنے باپ کا لاڈلا تھا۔ میرے شوہر کو یہ دیکھ کر انتہائی صدمہ پہونچتا کہ میں بچے کی دیکھ بھال سے پہلوتہی کرتی ہوں اور ایک ایسے فرض کی ادائیگی میں جو ہر ماں کی مایہ ناز خصوصیت ہے کوتاہی کر رہی ہوں۔ لیکن وہ حد درجہ خوددار اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے اس لئے کبھی انھوں نے میری شکایت میں زبان نہ کھولی۔ باپ نے لڑکے کو ماں کی شفقتوں سے پالا پوسا۔ جب راتوں کو بچہ روتا تو مجھے خبر تک نہ ہوتی۔ اور میں برابر میٹھی نیند کے مزے لیتی رہتی۔ یہ حالت دیکھ کر میری جگہ باپ نے لے لی۔ بہلانا اور تھپک تھپک کر سلانا انھیں کا کام تھا۔ میرے شوہر خاموشی سے کام انجام دینے کے عادی تھے۔ جب کبھی کوئی کھیل تماشہ ہوتا تو وہ مجھ سے کہتے "دیکھو تم چلی جاؤ۔ میں گھر ہی میں رہونگا۔ مجھے آرام لینے کی ضرورت ہے، تمھیں معلوم ہے کہ میں راتوں کو جاگ نہیں سکتا۔" یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ گھر میں نہ رہے تو بچہ کی نگرانی پھر کون کریگا؟ اور میری عدم موجودگی میں ان کا رہنا ضروری ہو جاتا۔

تعجب تو یہ ہے کہ اس کے باوجود لڑکا مجھ سے مانوس تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ جان چکا تھا کہ میں اس سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ اور اس لئے ڈرتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہونا پڑے اور وہ شاید اسی لئے میرا گرویدہ تھا اس کے ننھے سے دل کے معصوم ارمان پورے نہ ہوسکے۔

جب میں نہانے کیلئے تالاب کے کنارے جانے لگتی تو بچہ بھی ساتھ چلنے کی خواہش کرتا لیکن وہ مقام تو گاؤں کی لڑکیوں کا تفریح گاہ تھا۔ اس لئے شاید ہی کبھی میرا بچہ میرے ساتھ گیا ہوگا۔

بارش کے دنوں میں تالاب پانی سے ابلنے لگتا تھا اور وہ اس قدر چوڑا تھا کہ میری سہیلیوں میں صرف میں ہی اس کو عبور کرسکتی تھی۔ اس دن آسمان پر ہیبتناک بادل چھائے ہوئے تھے۔ لڑکا میرے ساتھ چلنے کے لئے رونے لگا۔ میں نے نوکرانی سے کہا۔ "ذرا تم بچہ کو دیکھتی رہو۔ میں ابھی آئی۔"

تالاب پر کوئی نہ تھا اور میں جلدی سے پانی میں کود پڑی۔ دور سے کسی نے مجھے "اماں" کہہ کر پکارا۔ میں نے پلٹ کر اپنے بچے کو دیکھا جو زینوں کو طے کرکے پانی کے قریب آرہا تھا۔

"میں آرہی ہوں۔" میں نے چلا کر کہا۔ "تم وہیں ٹھہرے رہو۔"

لیکن اس نے ایک نہ سنی اور خوشی خوشی پانی کے قریب بڑھتا گیا خوف کے مارے میرا جسم تھرانے لگا۔ میرے بازو شل ہوچکے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں مجھ سے وہ جانکاہ منظر نہ دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی ہنسی کی آواز بھی پانی میں ڈوب گئی۔

آخر کار جب میں بچہ تک پہونچ سکی۔ تو میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اس کی لاش کو پانی سے باہر نکالوں۔ اس بچے کی لاش کو جو زندگی بھر میری گود میں جی بھر کے نہ سویا تھا اور جس کا ننھا سا دل میرے لئے تڑپا کرتا تھا میں نے اس کی حسرتوں کا خون کیا۔ اب مجھے اماں کہکر پکارنے والا کوئی نہ تھا البتہ اس کی دلکش آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اس معصوم کو رلانے کی سزا اب میں بھگت رہی ہوں۔ جب وہ میرے پاس رہنا چاہتا تھا تو میں نے اس سے دوری اختیار کی۔ لیکن اب اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اس کا خیال میرے ساتھ ہے اور اسی کے تصور میں آوارہ و سرگرداں پھر رہی ہوں۔ اس وقت تک میری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اس کا پتہ نہ چل سکا کہ میرا گوپال مجھ سے اتنا قریب رہ کر بھی دور کیوں ہے؟

اس واقعہ کے بعد جو میرے شوہر پر گذری وہ ان کا دل ہی جانتا ہے شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی اگر وہ مجھے اس کا ذمہ دار گردان کے برا بھلا کہتے لیکن نہیں وہ اندر ہی اندر گھلے جا رہے تھے اور حرف شکایت زبان پر نہ لاتے تھے۔

میرے دل پر یہ داغ ابھی تازہ تھا کہ اس اثنا میں ہمارے گروجی بنارس سے تشریف لائے ان کی بچپن کی شکایتیں عالمانہ سنجیدگی سے بدل چکی تھیں۔ کھیل کود کے دن رخصت ہوچکے تھے۔ چیلے اور گروجی کے درمیان ایک خلیج حائل ہوچکی تھی۔ دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بچپن کے ساتھی ہیں۔ میرے شوہر کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ گروجی سے بات بھی کرسکیں۔

میرے شوہر نے گروجی سے التجا کی کہ وہ مجھے تسلی اور دلاسہ دیں۔ جس پر انھوں نے شاستر میں سے بعض چیزیں پڑھکر مجھ پر دم کیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ان الفاظ سے میری تشفی ہوئی لیکن میں ان کی قدر کرتی تھی۔ اس لئے کہ وہ گروجی کی زبان سے جاری ہوئے تھے۔ خدا خود گویا نہیں ہوتا لیکن کسی کو ذریعہ بناکر اپنے اور اپنی مخلوق کے درمیان ربط قائم کرتا ہے۔

میرے شوہر گروجی کی حد سے زیادہ عزت کرنے لگے۔ ان کی ہر حرکت ان کا ہر فعل اس کا ثبوت تھا کہ وہ ان کی کتنی قدر کرتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ

ساتھ حتی الوسع ان کی خدمت کرکے اپنے شوہر کی خوشنودی حاصل کرتی تھی۔ اس طرح دن گذرنے لگے۔ رفتہ رفتہ میرا غم غلط ہوتا گیا۔ اور میں نے اپنے خدا کو اپنے گرو کی شکل میں دیکھا۔

ہم لوگ کھانا اس وقت تک نہ کھاتے جب تک کہ گروجی کے متبرک ہاتھ اسے چھو نہ لیتے اور اسی کو ہم اپنا ذریعہ نجات تصوّر کرتے تھے۔ جب میں گروجی کے لئے ترکاری کاٹتی تو میرا دل فرط انبساط سے بلیّوں اچھلنے لگتا چونکہ ہم برہمن نہ تھے اس لئے کھانا پکانے کا شرف مجھے حاصل نہ تھا۔ ذات پات کے خیال سے مجھے رنج ہوتا تھا۔ گروجی ایک عالم باعمل تھے ان کو لذات دُنیوی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور ان کی جتنی بھی مجھ سے خدمت ہوتی میں کرتی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اور میرے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔

میرے شوہر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتے کہ میں عقیدتمندی سے گروجی کی خدمت کرتی ہوں۔ رفتہ رفتہ گروجی بھی مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور ان کو یہ معلوم کرکے اک گونہ اطمینان ہوا کہ گروجی مجھ سے مذہبی معاملات میں دلچسپی سے گفتگو کرتے ہیں اور وہ سعادت جس سے وہ خود محروم تھے انھیں اپنی بیوی کے ذریعہ حاصل ہو رہی ہے۔

اسی طرح ایک عرصہ گذرا۔ مجھے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ دن کب نکلتا ہے اور رات کب ہوتی ہے۔ شاید میری بقیہ زندگی بھی اسی طرح گذر جاتی۔ لیکن میرے دل میں چور تھا اور تعجب تو یہ ہے کہ اخیر وقت تک مجھے اس کا علم نہ ہوا۔

موسم بہار کی ایک دلفریب صبح تھی اور میں نہا کر گھر واپس ہو رہی تھی۔ میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ امرائی سے نکل کر میں نے گروجی کو آتے دیکھا۔ وہ کندھے پر تولیا ڈالے نہانے کیلئے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ منتر بھی پڑھتے جاتے تھے۔ میں اس حالت میں ان کے آگے آنے سے شرمائی اور دوسری طرف سے نکل جانا چاہا۔ لیکن انھوں نے مجھے پکارا۔ میں ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کانپتے ہوئے شرم سے گردن جھکائے ہوئے۔

انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا "تمھارا جسم کتنا خوبصورت ہے" چڑیاں آم کے درختوں پر چہچہا رہی تھیں خودرو پھولوں کی نکہت سے فضا معطر تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ خوشیاں منا رہا ہے۔

میں گھر کیسے پہونچی میں نہیں جانتی۔ میں سیدھے عبادت کے کمرے میں داخل ہوئی لیکن اب مجھ میں وہ پہلی سی بات باقی نہ تھی۔ میں خدا کی بارگاہ میں جھک جانا چاہتی تھی لیکن میرا دل کہیں اور تھا وہی امرائی والا منظر بار بار میری نظروں کے آگے آتا۔

جب گروجی دوپہر میں کھانا کھانے کے لئے آئے تو انھوں نے پوچھا، "اندری کہاں ہے؟" میرے شوہر میری تلاش میں نکلے لیکن میرا کہیں پتہ نہ تھا ہائے دنیا اب میری نہیں ہے۔ میری آنکھیں خیرہ ہو چکی ہیں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں خدا کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں پھرتی ہوں اور وہ مجھ سے دوری اختیار کرتا ہے۔

میں جانتی تھی کہ دن تو کسی نہ طرح گزر جائیگا لیکن رات میں میں اپنے شوہر کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہونگی۔ میرے حصہ میں انتہائی تاریکیاں تھیں لہ بس ـــــ اسی زمانہ میں میرے شوہر کا دل مثل شعلہ کے بھڑک اٹھا۔ اُن کے بعض خیالات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اصل واقعہ کو کس قدر جلد سمجھتے تھے میں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر بہت دیر میں سونے کیلئے جاتی مگر میرے شوہر اس وقت تک جاگتے رہتے تھے۔

اس شب کو میں بستر پر دیر سے گئی آدھی رات ہو چکی تھی میں نے دیکھا کہ میرے شوہر بستر پر نہیں ہیں بلکہ فرش پر پڑے سو رہے ہیں۔ میں ان کے پائنتی کی طرف لیٹ گئی۔ نیند میں انھوں نے کروٹ بدلی اور ان کا ایک پاؤں میرے سینے پر لگا۔ میں نے اس کو ان کا آخری تحفہ خیال کرکے قبول کیا۔

صبح کو جب وہ نیند سے بیدار ہوئے تو میں دریچے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ آسمان کی نیلگوں چادر آم کے درختوں پر عجیب و غریب کیفیت پیدا کر رہی تھی کائنات میں سکوت تھا بالکل سکوت ـــــ! میں اٹھ کے ان کے قریب گئی اور خود کو ان کے قدموں پر گرا دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور متلاشی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"مجھے دنیا کو خیرباد کہنا چاہیئے"۔ میں نے کہا۔

انھوں نے غالبًا اسے خواب تصور کیا اور اس لئے خاموشی اختیار کی "میرے سر کی قسم!" میں نے کہا۔ "میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ کسی کو بیاہ لائیں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کے ساتھ رہوں۔ مجھے آپ کے اور آپ کے گھر کو خدا حافظ کہنا چاہیئے"۔

"تم کیا کہہ رہی ہو؟" میرے شوہر نے پوچھا۔ "آخر تم سے کس نے گھر

——— چھوڑنے کے لئے کہا؟"

"ہمارے گروجی نے" میں نے جواب دیا۔

میرے شوہر کے حواس جلتے رہے۔ "ہمارے گرو نے" انھوں نے تعجب سے دہرایا۔ "انھوں نے تم سے کب کہا تھا؟"

"آج صبح جب میں نہا کے واپس ہو رہی تھی ان سے میری ملاقات ہوئی"

تھراتی ہوئی آواز میں انھوں نے پوچھا۔ "بتاؤ تو سہی، آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو یہ حکم دینے پر مجبور کیا"

"میں نہیں جانتی" میں نے جواب دیا۔ "آپ ان سے دریافت کریں وہ سب کچھ بتا دینگے"

"لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تم گھر میں رہ کر دنیا سے کنارہ کشی کر لو۔ میں ان سے کہدوں گا" وہ کہنے لگے۔

"ممکن ہے کہ وہ تمھاری تجویز قبول کر لیں۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا اس لئے کہ حقیقی معنوں میں اب میرے لئے دنیا میں گھر نہیں ہے"

کچھ دیر تک میرے شوہر سوچ میں بیٹھے رہے۔ جب آفتاب کی روشنی کرے میں داخل ہوئی تو انھوں نے کہا۔ "چلو گروجی کے ہاں چلیں"

میں نے دست بستہ عرض کی۔ "مجھے معاف فرمایئے۔ مجھے انھیں دیکھنے کی اجازت نہیں ہے"

میرے شوہر نے مجھے بغور دیکھا۔ میں نے نگاہیں نیچی کر لیں اس کے بعد انھوں نے کچھ نہ کہا۔ بہر حال مجھے اس کا یقین ہو چکا تھا کہ وہ میرے خیالات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔

دنیا میں صرف دو آدمیوں سے مجھے انتہائی محبت تھی ایک میرا لڑکا، دوسرے میرا شوہر،

ان میں سے ایک تو داغ مفارقت دے گیا اور دوسرے کو میں نے خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔ اور اب حق کی تلاش میں پھر رہی ہوں۔ یقین جانئے یہ کوئی دھوکا یا غلط فہمی نہیں ہے"

یہ کہہ کر اانندی رخصت ہو گئی ——— ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ——!

ٹیگور

اقوال زریں

ملک محمد طفیل خانصاحب امین آبادی

جو بات حکمت سے نہیں عین آفت ہے۔ جو خاموشی فکر کیلئے نہیں غفلت ہے اور جو نظر عبرت کیلئے نہیں وہ ذلت ہے۔

اعلیٰ مرتبہ بغیر مصیبتوں کے نہیں مل سکتا۔

اپنے باپ سے نیکی کرو تاکہ تمھاری اولاد تم سے نیکی کرے۔

عقلمند وہ ہے جو دنیا کو خراب کرے اور آخرت کو سنوارے۔ نہ کہ اس کے برعکس،

محبت ایک ایسا رشتہ ہے جو کہ بیگانوں کو یگانہ بنا دیتا ہے۔

مذہب خدا کی محبت اور روح کی غذا ہے۔

دوسروں کے عیب دیکھنے کے بجائے اپنے عیب دیکھو تاکہ دنیا تمھارے لئے جنت بن جائے۔

بدوں کی صحبت سے گریز کرو ورنہ اپنی تھوڑی بہت نیکیاں بھی گنوا بیٹھوگے۔

جس نے قناعت اختیار کی وہ خلق سے بے نیاز ہوا اور جس نے خلق سے کنارہ کشی کی وہ سلامت رہا۔

انسان خدا کا مظہر ہے، اس لئے خدا اور نیکی کو انسان میں دیکھو۔

نظر کی بھیک

پردہ کی آڑ سے محبت کی آخری التجائیں!

شاعر شباب حضرت فطرت واسطی!

آپ کا کیسا حال ہے دیکھوں
شیشۂ دل میں بال ہے دیکھوں
روح بھی پائمال ہے دیکھوں
رنگِ رخ بھی نڈھال ہے دیکھوں

سوزِ غم اور اک قلب لطیف
حسن اور عشق کی بلا میں شریک

حسن میں انقلاب ہے دیکھوں
میرا غم کامیاب ہے! دیکھوں
روح پر اضطراب ہے دیکھوں
شرم بھی محوِ خواب ہے دیکھوں

جگمگا اُٹھئے رات ہے تاریک
ڈریئے ڈریئے نہ آئے صبح حریف

دل میں کتنا سپاس ہے دیکھوں
لب میں کتنی مٹھاس ہے دیکھوں
عشق کا کچھ بھی پاس ہے دیکھوں
یہ تو میرا قیاس ہے، دیکھوں

آیئے اور آیئے نزدیک
رشتۂ حسن و عشق ہے باریک

حسن خود اک حجاب ہے دیکھوں
چاند اپنی نقاب ہے دیکھوں
شب بھی مست و خراب ہے دیکھوں
کیا خدا محوِ خواب ہے دیکھوں

میں بھکاری ہوں رات ہے تاریک
دیجئے دیجئے نظر کی بھیک،

عربوں کا ذوقِ شاعری

ایک بلند پایہ علمی مضمون!

از جناب مولانا عبدالقیوم صاحب ندوی (بارہ بنکی)

عرب اور اُن کی شاعری

شاعری اور بلاغت کچھ عربوں ہی کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ چیز ایک فطری اور طبعی ہے دنیا کا کوئی حصہ نہیں جہاں شعر و شاعری سے ذوق نہ رکھا جاتا ہو اور نظم و تغزل کے جذبات اور محرکات موجود نہ ہوں لیکن اس حقیقت سے ہرگز نہیں انکار کیا جا سکتا کہ شعر و شاعری میں عربوں نے جو ملکہ تام حاصل کیا اور فصاحت و بلاغت کے جن آسمانوں پر مہر و ماہ بن کر وہ چمکے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ اور عالم کا ہر فرد بشر شاہد ہے کہ لاکھوں میل پھیلی ہوئی دنیا میں سے کسی قوم اور ملک کو یہ فخر حاصل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ تھی اور صرف یہی وجہ کہ عرب اپنے علاوہ دیگر قوموں اور ملکوں کے باشندوں کو عجمی (گونگے) کے لقب سے پکارتے تھے۔

عربوں کو شعر و شاعری سے اس قدر گہرا ذوق تھا کہ وہ اپنے علوم اور اخبار ایام و حکم۔ اعمال و کارنامے حتیٰ کہ حسب و نسب وغیرہ تک شعر ہی کے ذریعہ سے محفوظ رکھتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے رؤسا اور امراء شعر و شاعری پر فخر و ناز کرتے اور اپنے ہمعصروں سے گوئے سبقت لے جانے کے خواہاں اور آرزومند رہتے تھے۔

عکاظ کا بازار

عکاظ عرب کا مشہور بازار تھا جہاں سال میں کئی بار عرب کے زبردست ادباء اور فضلاء اور عظیم المرتبت علماء اور شعراء جمع ہوتے اس موقع پر دور دراز کی گھنی آبادیاں شعر و شاعری کے ذوق میں بازار عکاظ میں جذب ہو جاتیں۔ اس زمانہ میں یہ بازار بلا مبالغہ انسانی سمندر کا جولانگاہ معلوم ہوتا قبائل کے رؤساء اور شعراء اپنے اپنے قصائد سناتے اور فصاحت و بلاغت کی منہ مانگی داد حاصل کرتے۔ (حیات الادب العربی)

ان کا یہ شاعرانہ جذبہ اس حد تک ترقی کر گیا تھا کہ ملک الشعراء امرء القیس نابغہ۔ اور زہیر وغیرہ نے جو زمانہ جاہلیت کے زبردست شعراء تھے اپنے اپنے قصائد کو خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیا تھا کہ تاکہ حج کے موقع پر دنیا کے تمام اقوام آئیں اور ان کو پڑھ کر ان کی داد دیں اور یہ قصائد اقوام عالم اپنے ساتھ لے جائیں تاکہ سارے عالم میں ان کی دھوم مچ جائے اور گھر گھر عربی شاعری کا سکہ بیٹھ جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد سارے عالم میں عربوں کی فصاحت و بلاغت کا شہرہ ہو گیا۔

قصائد سبعہ معلقہ

بعد میں ان کا نام سبعہ معلقہ رکھا گیا۔ جو درحقیقت زمانہ جاہلیت کے عربی فصاحت و بلاغت اور ان کی تہذیب و تمدن کے صحیح معنوں میں آئینہ دار ہیں۔ ان میں سے امرء القیس کا قصیدہ سب سے زیادہ شہرت دوام کا مالک ہوا جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل   بسقط اللوی بین الدخول فحومل

فتوضح فالمقراۃ لم یعف رسمہا   لما نسجتہا من جنوب و شمأل

ترجمہ (۱) "ٹھیرو ذرا محبوبہ اور اس کے مکان کی یاد سے آنسو بہا لیں جو دخول اور حومل وغیرہ مقامات (۲) اور توضح اور مقراۃ کے درمیان واقع ہے کہ جس کے نشانات اور رسوم کو شمالی اور جنوبی ہواؤں نے ابھی نہیں مٹایا ہے"

تری بعر الآرام فی عرصاتہا   وقیعانہا کانہ حب فلفل

ترجمہ "تم دیکھوگے ہرنیوں کی مینگنی کو اس کے مکان کے صحن میں مثل فلفل کے دانوں کے"

غرضیکہ یہ وہ قصائد تھے جن پر عربوں کو انتہائی درجہ ناز و فخر تھا اور ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے دنیا کے تمام ادیبوں اور شاعروں نے ہتھیار

ڈالدیئے تھے اور اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تھا۔ لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا اور آسمانی وحی آنے لگی تو عربوں کی یہ ساری فصاحت و بلاغت خاک میں مل گئی اور قرآن کے اسلوب بیان اور اس کی اعجازی فصاحت کے سامنے وہ مبہوت و حیران رہ گئے ان کے اندر سے ایک زمانہ کیلئے شعر گوئی کا جذبہ فنا ہو گیا اور بجائے تغزل و شاعری کے اشاعت مذہب اور خدمت اسلام کے کاموں میں مشغول و منہمک ہو گئے کچھ عرصہ تک یہی حالت رہی لیکن چونکہ قرآن نے شعر کی حرمت کا حکم نہیں دیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اشعار سنے تھے اس لئے عربوں کے اندر ایک عرصہ کے بعد پھر وہی جذبہ عود کر آیا اور شاعرانہ خیالات و محرکات ان کے دلوں میں پرورش پانے لگے۔ چنانچہ عمر ابن ربیعہ۔ خطیبہ۔ جریر۔ فرزدق۔ نصیب۔ ذوالرمہ، احوص وغیرہ اس زمانہ کے زبردست اور عظیم الشان شعراء میں سے شمار کئے جاتے تھے جو بحیثیت مجموعی ایام جاہلیت کے قدیم عرب شعراء سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہیں اور ان کی بلاغت و شعریت نابغہ۔ انترہ۔ ابن کلثوم۔ زہیر۔ علقمہ بن عبدہ، طرفہ ابن السعید وغیرہ دیگر شعراء جاہلیت سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔

ایام جاہلیت اور عہد اسلام کی شاعری کا فرق

آثار اور فلسفہ تاریخ کے مشہور امام حضرت علامہ ابن خلدون اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ عہد اسلام کے عرب شعراء قرآن کے سحر آفرین عبارات سنے ہوئے تھے اور دن رات اس کی مزاولت کیا کرتے تھے اور جاہلیت کے شعراء اس عظیم الشان اور عدیم المثال نعمت سے محروم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عہد اسلام کے عرب شعراء کے کلام میں اس کا عشر عشیر حصہ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ نکتہ اپنے ادیب و فاضل ترین استاد کے سامنے بیان کیا تو انھوں نے فرط مسرت سے مجھے گلے لگا لیا اور اسی روز سے وہ میری تعظیم و تکریم کرنے لگے وہ اس واقعہ کو فخریہ محافل اور مجالس وغیرہ میں بیان کرتے اور میری حد سے زیادہ تعریفیں کرتے۔ (مقدمہ ابن خلدون)

عربوں کے اس شاعرانہ جذبے میں اس وقت اور بھی حیرت انگیز ترقی ہوئی جبکہ ان کا شاہانہ دور شروع ہوا۔ شعراء خلفاء اور سلاطین کی مدح و ثنا کرتے اور وہ ان کو حسب لیاقت اور مرتبت انعام سے مالا مال کرتے جس کی وجہ سے آپس میں مسابقت شروع ہوئی اور ایک سے بڑھکر ایک شاعر باکمال پیدا ہونے شروع ہوگئے یہ اشعار صرف تفریح طبع کے لئے نہ تھے بلکہ انھیں سے خلفاء آثار۔ اخبار، لغت و زبان کی خود تحقیق بھی کیا کرتے تھے اور اس سے لطف اندوز اور محظوظ بھی ہوتے تھے

عرب بھی اس قدر دانی کو دیکھ کر اپنی اولاد کو اشعار حفظ کراتے ان کو اشعار کی ترغیب و تحریص دلاتے اور خلفاء کے دربار میں باکمال شاعر کی حیثیت سے پیش کرتے۔ (تاریخ الادبا) یہی سبب تھا کہ ان کے بچے بچے کی زبان پر بڑے بڑے قصائد ہوا کرتے اور وہ قصائد نسلاً بعد نسلاً بچوں کی گھٹی میں ڈالدیئے جاتے۔

عربوں نے نہ صرف شعر کے مخصوص اقسام نسب، مدح و ذم۔ رثا وغیرہ میں کمال اور مہارت پیدا کی بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام اور نادر سے نادر انواع بھی ایجاد کیں۔ چنانچہ ہارون الرشید کے درباری شاعر اور نظم کے بادشاہ امام اصمعی نے ایک قسم ایجاد کی جس کو بعد میں موجد کے نام سے "اصمعیات" پکارا گیا اور یہ قسم اس درجہ مقبول اور پسندیدہ ہوئی کہ آج بھی بڑے بڑے مجامع اور عظیم الشان محافل میں اس کو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بعد کے شعراء نے بھی اس میں طبع آزمائی کی۔ بڑے بڑے قصائد کہے اور اس کی مختلف انواع و اقسام کیں۔ چنانچہ اس قسم کو اگر موسیقی آلات سے ملتے جلتے طرز پر گایا جائے تو اس کو "غناء حورانی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

محبرۃ کالستر فی ید صانع　　اذا کان فی سلک الحریر نظام
اباحھا منھا فیہ اسباب مامضیٰ　　وشام تبارک والطعون لتم
علیکم سلام اللہ من لیس نائم　　ماغنت الورقایہ وناح حمام

اشعار کا عربوں پر اثر

اسی طرح ایک شاعر اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے جس کے ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں اور جن کو مشہور مغربی شاعر ابن شجاع کے مجمع القصائد سے نقل کرتے ہیں۔

طلبك من الممنوع منك سفاهت　　وصدك عمن صد عنك صواب
اذا رئیت ناسا یغلقو عنک بابھم　　ظهور المطایا یفتح اللہ باب

ترجمہ وہ حکمت کی جگہ تجھ سے بیوقوفی چاہتا ہے اور حکمت کے مقام سے تجھکو باز رکھنا چاہتا ہے۔ جب لوگوں کو دیکھ کہ وہ کرم و احسان کے دروازے تجھ پر بند کر رہے ہوں تو یقیناً اللہ تعالٰے اپنے احسان و کرم کے دروازے تجھ پر کھول دیگا۔ (مجمع القصائد لابن سجاع)

اس قصیدہ میں آگے چل کر شاعر نے انتہائی فصاحت و بلاغت سے اپنے دوست کو قیمتی مشورے دیئے ہیں اور بتلایا ہے کہ اہل قرابت کی ایذا رسانی اور ان کے ضرر پہونچانے سے تو ہرگز غم اور خوف مت کھا۔ کیونکہ اللہ تعالٰے مسبب الاسباب ہے وہ ہر طرح ہر شخص کی فکر کرتا ہے۔

ان اشعار کا اثر یہ ہوا کہ جب اُس کے مخالفین نے انھیں سنا تو سب کے سب اس کی ایذا رسانی سے تائب ہوگئے اور پھر ایسی محبت والفت ان سب کے درمیان قائم ہوئی کہ جس کی مثال کم دیکھنے میں آئیگی۔ (مجمع القصائد ابن شجاع)

عربوں کے نزدیک شاعری صرف تفریح کا ایک شغلہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ذریعہ ان کے بڑے بڑے لاینحل عقدے اور پیچیدہ سے پیچیدہ سے پیچیدہ سیاسی، تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل حل ہوا کرتے تھے اور ایسی آسانی سے حل ہوتے جو بغیر اس کے ایسے ہی دشوار اور مشکل تھے جیسے بہتے ہوئے سمندر کو روک لینا یا چلتی ہوئی ہوا کو بند کر دینا چنانچہ شبلی اسلامی عہد کا ایک مشہور و زبردست شاعر اپنے بھائیوں کو شیخ الموحدین (ابی محمد بن نافر جو سلطان تونس پر غالب ہوگیا تھا) کی حمایت کرنے اور ساتھ دینے پر تنبیہ و سرزنش کرتا ہے۔

یقول بلا جهل فتی الجود خالد ۔۔۔ مقالة قوال وقال صواب

ترجمہ خالد جو کہ بھلائیوں کے میدان کا جوانمرد ہے وہ ہمیشہ کہنے والوں کی باتیں پوری عقلمندی اور حکمت سے سنتا ہے اور خود بھی جو بات کہتا ہے وہ نہایت ہی درست ہوا کرتی ہے۔

مقالة حیران بذهن ولم یکن ۔۔۔ هریجا ولا فما یقول ذهاب

"اس کی گفتگو نہایت عاقلانہ ہوا کرتی ہے نہ فضول ہوتی ہے نہ گراہ کن"

غرضکہ اسی طرح وہ آگے بہترین طرز اسلوب اور انتہائی بلاغت کے ساتھ اپنے بھائیوں کے سامنے معاملہ کو پیش کرتا ہے اور پھر پوری حکمت اور عقلمندی سے ان کو زجر و توبیخ کرتا ہے۔ اس قصیدے کی بلاغت کا اثر اس کے مخالف بھائیوں کے دلوں پر یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ شیخ الموحدین کی حمایت سے بلکلیت باز آجاتے ہیں اور آئندہ کے لئے ہر طرح کی امداد و اعانت سے توبہ کرتے ہیں حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے شیخ الموحدین کی اعانت پر قسم کھائی تھی اور شیخ کی طرف سے ان کو بڑے بڑے مناصب پر فائز کرنے کا عہد و پیمان ہوچکا تھا (مجالس الشعرا)۔

ایک خاتون کے چند اشعار

نواحہ نامی ایک عورت قصبہ حوران کی رہنے والی تھی۔ کسی عداوت کی بناء پر دشمن اس کے شوہر کو بیخطا قتل کر دیتے ہیں اس کے غم و غصے میں وہ ایک قصیدہ کہتی ہے جس کے کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔ ان میں اس نے اپنے قبیلہ قیس کو جس خوبی کے ساتھ قصاص لینے پر آمادہ کیا ہے وہ خود اپنی نظیر ہے۔

تقول فتاة الحي ام سلمه ۔۔۔ بعين اداع السرمن لا رنی لها

تبیت بطول اللیل ما تالف الکری ۔۔۔ موجعا کان اشقا فی مجا لها

علی ملجا فی دارها بعیالها ۔۔۔ بلحظاتها عین البین عمیر احالها

ترجمہ اے ام سلمہ! قبیلہ کی جوان عورت اپنی آنکھوں کے ذریعہ سے کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نگرانی کرے جس کا کوئی رونے والا نہیں۔

پوری رات نیند سے ملاقات کے بغیر اور تڑپ تڑپ کر گذار دیتی ہے گویا کہ اس کی آنکھوں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔

یہ سب اس وجہ سے کہ اس کے گھر میں اس کے اہل و عیال پر جو کچھ گذری اور آنکھوں کے سامنے جو کچھ واقع ہوا"۔

اس قصیدہ کو سننا تھا کہ قبیلہ قیس پورا کا پورا آتش غضب بن گیا اور ان کا بچہ بچہ بھوکا شیر نظر آنے لگا۔ اس کے بعد اس شدت سے جنگ و جدال کا بازار گرم ہوا کہ آسمان و زمین لرز اٹھے۔ اس واقعہ سے جہاں فصاحت و بلاغت پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ عربوں کا شاعرانہ ذوق اس قدر عروج پر تھا کہ ان کی عورتیں بھی اس قدر قادر الکلام اور فصیحہ و بلیغہ ہوا کرتی تھیں کہ صرف ایک قبیلہ کو اپنا ہم خیال کر لیا کرتی تھیں (تاریخ الشعراء)۔

عرب اپنے اشعار سے وہ کام لیا کرتے جو بادشاہ اپنی پوری فوج سے بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اور ان کے ذریعہ قلوب کو وہ اس طرح مسخر و مطیع کرتے کہ من مانی بات پوری کرا لیتے اور بڑے بڑے سلاطین و امراء کو اپنے قصائد کے آگے زیر و زبر کیا کرتے۔

ابتدائے اسلام میں مرد و عورت ساتھ ہی خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ یہ بات ایک غیور اور خود دار شاعر کو بہت ہی ناگوار گذرتی ہے۔ بالآخر تنگ آکر وہ اپنے سحر کار کلام سے کام لیتا ہے۔ گورنر مکہ خالد بن عبد اللہ ہیں۔ سلیمان بن عبد الملک کا عہد حکومت ہے گورنر مکہ کے کانوں تک یہ اشعار پہنچتے ہیں۔

یاحبذ الموسم من موقف ۔۔۔ وحبذ الکعبة من المسجد

وحبذ الانی یزاحمنا ۔۔۔ عند استلام الحجر الاسود

ترجمہ کیسا پیارا ہے موسم اور کیسی پیاری ہے مسجد اور کیا اچھی ہیں وہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت ہم کو گھیر لیتی ہیں"۔

خالد بن عبد اللہ نے ان اشعار کو سن کر فرمایا کہ خبر اب آئندہ وہ تم کو نہیں گھیر کرینگی اور اسی وقت سے اس نے یہ حکم دیدیا کہ اب طواف کعبہ کے وقت مرد و عورت جمع نہیں ہو سکتے"۔ وہ تاریخ ہے اور آج کا دن پھر مرد و عورت

ساتھ مل کر طواف نہ کر سکے۔ یہ تھا شاعرانہ ذوق اور یہ تھا کلام کا جادو کہ جس سے خالد جیسے سخت دل آدمی کا دل بھی موم ہو گیا۔ کیا اس کی مثال دنیا کی کسی اور قوم میں مل سکتی ہے کہ کسی شاعر کے صرف دو شعر نے کسی سخت حاکم کو قدیم ترین رواج کو بدل دینے پر مجبور کر دیا۔

کمال بلاغت کی کچھ اور مثالیں!

عراق کا ایک تاجر مدینے آتا ہے اور جتنے نقاب اس کے پاس ہیں سب کو فروخت کر دیتا ہے لیکن سیاہ نقابوں کا ایک انبار رہ جاتا ہے جن کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تاجر سخت حیران ہوتا ہے بالآخر مدینے کے مشہور شاعر مسکین الدارمی کے پاس جاتا ہے جو ان دنوں شعر و شاعری کے شغلہ کو چھوڑ کر مسجد میں زہد و تقویٰ کی زندگانی گذارتے تھے۔

تاجر نے ان کو سارا حال سنایا اور درخواست کی کہ ان سیاہ نقابوں کی فروختگی کا کوئی سامان کریں۔ یہ سن کر شاعر موصوف سخت متفکر ہوئے۔ بالآخر انھوں نے اپنے ایک دوست کو ذیل کے اشعار لکھ کر دیدیئے اور فرمایا کہ ان کو مدینہ کی گلیوں میں پڑھ کر سنا دیں۔

قل للمليحة فی الخمار الاسود ماذا فعلت براهب متعبد
قد کان شمر للعلاق ثيابه حتی خطرت له بباب المسجد
ردی علیه صیامه و صلاته لا تقتله بحق دین محمدؐ

اس معشوق ملیح رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہدو کہ یہ تو نے ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا ہے۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کے لئے ایک گوشہ مسجد میں بیٹھ رہا تھا کہ دفعتہً تو سامنے آ گئی اور نماز و روزہ سب غارت کر دیا۔ پھر تجھے واسطہ ہے اے حسینہ دین محمد صلعم کا کہ تو اسے کہیں قتل نہ کر دینا۔ جس وقت یہ اشعار مدینہ کی گلیوں میں گونجتے ہیں سب کو یقین ہو جاتا ہے کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب پوش والی حسینہ پر عاشق ہو گیا ہے اور زہد و تقویٰ کے لبادہ کو اتار کر عشق و رند کے لباس کو زیب تن کر لیا ہے۔ پھر سارے مدینہ کی لڑکیاں اور نوجوان عورتیں سیاہ نقاب کو خرید کر پہنتی ہیں اور اسی دن سے سیاہ نقاب عورتوں کے فیشن میں داخل ہو جاتی ہے۔

عربوں کا دستور تھا کہ وہ مسجد کے بلند میناروں پر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے ایک دن خراسان کے گورنر کے کانوں میں یہ اشعار پڑے۔

لیتنی فی المؤذنین حیاتی انهم یبصرون من فی السطوح
فیشیرون او تشیر الیهم بالهوی من کل ذات الملیح

ترجمہ کاش میں بھی ان موذنین میں سے ہوتا جو کھڑے ہو کر ان اونچے اونچے میناروں سے آس پاس کی چھتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور وہیں سے عشوہ طراز ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں۔" یہ اشعار سن کر حاکم نے موذنین کو میناروں پر کھڑے ہو کر اذان دینے سے منع کر دیا اور اسی دن سے میناروں پر کھڑے ہو کر اذان دینا موقوف ہو گیا۔ (کتاب الادب)

فن شاعری میں عربوں کی ایجادات!

عربوں نے اپنی قوت اجتہادی اور ملکہ تفکر سے کام لے کر شعر و شاعری میں زبردست ایجادات کیں اور ایسی ایجادات کہ ان کی نظیر آج تک کسی قوم میں نہیں مل سکی۔ عربوں کی ان مشہور ایجادات میں سے ایک موشح نظمیں بھی ہیں۔ نظموں کی یہ قسم اندلس کے عربوں نے ایجاد کی جبکہ ان کی سلطنت کا ستارہ عروج پر تھا اور اندلس میں انھیں کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ قسم ایک لحاظ سے اور بھی اہم ہو جاتی ہے جبکہ اس کو سلطنت اندلس کی ایک غیر فانی یادگار قرار دیں۔

موشح کی مقبولیت اور عربوں کا انہماک!

اس نظم میں کئی ٹکڑے ہوتے ہیں اور ٹکڑے کا قافیہ دوسرے شعر کے ٹکڑے سے ٹکراتا ہے۔ ہر مصرعے میں عموماً چار ٹکڑے ہوتے ہیں اور ہر چوتھے مصرعے کا قافیہ تینوں سے الگ ہوتا ہے اس میں ہر قسم کے مطالب ادا کئے گئے اور یہ اس قدر مقبول اور مشہور ہوئی کہ اس میں عام الناس تک طبع آزمائی کرنے لگے۔ اس خاص قسم کا موجد مقدم بن معاصر الفریدی ہے جو امیر عبداللہ بن محمد المروانی کا خاص شاعر تھا۔ اس نے اس فن کو عبداللہ ابن عبد ربہ صاحب عقد الفرید سے سیکھا۔ اور عبادۃ القزاز جو امیر المعتصم بن حماد رح کے دربار کے افسر الشعراء تھے ان کو عروج اور کمال کے مراتب عالیہ پر فائز کیا۔ ہم اس موقع پر چند شعر نقل کرتے ہیں۔ اعمیٰ طلیطلی جو مشہور شاعر تھا کہتا ہے ؎

کیف السبیل الی صبری و فی المعالم اشجان
والرکب فی وسط الفلا بالخرد والنواعم قد بان

"میں صبر کیسے کر سکتا ہوں حالانکہ میری رگ رگ میں عشق کی گرم بازاری ہے۔ شہسوار ڈھلواں میدان میں ہیں اور باکرہ دوشیزگان اپنے پورے حسن اور رعنائی سے ظاہر ہو چکی ہیں۔" (سر البلاغۃ)

اکثر مشایخ کا بیان ہے کہ ایک دن رشح گو شاعروں نے مشاعرہ کیا۔

اور مشاعرہ کے لئے اس زمانہ کا سب سے مشہور مقام اشبیلیہ تھا جہاں کہ علماء و فضلا کی بیشمار تعداد موجود تھی۔ بادشاہ وقت کی صدارت میں مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس وقت ملک کے شاعر اعظم اعمٰی نے ذیل کا موشح پڑھا سارا مجمع حیران و ششدر رہ گیا اور وہ یہ ہے۔

ضاحکٌ عن جمالِ سافرٌ عن دُرٍّ ضاق عنہ الزمانُ وحواہ صدری

"ہنسنے والا ہے موتیوں کی قطار سے اور روشنی نکالنے والا ہے موتیوں کے انبار سے۔ زمانہ اس سے تنگ آگیا ہے اور میرا سینہ باوجود وسعت کے اس کی فراخی محبت سے ضیق میں ہے"

ابن بقی جو زبردست شاعر اور ادیب گذرا ہے اس نے جب اس موشح کو سنا تو پھر سال بھر کا اپنا تیار کیا ہوا موشح نہ پڑھا اور کہنے لگا کہ اس موشح کے بعد پھر کچھ پڑھنا گویا کہ منہ چڑھانا ہے۔ اس کے یہ الفاظ پورے طور پر نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ سارے شعراء نے اپنے محنت سے تیار کئے ہوئے کلام کو پھاڑ ڈالا کہ اس موشح کے بعد واقعی سب ہیچ ہیں۔ (مقدمہ تاریخ العلامہ ابن خلدون)۔

حکیم ابن ماجہ المغربی جو کئی راگوں کا بھی موجد تھا۔ مخدوم ابن تیلغویت صاحب سراقوسہ کے دربار میں حاضر ہوا اور ذیل کا موشح جس کا ابتدائی شعر یہ ہے اپنی کنیز سے کہلوایا۔

جرّ الذیل ایما جر وصل الشکر منک بالشکر

عقد اللہ رایت النصر لامیر العلاء ابی بکر

جس وقت اس قصیدے کو ابن تیلغویت نے سنا تو کپڑے پھاڑ ڈالے اور بیخود ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ہوش میں آیا تو درباریوں کو حکم دیا کہ اس شاعر کو سونے پر اس کے گھر پہونچاؤ۔ حکم کے ساتھ ہی درباریوں نے دربار سے لے کر شاعر کے مکان تک سونے کا انبار لگا دیا اور وہ تمام سونا جو کروڑوں کی مالیت کا تھا۔ سب کا سب صرف ایک قصیدے کے عوض میں شاعر کو دیدیا گیا۔

دنیا میں ہزارہا قومیں گزریں اور ان میں لاکھوں شعرا پیدا ہوئے مگر کیا آپ کسی اور شاعر کے قصیدے کی اتنی قیمت بتا سکتے ہیں کہ صرف ایک قصیدے کے عوض میں منوں سونا مل گیا ہو؟۔

زجل، موالی، اور قوما

نظمین! عربوں نے ان کے علاوہ بھی اور اقسام ایجاد کئے۔ منجملہ ان کے ایک مشہور قسم زجل ہے جو عربوں کی قدیم شاعری کی یادگار رہے۔ اس کا موجد ابن قزمان ہے

اس میں دو دو تین تین شعروں کے قوافی طاق طاق مصرعوں سے اور جفت جفت مصرعوں سے جوڑ کھاتے ہیں۔ اس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

آبکاتی لشاطی النہر نوح الحمام

علی الغصن فی البستان قریب الصباح

وکف السحر یمحو مداد الظلام

وماء الذی یجری بسغر الاقاح

باکرت الریاض والطل فیہا افتراق

سر الجواہر فی نحور الجوار

ترجمہ: مجھکو نہر کے کنارے سرسبز شاخوں پر بیٹھی ہوئی صبح صادق کے وقت قمری کے رونے نے رلا دیا۔

جبکہ سحر اپنی روشنی سے رات کی تاریکیوں کو پھاڑ رہی تھی نہر کا پانی خراماں خراماں اپنے حدود میں گلاب کے پھولوں سے ہو کر بہہ رہا تھا۔

صبح کو پھول تر و تازہ اور شگفتہ تھے اور شبنم ان پر اس طرح چمک رہی تھی جیسے خوبصورت جوان باکرہ لڑکیوں کے سینہ پر موتیوں کے ہار۔

عربوں نے ان کے علاوہ ایک قسم اور ایجاد کی جس کو بغدادی مواَلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مشہور و معروف قسم قوما بھی ہے۔ شعراء کا بیان ہے کہ اس قسم سے زیادہ اور کسی قسم میں سلیس بلاغت نہیں پائی جاتی ہے

علامہ علی بن الموذن سلیمان نے جو دربار شاہی سے امام الشعراء کے معزز لقب سے ملقب تھے اقسام نظم میں سے اس نظم کو بہت پسند کیا ہے۔ اور اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ہم انھیں کی کتاب سے ذیل کے چند اشعار نقل کرتے ہیں ؎

طرقت باب الخبا قالت من الطارق

فقلت مفتون لا ناہب ولا سارق

تبسمت لاح لی من ثغرہا بارق،

رجعت حیران فی بحر ادمعی غارق

میں نے باغ کے دروازے کو رات میں کھٹکھٹایا تو معشوقہ نے کہا۔ کون ہے؟ میں نے کہا تیرا مجنون ہے نہ چور ہے نہ ڈاکو۔ (یہ سنکر) وہ مسکرائی تو مجھ کو اس کے دانتوں کی چمک نظر پڑی اور وہ لوٹ گئی۔ مجھکو میرے آنسوؤں

کے سمندر میں غرق کرتے ہوئے (تذکرہ علی بن موذن)

ہم نے عربوں کے بیشمار دیوانوں سے اس جگہ صرف چند اشعار قلت وقت کی وجہ سے بطور نمونہ لکھدیئے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عربوں میں شاعری کا کیسا ذوق تھا اور انھوں نے فن شاعری کو کس قدر ترقی دی۔ کیسے کیسے شعرا پیدا کئے اور کیا کیا خدمتیں اور ایجادیں کیں۔ اگر موقع ملا تو انشاء اللہ آئندہ کسی پرچہ میں عربوں کی دیگر ایجادات جو انھوں نے فن شاعری میں کی ہیں بتفصیل پیش کی جاوینگی۔

عبد القیوم ندوی

عرضِ حال

از مولٰنا یوسف سلیم صاحب چشتی بی-اے

ستمگر، بیوفا، عیّار نے وعدے کئے برسوں
دلِ فرقت زدہ کو ہم نے بہلاوے دیئے برسوں

ادا کچھ ایسی بھائی اُن کے خنجر آزمانے کی
کہ زخمِ جانستاں کھانے پہ بھی تڑپا کئے برسوں

ہوا پیدا نہ وہ اندازِ مستی کا طبیعت میں
نشیلی انکھڑیوں کی یاد میں ساغر پیئے برسوں

تغافل کا سبب دریافت کرنے پر جو دکھلادی
تو اُس تصویر کے حوروں نے بھی بوسے لئے برسوں

غرض یہ تھی کہ پہلی دید کا نقشہ رہے قائم
گریباں اور دامن کے وہی ٹکڑے سیئے برسوں

وفورِ آرزو سے بیخودی ایسی ہوئی طاری
کہ نقشِ پا کے مٹ جانے پہ بھی سجدے کئے برسوں

سوالِ داورِ محشر پہ ہم کہدینگے اے یوسف
ستم ہم نے سہے برسوں ستم اُس نے کئے برسوں

سنجوگ

ایک دردانگیز مختصر افسانہ

مولانا امیہ اللہ آسی رام نگری

شیامانے بڑے حوصلے سے بناؤ سنگار کیا اور چھت پر آبیٹھی۔ اسے یقین ہورہا تھا کہ آج اپنے بناؤ سنگار اور رنگ وروپ کی بدولت کچھ نہ کچھ ضرور وصول کرلے گی ـــــ پچھلے دو دن اس نے بڑی تکلیف سے کاٹے تھے۔ وہ غریب بھارت کی نردھن بیوا ہے۔ نہ اس کے پاس اچھے گہنے اور کپڑے ہیں نہ رہنے کے لئے موزوں کوٹھا۔ پھر بھی وہ بسوا ہے اور اپنے قدرتی رنگ وروپ کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح پیٹ کی آگ بجھالیتی ہے۔

سردیوں کی تاریک رات ہے۔ وہ تنہا چھت پر بیٹھی ہوئی کشادہ سڑک پر آنے جانے والوں پر للچائی ہوئی نگاہ ڈال رہی ہے۔ دل میں ایک ہلچل سی مچ رہی ہے۔ "اگر آج بھی کچھ نہ ملا تو......؟" ساتھ ہی سامنے کے کوٹھے سے گانے کی رسیلی آواز کانوں میں آتی ہے اور اس کے کانوں میں تیر کی طرح پیوست ہوتی ہے۔ وہ سوچتی ہے۔ کاش اس خوش نصیب طوائف کی جگہ میں ہوتی.....؟"

ایک لامعلوم دردوکرب سے مضطرب ہوکر اور کچھ کھوئی ہوئی سی جیوں کی توں رہ جاتی ہے۔ بازار میں اب بھی چہل پہل ہے۔ بجلی کی روشنی رات کو دن بنا رہی ہے۔ گھوڑا گاڑی۔ موٹروں اور سائیکلوں کی بھرمار سے ایک ہنگامہ برپا ہے۔ اور........

ٹن... ٹن.... ٹن..... نیچے دوکان میں لگی ہوئی گھڑی سے آواز آئی۔ شیاما چونکی۔ اُف گیارہ بج گئے ـــــ؟ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ آہ اب کیا کرے۔ ابھی تک ایک پیسے کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور گھر میں کھانے کے نام سے ایک دانہ بھی نہیں۔

شیاما سردی کے ساتھ جیسے ستیاگرہ کر رہی ہو۔ تیر کی طرح آنے والی ٹھنڈی ہوا اس کے دل کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ مایوس نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہی تھی۔ مسکراتی اور مدھ بھری نینوں کے بان چلاتی۔ مگر........؟

اس کے ٹمٹماتے دیا کی دُھندلی روشنی سے منحوس بنے ہوئے کوٹھے پر کون سر پھرا آئے؟ دنیا تو آن بان اور چمک دمک کی پجاری ہے۔ جن کی جیبوں میں پیسے اور گرہ میں دام ہیں انھیں کیا غرض پڑی ہے کہ بناوٹ اور سجاوٹ سے دلھن بنے ہوئے کوٹھے چھوڑ کر اس خانقاہ میں آئیں۔

اس نے سنا سامنے کے کوٹھے سے روپیوں کے کھنکنے کی آواز آرہی ہے۔ ایک ساتھ پچاس روپے جیسے تھالی میں کود رہے ہوں۔ شیاما سوچنے لگی۔ آہ! میں ایک روپے کیلئے بلکہ.... مٹھی بھر دانے کے لئے اس سخت سردی میں جان دے رہی ہوں، کیا آج بھی سچ مچ کچھ نہ آئیگا؟ ـــــ اُف! مایوسیوں کا یہ ناقابل برداشت بوجھ کون اُٹھائے۔ اچھا کوئی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ دل میں ہزاروں تمنائیں لئے ہوئے وہ لپک کر کوٹھے میں گھس گئی۔ لیکن یہ کیا....؟ دھت دھت، ہٹ، کتا گھس آیا۔

شیاما مایوسیوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوب رہی تھی، آہ کیا اسے کتے کی بھی آؤبھگت کرنی ہوگی؟ وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

اُف! وہ دیکھو سامنے کوٹھے پر وہ بڑے سیٹھ جی براج رہے ہیں۔ "یہ کواڑ بند کردو" کی آواز آتے ہی فوراً دروازے بند ہوگئے اور چند لمحوں کے بعد قہقہوں کی بلند آواز سے کوٹھا گونج اُٹھا۔

دیکھتے دیکھتے سارے کوٹھے بند ہوگئے۔ بازار سرد پڑ گیا۔ ہر طرف نہایت سرعت سے خاموشی کا تسلط ہورہا تھا۔ لیکن شیاما اب بھی ٹکٹکی لگائے امید وبیم

کے جھولے میں جھول رہی ہے۔ اس کے دل میں ایک ہنگامہ سا برپا ہے۔ کیا اسی طرح روز بھوکوں مرنا ہوگا۔۔۔۔؟ آہ وہ بھی کیسے دن تھے جب ماں، باپ، بھائی بند اور "وہ" موجود تھے۔ پھر بیوہ ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد ماں باپ بھی مرگئے اور میں۔۔۔۔ اپنا منہ کالا کر کے خود غرض راہو کے ساتھ۔۔۔۔۔!

وہ سوچتے سوچتے اپنی بدحالی پر رو پڑی اور دل بہلانے کے لئے اٹھ کر کوٹھے میں چہل قدمی کرنے لگی۔ اس طرح بھی دل نہ بہل سکا تو پھر چھت پر آئی۔ نیچے سڑک پر تانگہ کھڑا تھا۔ "یہ لو پیسے" کہتا ہوا ایک نوجوان اتر پڑا۔

"کیا کھڑا رہوں بابوجی؟" تانگے والے نے لجاجت سے پوچھا۔

"نہیں" کہتا ہوا نوجوان تیزی سے شیاما کی کوٹھے کی طرف بڑھا۔ کیا سچ مچ شیاما کا اندازہ آج صحیح ہوگا؟ وہ خوشی سے پاگل ہوگئی۔ "ف رات کے ساڑھے بارہ بجے اس کی قسمت جاگی ۔۔۔؟ شاید سینما دیکھ کر لوٹے ہیں۔ بڑے آدمی ہیں وغیرہ۔۔۔۔۔۔" سینکڑوں خیالات فلم کی تصویروں کی طرح شیاما کی نظر تصور کے سامنے پھر گئے۔

"آیئے، تشریف رکھئے۔۔" شیاما نے اپنی مسرت کو دباتے ہوئے کہا لیکن گھگیا کر کہا

"پربھا۔۔۔ بہن پربھا۔۔۔!۔۔۔ تم یہاں کہاں؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج شیاما عالم خود رفتگی میں جان دے دیگی۔ وہ آنکھوں سے۔ دل سے، آواز سے بلکہ ہر ہر رونگٹے سے رو رہی تھی۔ اور ایک مدت سے بچا کر رکھے ہوئے آنسوؤں کے موتیوں کو بھائی کے چمکیلے بوٹ پر نثار کرنے لگی۔

نوجوان کا دل بیک وقت نفرت و محبت اور حیرت و ندامت کے مختلف و متضاد جذبات کا آماجگاہ بن رہا تھا۔

آسی رام نگری

تدبیر و تقدیر

مصور قلم حضرت باسط بسوانی

کون سا پہلو نکالوں آج میں تحریر کا
مسئلہ حل جس سے ہو تدبیر کا تقدیر کا

کوئی اس دار العمل میں پیرو تدبیر ہے
کوئی قسمت پر ہے شاکر قایل تقدیر ہے

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں
ہر عمل کے واسطے یہ واقعی مقسوم ہیں

صرف کر تو اپنی قوت ہر طرح تدبیر پر
اور انجام عمل کو چھوڑ دے تقدیر پر

تیر مارے تو نشانے پر یہ تیرا کام ہے
اور جو انجام ہو تقدیر اس کا نام ہے

لابدی سعی عمل ہے لازمی تدبیر ہے
اس سے تو غافل نہ ہو آگے تری تقدیر ہے

زعم کوشش پر نہ کر تو بندۂ مجبور ہے
"بندگی بیچارگی" باسط بہت مشہور ہے

شہید آرزو

محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی

"کیوں ڈاکٹر صاحب سچ بتائیے اباجان روبہ صحت ہو جائیں گے یا نہیں" خالدہ نے مایوسانہ انداز میں پوچھا اور اس کی آنکھوں سے اشک کے چند قطرے اس کے عارض گلگوں پر بہنے لگے۔ ڈاکٹر رشید گو مریض کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا تاہم خالدہ کی دلجوئی کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں۔ خالدہ تم گھبراتی کیوں ہو؟ تمہارے والد صاحب بہت جلد صحتیاب ہو جائیں گے۔ مرض کوئی ایسا تشویش ناک نہیں ہے۔"

خالدہ نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے باپ کے پژمردہ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ چند لمحہ کے لئے تخیلات کی دنیا میں گم ہو گئی۔ وہ اپنی آئندہ کتاب زندگی کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس کی طبیعت گھبرا رہی تھی۔ دل زور زور دھڑک رہا تھا۔

"اچھا رخصت"۔ رشید کی نرم آواز نے خالدہ کے خیالات کا طلسم توڑا۔ وہ چونک کر کرسی سے اٹھی اور بیس روپیہ کے "نوٹ" رشید کی طرف بڑھائے۔

رشید نے متبسم نظروں سے خالدہ کی طرف دیکھا اور یہ کہتے ہوئے "نہیں آپ اپنے ہی پاس رکھئے" آہستہ سے دروازہ سے باہر نکل گیا۔

خالدہ بیحد پریشان تھی۔ اس کو باپ کی زیست سے ناامیدی ہو چکی تھی۔ اس کا دماغ طرح طرح کے خیالات کا مسکن بنا ہوا تھا۔ وہ دفعتاً چونکی اس کے دماغ کے پردہ پر باپ کی نیم مردہ تصویر آگئی۔ وہ گھبرائی ہوئی باپ کے قریب گئی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آنسوؤں کے قطرے اس کے پھول سے رخساروں پر گوہر آبدار کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہوئے مرمریں ہاتھ سے باپ کے چہرہ سے چادر اٹھائی اور آنچل سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا۔ مریض نے آنکھیں کھولیں حسرت سے خالدہ کی طرف دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر مریض نے آنکھیں بند کر لیں اور تمام کمرہ میں خاموشی چھا گئی۔ خالدہ اسی جگہ بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد گھڑی نے دو بجائے خالدہ اٹھی اور اس نے میز پر سے ایک شیشی اٹھا کر ایک خوراک دوا باپ کے منہ میں ڈالی۔ تھوڑی دیر بعد مریض نے آنکھیں کھولیں۔ اور نحیف آواز میں کہنا شروع کیا۔

"بیٹی خالدہ۔ یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہیں۔ اب میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں۔ پیاری خالدہ تم مجھ کو بھول جانے کی کوشش کرنا۔ میری یاد کو اپنے عیش و آرام میں مخل نہ ہونے دینا۔ پیاری بیٹی گھبرانا نہیں میں تمہارے لئے کافی دولت چھوڑ رہا ہوں۔ جو تمہاری زندگی عیش سے گذارنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم تمہاری تنہائی کا خیال مجھے پریشان کر رہا ہے لیکن کیا کیا جائے "حکم ایزدی" ہے۔ پیاری خالدہ میری ایک آخری وصیت ہے۔ تم تاعمر کسی کو اپنا شریک حیات نہ بنانا"۔ خالدہ اس فقرے سے چونکی اور باپ کے چہرہ کی طرف دیکھا لیکن پھر شرم سے گردن جھکالی "خالدہ۔ دیکھو مرد بیوفا ہوتے ہیں۔ ان کی محبت جھوٹی ہوتی ہے۔ ان کے وعدے غلط۔ پیاری خالدہ تم کو تعجب ہوگا کہ تم میری زبان سے ایسی باتیں سن رہی ہو۔ میں تم کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو میں نے اس طویل عمر میں ایک معصوم ہستی کی زندگی سے حاصل کی۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو ایک ناقابل معافی جرم ہوگا" یکایک مریض کی آنکھیں پتھرا گئیں اور اس کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

خالدہ باپ کی ان باتوں کا کوئی مطلب نہ سمجھ سکی۔

۲

ایک صبح جبکہ خورشید تاباں بستر استراحت سے بیدار ہو کر چمن، مشرق سے نور کے پھولوں کی بارش کر رہا تھا۔ خالدہ نے کمرہ کا دروازہ کھولا، اور ایک نگاہ جانب مشرق ڈالی نسیم سحر کے سرد اور معطر جھونکوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن وہ کسی طرف بھی متوجہ نہ ہوئی۔ وہ اپنے تمام اعضاء میں ناقابل بیان شکستگی محسوس کر رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی غزالیں آنکھیں کثرت گریہ سے بے رونق تھیں۔ اس کے سیاہ دراز گیسو بے ترتیبی سے اس کی کندنی پیشانی اور گلگوں رخساروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کوچ پر لیٹ گئی۔

اب خالدہ کی زندگی اس پھول کے مانند تھی جو تمازت آفتاب سے پژمردہ ہوگیا ہو۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ وہ جس محور کے گرد حرکت کر رہی تھی وہ ایک نقطے سے بھی زیادہ مختصر تھا۔ آرام، عیش و مسرت جس کو اس نے بحر ناپیدا کنار تصور کر رکھا تھا ایک جلوۂ سراب سے بھی زیادہ بے حقیقت۔ سورج آہستہ آہستہ اوپر چڑھ آگیا اس کی حسین کرنیں دریچے سے چھن چھن کر خالدہ کے گلابی رخساروں پر عقیدت کے پھول چڑھا رہی تھیں۔ لیکن وہ اسی جگہ بے حس پڑی تھی۔

یکایک دروازہ کا پردہ اٹھا اور رشید کمرہ میں داخل ہوا۔ خالدہ اسکے استقبال کے لئے کھڑی ہوگئی۔ رشید نے مغموم نظروں سے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "خالدہ، کیا تم رو رہی ہو؟"

خالدہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے جواب دیا "آہ۔ ڈاکٹر صاحب میں بہت بدنصیب ہوں۔ میری کشتیٔ عشرت ناامیدی کے پہاڑ سے ٹکرا کر، چکنا چور ہوگئی ہے۔ پریشانیوں کا سمندر امنڈا چلا آرہا ہے۔ آہ۔ میں اس سنسار میں بالکل تنہا ہوں۔ کوئی بھی میرا شریک غم نہیں۔ مگر نہیں۔ نہیں میرے آنسو میرے شریک غم ہیں"۔

"نہیں۔ خالدہ۔ گھبراؤ نہیں۔ صبر کرو اور دامن استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ خدا تمھارا ساتھ دے گا" رشید نے بہت ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن اب میری زندگی بے کیف ہو چکی ہے۔ میرے لئے کوئی چیز جاذب توجہ نہیں اس لئے کہ اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں"۔ شدت غم سے خالدہ کی آواز رک گئی۔ رشید نے اس کی حالت سے متاثر ہو کر فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا اور ادھر ادھر کی باتوں میں خالدہ کا دل بہلانے لگا۔

۳

اب عزیز کی موت کو ایک سال کا طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ خالدہ کے دماغ سے باپ کی تصویر اب بہت دھندلی ہوگئی تھی۔ وہ اب باپ کی اس آخری وصیت کو بھی فراموش کر چکی تھی۔ اس کی زندگی کے خوبصورت لمحات رشید کی، صحبت میں بسر ہونے لگے۔ پہلے پہلے خالدہ باپ کی اس "انوکھی" وصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے رشید کی ہر درخواست کو ٹھکراتی رہی۔ لیکن پھر اس کو لغو اور بے معنی تصور کر کے رشید کو اپنے دل میں جگہ دی۔

آج خالدہ کی شادی کا دن تھا۔ طلوع آفتاب سے قبل وہ خوبصورت ساری میں ملبوس باغ میں گلاب کے ایک شاداب تختہ پر ٹہل رہی تھی جہاں حسین پھولوں پر باغ کی زینت تیتریاں اپنے منقش پر پھیلائے بیٹھی تھیں۔ کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ کیف سرمدی کے قدرتی نغمے تماشا گاہ عالم میں ترنم ریز ہو کر ہر دل کو "کیف سحر" کے حیات آگیں چشمے میں غرق کر رہے تھے۔ خالدہ اپنے خوشگوار مستقبل کے خیال میں محو تھی۔ اس نے اپنی شومیٔ قسمت کا نعم البدل پالیا تھا اس نے اپنی معصومیت میں مضراب خوشی سے رباب زندگی میں وہ دلکش نغمے پیدا کرنے چاہے جو اس کی طاقت سے باہر تھے۔ تاہم وہ اس وقت اپنے کو دنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب دوشیزہ تصور کر رہی تھی۔ آہ۔ اس کو خبر نہ تھی کہ اس کے حیات کے بربط کا تار مضراب زمانہ کی ایک ہی زد سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ دفعتاً وہ اس خواب شیریں سے چونکی اس کو اپنے مرحوم باپ کی دی ہوئی وہ خوبصورت صندلی صندوقچی یاد آئی جس کو دے کر اس نے وصیت کی تھی "میرے مرنے کے بعد کھولنا"۔

خالدہ فوراً باغ سے واپس آئی اور اس صندوقچی کو کھولا۔ اس میں سے ایک لفافہ نکلا۔ یہ لفافہ ان رازوں کا حامل تھا جو اس کی آنکھ بند ہو جانے کے بعد بھی سربستہ رہ جائے۔ خالدہ نے گھبرا کر لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

بیٹی خالدہ۔ ہمیشہ خوش رہو۔!!!

آج میں اپنے دل کے ان رازوں کو صفحہ قرطاس پر پھیلا رہا ہوں۔۔۔

جن کو اپنی زندگی میں بھی کبھی نوک زبان پر نہ لا سکتا تھا۔ زندگی ہی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس راز کو افشا نہ کرتا۔ چونکہ اس داستان غم سے تمہارا بھی تعلق ہے، اس لئے ان واقعات کو تم سے پوشیدہ رکھنا میرے نزدیک ایک اخلاقی جرم ہوگا۔ پیاری خالدہ۔ میں نے ہمیشہ تم پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں اُن کی محبت محض "فریب نظر"۔ تم بجائے کچھ جواب دینے کے متحیر ہو کر میرا منہ تکنے لگتیں۔ شاید تم اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں۔ اور سمجھتی بھی کس طرح تمہارا بچپن تھا۔ تم زمانہ کے نشیب و فراز سے ناآشنا تھیں۔ تم کو میری آخری وصیت بھی یاد ہوگی۔ وہ بھی تمہارے لئے معمہ ہوگی۔ اچھا سنو خالدہ اور اپنی مظلوم جنس کے حال زار پر ماتم کرو۔ اور خود ہی فیصلہ کرو کہ مرد بے وفا ہے یا باوفا ——————

پیاری خالدہ میرا روز کا معمول تھا کہ شام کو کھانا کھا کر سندر باغ میں ٹہلنے جایا کرتا تھا۔ چنانچہ حسب معمول ایک روز میں وہاں گیا۔ باغ میں چند دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ ادھر اُدھر کی باتوں میں تقریباً گیارہ بج گئے اب میں گھر واپس آرہا تھا۔ فضا پر غضب کا نکھار تھا۔ چاند نے اپنی نورانی چادر میں ساری فضا کو ڈھانپ رکھا تھا۔ آسمان کی نیلگوں چادر پر جابجا ستارے شکستہ ہار کے موتیوں کی طرح بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ دفعتاً میرے قدم رک گئے کسی کے آہستہ آہستہ کراہنے کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا لیکن پتہ نہ چلا۔ اب آواز بھی بند ہو چکی تھی۔ میں بدستور چلا جا رہا تھا۔ معاً کسی نامعلوم چیز سے میرا پیر ٹکرایا۔ میں رک گیا اور اس کو بغور دیکھا۔ اُف۔ یہ ایک عورت کی لاش تھی۔ میرا جسم شل ہوگیا۔ ہاتھ پیر سرد ہونے لگے۔ میں نے چاہا کہ وہاں سے فرار ہو جاؤں مبادا کوئی آفت پیش آئے۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا لیکن میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی میں پھر واپس آیا اور لاش کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ حسین عورت مردہ نہ تھی بلکہ بے ہوش تھی۔ میں اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اور رومال سے اس کے پژمردہ چہرہ کو ہوا کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد عورت نے آنکھیں، کھول دیں۔ اور حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ اس وقت میری کیا حالت تھی؟ آہ۔ خالدہ شدت غم سے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میں کس طرح ان واقعات کو قلم بند کروں۔ پیاری بیٹی میں اس معصوم عورت کو وہاں سے اٹھا کر پوشیدہ طور سے ہسپتال لے گیا۔ ہسپتال پہنچ کر اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ اب خالدہ اس بےگناہ ہستی کی وہ پرسوز داستان سنو جس نے مجھے اس رنگین دنیا سے متنفر کر دیا۔

جان سے زیادہ عزیز خالدہ۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ فضا پر ایک عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ وہ بدنصیب عورت۔ آنکھیں بند کئے چارپائی پر لیٹی کراہ رہی تھی۔ دفعتاً اس نے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں کھولیں اور حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے"؟

مریضہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر پوچھا "کیا کچھ زیادہ تکلیف ہے"؟

مریضہ نے بہت نحیف آواز میں جواب دیا "نہیں"۔ دیوار پر لگی ہوئی کلاک نے بارہ بجائے اب پورے چار گھنٹے گذر چکے تھے۔ میں نے شیشی سے دوا پلٹی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دوا پی لیجئے"۔

مریضہ نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور جواب دیا "نہیں"۔

میں نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا "آپ جلد تندرست ہو جائیں گی گھبرائیے نہیں"۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی لیکن پھر بھرائی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولی۔ آہ۔ اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ میں اس فریبی دنیا کا شکار ہو چکی ہوں اب میرا مر جانا ہی میرے لئے زندگی ہے۔

اتنا کہکر مریضہ کی آواز رک گئی شاید وہ اپنے گذشتہ زندگی کے ہیبتناک واقعات کو یکجا کر رہی تھی۔

اب رات کافی گذر چکی تھی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ کھیتوں اور میدانوں میں دھوپ سی چاندنی پھیل رہی تھی۔ نور کا ایک سیلاب آگیا تھا۔ آہ۔ اس کی روشنی میں کس بلا کا سکون تھا۔ ساری دنیا خواب راحت کے مزے لے رہی تھی۔ مگر آہ۔ میرے قلب کو سکون نہ تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں گھڑی نے ایک بجایا۔ جس نے فضا کے خاموش نظام کو درہم برہم کر دیا۔ گھنٹہ کی آواز سے مریضہ چونک پڑی۔

"کیا آپ ابھی تک سوئے نہیں"؟ مریضہ نے نحیف آواز میں کہا۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا۔ اجنبی۔ ہمدرد اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ہوں۔ یہ بچی آپ کے سپرد ہے۔ جب تک زندہ رہے آپ اس کو اپنی اولاد تصور کریں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ اپنی بے کیف زندگی کی پُردرد کہانی آپ کو سنا کر اپنے دل کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تپش کم کروں"۔

میں مجسم حیرت بنا اس کی طرف تک رہا تھا۔ میری زبان بند ہوگئی تھی۔ مریضہ نے اپنے پُردرد حالات زندگی یوں سنانے شروع کئے۔ آہ۔ پیاری خالدہ — کس طرح ایک بیکس کے حالات قلمبند کروں۔ اس کا حسین مگر مغموم چہرہ میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ مجھ سے بار بار سوال کرتی ہے "میری بچی کیسی ہے"؟ پیاری خالدہ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس کا کیا جواب دوں۔ اچھا خالدہ سنو۔

"مجھ کمبخت حرماںنصیب کا نام زہرہ ہے۔ جب میں نے اس عالم رنگ و بو میں قدم رکھا۔ ہر طرف مسرت اور شادمانی نظر آئی حالانکہ میری والدہ میرے ہوش سنبھالنے سے قبل ہی اس فریبی دنیا کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ تاہم میری نظروں میں دنیا سجی سجائی ایک آراستہ "دلھن" کے مانند تھی۔ میری دنیا ایک شاداب گلشن تھی جہاں کا ہر پھول اپنے دامن میں ایک رنگین فسانہ لئے ہوئے اور ہر کلی آنے والے خوبصورت لمحات کی "آئینہ" دار تھی۔ آہ۔ میں انجان تھی۔ میں اس حسین دنیا کے دیکھنے میں ہمہ تن محو ہوگئی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے اور شادابی چمن نے مجھے اس دنیا میں پہنچا دیا جہاں کا ذرہ ذرہ رنج و غم و تفکرات سے بیگانہ۔ معصومانہ انداز میں محو رقص تھا۔ دفعتاً پھن پھیلا کر دوڑتے ہوئے سانپ کی طرح بادل کے ایک کالے ٹکڑے نے اس موسیقی نواز حسن کے منظر کو گہری اندھیاری میں ڈھانپ لیا ——"

آہ۔ میرے والد جن سے میری امیدوں کی دنیا منور تھی۔ مجھے تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے (غالب)

آہ۔ میرے محسن۔ اب اس پاپی سنسار میں میرا کوئی نہ تھا۔ میری امیدوں اور تمناؤں کا رنگین گلشن یک بیک اجڑ گیا۔ میرے تخیلات کی مرتب کی ہوئی محفل زمانہ کی ایک ہی کروٹ سے فنا ہوگئی۔ اب میری نگاہ میں دنیا ایک ماتم کدہ تھی۔ جہاں کے لوگ مسرت اور شادمانی سے بیگانہ؛ حسرت و یاس کی مجسم تصویر تھے۔ آہ۔ اس وقت مضراب غم رباب حیات سے ایسے پرسوز نغمہ پیدا کر رہا تھا جس سے یاس و حرماں نصیبی کی چنگاریاں نکل رہی تھیں ؎

کس کی یہ آہ گرم تھی صیاد دیکھنا۔
سب تیلیاں قفس کی ہوا سے جھلس گئیں (جلیلؔ)

آہ خالدہ۔ زہرہ۔ مظلوم زہرہ صرف اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ فرط غم سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کا بدن سرد ہوگیا۔ دانت جکڑ گئے —

"ارے یہ بیہوش ہوگئی"! میں نے خوف سے لرزتے ہوئے چلایا۔ ڈاکٹر نے زہرہ کو دیکھتے ہوئے کہا "خوف و تردد کی بات نہیں۔ کسی دماغی و ذہنی، تکلیف کی وجہ سے بیہوش ہوگئی جلد اچھی ہو جائے گی"!

اب زہرہ کی طبعیت قدرے بہتر تھی اس نے اپنی سرگزشت پھر اسطرح شروع کی۔

"میرے محسن باپ کے مرنے کے بعد میں سلیم کے سایہ عاطفیت میں پرورش پا رہی تھی جو میرے والد مرحوم کے بہت دوست تھے۔ میرے والد نے کافی سرمایہ چھوڑا تھا جو میرے بسر اوقات کے لئے کافی تھا۔ سلیم صاحب نے میری تعلیم کا بھی معقول انتظام کر دیا۔ سلیم مجھے اپنی اولاد سے زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ کبھی میری دل آزاری گوارہ نہ کر سکتے تھے۔ سلیم کے ایک لڑکا تھا جس کا نام خلیق تھا۔ وہ بچپن سے میرے ساتھ کھیلتا اور پڑھتا تھا۔ اس کو مجھ سے محبت تھی۔ اور آہ۔ مجھے بھی اس سے۔ اب میری عمر چودہ سال کی ہوگئی تھی۔ میری تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو چکا تھا۔ اب میں خانہ داری کا کام بھی انجام دینے لگی تھی۔ اسی طرح دن گذرتے رہے۔ ہماری کشتی حیات بحر ہستی میں بہہ رہی تھی۔ عشق کا دیوتا "کیوپڈ" ہمارے گلے میں محبت کے ہار پہنا رہا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے صبح کا سہانا وقت تھا۔ چڑیاں اپنے میٹھے میٹھے نغموں سے دیوتا کو لبھا رہی تھیں۔ میں اپنے کمرہ میں چارپائی پر آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ کسی نے میرے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "زہرہ کیا آج ٹہلنے نہ چلوگی"؟ میں نے چونک کر دیکھا تو خلیق میرے قریب کھڑے تھے۔ میں نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔

۴

میں خلیق کے ساتھ دریا کے کنارہ ٹہل رہی تھی۔ آہ۔ بہار اپنی پوری شباب پر تھی۔ چمن میں ایک قیامت کی آگ لگی ہوئی تھی۔ پھول معصومانہ انداز میں جھوم رہے تھے۔ کلیاں اس دلکش منظر کو دیکھکر مسکرا رہی تھیں، اور جب ضبط نہ ہو تا تو بے اختیار ٹھٹھا کر ہنس پڑتیں۔ دریا کی چمکیلی سفید چادر پر ہلکی ہلکی شکنیں پڑ رہی تھیں جس میں کنول کے خوبصورت پھول جھک جھک کر پانی کو چھو رہے تھے۔

خلیق نے کچھ پھول توڑے اور ایک حسین مالا تیار کی۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ چہرہ کا رنگ زرد تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں میں حسن و عشق کا ایک رنگین افسانہ چھپا تھا۔ خلیق نے پھولوں کی وہ خوبصورت مالا مجھے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"زہرہ۔ یہ میری محبت کی مالا" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"خلیق آنکھیں کھولو۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں محبت کا نخل ہرا ہونے سے قبل ہی سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔ آہ۔ خلیق۔ مجھے تم سے حقیقی اُنس ہے۔ میں تمھاری ہوں۔ اور صرف تمھاری۔ مگر افسوس خلیق تم میرے کبھی نہیں ہو سکتے" وہ متحیر ہو کر میرا مُنہ تکنے لگے۔ کچھ دیر سکوت کا عالم طاری رہا۔ ہم ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر خلیق نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"پیاری۔ زہرہ۔ تمھارا خیال غلط ہے" میں نے جلدی سے ان کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کھڑکی کے پردہ سے کوئی جھانک رہا تھا۔ خوف سے میرا جسم لرزنے لگا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔

۵

دوپہر کا وقت تھا، سب کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ڈائننگ ہال میں صرف سلیم صاحب ان کی بیوی اور میں رہ گئی۔ آج خلاف معمول ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سبھوں کے مُنہ پر مہر خاموشی لگی ہوئی ہے۔ میرا دل کسی آنے والی مصیبت کا آئینہ دار تھا۔ طبیعت خود بخود گھبرا رہی تھی۔ آفتاب کی سنہری کرنیں اداس معلوم ہو رہی تھیں۔ نو شگفتہ پھول کملائے نظر آ رہے تھے۔ اس وقت کوئی شے بھی میرے لئے جاذب نظر نہ تھی۔ میں اس سکوت سے تنگ آ کر اپنے کمرہ میں جانے کے لئے اٹھی۔ چچی جان (سلیم کی بیوی) نے میری طرف پُر معنی نظروں سے دیکھا اور کرخت لہجہ میں کہا "زہرہ۔ آج مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"۔ ان کا یہ کہنا سنتے ہی میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پیشانی پر پسینہ آنے لگا۔ میں نے بہت دبی ہوئی آواز میں کہا "چچی جان فرمائیے"۔ انھوں نے اس قدر پر غضب لہجہ میں جواب دیا مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سارا ڈائننگ ہال ان کی گفتگو کے خوف سے کانپ رہا ہے۔

"زہرہ۔ سنو۔ میں نے تم کو اس لئے پرورش نہیں کیا کہ تم میرے خاندانی وقار پر بٹہ لگاؤ۔ تمھیں خیال رکھنا چاہئے تھا کہ جس ہنڈیا میں کھاؤ اس میں چھید نہ کرنا چاہئے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں خلیق کی شادی کسی رئیس گھرانے میں کروں گی جہاں سے بہت جہیز و جائداد ملے گی۔ تمھارے پاس کیا رکھا ہے۔ تم تو خود دوسروں کے ٹکڑوں پر پڑی ہو"۔

آہ۔ میرے محسن۔ ان کا ایک ایک لفظ میرے نازک دل پر نشتر کا کام کر رہا تھا۔ مگر آہ۔ فلک کی ستائی ہوئی۔ مالک کی ٹھکرائی۔ دوسروں کے رحم و کرم کی طالب خاموشی سے یہ تمام باتیں سنتی رہی۔ سلیم صاحب نے بھی بہت گرج کر کہا۔

"بس۔ زہرہ۔ اب بھلائی اسی میں ہے کہ تم یہاں سے فوراً چلی جاؤ ورنہ ذلت سے نکالی جاؤ گی"۔

میرے محسن۔ میری زبان میں اتنی طاقت نہیں جو اس وقت کی حالت بیان کر سکوں۔ میری نظروں میں دنیا تاریک تھی۔ غم کے بادل میرے سر پر منڈلا رہے تھے۔ ہر طرف ناامیدی اور مایوسی اپنی بھیانک صورت سے مجھے ڈرا رہی تھی۔ دنیا کی ہر شے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی ؎

کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں

اے ہجوم نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

آہ۔ سلیم۔ جنہوں نے مجھے پالا تھا ان کو بھی میری یتیمی اور بیکسی پر رحم نہ آیا۔ خیر اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب میری قسمت کا قصور ہے۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرہ میں گئی۔ کچھ دیر بیٹھی ہوئی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتی رہی۔ دل میں سوچا کہ خلیق سے ایک بار مل لوں۔ لیکن پھر ان سے ملنا خلاف مصلحت سمجھا۔ میں جانتی تھی کہ خلیق کو مجھ سے محبت ہے۔ وہ میری ذلت اور جدائی کبھی گوارہ نہ کر سکے گا۔

زہرہ اب تمھیں زیادہ انتظار کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑے گی۔ میں آج شام کی ٹرین سے تمہارے پاس پہونچوں گا۔ فقط۔ تمہارا سوگوار محبت "خلیق"

خط پڑھتے ہی میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ آہ۔ کتنا، سہانا۔ کتنا خوبصورت وقت تھا۔ شاید کوئی دنیا کی حسین ترین شے بھی حاصل کرکے اتنا خوش نہ ہوگا جتنا میں اپنے سرتاج۔ اپنے مالک کا خط پاکر خوش تھی عزیز خالدہ۔ کیونکر لکھوں کہ اس وقت زہرہ کی کیا حالت تھی۔ وہ ایک نامعلوم جذبہ سے متاثر ہوکر چند لمحہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ایک خندۂ بے محابہ مچل رہا تھا۔ اس نے پھر میری طرف مخاطب ہوکر کہنا شروع کیا۔

"پیارے محسن۔ پھر بھی میرے دل میں ایک نامعلوم کسک تھی۔ میرا دماغ طرح طرح کے عجیب وغریب سوالات کا مسکن بن رہا تھا۔ آخر میمونہ نے ایسا کیوں لکھا؟ کیا وہ مجھ سے مذاق کررہی تھی۔ یا وہ مجھ کو میرے سرتاج سے بدظن کرنا چاہتی تھی۔ مگر نہیں ہرگز نہیں۔ میمونہ مجھ سے ہرگز مذاق نہیں کرسکتی۔ وہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ میں اس کی عادات و اطوار سے بخوبی واقف ہوں۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے ضرور اس میں کوئی حقیقت پنہاں ہے۔ کل کے خط میں انھوں (خلیق) نے لکھا تھا "شاید تم کو زہرہ میری باتوں کا یقین نہ آئے۔ شاید تم انہیں سراسر فریب ہی سمجھو"۔ ہائیں اس جملے کے کیا معنی ہیں۔ ان الفاظ کے پردہ میں کوئی خوفناک راز جھلک رہا ہے۔ آہ میں کیا کروں۔ میرے عزیز محسن۔ اس قسم کے خیالات سے میری طبیعت پراگندہ تھی۔ یہ دونوں خط میرے لئے ایک معمہ بنکر رہ گئے تھے

خلیق صاحب حسب وعدہ اسی روز شب کی ٹرین سے تشریف لے آئے۔ اس دوران میں ان کا برتاؤ میرے ساتھ جس قدر اچھا رہا۔ میں کبھی یقین نہیں کرسکتی تھی کہ وہ کسی اور سے بھی محبت کرتے ہوں گے، اب پھر میری زندگی عیش سے گذر رہی تھی۔ میمونہ کے خط کا وہ غم انگیز مضمون قریب قریب میرے دماغ سے اوجھل ہوچکا تھا۔ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ غالباً میمونہ کو کسی نے غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے ایسی غلط اطلاع دی بارہا جی چاہتا کہ وہ خط خلیق کو دکھاؤں لیکن پھر جرأت نہ ہوئی۔ اسی طرح چار ماہ گذر گئے۔ ایک روز صبح کا سہانا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دنیا اپنا سیاہ لباس اتار کر زریں لباس زیب تن کررہی تھی۔ میں باغ میں ٹہل رہی تھی۔ خلیق بھی میرے ہمراہ تھے۔ وہ بار بار مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن نامعلوم کیوں رک جاتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا "زہرہ آج ناشتہ ذرا جلدی تیار کرنا کیونکہ آج مجھے اسٹیشن پر اپنے ایک دوست سے ملنے جانا ہے"۔

میں نہیں سمجھ سکی کہ اس میں کوئی فریب پنہاں ہے جس کی وجہ سے وہ مجھ سے یہ معمولی سی بات کہنے سے جھجک رہے تھے۔

اُن کے جانے کے بعد میں تنہائی سے تنگ آکر اُن کے مطالعہ کے کمرہ میں جا بیٹھی۔ ان کی میز پر ایک خوبصورت کتاب رکھی تھی جس پر سنہری حروف میں لکھا ہوا تھا "کنول کا پھول"۔ کتاب کی اسی حسین سرخی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے کتاب اٹھاکر ورق گردانی شروع کی۔ کتاب سے ایک، کاغذ زمین پر گرا۔ میں نے جھک کر کاغذ اٹھالیا۔ اس پر لکھا تھا۔

"فہمیدہ — ار رام نگر"

ہائیں "رام نگر" کہاں ہے؟ میں نے اپنے دل سے سوال کیا۔ غالباً یہ اُن کے چچا کا وطن ہے لیکن یہ "فہمیدہ" کون ہے۔ اس خیال سے میرے دل میں ایک تیر سا چبھا۔ پرانے زخم جو اب خشک ہوچکے تھے پھر ہرے ہوگئے۔ میمونہ کے خط کا ایک ایک حرف میرے دماغ میں رقص کرنے لگا۔ مجبوراً میں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

میرے سرتاج! — کشتۂ غم کا سلام لو۔

نوازش نامہ ملا۔ اس سے بوئے محبت آرہی تھی۔ اس سے پیشتر والے بھی مختصر نامے ملے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے واقعات کو سمجھتے ہوئے خاموشی ہی بہتر معلوم ہوئی۔ کیا کہا؟ "تم مجھ سے بدظن ہو"۔ کیا حقیقت پر شکوک کے پردہ ڈالتے ہوئے۔ کیا میرے الفاظ حقیقت میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں؟ تم نے مجھے فریب دینے کی ناکام کوشش کی۔ کاش یہ تحریر تمہارے دل کا پہلو ثابت ہوتی۔ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تم نے مجھ سے کچھ کہا اور پھر ٹال گئے کہ "وہ تو میرا مذاق تھا"۔ اسے کاش تم جب ہی اپنے شادی شدہ ہونے کا اعتراف کرلیتے۔ تو آج کیوں میں رقابت کے شعلوں سے کھیلتی۔ بولو۔ بولو۔ خاموش کیوں ہو۔؟ تم نے مجھ حرماں نصیب کے لئے آخر کیوں ایسے حسین الفاظ

استعمال کر کے میرے نازک قلب کی خاموش چنگاریوں کو شعلہ ریز کیا؟ خیر تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ اگر تم پیشتر ہی سے کہہ دیتے تو آج مجھے تم سے شکایت نہ ہوتی۔ ہاں بتلاؤ۔ سچ بتلاؤ وہ کون سی خوش نصیب ہستی ہے جو تمھاری شریک حیات ہے۔ ہاں میرے مالک۔ بولو۔ آخر چپ کیوں ہو گئے۔ وہ کون ساحرہ ہے جس نے اپنے سحر آفریں نغموں سے تمھیں مسحور کر لیا۔ آہ۔ میں چھیڑوں اور تم نہ بولو میں پکاروں اور تم نہ سنو۔ جس ہستی کا مشغلہ تمھاری خوشنودی ہو۔ غضب ہے کہ تم اس سے اپنا دامن بچاؤ۔ تم اپنے ہر خط میں تسلی دیتے رہے۔ کہ میں تم کو عنقریب بلاؤں گا۔ لیکن وائے قسمت میرا یہ رنگین خواب کبھی پورا نہیں ہوا۔ خیر میں کل صبح کی ٹرین سے تمھارے پاس پہنچوں گی۔ تم مجھ کو اسٹیشن پر ملنا ——— تمھاری "شریک حیات"۔ "فہمیدہ"۔

میرے عزیز محسن۔ میں نے خط ختم ہی کیا تھا کہ یکایک دروازہ کا پردہ اٹھا۔ خلیق اندر داخل ہوئے اور ان کے پیچھے ایک بیس سالہ جوان لڑکی اندر آئی۔ میرا سارا بدن خوف اور غصہ سے کانپنے لگا زبان سے ایک، ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ جب آنکھ کھلی تو میرا سر میرے عزیز ہمدرد۔ تمھارے زانو پر تھا۔ آہ۔ میں کس طرح کس زبان سے تمھارا شکریہ ادا کروں"۔ پیاری خالدہ۔ عزیز خالدہ۔ اتنا کہتے ہی بیکس زہرہ کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور وہ ہمیشہ کیلئے موت کی آغوش میں سو گئی۔ خالدہ تم اسی بدنصیب زہرہ کی بدنصیب لڑکی ہو۔ رشید تمھارا چچازاد بھائی ہے جو عرصہ سے تم سے شادی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس سے تمھاری عزیز والدہ کی روح کو بیحد تکلیف ہو گی۔ اب تم سمجھدار ہو جو کام کرو سمجھ کر کرنا اچھا رخصت (عزیز) خط ختم کرتے ہی خالدہ کی ایک چیخ نکلی اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

رات کے دس بجے رشید نائٹ سوٹ پہنے حجلہ عروسی میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ چہرہ پر مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ آج اس کی نظروں میں ہر چیز مسرت اور شادمانی سے لبریز تھی۔ کیونکہ وہ اس گوہر نایاب کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جس کیلئے مدتوں سے پریشان اور کوشاں تھا۔ رشید آہستہ آہستہ خالدہ کے قریب گیا۔ خالدہ عروسی لباس میں ملبوس ایک آراستہ سیج پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس پر ابدی نیند طاری تھی۔ رشید خالدہ کو پرحسرت نظروں سے تک رہا تھا دفعتاً اس نے زمین پر پڑے ہوئے ایک لفافہ کو دیکھا جس میں زہرہ کے واقعات زندگی قلمبند تھے رشید نے لفافہ اٹھایا اور خط کو پڑھ کر جیب میں رکھ لیا اور اس حسین تربت پر آنسوؤں کے چند پھول

بہاریں!

امین حزیں

وہ آئیں بہاریں وہ چھائیں بہاریں
وہ اُودی گھٹائیں وہ لائیں بہاریں

وہ شاخوں پہ کوئل کی دلکش نوائیں
جو شورِ جنوں خیز دل میں اٹھائیں

کہ باغوں میں پھولوں سے جنت بسی ہے
محبّت کی مستی بھی کیا چھا رہی ہے

بلند آبشاریں حسیں سبزہ زاریں
وہ نہریں تلاطم وہ پُرلطف دھاریں

اُفق پر سحر کی حسیں روشنی ہے
شعاعوں سے جس کی شفق کھیلتی ہے

کہ جیسے فرشتوں کا اک قافلہ ہے
جہاں کا جہاں چھوڑ کر پھر چلا ہے

وہ جھولے سنبھالے وہ ناگیں نکالے
وہ مستانی حوریں وہ الھڑ گوالے

فقط میں ہوں اس زندگی سے ہراساں
کہ میرا کوئی بھی نہیں زندگی میں!

میں حیرت سے تکتا ہوں اُن کی بہاریں
میں روتا ہوں دنیا کی ایسی خوشی میں!

مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی مرحوم

سن ولادت ۱۸۲۸ء سن وفات ۱۸۹۳ء

جناب سید دل محمد صاحب فضا جالندھری

مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی نواب مرزا عالم بیگ کے خلف الرشید تھے۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں قربان تخلص کرتے تھے اور مومن خاں دہلوی کو اپنی غزلیں دکھایا کرتے تھے۔ مومن کے انتقال کے بعد غالب کو غزل دکھانے لگے۔ اور سالک تخلص اختیار کیا۔

آپ کی ولادت حیدر آباد کی ہے مگر تربیت ونشو ونما دہلی میں ہوئی۔ فارسی اور عربی کی درسی کتابیں وہیں کے ارباب فضل وکمال سے پڑھیں۔ مرزا سالک کی شاعری کا زمانہ وہی ہے جبکہ گلشن دہلی پر خزاں کی آمد کے آثار پیدا ہو چلے تھے ان کے خواجہ تاش بھائی حالی، مجروح، رخشاں، انور، ظہیر، علائی، اشکی وغیرہ شعرائے باکمال تھے۔ خوش مزاج اور رنگین طبیعت انسان تھے۔ بذلہ سنجی کے ساتھ قدرت نے انھیں ایسی ذکاوت عنایت فرمائی تھی کہ چند روز کی مشق کے بعد نہایت اعلیٰ درجہ کے نقاد اور سحر بیان شاعر بن گئے اور اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آنے لگے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے پر آشوب زمانہ میں دہلی سے نکل کر الور میں جا کر پناہ گزیں ہوئے اور وہاں وکالت کرتے رہے۔ مدت تک وہاں رہے اس کے بعد حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں سررشتہ تعلیم میں سررشتہ دار کے عہدے پر متعین ہو گئے۔ اور اسی خدمت میں زندگی بسر کر دی۔ حیدر آباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اُردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا۔ سالک کچھ عرصہ تک اس کے مدیر رہے۔ یہ رسالہ نہایت قابل قدر تھا اس کے تاریخی مضمون دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کا دیوان جو حیدر آباد میں شائع ہوا تھا باوجود کوشش کے مجھے دستیاب نہیں ہو سکا البتہ ان کے متفرق اشعار مختلف رسائل اور کتب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان کے کلام کے متعلق مختلف ادباء کی رائیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

محترمہ طاہرہ خاتون لکھتی ہیں کہ۔

"مثل مجروح کے ان کے یہاں بھی تازگی مضمون کی کمی ہے رفعت تخیل اور آمد ان کے کلام میں بہت ہے۔ دہلی کی بربادی پر سالک شہر آشوب اور غالب کا مرثیہ بہت مشہور ہے۔" (ظفر نمبر نگار لکھنؤ۔)

مسٹر سکینہ بالو مصنف تاریخ ادب اُردو رقمطراز ہیں کہ۔

"سالک کا کلام جدت سے خالی ہے۔ خیال اور زبان کے اعتبار سے اچھا ہے۔"

افسوس ہے کہ مسٹر سکینہ اور محترمہ طاہرہ خاتون نے رائے قائم کرتے وقت انصاف سے کام نہیں لیا۔ ہم اس موقع پر شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کی رائے لکھتے ہیں۔

"یکے در چمنستان سالک بیا و دیدہ و دل را رخصت تماشا دہ۔ تا وا رسی کہ گلشن معنی در عین خزاں شگفتہ و شاداب است و نہال سخن در پایان موسم تازہ تر از عہد شباب ندانم ایں صدائے دلکش از کجا بود چہ بلا گرمی اثر با خود داشت کہ از پردۂ گوش بدل فرود آمد مرا در من نگذاشت۔ چوں بخود باز آمدم گرم از جا برخاستم و دیوان سالک خواستم

سبحان اللہ کتابے دیدم چوں نسخہ جمال یوسفی سراپا انتخاب و زلیخائے سخن را باز گشت عہد شباب - ابیاتش ریختہ اما ہتنک پہلوی و دری بیانش سادہ اما نمونہ گفتار سعدی و انوری - مضامین ہمہ تازہ و نو معانی ہمہ الفاظ را درگرد قصیدہ و غزل ہمہ طلسم رنگ و بو قطعہ و رباعی ہمہ کرشمہ و جادو - ذکر فراق دل آویز تر از وعدہ وصال و شکوہ جفا، طرب انگیز تر از مژدہ وفا آنجا کہ طول مقال است - لفظ را اندازہ وسعت خیال است و آنجا کہ اختصار بیان ہست ہفت دریا در کوزہ نہاں است ۔ ۔ ۔ "

(۱) ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی مطبوعہ دہلی ۱۳۲۲ھ صفحہ ۱۰۵)

آگے چل کر مولانا حالی عرفی اور نظیری کے کلام کی انفرادی خصوصیات بیان کرتے ہیں اس کے بعد لکھتے ہیں۔

" اما در حملہ کہ غالب بادہ فروش است و سالک بادہ پیما - بادہا ہمہ سرجوش است و نشۃ ہا ہمہ رسا ۔ ۔ ۔ الخ "

آخر کے فقرات میں سالک کے متعلق کس قدر حسن عقیدت اور محبت کی تراوش پائی جاتی ہے۔

" خاصہ آں آئینہ صورت نمائے غالب و مراد ہمچو من ہزار را بجائے غالب آں در سخنوری یکتا و در پاک گوہری ہمتا آں در شعلہ زبانی علم و در شیوہ بیانی مسلم آں رہرو قدسی سالک جناب مرزا قربان علی بیگ متخلص بہ سالک لا زال ظلہ و ذکرہ جمیلا کہ امروز نکتہ دری و نکتہ سنجی استادان استاد است - الحق اگر سخن را صہبا بتواں گفت سخنش سرجوش بادہ سخن است "

— جہاں تک میرا خیال ہے سالک کا کلام پختگی اور رفعت تخیل کے لحاظ سے خاص چیز ہے اور یہ سرسری نظر سے یہ کہہ دینا جدت اور تازگی کی کمی ہے خود نقادوں کی بے بصری کی دلیل ہے۔

مرزا غالب مرحوم کے یوں تو اپنے تمام تلامذہ سے مشفقانہ مراسم تھے لیکن سالک مرحوم سے خصوصی تعلقات تھے اردوئے معلیٰ میں متعدد خطوط سالک

کے نام موجود ہیں۔ ہم یہاں سنداً مرزا غالب کے ایک خط کا اقتباس پیش کرتے ہیں

"میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو پیٹ چکا اب چچا کو بھی رو مجھکو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات واحتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہونچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب ایک جوتی اور لگی۔ بہت اترا تا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے جنت آرامگاہ وعرش نشیمن خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے ..... الخ"

— مرزا سالک نے پینسٹھ[65] سال کی عمر میں سنہ ۱۲۹۱ھ میں انتقال کیا اور حیدر آباد میں مدفون ہوئے۔ آج ڈھونڈے سے بھی ان کا دیوان نہیں ملتا۔ انتخاب کلام ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ سالک کے ورثا میں عابد صاحب دہلی میں بقید حیات ہیں ان سے درخواست ہے کہ اپنے باوا جان کا دیوان شایع کر کے تشنہ کامان ادب کی پیاس بجھائیں۔

یوں عمر گزاری تری فرقت میں کہ ہر دم　　جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا
تنگدستی اگر نہ ہو سالک　　تندرستی ہزار نعمت ہے۔
نہیں اک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں　　پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا
اپنی سستم کشی کا مجھے امتحاں ہے اب　　درکار ایک اور نیا آسماں ہے اب
تم آگئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون　　لو آج اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم
پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب　　تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں
اعتبار نگہ ناز ہے کیا کیا ان کو　　قتل کو آئے ہیں اور ہاتھ میں تلوار نہیں
اے خضر اتنے دن ترے کیونکر بسر ہوئے　　ہم سے تو رات کٹ نہ سکی انتظار کی
ہوں وہ خود رفتہ کہ کیا جانے کہاں دل کھویا　　یاد آتا ہے تو اتنا کہ مجھے یاد نہیں
جلنے دے اے تصور جاناں نہ کر تلاش　　ایسا نہ ہو کہ وہ کسی دشمن کے گھر ملے

صیاد اور بند قفس سے کرے رہا　　جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے
بھرا ہوا آشیانہ اور آدھا جلا ہوا　　بجھ بھی گئی تھی آگ تو بجلی کو کیا ہوا
رشک سے غیر کے مرنے کی خوشی بھی نہ ہوئی　　اب یہ غم مجھکو ہوا ہے کہ وہ غم کرتے ہیں

تازگی بیان وندرت

گماں مجھ پر ہے اس کو دادخواہی کی شکایت کا　　قیامت ہو گیا حق میں مرے آنا قیامت کا
تھی شکیبائی علاج اضطراب　　چارۂ رنج شکیبائی نہیں
تھا جفاکش ایک سالک آج وہ بھی مرگیا　　اب لئے بیٹھے رہو تم شیوۂ بیداد کو
ہوں خلش دوست دعا ہے کہ دوا کے بدلے　　یارب اس عہد میں درد دل بیمار بکے
خوف ہے یہ دل بیتاب نہ بر میں آجائے　　ہم نہ لیں مول جو وہ طرۂ طرار بکے

تکرار الفاظ

غیر سے شیوۂ ظلم وستم کرتے ہیں　　دیکھئے آج وہ کیا ہم پہ کرم کرتے ہیں
ہو گیا وعدہ وفا اس بیوفا سے رات کو　　اے اجل آجا کہیں تو ہی بلا سے رات کو
صبر سے سہل گزر جائینگے دن ہجراں[1] کے　　سالک انسان کو لازم نہیں مضطر ہونا

غالب کے انتقال پر ان کے تین نامور شاگردوں حالی۔ مجروح۔ اور سالک نے مرثئے لکھے تھے۔ حالی اور مجروح کے دواوین آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں اور ان کے مرثیوں کی قدر وقیمت معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت سالک کا دیوان نایاب ہے۔ بڑی جستجو سے ایک پانی پتی دوست نے ان کا مرثیہ بہم پہونچایا ہے جو ناظرین عالمگیر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

مرثیہ غالب از مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

اسد اللہ خاں بہادر کا　　بھر گیا کیوں حیات کا ساغر
اس ضعیفی و ناتوانی میں　　کیوں عدم کی طرف کیا ہے سفر
حیف اے آسمان ناہنجار　　وائے اے روزگار کیں پرور
ہائے وہ تاجدار ملک سخن　　ہائے وہ اوستاد اہل ہنر
اس کے غم میں ہوا ہے ماتم عام　　پھر نہ کیونکر سیاہ ہو دفتر
گمرہان رہ معانی کا　　آج دنیا سے گم ہوا ہے خضر
پاؤں رکھنا سنبھال کر سالک　　اب طریق سخن ہے بے رہبر
کس کو اہل زمانہ جانیں گے　　بہترین زمانہ سے بہتر
ان کے اوصاف کیا رقم ہوں کہیں　　میری حد بیان سے باہر

---

[1] ہجراں کے اس دور میں متروک ہے۔

فکر ان کی گئی ہے واں کہ جہاں ۔۔ طائرِ سدرہ کا رہے شہپر
ان کے اندیشے کی بلندی سے ۔۔ قصرِ معنی ہے آسمان نظیر
نثر دیکھو تو معدنِ معنی، ۔۔ نظم دیکھو تو رشکِ عقدِ گہر
ان کے اجمال سے عیاں توضیح! ۔۔ ان کے انداز میں ادا مضمر
ہائے وہ لطف یاد آتے ہیں ۔۔ جن میں ہوتی ہے کاوشِ نشتر
مجھکو سودا نہیں کہ اس غم میں ۔۔ در و دیوار سے نہ پھوڑوں سر
کور ہو جائے بس ابھی یا رب ۔۔ گر نہ دریا بہائے دیدۂ تر
ہوں نہ اس غم سے جس کے ٹکڑے ۔۔ میرے سینے میں وہ کہاں ہے، جگر
مجھ سے کیا پوچھتے ہو سالِ وفات ۔۔ ہوش کب ہیں بجا کہ ہوں مضطر
دیکھ لو رنجِ حسرت و دوری ۔۔ دل نومید پر ہجومِ آور ؛
۱۲۸۵ھ

قطعہ

غمِ مرگِ دبیر الملک عام است ۔۔ سپہر ابوابِ غم در دہر بکشاد
ریاحینِ سخن پژمردہ گشتند ۔۔ خیابانِ معنی رفت برباد
ز دل پرسیدم از سالِ وفاتش ۔۔ بہ سالک داغ نجم الدولہ بنہاد
نظر کردم سرِ ہر مصرعے را ۔۔ بنائے عیسوی تاریخ افتاد
۱۸۶۹ء

گوہرِ نایاب

چند مشہور و معروف شعرا کے بہترین کلام کا ترجمہ

محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی

۱

اُف ــــ کشتیٔ حیات، آرزوؤں کے عمیق سمندر میں نا امیدی کے پہاڑ سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی ــــ آہ ــ وہ ناخدا کہاں ہے جو اس کے ان چند بچے ہوئے ٹکڑوں کو ڈوبنے سے بچائے ــــ ذرا کوئی اسے آواز دو ــــ جو اس عظیم تلاطم کو اپنی نرگسی آنکھ کے ایک اشارہ سے بالکل خاموش کر دے ــــ اے محبت کے حسین دیوتا ــــ میں نے اپنا دل تیری راہ میں قربان کر دیا۔

۲

جوانی کے چڑھتے ہوئے دَور میں ــــ آہ، میری زندگی کی کھیتی محبت کے نہ تھمنے والے آنسوؤں سے سینچی جا رہی ہے۔ ہاں ــــ وہ دیکھو! ــــ میری زندگی کا باغ کس قدر سر سبز نظر آ رہا ہے ــــ درختوں کی ٹہنیاں ــ نا امیدی۔ حرماں نصیبی اور افسردگی کے پھولوں سے لدی ہوئی ہیں ــــ کیونکہ اے محبت کے دیوتا ــــ میں نے اپنا دل تیری راہ میں قربان کر دیا۔

۳

اے خزاں! ــــ کیا یہ تیرے دستِ ظلم کا ستایا ہوا چمن اب کبھی سر سبز نہ ہوگا ــــ کیا؟ ــــ بلبل کے یہ پُرسوز نغمے سننے کے لئے اس چمن کا کوئی بھی نونہال ــــ اس ابدی نیند سے بیدار نہ ہوگا۔ آہ ــــ! کیا یہ اسی طرح اکیلی اس اُجڑے ہوئے چمن میں آہ و زاری کرتی رہیگی۔ یہاں تک کہ موت اس کی امیدوں کی جھلملاتی ہوئی شمع کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیگی اے محبّت کے دیوتا! ــــ کیا اس لئے کہ اس نے اپنا دل تیری راہ میں قربان کر دیا۔

۴

آ ــــ اور میرے دل کی بجھی ہوئی شمع کو ــــ محبت کی چنگاری سے روشن کر ــــ اُف یہ دل رنج ــ نا امیدی اور حرماں نصیبی سے تاریک ہے۔ آہ! ــــ کیا تو اس کو محبت کی روشنی سے ایک بار اور نہ چمکائیگا ــــ دیکھ شمع کو پروانہ کی آنکھ سے دیکھ ــــ کیونکہ صرف وہی جو محبت کی آگ میں جل کر خاکستر ہو جائے ــــ اس کی حقیقت پہچان سکتا ہے۔

کوشش

نثار الملک میر آصدی اجمیری

جہاں کی کشمکش سے جب بشر مجبور ہو جائے
تو پھر کوشش کرے ایسی کہ مشکل دُور ہو جائے
ہمیں کیا فائدہ، اے ہمنشینو، ہم تو جاتے ہیں
بلا سے اُن کی محفل کا نیا دستور ہو جائے
مجھے بھٹکا رہا ہے وادیوں میں میرا استقبل
میں جتنا پاس پہونچوں منزل اتنی دور ہو جائے
اسے کہتے ہیں قدرت یہ بھی قدرت کا کرشمہ ہے
کوئی گمنام رہ جائے کوئی مشہور ہو جائے
مجھے اے میر دنیا کے غموں نے گھیر رکھا ہے
کہاں قسمت کہ یہ دل دو گھڑی مسرور ہو جائے

بادہ احمر

حضرت احمر گورکھپوری

نغمہائے اثر انداز کہاں سے لاؤں؟
سوز میں ڈوبا ہوا ساز کہاں سے لاؤں
بیکسی ہمدم و ہمراز کہاں سے لاؤں؟
غم میں ڈوبی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
اُف وہ دزدیدہ نگاہوں کے حسیں نظارے
اُف وہ تیرِ غلط انداز کہاں سے لاؤں
عشق نے جس کیلئے قیس کا جامہ پہنا
حسنِ خود بیں کے وہ انداز کہاں سے لاؤں
جس سے برہم ہوئی دنیائے محبت میری
دلرُبائی کے وہ انداز کہاں سے لاؤں
موت ہے میرے لئے تلخیٔ انجامِ حیات
تجھکو اے لذتِ آغاز کہاں سے لاؤں
سننے والوں کو جو خود رفتہ کرے اے احمر
اپنے شعروں میں وہ اعجاز کہاں سے لاؤں

پرستار

جناب سید شاہ بلیغ الدین حسین صاحب حیدر آباد دکن

زروقا عظیم الشان سلطنت یونان کا واحد حقدار جب دنیا کے گوشے گوشے کی سیر و تفریح سے واپس آیا تو اس کے ساتھ شاہ اٹلی کا دیا ہوا وہ مجسمہ بھی تھا جو اب اس کی تمناؤں کا واحد مقصد اور اس کی زندگی کا راز تھا۔

بادشاہ اٹلی نے وینس کا یہ مرمریں مجسمہ خاص طور پر شہزادہ زروقا کے نذر لانے کے لئے تیار کرایا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سنگ تراش نے اپنا پورا کمال اور صناعی اس میں ختم کردی تھی۔ اس کی نزاکت اور خوبصورتی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بڑی مخمور نرگسی آنکھیں۔ کھلے ہوئے بال پتلے ہونٹوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اب وہ کچھ کہنے کو ہے۔ اس کا سڈول جسم اور سفید براق سی رنگت۔ کچھ ایسی ناقابل بیان کشش اپنے آپ میں رکھتی تھی کہ دیکھنے والا بیخود ہوجاتا تھا اور گھنٹوں تکتا رہتا تھا۔

پہلی مرتبہ جب یہ مجسمہ شہزادے کو دکھایا گیا تو وہ اس کے سحر کارانہ حسن سے اس درجہ بے اختیار ہو گیا کہ والہانہ کیفیت سے بڑھ کر اس کے جسم کے ہر حصے کو چومنے لگا لیکن جب آہستہ آہستہ اس کا یہ جوش کم ہوا تو اسے اپنی اس مجنونانہ حرکت پر اس قدر شرم آئی کہ وہ چیخ مار کر ہٹ گیا اور چکرا کر اس کے قدموں پر گر پڑا۔

شاہی ملازموں نے اسے پلنگ پر لٹا دیا بہت دیر بعد اسے ہوش آیا لیکن وہ بیتاب تھا اور اپنی اس حرکت پر بیحد ملول تھا۔ "کوئی انسانی ہاتھ اس کے لطیف جسم سے مس نہیں ہونا چاہئے"۔ اس خیال نے شہزادہ کو اور صدمہ پہنچایا اس نے کیوں ایسی بیہودہ حرکت کی۔ شہزادہ کو اپنی غلطی کا اس قدر احساس تھا کہ وہ اس کے آگے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس میں آنکھ اٹھانے کی تاب نہ تھی۔ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے خاموش آنسو بہانا شروع کیا۔ رہ رہ کر اسے اپنی غلطی یاد آ رہی تھی۔ "کیوں اس نے ایسی بیہودگی کی۔ اس کے نازک جسم کو صدمہ پہونچایا"۔

شہزادہ بے اختیار رونے لگا۔ وہ اس طرح رو رہا تھا جیسے کوئی اپنے محبوب کے جدا ہونے پر۔ درباری حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ ان میں سے چند ایک کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور وہ بہت متاثر معلوم ہوتے تھے۔ شہزادہ روتا رہا اور گھنٹوں روتا رہا حتیٰ کہ شام تک اس کی آنکھیں سوج گئیں۔ اسے روحانی صدمہ ہو رہا تھا۔ بڑی رات گئے تک وہ اسی طرح مصروف رہا۔ دفعتہ اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اس نے گردن اوپر کو اٹھائی اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہر طرف سکوت ہی سکوت تھا۔ وہ اٹھا اور اس سے "معافی مانگنے چلا ــــ اس کے قریب تک جانے کی شہزادہ میں ہمت نہ تھی۔ وہ وہیں چوکھٹ پر گر پڑا اور پھر ایک بار شدت غم میں بیہوش ہو گیا۔

بادشاہ اور تمام ملازمین شاہی پریشان ہو گئے۔ شہزادہ کو محل میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں بڑی مصیبتوں سے تھوڑی دیر کے لئے اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔ شہزادہ مسکراتا ہوا اٹھا۔ اس کی خطا معاف ہو گئی تھی۔ وہ بیحد خوش تھا اور اب روزانہ اس کی پرستش کرتا تھا۔

شہزادہ کو اسی حالت میں یونان پہونچا دیا گیا۔ جہاں اس کی وارفتگی اور بڑھ گئی۔ وہ چوبیس گھنٹے اس کے آگے سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کا روزانہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ علی الصبح جب خدا کے نیک بندے اس کی بندگی میں مصروف رہتے وہ نہا دھو کر کپڑے بدلتا اور خوشبو میں بسکر پھولوں کا ہار لئے اپنی حسن کی دیوی کی پوجا کے لئے جاتا جہاں ہار اس کے گلے میں ڈال کر گھنٹوں عالم محویت میں بیٹھا رہتا۔ دن اور رات کا تقریباً تمام حصہ اسکے آگے سر جھکائے گذر جاتا لیکن پھر بھی وہ وہاں سے اس وقت تک نہ اٹھتا جب تک کہ ملہ خود آکر اسے نہ لیجاتی

شاہ یونان اپنے اکلوتے لخت جگر کی حالت پر بیحد رنجیدہ معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی پرستش میں خلل انداز ہونا نہ چاہتا تھا۔ اس لئے کبھی وہ خود

ولیعہد سلطنت کو دیکھنے کے لئے چلا آتا اور پردوں کی اوٹ سے معبد میں جھانکتا تھا تو عطر و عنبر کی خوشبو سے اس کا دماغ بس جاتا۔ بسا اوقات وینس کے ملکوتی حسن کو دیکھ کر وہ خود بھی تھوڑی دیر کے لئے گم ہو جاتا۔

شہزادہ کی اس حالت کی خبر آناً فاناً تمام سرزمین یونان میں پھیل گئی سلطنت کے ہر حصہ سے لوگ اس کے دیکھنے کے لئے جوق در جوق آنے لگے لیکن سب بے نیل و مرام واپس لوٹے۔ شہزادہ کو کسی نے بھی نہ دیکھا۔ چوبیس گھنٹے وہ معبد میں رہتا جہاں داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ بجز ملکہ کے جو شہزادہ کو اس عالم استغراق سے جگا کر اپنے محل میں لے جاتی اور وہاں تھوڑی دیر کے لئے سلا دیتی تھی۔

شہزادہ کے اس معمول میں سر مو فرق نہ آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی پرستش میں مصروف رہتا تھا۔ لیکن اب اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا سوچنے لگا کہ "وہ" زندہ ہے۔ اسی خیال میں روز بروز اس کا انہماک بڑھتا گیا حتیٰ کہ ہوتے ہوتے شہزادے کو اب یہ یقین ہونے لگا کہ واقعی اس میں روح حلول کر گئی ہے۔ وینس زندہ ہے اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ میں اس قدر راسخ ہو گیا کہ بعض اوقات صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا وہ واقعی مسکرا رہی ہے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ لیتا اور پھر خود ہی مغلوب ہو کر نگاہیں نیچی کر لیتا۔ بعض اوقات انتہائی جذبہ کے عالم میں شہزادہ کا ہاتھ جب اس کے کسی حصہ سے مس ہو جاتا تو وہ ایکدم چونک پڑتا اسے اپنے آپ میں حدت محسوس ہونے لگتی۔ اس کی روح میں ارتعاش پیدا ہوتا اور وہ پسینہ میں نہا جاتا۔

شہزادہ کو اس کا پورا یقین ہو گیا کہ "وینس" ایک زندہ ہستی ہے اور صرف وہی دنیا میں اس کا واحد پجاری ہے تو اب وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ ہوتی چپ ہو جاتا اور پھر اپنے خیال میں گم ہو جاتا۔

ایک رات اتفاقیہ اس عالم محویت میں وہ اس کے قدموں پر سر رکھے سو گیا —— اس نے دیکھا کہ مرمریں مجسمہ میں جان پیدا ہو رہی ہے اور وہ ایک لطیف انگڑائی لیتے ہوئے آنکھیں کھول رہا ہے۔ شہزادہ اٹھ بیٹھا۔ اس کی سیاہ کاکلیں ہوا میں لہرانے لگیں اور اس نے نشہ کی حالت میں آنکھیں کھول کر دیکھنا شروع کیا۔ شہزادہ مست ہو گیا اور ایسا محسوس کرنے لگا کہ وینس مسکراتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی ہے اور اسکی نگاہیں اس کے دل کی تلاشی لے رہی ہیں تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ آگے بڑھ رہی ہے اور پھر اسے خیال ہونے لگا کہ اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کر دیں شہزادہ اس خیال میں ایکدم اٹھ کر بے اختیارانہ اس سے لپٹ گیا ساتھ ہی وہ مجسمہ زمین پر آ رہا اور نیچے گر کر پاش پاش ہو گیا اس کے ٹوٹنے کی جھنکار سے معبد گونج اٹھا شہزادہ مجسمہ کے ساتھ گر کر بیہوش ہو گیا اس کے بعض ٹکڑے شہزادہ کے بدن میں چبھ گئے اسکے ایسی سخت چوٹ آئی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ وینس کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر اس نے جان دیدی۔

شاہ یونان اپنے بیٹے کی موت سے بیحد متاثر ہوا جب وہ اسے دفنا کر لوٹا تو اسے ہر طرف سے پرستار پرستار کی آوازیں سنائی دینے لگیں اسے محسوس ہونے لگا کہ دنیا کی ہر چیز پرستار پرستار پکار رہی ہے جب وہ معبد میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کے نور نظر کی روح برابر اپنی جگہ بیٹھی پرستش میں مصروف ہے "سچ ہے" بوڑھے بادشاہ نے کہا۔ "حقیقی محبت لافانی ہوتی ہے" ایک طرف سے آواز آئی "لیکن اس کے لئے ایک ایسے ہی پرستار کی بھی ضرورت ہے"۔ بادشاہ نے پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مجسمہ کے ٹکڑے بول رہے ہیں۔

امیدّ

از جناب رئیس احمد صاحب رزاقی طور

تیری امیدّ نے دیوانہ بنایا مجھ کو
ہر لب و گوش پہ افسانہ بنایا مجھکو

کج ادائی نے تری توڑ دیا تھا دل کو
ہاتھ میں لیکے کہیں چھوڑ دیا تھا دل کو

تو بتا دے دلِ صد چاک کو جوڑا کس نے
تیری امیدّ کے مرہم کے علاوہ کس نے؟

تیری فرقت نے شب و روز سلائی امید
مری تخئیل نے جا جاکے جگائی امید

آفریں ہے دل مسکین کو امیدّ تو کی
صبر کو اور مری تمکین کو امیدّ تو کی

تری امیدّ میں رہتا ہے مرے دل کو قرار
تیری تصویر پہ اور اپنے تصوّر پہ نثار

نا امیدی میں بھی امید کیا کرتا ہوں
کیا کروں یونہی مر مر کے جیا کرتا ہوں

دن کو امیدّ تری رات کو امید تری
تیرا ہر غم ہے مرا اور مری ہر عید تری

تو کھنچے لاکھ مگر مجھ سے تعلق ہے ضرور
دُور ہے مجھسے مگر کب مری امیدّ سے دُور

میں صدف ہوں تو مرا گوہر نایاب امید
بحرِ ذخارِ محبت میں ہے پایاب امید

آئی امیدّ کبھی وعدۂ فردا بن کر
روزِ فردا مری حسرت کا تماشا بن کر

دل میں ہو درد تو امیدّ بڑھا دیتی ہے
حسنِ معصوم کی تصویر دکھا دیتی ہے

رہروِ عشق کو منزل کا پتہ دیتی ہے
تھک کے سو جائے مسافر تو جگا دیتی ہے

آئے امیدّ اگر رات کی تنہائی میں
جان پڑ جائیگی تخئیل کی رعنائی میں

نا امیدی میں جو امیدّ کا یارا ہوگا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہوگا

مجھ کو امیدّ ہے اک روز وہ میرے ہونگے
ورنہ پھر چاندنی راتوں میں اندھیرے ہونگے

ملکۂ احمد نگر

ایک دردانگیز رومان

از جناب اے۔ آر۔ رشدی بھوپال

چنگاری

سرسبز و شاداب پتیوں نے مقبروں اور گنبدوں کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ ان پر سفید پھولوں کی کلیوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ سفید کبوتر فضا میں ادھر اُدھر تیر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے درختوں پر پھدک پھدک کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ سست و بیخود تتلیاں پھولوں کی جستجو میں پھڑپھڑاتی پھر رہی تھیں۔ ان کے رنگین پر روشنی میں چمک رہے تھے۔ پھولوں اور نارنگیوں کی خوشبو سے ہوا معطر تھی یہیں ایک سنگ مرمر کے چبوترے پر ملکۂ احمد نگر ـــــ چاند بی بی، رونق افروز ہے سڈول بدن صاف و شفاف خدوخال اور حسن معصوم دنیا کی نگاہوں کو جذب کر رہا ہے وہ اس وقت قرآن خوانی میں منہمک ہے۔ ایک ہلکی سی آواز اس کی تلاوت میں دخل انداز ہوتی ہے۔ اس کے رشتہ کا ایک نواب سر تسلیم خم کئے نظر آتا ہے۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور چہرہ پر نقاب ڈال لیتی ہے اور آنے والے سے دریافت کرتی ہے۔

"آپ یہاں کس لئے تشریف لائے ہیں۔؟"

"مجھے آپ کی محبت کی کشش لائی ہے۔" آنے والے نے جواب دیا دل کے ہاتھوں میں مجبور ہوں عزیز سلطانہ۔"

"شاید سر پھر گیا آپ کا محمد خاں۔" چاند بی بی نے کہا۔ "میری محبت میرے شوہر کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی۔"

"آپ بیوقوف ہوئی ہیں سلطانہ۔" محمد خاں نے کہا۔ "آپ اپنی زندگی کو مسرور بنا سکتی ہیں۔"

"میرے لئے یہی کیا کم مسرت ہے۔" چاند بی بی نے کہا۔ "کہ اپنے وطن عزیز کی خاطر سے زندہ رہوں، اور دل و جان سے اس کی خدمت کروں اور اس طرح میری زندگی وطن پر قربان ہو جائے اور خدا ساتھ محبت کے اٹھالے۔"

"آپ مجھ سے شادی کر کے وطن کی اچھی طرح خدمت انجام دے سکتی ہیں۔" محمد خاں نے عیاری سے کہا۔ "آپ ملکۂ احمد نگر ہونگی اور شان و شوکت آپ کی ادنیٰ کنیز۔"

"کیا آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔" چاند بی بی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں اور مذاق؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں سلطانہ؟" نواب نے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ کہئے آپ کی حریصانہ نظریں احمد نگر کے تخت پر لگی ہوئی ہیں اب سمجھی؟" چاند بی بی نے کہا۔

"سلطانہ میری درخواست پر کچھ تو غور فرمایئے۔" نواب نے کہا۔

"خاموش!" چاند بی بی نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا حسین چہرہ مارے غصے کے سرخ انگارہ ہو گیا تھا۔

"محمد خاں تم غدار ہو۔" چاند بی بی نے کہا۔ "یاد رکھو میں آخر دم تک وفادار رہونگی" محمد خاں نے چاند بی بی کے جو یہ تیور دیکھے تو وہ لرز اٹھا۔

چاند بی بی نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اب تک تمہاری دغابازی اور گستاخی برداشت کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم اور سر پر چڑھے جاتے ہو لیکن یاد رکھو اب میں تمہاری ان بدعنوانیوں کو برداشت نہیں کر سکتی اگر اب بھی تم باز نہ آئے تو اس کا خمیازہ تم کو بھگتنا پڑیگا۔"

قریب ہی کے ایک مینار سے اذان کی آواز سنائی دی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر

"مغرب کی نماز کی اذان۔" چاند بی بی نے کہا اور سر تسلیم خم ہو گئی۔

"اچھا اب مجھے نماز پڑھنے دیجئے اور آپ تشریف لے جایئے۔"

محمد خاں کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

وہ وہاں سے خفیف ہوکر دانت پیستا ہوا چلا گیا۔ "تمہاری قسمت ہی برگشتہ ہے سلطانہ۔" اس کے کچھ روز بعد شہنشاہ اکبر کو جو عرصہ سے تسخیر احمد نگر کی دھن میں لگا تھا ایک خفیہ خط ملا جس میں مرقوم تھا کہ آپ فوراً حملہ کر دیجئے۔ فتح آپ کی ہے ——یہ محمد خاں کا پیغام تھا۔

آگ

احمد نگر میں جب یہ خبر وحشت اثر پہونچی کہ اکبر بذات خود احمد نگر فتح کرنے آرہا ہے اور راستے کے تمام قلعے اس کے قبضے میں آگئے ہیں تو وہاں بڑی گڑبڑ پھیل گئی اور ہر شخص پریشان ہوگیا۔ چاند بی بی کی فوج اس کے سامنے مٹھی بھر تھی وہ بھلا مغل فوج کا کس طرح مقابلہ کر سکتی تھی۔ قلعہ احمد نگر آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ گویا خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ اے رب العالمین مجھے اس لشکر جرار سے بچا۔ چاند بی بی بھی اسلحہ جنگ سے آراستہ۔ سیاہ بالوں کو پگڑی میں چھپائے چہرے پر زریں نقاب ڈالے۔ گھوڑے پر سوار سپاہیوں کو جوش دلا رہی تھی، اور ان کی ہمت نہ ٹوٹنے دیتی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے تمہاری وفاداری، حب الوطنی اور ہمت پر کامل یقین ہے کہ تم کبھی احمد نگر کی حفاظت سے دست بردار نہ ہوگے۔ تم جانتے ہو کہ مغرور مغل ہماری فوجی قوت، جوش، تنظیم، خودداری اور ایثار کے آگے اپنا سر جھکا دینگے اور تمہاری یہ بہادری اوراق تاریخ میں زریں حرفوں سے لکھی جائیگی" چاند بی بی کی یہ پرجوش تقریر سارے مجمع میں گونج اٹھی۔

چاند بی بی نے اپنی تلوار ہوا میں لہرایا جس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اس نے اپنے آدمیوں سے پوچھا۔ "کیا تمہیں میری محبت پر بھروسہ نہیں ہے۔ کیا تم لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو؟ خواہ تمہیں فتح ہو یا شکست۔ یاد رکھو، تمہارے وطن کی عزت خود تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے کیا تم تیار ہو؟" چاند بی بی کے اس استفسار کا جواب پرجوش نعروں سے دیا گیا۔ ہر شخص کے دل میں جذبۂ حب وطن کارفرما ہوگیا اور وطن عزیز کی حفاظت کے لئے کٹ مرنے پر تیار ہوگیا۔ وہ سب چاند بی بی کے ساتھ موت کے منہ میں جانے کے لئے تیار تھے وہ ذلت کی زندگی پر مرجانا زیادہ پسند کرتے تھے۔

بگل کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دی۔ یہ آواز قلعہ کی فصیل کے پاس سے آرہی تھی جو اعلان جنگ تھا۔ چاند بی بی فوراً ادھر روانہ ہوئی۔

راستہ میں ایک زخمی سپاہی پڑا ہوا ملا جو مقابلہ کرتے ہوئے دشمن کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ "وہ قلعہ میں سرنگ لگا رہے ہیں ... جلدی کیجئے" یہ کہہ کر وہ زخمی تو جان بحق ہو گیا۔ چاند بی بی نے مردہ سپاہی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیشک تم جنتی تھے۔" اس کے بعد اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو ہوشیار کر دیا اور انھوں نے بھی دشمن کی سرنگ کے مقابلے میں ایک دوسری سرنگ لگا دی۔ یکایک بے خبری کے عالم میں دشمن کی سرنگ پھٹ گئی اور تیز آگ بھڑک اٹھی۔ دشمن ہوشیار تھے وہ بچ گئے سرنگ کے بھک سے اڑ جانے سے زمین دہل گئی زلزلہ آگیا اور قلعہ کا ایک حصہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ ہزاروں سپاہیوں کے پرزے اڑ گئے دھوئیں اور تاریکی نے ہر طرف قبضہ جما لیا۔

اکبر کی حیرت

چاند بی بی رنج و غم سے تڑپ اٹھی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے، دشمن قلعہ کی دراز سے اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔ محافظ دراز کے قریب پہونچ گئے۔ فصیل پر سے دھڑا دھڑ بندوقیں چلا رہے تھے۔ دشمن گولیوں کی تاب نہ لا سکے بالآخر وہ ناچار ہو کر شام کے وقت اپنے خیموں میں چلے گئے اس خیال سے کہ صبح ہوتے ہی حملہ کر دیں گے۔

دوسرے دن مغلوں کی حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ قلعہ کا گرا ہوا حصہ بدستور سالم ہے اور ایک جدید دیوار نے کل والی دراز کو بند کر دیا ہے۔ چاند بی بی بذات خود اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ اس کی تلوار چمک چمک کر مغلوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہی تھی۔ اکبر اعظم اس کی شجاعت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ گذشتہ رات چاند بی بی نے آنکھوں ہی میں کاٹی تھی۔ اور کھڑے کھڑے اپنے سامنے ہی دیوار کی دراز بند کرا دی پھر بھی اس کے چہرے سے تکان کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے۔

اکبر اگرچہ ملول تھا مگر اس نے فوج کو حملے کا حکم دیدیا۔ جب مغل قلعہ کی دیوار کے پاس پہونچے تو محافظوں نے آگ برسانا شروع کر دیا۔ مغل رک گئے بہت سے مارے گئے۔ اس کے بعد مغلوں نے قلعہ کی دیوار پر گولے مارنے شروع کئے جس سے در و دیوار ہلنے لگے۔ محافظوں نے بھی جو قلعہ کی حفاظت بڑی بہادری سے کر رہے تھے آگ برسانی شروع کر دی لیکن دشمن کے نہ ختم ہونے والے حملوں کے سامنے ان کی تمام تدبیریں ضایع ہو گئیں ان کا گولہ بارود بھی ختم ہو گیا اور ان کی بندوقیں بھی خاموش ہو گئیں۔ چاند بی بی نے حکم دیدیا کہ جس قسم کے گولے اور دھات کے ٹکڑے ملیں وہی چلائے جائیں لیکن جلد ہی یہ بھی ختم ہو گئے۔

اکبر متحیر تھا اور خاموش۔ اس نے خیال کیا کہ وہ عورت ہے لیکن پھر بھی اس نے بہادری اور دلیری کی وہ نظیر پیش کی ہے جو انتہائی حیرت انگیز ہے گولیاں چاند بی بی کے سر کے پاس سے سرسراتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ اس کے ہمراہی موت کا شکار ہو رہے تھے۔ لیکن اس کے پائے استقلال میں لغزش کا نام نہ تھا۔ قلعہ کانپ رہا تھا۔ چاند بی بی کے لئے یہ خیال سوہان روح ہو رہا تھا کہ اب مدافعت زیادہ عرصہ تک نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ قلعہ کے مضبوط دروازوں کے قلابے چرچرانے لگے۔ ایکا ایکی قلعہ کے دروازے کھل گئے۔ چاند بی بی کے سپاہیوں کو بھی بیحد جوش آگیا۔ انھوں نے بھی جان کی بازی لگا رکھی تھی اور نعرۂ جنگ سے سارا قلعہ گونج رہا تھا۔ مغل بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ یکایک اکبر نے تحکمانہ لہجہ میں گرج کر کہا ——— "ٹھہرو!"

چشم زدن میں تمام مغلوں نے لڑنا بند کر دیا۔ اکبر کا ہاتھ جس میں شمشیر آبدار چمک رہی تھی چاند بی بی کے سلام کو اٹھا۔ مدافعین بھی رک گئے چاند بی بی گھوڑے پر سے اتر پڑی اور سر تسلیم خم کر کے اکبر کے سلام کا جواب دیا۔ اکبر نے صلح کا سفید علم لہرا دیا۔ اور چاند بی بی کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ اس کی شجاعت اور دلیری سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے اور صلح کا خواہشمند ہے چاند بی بی نے اس کا دلی شکریہ ادا کیا اور جواب دیا کہ صلحنامہ کل مرتب کیا جائیگا۔ دونوں طرف کی فوجیں اپنے اپنے خیموں میں واپس چلی گئیں۔

غداری

چاند بی بی نے اپنے محل کو صاف کیا اور از سر نو اس کی آرائش کی اپنی تلوار کو بوسہ دیا اور اس کو اپنی جگہ پر لٹکا دیا۔ اس نے جسم سے زرہ بکتر بھی اتار دیا۔ تازہ پانی سے جا کر غسل کیا اور پھر اپنے زنانے کپڑے زیب تن کر لئے یہ لباس بالکل سفید تھا۔ سفید پائجامہ، سفید کرتہ۔ سفید ہی ٹیکا، سفید ہی شال اور سفید ہی سلیپر۔ اس سادے لباس میں "جانباز ملکہ" اور زیادہ دلکش معلوم ہو رہی تھی۔

"پیاری سلطانہ تم تو مجسمۂ حسن معلوم ہو رہی ہو۔ اس کی ایک کنیز نے کہا۔ چاند بی بی نے شوخی سے اس کے رخساروں پر ایک ہلکا طمانچہ مارتے

ہوئے جواب دیا۔ "آج میں سفید لباس میں ملبوس ہوں"۔ چاند بی بی نے کہا "کاش اسی حالت میں اپنے شوہر سے جاملوں"۔

اس کے بعد فرحت حاصل کرنے کیلئے اس نے شربت کا ایک گلاس نوش کیا۔ "کل کا دن احمد نگر میں خوشی کا دن ہوگا"۔ اس نے اپنی کنیز سے کہا۔ "اکبر اعظم سے صلح کرنے کے بعد احمد نگر اپنا سر اٹھانے کے قابل ہوگا"۔ چاند بی بی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب میں سوتی ہوں"۔

جوں ہی وہ جانے کے لئے مڑی کہ ایک افسر بھاگتا ہوا آیا۔ "بھاگئے سلطانہ بھاگئے!! اس نے چیخ کر کہا۔

چاند بی بی نے کہا۔ "کیا ہے؟"

"محمد خاں نے آپ کے خلاف جوان بادشاہ کو بھڑکا دیا ہے تمام شاہی خاندان آپکے خلاف ہوگیا ہے اور بہت سے آپ کے دشمن ہوگئے ہیں کیونکہ آپ نے صلح کرلی ہے"۔ افسر نے بیان کیا۔ "محمد خاں آپ کے پیچھے پیچھے بھاگ کر پڑا ہے.... فوراً یہاں سے کہیں نکل جائیے۔ وقت ضایع نہ کیجئے۔ سب سے زیادہ تیز رفتار گھوڑا آپ کا انتظار کر رہا ہے"۔

چاند بی بی ناز کے ساتھ تن کر کھڑی ہوگئی۔ "کوئی ڈر کی بات نہیں" اس نے کہا "میں ان کا مقابلہ کرونگی۔ اور دیکھونگی کہ ایک غدار کی غداری کامیاب ہوتی ہے یا میری سچائی......"

اتنے میں محمد خاں داخل ہوا اور اندر آتے ہی چاند بی بی کے سینہ میں خنجر بھونک دیا.... چاند بی بی گر پڑی اس کی زبان سے نکلا "اللہ!" اس کے مرمریں ہونٹ کانپے اور احمد نگر کا چاند غروب ہوگیا۔

انتقام

اکبر اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا سپہ سالاروں سے دہلی اور احمد نگر کے صلحنامہ کے شرائط کے متعلق بحث و تمحیص کر رہا تھا۔ یکایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سے وہ چونکنا ہوگیا۔ فوراً ہی خیمہ کا سپاہی اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے سوار بھی شہ نشین میں داخل ہوگیا۔ سوار تھکن اور ماندگی سے چور چور ہو رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی زمین پر گر پڑا۔ اس نے بمشکل کہا——

"آہ، چاند سلطانہ قتل کردی گئی"۔

اکبر یہ سن کر اچھل پڑا اور بھونچکا ہوکر رہ گیا۔ وفور جذبات سے

وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ تمام حاضرین پر اداسی چھاگئی۔ لوگوں نے آنے والے سے چاند بی بی کے متعلق مزید تفصیلات دریافت کیں۔ آہستہ آہستہ اکبر کی حالت میں تغیر ہوا۔ وہ سخت پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مارے غصہ کے سرخ انگارہ ہوگئیں۔ اس نے کہا ایسا بزدلانہ جرم کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس کا انتقام لے کر چھوڑینگے!

آگ کی طرح چاند بی بی کے مرنے کی خبر ساری فوج میں پھیل گئی۔ بگل بجنے لگے۔ توپیں چلنے لگیں قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی مغل اندر گھس گئے۔ احمد نگر تھرا گیا۔ وہ گڑبڑ مچی اور وہ جنگ وخونریزی ہوئی کہ الامان والحفیظ۔

سڑکوں پر خون کا سیلاب تھا۔ غدار یکے بعد دیگرے واصل جہنم ہو رہے تھے .... کہا جاتا ہے کہ اکبر نے اپنے انتقام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا —— محمد خاں کے ٹکڑے اڑا دیئے گئے اور احمد نگر ویران ہوگیا۔

جب مغل اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے اور احمد نگر تسخیر کرلیا گیا تو شہر میں خاموشی چھاگئی۔ مغلوں نے ازسرنو سڑکوں کو درست کیا۔ ان کے ہتھیار روشنی میں جھلمل کر رہے تھے اور علم ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چاند بی بی کی سلامی توپوں سے کی گئی۔ اس کا جنازہ آہستہ آہستہ سپہ سالاروں اور فوجی افسروں کے جلو میں چل رہا تھا اور پیچھے پیچھے اکبر تھا غمگین —— خاموش، سر جھکائے ہوئے!

جنازہ پر دہلی اور احمد نگر دونوں کے پرچم لہرا رہے تھے جو کل تک اعلان جنگ تھے لیکن آج متحد —— چاند بی بی کی لاش پر یاسمین کے پھولوں کی جالی تنی ہوئی تھی۔ جس مغل سپاہی کے قریب سے جلوس گذرتا تھا وہ فرط عقیدت واحترام سے سر جھکا دیتا تھا۔

چاند بی بی کو ایک مقبرہ میں دفن کردیا گیا اور آج تک اسی میں ہندوستان کی بے نظیر ہیروئن —— احمد نگر کی ملکہ محو استراحت ہے۔

کا خاکہ ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کے نقائص کا۔ موجودہ تہذیب و تمدن ہمارے معاشرہ کو کس طرح برباد کر رہا ہے۔ اس کا ایک ہلکا سا عکس مجنوں کی ڈائری میں دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ اگر ہوا کا رخ یہی رہا۔ تو سو سال کے بعد ہماری کیا حالت ہوگی بیحد دلچسپ کتاب قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

تین پیسے کی چھوکری

از قاضی عبدالغفار مصنف "لیلیٰ کے خطوط" یہ افسانے قاضی صاحب کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ وثوق سے کہا جاتا ہے۔ کہ یہ افسانے اردو لٹریچر میں ایک حسین اضافہ ثابت ہونگے جو حضرات افسانہ نگاری کے شائق ہیں اور افسانوں میں حقیقی روح دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو جلد از جلد آرڈر بھیجنا چاہیے قیمت عہ

لمحات رنگین

مس زبیدہ سلطانہ کے حسین افسانوں کا مجموعہ ہے جسے مصنفہ نے نہایت کاوش اور محنت سے لکھا ہے قیمت عہ

ناظمہ کی آپ بیتی

ایک شریف زادی کی عبرتناک آپ بیتی۔ یہ نہ کوئی افسانہ ہے۔ نہ کہانی۔ بلکہ ایک سچا واقعہ ہے جس کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ دوشیزگی۔ ازدواجی زندگی اور مایوسی۔ مصنف کی یہ ادبی کاوش ایک قومی و ملکی خدمت ہے۔ پریس اور پبلک نے نہایت زوردار الفاظ میں اس کا خیر مقدم کیا ہے کتاب بیحد دلچسپ اور واقعات سچے اور ہوشربا ہیں قیمت عہ

گھر کا بہادر

مشہور مزاح نگار حضرت مرزا عظیم بیگ چغتائی کا تازہ ترین طرز تحریر کا شاہکار افسانہ ناول۔ نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز ناول ہے۔ مصنف نے اپنے شوخ اور مزاحیہ طرز بیان کے ساتھ سکون عظیم کے جھگڑے کرتے ہیں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک سین دکھائے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ محصول ڈاک ۵؍

خطوط کی تفسیر لعنی

خطوط کی تفسیر لعنی مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایسا ہنسنے ہنسانے والا ناول ہے جس کی تمام سطور میں دل لگی ہے قیمت بارہ آنے ۱۲؍

غزل

ترکستان کی بہت دلچسپ کہانی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسی دلچسپ کہانی آپ نے کبھی نہیں پڑھی ہوگی۔ واقعات اتنے ہوشربا ہیں کہ حیرت ہو کر رہ جائیں گے قابل مصنف کے زور قلم لکھا گیا ہے قیمت صرف ۱۰ آنے علاوہ محصول ڈاک

سلامبو

آج سے دو ہزار سال قبل کی قرطاجنہ قدیم کی حسین و جمیل داستان مترجمہ مولینا عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سلامبو میں مصنف نے آج سے دو ہزار سال پہلے کے واقعات کی تفصیل پیش کی ہے اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ تہذیب و معاشرت حاکم و محکوم رزم و بزم امرا و غربا، مذہب اور ریعتقد اور رسمیں سب کی تصویر دیکھ لیجئے۔ اس تاریخی منظر پر حسین سلامبو اور شہ زور ماتو کی داستان عشق مرتب کی ہے۔ حسن و عشق کی آویزش۔ وحشی سپاہ کی بغاوت جنگ کے بھیانک مناظر قتل و غارتگری کی دل ہلا دینے والی روئداد۔ غرضیکہ اس زمانہ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر فاضل مصنف نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے ضخامت ۵۰۰ صفحات ہر دو جلد قیمت تین روپے ؎۳

شاخ نبات

مجموعہ کلام حضرت طالب باغپتی حضرت طالب باغپتی ملک کے مشہور اور دقیقہ رس شعراء میں سے ہیں جن کی ذات علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے آپ کی تازہ ترین تصنیف شائع ہو چکی ہے جو شاخ نبات کے نام سے بالکل اسم بامسمیٰ ثابت ہوئی ہے شاخ نبات اس سال کی بہترین تصنیف ہے۔ ضخامت ۲۷۰ صفحات متعدد سہ رنگی تصویریں۔ قیمت عہ

طلسم سامری

ملک روس کی ایک نہایت دلچسپ داستان ساحروں اور زنارکشوں کے خوفناک حالات اس قدر دلچسپ ہیں کہ شروع کر کے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تاریخی حقائق کو ایسے رنگین و ہوشربا پیرائے میں بیان کرنا میاں اسلم کی جادو نگاری ہی کا کام ہے۔ قیمت صرف عہ

عجیب

مشہور زمانہ ادیب قاضی عبدالغفار مصنف "لیلیٰ کے خطوط" کی نہایت دلچسپ تصنیف قیمت عہ ایک روپیہ

آرائش جمال باتصویر

اردو زبان میں زنانہ سنگھار کے متعلق پہلی کتاب جو ایک معزز خاتون نے لکھی ہے۔ اس سے پہلے اس قسم کی دوسری کتاب موجود نہیں تھی جو بہو بیٹیوں کے ہاتھوں میں دی جاسکے۔ کتاب کی خوبیاں پڑھنے سے واضح ہونگی۔ متعدد بلاک کی تصاویر مجم ۲۷۰ صفحات مجلد صرف عہ

طلسمات

جوانی کی تلخیوں اور رنگینیوں کے بند راز۔ قیمت عہ